

www.paksociety.com

خوبصورت لڑکیوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

ستمبر 2012

نگران اعلیٰ

معراج رسول

عیدِ مبارک

سچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی کوٹاہیوں اور ان سے جنم لینے والی محرمیوں پر ایک صاحب دل صاحب نظر کا نوٹ

11

انشائیہ

جون ایلینا

ماضی کا آئینہ یا اختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

20

تج نامہ

ڈاکٹر ساجد امجد

عقلمند دشمن ایک زور آور مجسمہ کے درمیان اسرار کھیل

49

مستحق

کاشف زبیر

دو بھائیوں کی بے مثال محبتوں اور محنت الفتوں کا عجیب تماشا

93

بھائی

مریم کے خان

”وکالت کا خوناچہ“ لگانے کی خواہش کرنے والے ایک مکمل کا پیرزح انداز

106

پس منظر

مرزا امجد بیگ

آپ کے خط

12

مدیر اعلیٰ

سینس کی تلاش اور تباہ کن قارئین کی تحویلوں میں شریک باتیں، گلے شکوے اور پر خلوص مشورے

جدائی

43

طاہر جاوید مغل

عہد گزشتہ چند خوشگوار لمحات کشید کرنے والے ایک دیوانے کا قصہ

ہکاشکوں

62

انوار صدیقی

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد و طویل سلسلہ

تعاقب

103

سلیم انور

رگوں میں ابھری گردش تیز کرنی ایک سنسنی خیز تحریر

روزِ دل

135

زاہد نقوی

محبت کی قوس قزح اور دل کی بے ترتیب جھڑکنوں کا حساب

گھسے کے بھیدی کی سفاکانہ کارروائیوں کا دلچسپ سلسلہ جبراً

147

دولت کا رشتہ

ابوالمنصور

محض ذاتی مفاد کی خاطر گھروں کو آگ لگانے والوں کا قصہ

155

ہلمٹ کی چوٹی

بابر نعیم

اس فریب کار دنیا میں آزمائش کن لمحات کی سنسنی خیز واردات

213

فری کا

نظارت نصر

سیطرہ سطر جلد بازی کے شکار پر تجسس واقعات کا تسلسل

235

شامِ اعمال

مختار آزاد

نیٹ چیٹنگ کے پس منظر چیٹنگ تک ایک دلچسپ ماجرا

253

ہم شکل

تنویر ریاض

محفل شعروں

152

قارئین

آپ کے ہاتھوں کی ایک ٹخنہ ٹخنہ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

میسافر

168

ناصر ملک

گل و گھڑی سے ابھرتا ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

حضر شعیب علیہ السلام

223

رضوانہ ساجد

سرورانِ قوم کی بد اعمالیوں اور مہربانی حق کا ایک اور عجیب واقعہ

خود گوواہی

249

ثمر عباس

ایک مجسمہ ذہن کی الجھی نفسیاتی اور حالات کا پیچ و خم

قرضِ سافت

258

عائشہ فاطمہ

رنگین لہجہ میں حسین چہرے کے بدلتے رنگ اور سنگین دلالت قلبی کا شاخشا

بے دولتی

ہمارا سب سے بڑا ہنری یہی تو ہے کہ ہمارا ہنر اپنے کام نہ آئے اور یہ کہ وہ دوسروں کے پست و پیش، چپ و راست اور پس و بلندی کی صورت گری کرنے میں، انہیں سنوارنے اور نکھارنے میں اپنا جواب نہ رکھتا ہو۔ تم تھے ہی نہیں، ہم تھے ہی نہیں، تم ہو ہی نہیں، ہم ہیں ہی نہیں۔ ہم اور تم تو بس ایک دکھائی دینے والا دھوکا ہیں، ایک دھوکا جو نہ جانے کیوں ہے؟ میں یہ سوچتے سوچتے ہلکان ہو گیا ہوں کہ وہ جو نہیں ہیں، وہ جو دھوکا ہیں، وہ دکھائی بھی کیوں دیتے ہیں۔

ہمیں شرم آنا چاہیے کہ ہم تم میں سے ہیں اور تمہیں اس پر پچھتانا چاہیے کہ تم ہم میں سے ہو۔ تم اور ہم ایک بیزار کر دینے والا تماشا ہیں جسے دیکھتے دیکھتے پھوٹے دکھنے لگے ہیں۔

ہم سرزمین عرب کے اس علاقے کو ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں جس کو ہماری سرزمین کے ہنرمندوں نے ریگستان کا معجزہ بنا دیا ہے، ہنر کا معجزہ۔ ہماری کارگزاری کا سارا سلیقہ دوسروں کے لیے اس کمال کے ساتھ ظہور میں آیا ہے۔ ہم نے اپنی بستیوں سے دوران بستیوں میں آکر جو عمارتیں بنائی ہیں، وہ سر بلند رہنے کے لیے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے گر پڑنے کے لیے نہیں ہیں اور گزرگاہوں کا جو فرش بچھایا ہے وہ زمین کے سینے پر جڑے رہنے کے لیے ہے، موسم کی اگلی ہی رو میں ادھڑنے کے لیے نہیں۔ نہیں سمجھا جاسکتا کہ شہر پردازی کی وہ کاوش اور دفتر داری کی وہ دانش آخر کس کام کی جو اپنے شہروں اور اپنے دفتروں کے کام نہ آئے۔

تمہارے شہروں کے باہر، تمہارے ماہر، تمہارے محنت کش دوسری سرزمینوں کے ناموں کو لپچائے ہوئے کانوں سے سنتے ہیں۔ ایسے کتنے ہیں جو یہاں سے سفر اختیار کرنا نہ چاہتے ہوں۔ کسی نے کہا تھا اور کراہتے ہوئے کہا تھا:

”میرے لوگ، میرے جفاکش دوسری قوموں کی مزدوری کریں گے۔ ان کی تھکان دوسروں کا آرام بنے گی۔ میرے اہل ہنر دوسروں کے غلام ٹھہریں گے۔ میرے اہل دانش کی مہارت دوسروں کے اشاروں کی خدمت کا قرار پائے گی۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے اپنے کام کے حساب سے خوب خوب کمائے گا اور یہ ذلت، ندامت اور عکبت کی کمائی ہوگی۔ وہ اپنے وجود سے دستبردار ہو جائیں گے اور پھر تو وہ جو چاہیں، پائیں اور جتنی اشرفیاں چاہیں، اپنی جیبوں میں بھر کر لائیں۔“

پر یہاں ایک اور بات بھی کہنی چاہیے اس لیے کہ وہ حق اور انصاف کی بات ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ لوگ آخر یہ کیوں نہ چاہیں کہ انہیں دو وقت کی روٹی ملنے کا سہارا تو ہو۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ، بہت زیادہ کی امید ہو تو آخر وہ اپنے شہروں سے کیوں نہ کوچ کر جائیں۔ میں تو کبھی کبھی یہ کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ مہارتوں اور ہنرمندیوں کو اپنی سرحدیں پار کرنے کی خواہش آخر کیوں نہیں رکھنی چاہیے؟ انہوں نے اپنی عمر کا بہترین زمانہ دن رات محنت کر کے گزارا ہے۔ ان میں سے اکثر کو ان کے شہروں سے کیا ملا ہے۔ ان میں سے لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو ہر حالت میں یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے لاکھوں ایسے ہیں جو آج کی امید نہ سہی تو کل کی امید پر زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں مگر یہاں تو ابھی تک نہ آج کی امید ہے اور نہ کل کی۔ وہ یوں کہ جو ہمارے والی ٹھہرے ہیں وہ بھی فضول ہیں اور جوان والیوں کو ہٹا کر ان کی گدی پر بیٹھنا چاہتے ہیں وہ بھی فضول ہیں۔

جن لوگوں نے اپنے آقاؤں سے لولگائی ہے اور جنہوں نے ان آقاؤں کے حریفوں سے امید رکھی ہیں وہ سب گھائے میں رہے ہیں۔ حکمرانوں اور مدعیوں کا کہا باطل ہی ثابت ہوا ہے، باطل باطل سب باطل۔ اب اگر لوگ پھر کران دونوں پر ٹوٹ پڑیں تو کیا یہ کوئی جرم ہوگا؟ میں کہتا ہوں کہ یہ حق ہوگا، انصاف ہوگا، عدل ہوگا۔ لوگ وعدوں سے تنگ آ گئے ہیں چاہے یہ وعدے یہ کریں یا وہ.....

اس ملک کے حاکموں اور ان کے حریفوں نے اور ان کی حکمتوں نے یہاں کی جو ہر دار زہانتوں کو دوسری قوموں کا گداگر بنا دیا ہے اور یہ ہنرمند بے قصور ہیں۔ یہ بے چارے ملکوں ملکوں جا کر گداگری کرتے ہیں اور اپنے اپنے کشلو لوں کی بھیک اپنے ملک میں بھیج دیتے ہیں۔ وہ اس ملک کی اور کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ مگر ان محنت کشوں کی بھیجی ہوئی یہ دولت اس ملک کی ہے، دولتی ہے ہاں، اے مجبور بار برداری کی قوم! یہ تیری بے دولتی ہے۔

پچھلے دنوں میکسیکو میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی تقریری مقابلے میں پاکستانی ہونہار طالب علموں نے 45 ممالک کے دوسو سے زائد طالب علموں میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے پاکستان کا نام سر بلند کیا۔ تقریری مقابلے میں عنوان تھا ”گوانتا نامو بے جیل فوری بند ہونا چاہیے“۔ پاکستانی ٹیم کی قیادت زینب حمید، کراچی گرامر اسکول نے کی۔ دوسری خوشخبری یہ ہے کہ گورنر سندھ اور سی پی ایل سی کی کوششوں سے صومالی قزاقوں کی 20 ماہ قید کے بعد بحری جہاز کا پاکستانی عملہ اپنے پیاروں تک پہنچ گیا یوں متعلقہ خاندانوں کی عید اپنے پیاروں کی دید سے دو بالا ہو گئی۔ ان خوشخبریوں کے ساتھ ہم بھی چلتے ہیں۔ اپنے نٹ کھٹ پیاروں راج دلا روں کی محفل میں..... جہاں شور ہے اور شوخی بھی.....

ساحر ناز لدھیا ٹوٹی، کونڈے سے بھر پور تھیرے کے ساتھ محفل کی زینت بنے ہیں۔ "سپنس سے ہماری شناسائی تو دس سال سے ہے جب پہلی بار اپنی کزن جو ہماری مابا ایمان ہی کی طرح ناک بھوں چڑھانے میں کسی طور کم نہیں..... کے خوب صورت ہاتھوں میں گل رنگ رنگوں سے مزین اپنی خوب رو آنکھوں سے دیکھا (لیکن آپ کی کزن نے شاید ہماری محفل میں کبھی شرکت نہیں کی) نگاہ شناس تو تھیں ہی، شوق دید بھی پیدا ہوا تو بعد شوق ملاحظہ کیا..... تاریخی تحریروں کو رسالے کی جان جانا اور دیگر منفرد سلسلوں کو اس کی انفرادیت گردانا..... لفظ "لفظ سخنر زوہ بڑا حاور عشق" سپنس میں ایسے مجنوں ہوئے کہ آج تک پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ شاید یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا اور ہم صرف قاری ہی رہتے لیکن ہمارے گوئے قلم کو زبان اس خیال نے دی جو یہ دستور محفل میں ایک صاحب ذوق، پائے دانش تھیرہ نگار کی کی کو برابر محسوس کر رہا تھا..... پس اسی خلا کو پورا کرنے آن وارد ہوئے..... امید ہے بخود نگاہ بنایا جائے گا ہر آنکھوں پہ بٹھا جائے گا (چشم مارشون دل ماشاد) سپنس بلاشبہ ایک معیاری تخلیق ہے..... اور ایسے ناموافق حالات میں جبکہ..... سکون بجلی کی طرح ناپیدا اور ڈپریشن مہنگائی کی طرح بڑھتا ہی جا رہا ہے، سپنس آنکھوں کی ٹھنڈک، فرحت و دھنک اور ذہنی استراحت سمیت معلومات کا بہترین ذریعہ ہے۔ ماہ اگست کے حصول سپنس میں پسینا پسینا ہو گئے، سینہ بہ سینہ ملے تک..... سرورق خوش رنگ تیلیوں کے صراحی کے گرد منڈلانے اور حسینہ کی صراحی دار گردن کے اوپر پری لیکن سنجیدہ چہرہ جو ہمیں ہویا کیے جا رہا تھا کا خوب صورت منظر پیش کر رہا تھا۔ انشاء یہ نے ہمیں ہمارے ذہنوں سے مٹی تاریخ کی فتح مزاجی اور اس کی اہمیت کا ادراک کرایا..... ماضی کی کڑوی آزمائشوں سے جو سکھ لیتے ہیں، سمجھ لیتے ہیں وہ سنبھل لیتے ہیں۔ ایلیا صاحب کے خوب صورت الفاظ اور انداز بیاں سے دل ناداں کو مسکورا و سرور پایا، وہیں کڑوے کٹیلے معنی و مفہوم سے نادم و ناداں رہ گئے۔ ادارہ یہ جگہ عوام کی فکر میں ہلکان اور عسکرانوں کے بے حس رویے سے پریشان نوحہ کن تھا، پر یہ پکار بھی صدا پہ صحرا اور درانگاں جانے والی ہے۔ محفل میں صنف نازک کی، ان کے سوچنے کی صلاحیت ہی کی طرح قلت..... اور صنف کرخت کی عقل و خرد سے مالا مال ہونے کی طرح فردوانی نظر آئی۔ بزم جاناں کی بے جان، نہایت تزک و احتشام سے براجمان، سند صدارت کے ایک مینے کے مہمان، گستاخ انجم..... اپنی چست خھرے بازی اور تیز و نو کیلے جملوں سے سرفہرست رہے، اپنے ہماری نام کی طرح ان کا تھیرہ بھی ہماری پڑ گیا..... مبارک باد۔ مافہرہ سے مس جویریہ کی معصومیت بھی بھلی لگی۔ ویسے عرض ہے کہ آپ کچھ زیادہ نہیں بلکہ بہت کچھ..... کم بول نہیں، یہاں تو ایسے ایسے چرب زباں اور باتوں کے بادشاہ بھی موجود ہیں جن کی چلتی زبانیں بڑھتی مہنگائی کی طرح کبھی نہیں ٹھمتیں۔ سرگودھا سے عمران حیدر بلوچ ادعا ہے تمہیں جلد از جلد جیل سے رہائی ملے۔ ریاض شاہد، حسین عباس بلوچ اور رائے قیصر عباس کھرل کی اسیری بھی رہائی میں بدلنے کے لیے دعا گو ہوں۔ شیر علی خان آپ شاید رمضان المبارک میں شہر، شہر سمجھوروں کی ریزمی لگاتے ہیں جو نام تو لکھا لیکن مقام نہیں لکھا..... تھیرہ پسند آیا..... حکیم سید محمد رضا شاہ صاحب آپ کے مختصر تھیرہ لکھنے والی بات پر میں بھی شائق ہوں، سچی تو میں نے اپنا خط بھی فقط دو چار لائنوں ہی پر مشتمل رکھنے پر اکتفا کیا (ماشا اللہ..... اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو) را جا صاحب نواز صاحب حسب معمول سیدھا سا اور سنجیدہ سا تھیرہ لے کر آئے۔ کراچی سے این آر ڈرٹا آپ کے خطوط ایسے آتے ہیں جیسے سرکاری ننگے سے پانی..... دک رک کر آتا ہے۔ عبدالرؤف عدم

راولپنڈی سے اور محفل میں زبردستی گھسنے محمد قدرت اللہ نیازی کے تبصرے بھی پسند آئے۔ کہانیوں میں حسب معمول ابتدا دیہاتی پس منظر لیکن اعلیٰ سوچ و فکر کے تناظر میں لکھی گئی جاندار کردار نگاری اور شاندار مکالمے بازی سے آراستہ و پیراستہ مسافر سے کی۔۔۔۔۔ شہرے کی کٹنگی ایام میں گزرتی دیکھتی زندگی۔۔۔۔۔ والد عرف کمالے کی دوا آتش اور میڈم شکیلہ جیسے دل فریب، مگر ریز کرداروں کی دُور سے نہایت مہارت و مشافی سے بنی گئی ایک دل آویز تحریر۔ کہانی کی آخری لائیں ہمارا اضطراب بڑھا گئیں۔ الگ انداز تحریر لیے اور منفرد کرداروں سے مزین کشکول بھی بلاشبہ ہمارے پسندیدہ سلسلوں میں سے ہے، طاقت و دُرم میں چور چور شیخ حامد کے خلاف اور بگ زیب پوری تاب سے برسرِ بیکار ہے۔ آخری صفحات کی زینت پانچواں آدمی گو کہ ویسی تحریر ہرگز نہیں رہی تھی اقبال جیسے بڑے مصنف کا نام دیکھ کر ہمارے ذہن رسا نے سوچی تھی لیکن بہر حال اچھی تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد بادشاہوں کی شان و شوکت کی بلند یوں میں سوچ کی پستیوں جن کی تباہ کاریوں سے شہر کے شہر ویران اور شہر یوں کا بحران ہونے کو تھا۔۔۔۔۔ کو جا کر کرتے نظر آئے، مشتاق قلم کار کا ماضی کے درپہلوں کنارے کرانے کا انداز ہمیں بھا گیا۔۔۔۔۔ ملک صغیر حیات کی تحریر پردہ نشیں میں پردہ نشیں کے پردے جاک کے تو در پردہ جو شخص برآمد ہوا وہ ہمارے سامنے میں بھی نہیں تھا، انسانیت کے لبادے میں حیوانیت سے بھی بدتر انتقام کی آگ میں جلتا چودھری الہی بخش سمجھ رہا تھا کہ وہ قانون کو بھی جیل دے کر نکل جا۔۔۔۔۔ مختصر کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح مغربی و مشرقی ادب ایک دوسرے پر سبقت لے جانے پر عائد تھا۔۔۔۔۔ آغاز ایم اے راحت کی تحریر قرض حسنہ سے کیا۔۔۔۔۔ کو محض خواب گراں سمجھ لیے، بنت خوابوں میں اٹھے، بھی نہ سلینے والے ایک بے وقوف کا مجراے خاص۔ شمر عباس کی تحریر وارث میں ہمیں لگا کہ عیار حیاری و مکاری اسی پر بھاری پڑ جائے گی لیکن ایسا بہر حال نہیں ہوا۔۔۔۔۔ لطافت آمیز تحریر آدم خور گلز بھاگ لطف احساس میں جکڑے، روانی سے چلتی ہمارے اشرف المخلوقات ہونے پر اٹھانچا جھڑپ گئی۔ ویلنا کے وحشی میں وجود زن نے اپنی تخریب کاری دکھادی، ٹونی کا جذبہ اور قربانی لائق تحسین ہے۔۔۔۔۔ کی تحریر امانت جس میں گھر کے بھیدی نے ہی خیانت کر دی، ایک تجسس آمیز تحریر رہی۔ کاشف زہیر کی نئی دنیا نے بھی بور نہیں کیا۔ نیو ریاض کی تحریر جن پرستی پر مبنی حرم و لالچ میں گھرے مغرب کی خوب نمازی کر رہی تھی۔۔۔۔۔ نجمہ شکور کی تحریر چھوٹا بخش چہرے پہ قسم بکھیر گئی۔ سب سے آخر میں حضرت سلیمان سبق آموز، ایمان افزہ شب و روز سے فیروز ہوئے اور یوں یہ شمار بھی اپنی تمام تر رعنائی و دلکشی سے قلب و ذہن کو منور کرتا تمام ہوا۔ اب جبکہ میں یہ خط لکھ رہا ہوں تو رمضان المبارک کی ابتدا ہے، جب شائع ہوگا تو مغرب اس بابرکت مہینے کا اختتام ہوگا اور عید کا ذکر سرعام ہوگا، آزادی کا دن بھی ہمارا منہ ہمیں کچھ یاد دلانے لگا کہ۔۔۔۔۔ ہم بھی چند دہائیوں پہلے آزاد ہوئے تھے اور یہ ظاہر اب بھی آزاد لکھے اور سمجھے جاتے ہیں۔ میری طرف سے ادارے قارئین کو رمضان کی رحمتیں، برکتیں، عید کی خوشیاں اور آزادی مبارک ہو۔“

﴿رمضان﴾ پاشا، کمیشن اقبال، کراچی نے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”سپنس مل گیا، اگست 2012ء کا سرورق، حسین اور جاذبِ نظر، اشتہارات، جزار کن۔ انشائیہ، کڑوا بچ، آپ کے خط، جبرہ نگاروں کی رزم گاہ۔ فیصلے فقیروں کے، اندرونی واقعات سے آگاہی، نئی دنیا، ماضی بید کا دل سوز قصہ۔ آدم خور گلہ بھاگا، ایک طویل و عریض لطیفہ۔ کشکول، معرکہ تنکی و بدی۔ قرضہ حسد، دن کو خواب دیکھنے والے احق کا شاخسانہ۔ جنت، جہنم کے یاداش میں ملی ہوئی بہشت محفل شعر و سخن، شعر و شاعری سے بھرپور انگزار۔ ویلٹا کے وحشی، زمانہ قدیم کی دلخراش داستان۔ مسافر، کھن رستوں کا سفر پر خطر ابھی باقی ہے۔ امانت، خیانت ہوتے ہوتے رہ گئی۔ حضرت سلیمان، ایمان تازہ کرنے والا قصہ۔ چھوٹا بخش، ایک لمبی چوڑی گپ۔ وارث، پسند نہیں آئی۔ پانچواں آدمی، دی امانت، خیریت آف دی منتھ۔ کترین، بہت عمدہ۔ سپنس کا عمل، قابلِ داد افراد۔ مدبر اعلیٰ، سنسر کے ماہر۔ آخری بات، سپنس میں کام کرنے والے ہنرمندوں اور قلم کاروں کو دعائیں اور تسلیات..... اور رمضان مبارک۔“ (بہت عمدہ..... مختصر مگر جامع تبصرہ)

۱۱۰ سعدیہ بخاری، ضلع انک سے جلی آ رہی ہیں ”میرے خط کی دو چار انہیں شائع کر کے آپ نے احسان عظیم کیا ہے اس کے لیے میں بے حد مشکور ہوں اور امید رکھتی ہوں کہ یہ والا خط ضرور شامل محفل کریں گی کیونکہ اگلے ماہ عید کی وجہ سے خط نہیں لکھ سکوں گی (کبھی کبھی جگہ کی قلت ایسا کرواتی ہے) اب آتی ہوں رسالے کی طرف، اگست کا سببسن بلاتا خیر پہلے کی طرح 18 تاریخ کو ملا۔ سرورق بلاشبہ ہماری آزادی کے سال کی عکاسی کر رہا تھا اور سرورق کی حسد اس بات پر اتر رہی ہے کہ پاکستان 65 سال کا ہو چکا ہے۔ آپ سب کو کاشمی عی مبارک باد دے دوں۔ اللہ کرے سب امیر و غریب کو عید کی خوشیاں برابر ملیں، آمین۔ جون ایلینا، حسب حال آزادی کی بات کر رہے تھے، 65 برس گزر گئے لیکن ہم جہاں کے تھے وہیں رہ گئے کیونکہ ہم نے جسمانی آزادی تو حاصل کر لی لیکن ذہنی آزادی حاصل نہ کر سکے۔ ادارے میں مدیر اعلیٰ جن خیالات کا اظہار کر رہی تھیں میں ان سے پوری طرح اتفاق کرتی ہوں۔ خطوط میں اس بار پہلے ہی نمبر پر ایک گستاخ صاحب تعریف فرماتے جو قتل اردو میں اپنے خیالات کا اظہار فرما رہے تھے۔ ویسے گستاخ انجم صاحب آپ کا نام انجم گستاخ ہے یا گستاخ انجم ویسے بات تو ایک ہی ہے، ناک کو چاہے احرے پکڑو۔ اس بار تو طاہرہ یاسمین نے رہنار کیا کہ تو زو یا، کدھر ہو بھی؟ چند دھری نذیر صاحب آپ کے شمالی علاقہ قلات والے دوستوں نے آپ کو خشک میوہ جات کھلا کھلا کر آپ کے دماغ کو بھی خشک کر دیا ہے مجھے نہ بھجوائیں باوام۔ کچھ نیازی صاحب کو بھجوادیں وہ ان کا لپ اپنے سر پر لگا لیں، کھانے سے شاید فائدہ نہ ہو لگے نہ ہی ہو جائے ان کی یادداشت کو۔ سب سے پہلے ملک صفدر حیات کی ڈائری سے انتخاب کہانی پر وہ نشین پڑھی، بہت سسنی خیز کہانی تھی۔ قتل کی واردات میں اتنا سببسن نہیں تھا جتنا ملک صاحب کے کواری پر ہونے والی پراسرار دسک میں تھا۔ قتل کا معما تو حل ہو گیا پر دسک والی بات، هنوز سببسن سے ہمارے لیے۔ دوسرے نمبر پر پڑھی مسافر۔ کہانی میں باقاعدہ ایکشن کا آغاز ہو چکا ہے، میڈم ٹیکلی اور شہریار کے درمیان آنکھ بچھوٹی اچھی جا رہی ہے اور حیدر خان کی پروین کے انخواسے لافعلی چٹائیں کیا رنگ دکھائے۔ کشکول اچھے انداز میں رواں دواں ہے۔ سینہ حاد کو تاکا کی پرنا کا می ہو رہی ہے۔ اچھا اقبال آخری صفحات پر ایک شاہکار لے کر آئے، پانچواں آدمی، پاکستان دشمنوں کو بے نقاب کرتے ہوئے بابر بہت بری طرح پھنسا پر اس کی قسمت اچھی تھی کہ بچ گیا۔ تاریخی کہانی میں تعلق خاندان کے ایک بادشاہ کی ظلم و زیادتی کے واقعات بیان کیے گئے اور سنے بادشاہ فیروز غلط فہمی کی تاریخ کا آغاز بھی ہو گیا۔ اسلامی تاریخ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی روداد حیات اہتمام پذیر ہوئی۔ ایمان افروز واقعات دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے۔ مختصر کہانیاں کا ذکر ہو جائے۔ نجمہ سودی ہمیشہ ہی مختصر کہانی کے ساتھ آتی ہیں۔ اس بار بھی انہوں نے انسان شکاری اور گنزدہ بھگ کے درمیان مکالمے سے انسان کی ازلی مطلب پرستی کو پر مزاج انداز میں اجاگر کیا۔ نئی دنیا کی سیر بہت پر خطر اور پر عزم رہی۔ زندگی کی بقا کے لیے جدوجہد آخر دم تک کی جاتی ہے۔ چھوٹا بخش میں کنبھوں کا مذاق اڑایا گیا۔ قرض حسنہ میں ایم اے



راحت جاتی آنکھوں کے خوابوں کی کرشمہ سازیاں بیان کر رہے تھے جن کا تعلق شاید بے روزگاری جیسے سنگین مسئلے سے ہے۔ جنت میں لیواؤ کا فیصلہ قطعی غلط تھا، اس کا جزیرے پر رہ جانے کا فیصلہ بالکل سمجھ نہیں آیا۔ ویلٹا کے وحشی سب سے بہترین کہانی تھی۔ نوٹی کا بھائی سے اور محبوبہ سے محبت کا انوکھا انداز بہت اچھا لگا۔ امانت میں سراغ رساں کی پھرتیاں قابل داد ہیں، ایک ہی دن میں کیس حل کر دیا۔ وارث میں ہال کی چالاکی میں حیران کر گئی۔ کترین میں سو سو تھیں۔ اشعار میں یحییٰ احمد اور مسز فضا القمر سلطانہ کا انتخاب بے حد پسند آیا۔“

محمد قدرت اللہ خان نیازی، حکیم ناؤن، خانیوال سے تیسرا کر رہے ہیں سب سے پہلے ادارہ اور قارئین کو عید کی مبارک باد قبول ہو۔ روزے کی وجہ سے سرورق سے نظر بچاتے ہوئے انشاء پر جانچنے جو پاکستان اور بھارت کی دشمنی پر لب کشائی کرتے نظر آئے جو گزشتہ 65 سالوں سے دونوں ممالک کے بھٹ کا بڑا حصہ دفاع کے نام پر بڑبڑ کرتی آئی ہے۔ گستاخ انجم اپنے مودب تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر کانپ رہے تھے۔ پوتے پوتوں کی شادیوں کے بعد موصوف پھر سسٹنس کو رونق بخشنے آئے ہیں، خوش آمدید اور مبارکال۔ جویریہ نعیم ڈرتے ڈرتے محفل میں چلتی نظر آئیں اور کمال دیکھیں 2 جولائی کو شمارہ وصول کیا حالانکہ 17 جون کو ہی شمارہ آجاتا ہے اور اتالیق خط لکھ کر بھی شامل محفل ہیں۔ اس خصوصی مہربانی کا آئینی جی کو ٹھیکس ضرور کہہ دینا۔ شیر علی خان! ماہ کی عمر کا اندازہ کیلکولیٹر سے نہیں انٹرنیٹ کی مدد سے لگنا پڑے گا۔ ریاض شاہد بھائی سب اسپروں کے لیے دعا ہے کہ اللہ بے گناہوں کو رہائی عطا فرمائے، آمین۔ عبدالرؤف عدم! بھئی آپ ابھی تک وجود میں نہیں آئے؟ نیازی کے جانے سے توحید نے کل جانا تھا ہم تو گئے ہی نہیں، ہمارے نہ جانے سے اس کی کیا حالت ہوئی یہ آپ ہمایوں سعید سے پوچھیے گا کیونکہ ٹوٹے دلوں کو جوڑنے والی بٹلی لے کر وہ وہاں پہنچے ہوئے ہوں گے۔ غالباً بار عباس اپنے فرزندوں کے ساتھ شامل محفل ہیں، واپسی مبارک ہو۔ سعدیہ، چودھری احمد خان کی پیشکش سے فوری فائدہ اٹھائیں اور مفت میں باوام کھائیں اور یادداشت بڑھائیں۔ سب سے پہلے شکول پڑھی، اورنگ زیب کے جارحانہ اقدامات پسند آئے۔ لیاقت حسین کے سرسالت بھی مزہ دے گئے۔ شیخ خالد کو گھیرنے کے اقدامات میں تیزی آ رہی ہے۔ پر تاب کی واپسی سے لیاقت حسین کی مزید روحانی صلاحیتیں سامنے آئیں گی۔ ناصر ملک مسافر کو سرپٹ دوڑائے جارہے ہیں، حالات میں بڑی تیزی سے تبدیلی ہو رہی ہے۔ میڈم کچھ زیادہ ہی مہربان ہو چکی ہے شہر پار۔ ڈاکٹر شاہ کا غیاب پسند نہیں آیا۔ آخری صفحات پر راج اقبال پانچواں آدمی لے کر آئے، ہماری سیاست میں غیر ملکی عناصر کا کل دخل شروع سے ہی موجود ہے تاہم پارکسز نے تو حد ہی کر دی۔ شوکت باجوہ کو مار کر اس کی جگہ لے بیٹھا۔ صحافیوں کے کردار کے بارے میں جان کر حیرت ہوئی کہ کیسے کرپٹ سیاستدانوں کی حمایت میں کالم لکھتے ہیں۔ ایم اے راحت قرض حسنہ لے کر آئے۔ پاکستان کے اکثر نوجوانوں کی ترجمانی کرتی کہانی اچھی لگی۔ شیراز کے خواب واقعی مکمل کہانی محسوس ہوتے تھے تاہم آخری بار حقیقت ہی رہی اور یہی اکثریت کی کہانی کا ایندھن ہوتا ہے۔ نذیر احمد بڑی اور جاوید راؤ کے اشعار پسند آئے۔“

بابا بر عباس، حسین عباس، کمیل عباس، گلپانہ روڈ کھاریاں سے محفل میں شریک ہوئے ہیں سرسجی سسٹنس کا نیا شمارہ کافی انتظار کے بعد 17 جولائی کو اپنا دیدار کروانے میں کامیاب ہوا۔ سرورق دیکھ کر منہ سے ایک بھیا تک چچ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وراہل اس بار ڈاکر صاحب نے جانے انجانے میں سرورق پر اریزہ بخاری اور بشری افضل آئی کواکشا پیٹ کر دیا۔ ڈاکر صاحب کو عرض کرتا چلوں کہ گدھے اور گھوڑے کو ایک جگہ جمع نہ کریں۔ جون



ایلیا مرحوم کا انشاء یہ جس کا موضوع اس بار آزادی تھا، آزادی بھی خدا کی عطا کردہ ایک نعمت ہے، آزادی کی قدر و قیمت جیل میں بندان قیدیوں سے پوچھیں جو اپنے چاروں سے دوران کال کوٹھریوں میں بند ہیں۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے (بے شک) سرسجی آپ کی تلخ باتوں کا اثر ان حکمرانوں پر نہیں ہوگا یہ سب اپنا ہی خون جلانے والی باتیں ہیں۔ اس بار کرسی صدارت پر گستاخ انجم صاحب حد سے بڑھ کر گستاخیاں کرتے نظر آئے، اپنے قول و فعل سے دور، مجبور و بے قصور گستاخ کو اس کی گستاخیوں پر داد دینے پر بے طرح مجبور فرشی سلام پیش کرتا ہے۔ جویریہ بنت ڈاکٹر نعیم اکبر صاحبہ ارے بی بی آپ کی سحرک طلوع ہوئی چونکہ آپ ہماری پیاری سی محفل میں پہلی بار حاضر ہو رہی ہیں تو ایک سینئر ہونے کے ناتے میں اور میرے دیگر ساتھی آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ارے یہ کیا جویریہ بی بی، آپ نے میرے خط کا ذکر کیا ہی نہیں۔ عمران حیدر بلوچ خوش رہو خدا تم سب کو ان کال کوٹھریوں سے نجات دلانے، آمین۔ باقی کراچی کے حالات پر ہر روز دوند دل حیران و پریشان ہے، ہر کوئی خون کے آنسو رو رہا ہے۔ شیر علی خان صاحب آپ بھی مجھے جملی شیر ہی لگے ہیں اصلی شیر بھی بھاگتے ہوئے اپنا پتا نہیں بتاتا اور آپ نے بھی جگہ کا نام نہیں لکھا، بھایا اب بھلا ایسی بھی کیا بدحواسیاں۔ رائے قیصر عباس کھرل صاحب ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔ مجھے تاجپ کو بھی یاد کر لیا کریں میں پیارا سا بندہ ہوں۔ حکیم سید محمد رضا صاحب، اور ستائیں کیا حال ہے، حکمت کیسی چل رہی ہے، اس گورکن کا چتا چلا جس سے آپ کا معاہدہ ہوا تھا آخر کو آپ حکیم ہیں۔ عبدالغفور خان تنگ صاحب خط پسند کرنے کا شکر یہ۔ سید محمد الدین اشفاق بھائی آپ مجھے اور جعفر حسین کو مسکا رہے ہیں یا پھر واقعی خلو ملا سفر دھتھے سہر حال خوش رہیں، جیتے رہیں۔ حسین عباس بلوچ، بیٹا میری تمام تر نیک دعائیں آپ سب کے ساتھ ہیں، خدا آپ سب کو جلد از جلد ان عقوبت خانوں سے رہائی دلانے، آمین۔ قدرت اللہ نیازی صاحب کبھی ہمارا قومی کھیل ہاکی ہوا کرتا تھا اب ہمارا قومی کھیل احتجاج بن گیا ہے، کوئی بات ہوئی نہیں احتجاج شروع اور ہمارے حکمران ایسے کھیل کروانے میں ماہر ہیں۔ N.S.R. مڈل بھائی ہماری پولیس کے کرکٹوں ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ہر کوئی ان سے نالاں ہے۔ چودھری احمد خاں صاحب باوام کھانے کی ضرورت تو آپ کو بھی ہے ارے بھائی میرے باوام جہاں دماغ کے لیے ضروری ہیں وہاں آنکھوں کے لیے بھی ضروری ہیں۔ جناب چودھری صاحب آپ کو میرا خط نظر نہیں آیا۔ واہ جی واہ کیا خوب، زبردست ہمایوں سعید راج صاحب کیا لکھتے ہیں آپ، دل کرتا ہے آپ کا خط فوٹو اسٹٹ کروا کے لوگوں میں بانٹوں امیری طرف سے ماہ رمضان کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ خدا کرے اس ماہ رمضان میں ہمارے حکمران زیادہ سے زیادہ نیکیاں کریں جس کا اثر ہم عوام پر بھی ہوا اور دوسری بات 21 جولائی کو میری سالگرہ بھی ہے، اب جلدی سے محفل کے دوست تالیاں بجا لیں شاپاش شاپاش! ارے خواتین کی تالیوں کی آواز نہیں آ رہی، چل رہی ہیں شاید۔ اب بات ہو جائے ذرا کہانیوں کی، ارے بھلا کون سی کہانیاں ابھی تو کوئی پڑھی ہی نہیں۔“ (کمال ہے..... آپ بھی کام کی بات بھول جانے کے عادی ہیں)

محمد اسماعیل اجاگر، پنڈی کھب، ضلع انک سے ملے آ رہے ہیں کافی دنوں بعد محفل میں شریک ہو رہا ہوں۔ ستمبر 2011ء میں آپ سے ہونے والی ملاقات کی مہک ابھی تک باقی ہے۔ اگست 2012ء کا سرورق بہت پسند آیا۔ خاص کر خوب صورت گلہ دان اور تلیاں۔ لیکن اگر گلہ دان پہ چند خوب صورت پھول ہوتے تو تلیاں بھی خوش ہو جاتیں اور ہم بھی۔ انشاء یہ کافی پر فکر رہا۔ جون ایلیا صاحب حقیقت تو یہ ہے کہ ہم آزادی کے قابل ہی نہیں تھے۔ وہ قربانیاں وہ لہجہ سب رائگاں گیا۔ جون ایلیا صاحب یہ سزا ہے اس عہد کو بھلانے کی جو ہم نے قیام پاکستان کے وقت کیا تھا۔ ملک صنف حیات کی تحریر ہمیشہ عمدہ

چاہتوں کا سفر

طاہر احمد یوسف زئی، گلبرگ، لاہور کا محبت نامہ ویسے مجھے ایک خاموش قاری کی حیثیت سے کئی سال ہو گئے ہیں مگر خط لکھنے کی جرأت و جسارت پہلی مرتبہ کر رہا ہوں، ویسے مجھے خط لکھنے سے زیادہ پڑھنے میں مزہ آتا ہے اور اس خط کے لکھنے کی جو حسین وجہ ہے وہ ہماری ہونے والی بیگم صاحبہ ہیں جنہیں میں بذریعہ سسٹنس پر پوز کرنے والا ہوں۔ یہ عجب اتفاق تھا کہ میرے موبائل نمبر پر ایک انجانے نمبر سے good morning کا پیغام آتا ہے۔ جس کا صرف last digit پیغام تھا باقی نمبروں کی ترتیب میرے نمبر کی تھی اور شاید یہ پیغام صبح بھی میری زندگی کی ہر مارنگز کو گڈ کرنے کے لیے تھا۔ پھر آہستہ آہستہ دوستی بڑھتی رہی اور بالآخر محبت کے خوب صورت آغاز میں ڈھل گئی۔ معلوم نہیں تھا کہ اس سے میری زندگی میں ایک نیا موڑ آئے گا۔ جب واپسی کی خاطر یو اے ای ابو ظہبی کے لیے فلائٹ میں بیٹھا تو مجھے لگا کہ میں یہاں کچھ چھوڑے جا رہا ہوں۔ وقت نے احساس دلایا کہ یہ دل کس اہم شخصیت کو لاہور کینٹ میں چھوڑ آیا ہے بس پھر کیا تھا میں نے کچھ ماہ بعد واپسی کا ارادہ کیا اور فلائٹ لی اور سیدہ حاشمہ قادریہ و س البلا دیس آ گیا۔ شاید قدرت کی طرف سے انہیں پر پوز کرنے میں کچھ وقت باقی تھا، میں نے سوچا کہ میں ہر دفعہ سسٹنس کے ذریعے ہی اپنی عزیز شخصیت کو پر پوز کروں لیکن شب برات کے دنوں میں میرا ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور کئی دن تک اسپتال میں بھی رہا اور میں اب الحمد للہ خیریت سے ہوں۔ مگر اس دل نادان کو کون سمجھاتا جو عرب کی اتنی عظیم و شان سرزمین کو چھوڑ کر اپنے وطن عزیز پاک سرزمین پر واپس آ گیا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے بس پھر کیا تھا ہم نے بھی فلمی ڈائلاگ مارا۔ ”کہ دل بھلے سے لیٹتے ہوتا ہے مگر ہمیشہ رات ہوتا ہے“ کے مصداق ہم نے ان سے اظہار محبت کر ڈالا۔ بس پھر ہم نے اس حسینہ و ماہ جبینہ لاہور سے اظہار محبت کیا تو وہی ہوا جس کا دل کو یقین تھا کہ انہوں نے بھی دل کی فشا کے مطابق جواب دیا اور اب میں اپنے کھردوالوں کو غریب تمام تر لوازمات کے ساتھ ان کے ہاں رشتہ لینے بیٹھنے والا ہوں مگر اس سے پہلے سسٹنس کے ذریعے انہیں باقاعدہ پر پوز کرتا ہوں۔ ان کا نام نامی اسم گرامی، شبانہ حسن (لاہور کینٹ) جن کا خط جولائی 2012ء میں آپ نے پڑھا۔ اے میرے خدا یا یہ تو نے کسی نرالی جوڑی بنائی کہ موبائل نمبر بھی ایک، عادت و اطوار بھی ایک، علاقہ بھی ایک۔ اے میرے رب کائنات عزوجل مجھے ان کے حق میں اور انہیں میرے حق میں بہتر فرما اور ہماری جوڑی کو صدا سلامت رکھنا (تمام محفل کے دوست پر زور آمین کہہ رہے ہیں) ایک بات اور ہم نے اب تک ایک دوسرے کی ایک جھلک تک نہیں دیکھی۔ اب ہم ان کو اسی دن دیکھیں گے

جب وہ ہمارے عقد میں تشریف لائیں گی۔ اب کچھ باتیں اپنی جان سے پیاری شیوجی سے بھی کہ آپ نے جس طرح میری محبت کو قبول کیا اور میرے لاابالی مزاج کو نکیل ڈالنے کا ارادہ کیا ہے تو میں ان سب قارئین کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ انشاء اللہ آپ کو میری طرف سے کبھی تکلیف و پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، آپ صرف ہمارے دل ہی کی ملکہ نہیں بلکہ ہماری حسین دنیا کی بھی راجکاری ہوں گی۔ خیر دل کے جذبات الفاظ کے نہیں اخلاص کے متقاضی ہوتے ہیں۔ بقول شاعر

بس ہر کھڑی قیامت تھی یہ نہ پوچھ کب گزری
بس یہی غنیمت ہے تیرے بعد شب گزری

اب دیکھنا یہ ہے کہ میرا یہ پر خلوص محبت نامہ جو کہ میری زندگی کا پہلا خط ہے، کہاں تک کامیابی کے زینے کو چھوتا ہے اور اب میں جناب عزت مآب، رونق محفل، جان یاراں و دوستان محمد حسین عباس بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا کا دل سے مشکور و ممنون ہوں کہ جنہیں ہماری ہونے والی بیگم صاحبہ کا نہ صرف خط پسند آیا بلکہ آپ نے نہایت جامع و مختصر الفاظ میں لکھا کہ ”شبانہ حسن جی نے مختصر لیکن خوب صورت الفاظ کا چناؤ کیا۔“ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ان تمام دوستوں کو جو کہ وہ اور اگر وہ آزمائشوں کی وجہ سے اسیری کی زندگی گزار رہے ہیں، باعزت آزادی نصیب فرمائے اور اب میں سسٹنس کی پوری ٹیم کا تہ دل سے شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جن کی اس شب دروز لا زوال محنت و کادشوں کے سبب اپنی مادری اور قومی زبان اردو میں اتنا کچھ پڑھنے کو ملتا ہے۔ سسٹنس اپنی محبوبہ کے کہنے پر مسافر کی پہلی قسط سے پڑھنا شروع کیا تھا لیکن ہم ظہرے کیکر کے فقیر جس کو پہلے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ڈائجسٹ کے شروع میں محبت نامے بھی ہوتے ہیں پھر ہماری اصلاح جناب شمر عباس صاحب نے کی اور ارشاد فرمایا کہ اگر آپ چاہیں تو خط لکھا کریں اور میں نے سب سے پہلا خط جو کہ ماہ ایمان جی کا تھا، پڑھا۔ اتنا اچھا لگا کہ میں ماہ جی آپ کا فین ہو گیا اور اب میرے اس love letter کے بارے میں کوئی کچھ لکھنے نہ لکھے مگر مجھے آپ کے رہنما کس کا انتظار رہے گا کہ آپ ہماری محبت کے بارے میں کیا ارشاد فرمائی ہیں۔ سسٹنس میں تاریخ اور تصوف کے صفحات بے حد پسند آتے ہیں۔ اس کے علاوہ شعر و سخن اُس کی لا جواب سلسلے وار کہانیاں مسافر اور شکول جانے آگے کیارنگ لاتی ہیں۔ مجموعی طور پر سسٹنس ایک معیاری پرچہ ہے اور اب میں آخر میں معراج رسول النکل، عذرا آئی، ذاکر انکل اور پوری ٹیم کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آخر کار آپ سب نے مجھے بھی خط لکھنے والا اور کرسی سے محبت کرنے والا بنا دیا۔“ (آپ کا محبت نامہ منفرد جگہ لیے ہوئے ہے..... شبانہ حسن سے امید ہے کہ وہ ہمارے اس نٹ کھٹ قاری کا پر پوزل ضرور قبول کر لیں گی۔ ہمیں آپ کی مٹائی کا بھی انتظار رہے گا.....)



ہوتی ہے۔ آدم خور لکڑ بچہ اور قرض حسنہ طنز و مزاح کے پیرائے میں لکھی گئی کافی دلچسپ تحریریں تھیں۔ نئی دنیا کاشف زیر صاحب کی بہترین کہانی رہی۔ ان کو یہ کمال حاصل ہے کہ یہ اپنی تحریروں میں منظر کشی کمال کی کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے سامنے کوئی قلم چل رہی ہے۔ آخری صفحات پر پانچواں آدمی پڑھ کر اپنے ملک کے سیاست دانوں کے عروج و زوال کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ چھوٹا بخش بھی اچھی کہانی تھی، مختصر مگر پراثر۔ اس کہانی کے ساتھ بنا پور ٹریٹ خوب صورت ہے۔

✽ ہمایوں سعید راج، بنوں سے تمبرہ کر رہے ہیں "اگست کے سرورق پر ہم نے دو خصوصی مہینوں یعنی رمضان المبارک اور ماہ آزادی کی خفیف جھلک بھی نہ دیکھی۔ کھاریاں کا کھار پانی پینے والے گستاخ انجم کے تمبرے میں گستاخیاں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں۔ ریاض شاہد کے خط نے بے تحاشا افسردہ کیا۔ کاش میں آپ سب کے لیے کچھ کر سکتا۔ عمران برادر! 03329731930 میرا گناہ ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی بھی وقت بذریعہ ٹیکسٹ راپٹ کیا جاسکتا ہے۔ شیر علی برادر! لڑکیاں عجیب کا پلٹیکس کا شکار رہتی ہیں۔ ان کو اگر توجہ دو تو ان کی گردن اکڑ جاتی ہے اگر نہ دو پھر اس غم میں گھلتی رہتی ہیں لہذا ان کو پالیسی اپناؤ۔ حسین برادر! آئیڈیالوگ اچھا ہے مگر میری ہمت ابھی جواں ہے اور ریڈی میڈ حاجن کی تلاش بلاناغہ جاری ہے۔ عباس کھرل صاحب ماہ کی یادوں میں بے حال نظر آئے۔ جنیل انتظامیہ نے آف دی ریکارڈ انکشاف کیا ہے کہ کھرل صاحب کھانا پینا تقریباً چھوڑ چکے ہیں۔ ثاقب برادر! اگر پاپی پیٹ کی صبر و شرمناکی اشیاء سے ٹونگ کی جائے تو نیرت انگیز نتائج سامنے آتے ہیں۔ سی این این ایم آر ایس ٹی ایم ایم ڈیٹر صاحب! تمہارے لیے جاوید اختر صاحب کا مصرعہ عرض ہے "ہم تو بھی جیسے ہے ویسے رہیں گے"۔ ناصر ملک کی مسافراتی اچھی لگتی ہے، اتنی اچھی لگتی ہے کہ کیا بتاؤں۔ حضرت سلیمان کی داستان کا آخری حصہ نہایت جوش و خروش اور مذہبی عقیدت و احترام کے ساتھ پڑھا۔ یہ قرآن پاک کا اعجاز ہے کہ اس نے تمام نبیوں پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات کی تردید کی اور انبیاء کو ہر قسم کے گناہ سے معصوم قرار دیا۔ چھوٹا بخش دلچسپ ترین اور عبرت انگیز کہانی ثابت ہوئی۔ اتنے حساس اور وسیع موضوع کو مصنف نے دو صفحات میں سمیٹ کر کمال کر دیا۔ کاشف زیر کی بیشتر مغربی کہانیوں میں ایڈ وینچر کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ نئی دنیا بھی حسب توقع نہایت شاندار رہی۔ آدم خور لکڑ بچہ ایک دلچسپ تھیم کی خوب صورت کہانی تھی۔ ایم اے راحت کی خوابوں میں رہنے والے شخص کی کہانی بھی لاجواب رہی۔ جن کا آخری خواب ایک بھانک حقیقت کے طور پر سامنے آیا۔ ملک صاحب ایک پردہ نشین کو بے جواب کرنے میں کامیاب رہے۔ آخری صفحات پر انچ اقبال ملکی حالات کا احاطہ کرتی سنسنی خیز کہانی لے حاضر تھے۔ بے روزگاری نوجوان نسل کو کس راہ پر لے جا رہی ہے ہمارے آقاؤں کو اس کی مطلق فکر نہیں۔ محفل شعرو سخن میں حسین اور ریاض شاہد کے اشعار نے دلگی کیا۔"

✽ ادريس احمد خان، ناظم آباد کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "اگست کا شمار اپنے وقت پر مل گیا۔ سرورق کو تعارفی اور تنقیدی نظر سے دیکھتے ہوئے انشائیہ میں جاوید ہوتے۔ حسرت اور امید کے ساتھ آزادی کا ذکر کیا گیا۔ اکیسویں صدی میں تقریباً ساری دنیا بدل گئی مگر ہندوستان اور پاکستان کے مسائل وہی ہیں۔ جس کی لاشی اس کی بھینس والی حالت ہے۔ 65 سال ہو گئے ہندوستان پاکستان کو آزاد ہونے یہ سلسلہ اب بند ہو جانا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ آسانیاں عوام کو فراہم ہونا چاہئیں۔ معاشی ترقی ہوگی تو دیگر مسائل ثانوی ہیں۔ عوام کو بے وقوف بنانے کا یہ سلسلہ اب ختم ہو جانا چاہیے اور اب محفل کی طرف چلتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنا خط تلاش کیا مگر بے سود۔ دیگر دوستوں کے پیسے اور ٹکٹیں تمبرے پڑھ کے محفوظ ہوئے۔ گستاخیاں کرنے پر پہلا نمبر آنے پر ہماری مبارک باد۔ ریاض شاہد جیتھر تمبرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ اتفاق سے میں بھی جیتھر ہوں، کمپنیوں کا ایڈوائز و نائزنگ ورک کرتا تھا اسی سبب سات سال پہلے ایک بورڈ لکھتے ہوئے ہائٹ سے نیچے گر گیا تھا جس کے سبب ریزہ کی ہڈی کا فریکچر ہو گیا تھا۔ تب سے صاحب فراموش ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے ہمت دی، تھوڑا جھل پھر لیتا ہوں (اللہ آپ کو شفاء بھی عطا فرمائے۔ آپ کی ہمت اور جذبے کے ہم قائل ہو گئے)۔ سعدیہ بخاری شعر پسند کرنے کا شکریہ اور بھائی بابر عباس آپ کی بات صحیح ہے، جب اللہ نے دل دیا ہے تو دل کے معاملات درپیش آتے ہیں۔ آگے بڑھے تو مسافر کے ہم سفر ہو گئے جہاں مسافر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ نت نئے معرکے سر ہو رہے ہیں۔ ناصر ملک صاحب کو مبارک باد۔ دوسری کہانی کی طرف بڑھے، کشکول میں بھی نئے نئے واقعات اور حالات نظر آ رہے ہیں۔ نئے نئے لوگ بھی متعارف کرائے جا رہے ہیں۔ تیسری کہانی تاریخ کے درپچوں سے آشکار کرنے والی فیصلے فقیروں کے بھی اچھی تھی اور دلچسپی سے پڑھی گئی۔ اللہ کے ولی بھی اپنی مملکت کے بادشاہ ہوتے ہیں جو بغیر کسی طمع و لالچ کے کسی جاوید ختم کے دیوں پر حکومت کرتے ہیں۔ دنیا کے بادشاہ کو دنیا پر حکومت کرتے ہیں مگر اللہ کے ولی دین و دنیا دونوں پر حکومت کرتے ہیں۔ آدم خور لکڑ بچہ نے بے ساختہ لبوں پر مسکراہٹ لانے پر مجبور کیا کہ آج کے دور میں ہم بھی ایک نعمت ہے۔ ایم اے راحت کی قرض حسنہ بھی کہنہ مشقی کا ثبوت تھی۔ خواب دیکھنے والا اپنے خواب کی تکمیل ہوتے دیکھنا چاہتا ہے جو ناممکن ہے۔ پردہ نشین بھی بس شیک ہی تھی جنت گوارا ہی کیونکہ دل کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ جس کو ہم زندگی سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں وہی اپنی ہوجاتا ہے۔ محفل شعرو سخن اور کترنوں نے مزہ دیا۔ ویلنا کے وحشی اچھی لگی کہ محبت کرنے کے باوجود مرے ہوئے بھائی کی محبت کا احترام کیا۔ امانت بھی بہتر انداز لے لی تھی۔ روح کو بالیدگی اور تازگی بخشنے والے حضرت سلیمان علیہ السلام کے حالات و واقعات نے روح کو سرشار کیا۔ چھوٹا بخش نے بھی ہنسنے پر مجبور کیا۔ انچ اقبال جیسے مجھے ہوئے قلم کاری کہانی پانچواں آدمی بھی خوب صورت کہانی تھی۔"

✽ تفسیر عباس، بابر، اوکاڑہ سے تشریف لائے ہیں "اب کی بار سنسنی 18 جولائی کو شہر دل کی زینت بنا۔ انتظار کی شدت اور فراق لحوں کی حدت..... سے دو شیرہ سرورق کی منعم واداس آنکھوں میں سفید لحوں کی اذیت..... قابل دید ہے۔ جب..... آس کو یاس کی دیمک لگ جاتی ہے، جب نوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں آنکھوں کی پتلیوں کو لہو لہو..... اور انگلیوں کی پوروں کو زخمی کر دیتی ہیں تو یہی ہوتا ہے۔ سنسنی کا معیار اور محبت..... ذوق مطالعہ کو جلا بخشتی ہے، جہیز لحوں کو ہمیز دیتی ہے۔ ماہر جاض..... جون ایلیا کا پر مغز انشائیہ..... آزادی..... اہم سوال ہے اور لکھنے پر بھی کہ آزادی خود بخود ہونے کے بعد ہم نے ایسا کیا تیرا ہے کہ..... آزادی کے 65 سال مکمل ہونے پر فخر کر سکیں؟ ہم نے اس کی جتا، استحکام سالمیت اور معیشت کی مضبوطی کے لیے کیا کیا؟



آپ کے خط میں آپ کی فکر انگیز گفتگو، ہم تو اس ضمن میں یہی مشورہ مفت عنایت کر سکتے ہیں کہ سیاسی گفتگو سے احتراز و اجتناب جزو لازم ہے کہ پتھر کے پھاڑک کسی کی صدا بھی سننے میں..... (شاید کہ ترے دل میں اتر جائے.....) مسند صدارت پر دینی سیدال سے گستاخ انجم کا بہترین، مفصل و جامع اور عقل و دلیل تمبرہ..... بعد شوق ملاحظہ کیا۔ بہترین کاوش اور کامیاب کوشش کے لیے ڈیروں دفعہ مبارک باد..... مانسہرہ سے جویریہ بنت نعیم اکبر سحر کی پہلی آمد پر دل سے خوش آمدید۔ آپ نے ہماری محنت اور محبت کو پسند کیا ہمیں از حد خوشی ہوئی۔ سرگودھا سے عمران حیدر بلوچ کی زندہ ولی قابل داد ہے اور ہم دعا گو ہیں کہ رب عظیم آپ کو کربلا کے بے جرم و خطا اسیروں کے صمد تھے..... صوبت و کئی دوراں سے رہا کر دے، آمین۔ سرگودھا سے ریاض شاہد آپ سے متعلق یہ جان کر از حد افسوس ہوا کہ آپ سزائے موت کے قیدی ہیں، کاش کہ..... دست تقدیر کوئی معجزہ دکھائے اور آپ زندگی اور کائنات کی خوب صورت نفاذ میں سانس لے سکیں۔ کراچی سے این ایس آر مدثر نے کافی دنوں بعد درشن عطا کیے۔ آپ نے ہمارا نمبر شاید ڈیلیٹ کر دیا۔ ایک سے سحد یہ بخاری، آپ نے یقیناً درست فرمایا ہوگا، آپ کے پرانے زمانے کے پرانے شاعروں کی بات ہی کیا تھی۔ کھاریاں سے بہت پیارے بھائی بابر عباس جنہوں نے قارئین کے مابین رابطوں کی بنیاد رکھی، مجتوں کو فروغ دیا۔ اس بار اپنے شہزادوں کے ساتھ شریک بزم ہوئے ہیں، خوشی ہوئی۔ تازہ ترین خبروں میں ماہ ایمان کا فرار باعث تشویش ہے گمشدہ احباب میں محمد جاوید بلوچ، آغا فرید احمد خان، تصویر العین، ولشیں بلوچ اور پشاور سے ہماری بہت پیاری بہن..... طاہرہ گلزار، آپ تمام لوگ اچھے بچوں کی طرح واپس آجائیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے..... سب سے آخری تحریر انچ اقبال کی دلچسپ، سنسنی و تجسس سے بھرپور کہانی پانچواں آدمی پڑھی۔ بے شک کہ سیاست دان غیر ملکی انجنیئروں کے ہاتھوں کھ پتلیوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ بابر بال بال بچا۔ بہترین مصنف ناصر ملک کی لازوال تحریر..... مسافر اپنی مثال آپ ہے جو کہ براہ چشم سر زمین قلب تک آن پہنچی ہے لہذا اسے بعد شوق و اہتمام ملاحظہ کیا جاتا ہے۔ میڈم شکیلہ کا جنون عشق..... خالد لوہاری کی اندھی محبت، شہر یادی کی مجبوریاں اور اس کا پاورفل اور اثر انگیز کردار۔ نہایت دلچسپ سلسلہ ہے۔ کشکول کی پراسراریت کا سفر جاری و ساری ہے کہانی بہتر سے بہتر کی جانب گامزن ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی تحریر و تحقیق..... ماضی کے آنے میں..... فیصلے فقیروں کے..... حضرت علی کرم اللہ وجہہ کفرمان ہے کہ ظلم کی حکومت کچھ عرصے پر محیط ہو سکتی ہے لیکن منافقت کا نظام نہ وبال و وزیر ہو کر نمونہ عبرت بن جاتا ہے۔ اوراق تواریخ پر رقم..... سلطان محمد تغلق کے دور پر۔ عہد حاضر کے ارباب اقتدار و اختیار کے لیے مقام عبرت و دعوت فکر ہے۔ کاشف زیر کی دل گداز تحریر..... نئی دنیا نے بے حد متاثر کیا۔ مولیٰ کی نیت کا خلوص، اس کی مشکوک کا حل ثابت ہوا۔ نجمہ مودی کی شکاریات پر مبنی دلچسپ تحریر نے دعوت فکری۔ ایم اے راحت کی قرض حسنہ اچھے ہوئے رشیم کی طرح تھی۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور حد سے زیادہ مسائل کے ساتھ..... بڑھتی ہوئی آبادی لکھنے پر یہ ہے۔ ملک صفدر حیات کا ایک اور دلخیز واقعہ..... پردہ نشین، دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ تویر ریاض کی دلگداز تحریر جنت کے دلکش انجام نے بہت مطمئن کیا۔ نیم اقبال کی سنسنی خیز تحریر ویلنا کے وحشی خیر و شر، حق و باطل اور محبت و نفرت کی ازلی کشاکش کا..... پراثر و چشم کشا مبرا۔ اسٹوری آف دی منٹھ..... وائٹا کے خوب صورت کردار نے متاثر کیا، انجام خلاف توقع ہوا۔ بابر نعیم کی امانت..... دلچسپ تحریر ثابت ہوئی۔ نجمہ گلزار کا چھوٹا بخش بھی خوب رہا۔ بے شک کہ جیسی کرنی..... ویسی بھرنی، شمر عباس کی پراثر اور دلچسپ تحریر..... وارث نے بھی بور نہیں کیا۔ بزم شعرو سخن، قارئین کے بہترین ذوق کا آئینہ ہے۔ عظیم الشان پیغمبر..... حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایمان افروز واقعات و دلچسپ حالات پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ آخر میں آپ کو آپ کے اسلاف کو اور تمام قارئین کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے..... عید مبارک۔" (آپ کو بھی عید مبارک)

✽ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی بہاولپور سے محفل میں آئے ہیں "خوب صورت کہانیوں کا مجموعہ سنسنی ڈائجسٹ اگست 2012ء کا شمارہ اپنی آن، بان اور شان کے ساتھ مقررہ تاریخ کو نظر آیا۔ جون ایلیا کی آزادی کے بعد آپ کے خط چھوڑ کر تاریخی کہانی فیصلے فقیروں کے پڑھی۔ نظام الدین اولیا کے دور کی یہ کہانی ہنوز دلی دور است خوب رہی۔ نئی دنیا مولیٰ کی کہانی لاجواب رہی۔ آدم خور لکڑ بچہ پراثر و مزاح تحریر تھی۔ کشکول کی قطع نمبر 13 کے بعد ایم اے راحت صاحب کی قرض حسنہ ایک خیالی خاک تھی، اچھی رہی۔ ملک صفدر حیات کی پردہ نشین کھیت میں لڑکی کا قتل، سنسنی سے بھرپور رہی۔ تویر ریاض کی جنت، مغربی محمد سیاح، قیمتی موتیوں کی اسٹیکنگ اچھی رہی۔ بزم سخن کے بعد ویلنا کے وحشی بہت زبردست کہانی ہے۔ مسافر کی قطع نمبر 6 پڑھی۔ بیبا، قتل کھالے کو ملنے والی لاش کس کی ہے؟ ایک سنسنی خیز موثر پر کہانی پہنچی ہے، اگلی قطع کا انتظار ہے۔ امانت اور حضرت سلیمان علیہ السلام پڑھی۔ چھوٹا بخش مختصر مگر جامع تحریر ہے۔ وارث، آخر بال کیستہ ترین کی انشورنس کا مالک بن گیا۔ انچ اقبال صاحب کی پانچواں آدمی آخری صفحات کی ایک اچھی اور خوب صورت کہانی ہے۔ محفل شعرو سخن کے اشعار زبردست ہوتے ہیں۔"

✽ محمد زبیر ساگر، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ملے آ رہے ہیں "دوما، بعد خط لکھ رہا ہوں پہلی کئی خط لکھے لیکن آپ نے شائع نہیں کیے فہرہ بہت آیا مگر پھر بھی رہ نہ سکا۔ اگست کا سنسنی دیکھا تو ناکمل دیکھتے ہی خط لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ سنسنی سے دلی محبت ہے اس کا ساتھ بھی نہیں چھوڑوں گا۔ میں سنسنی کے لیے کہانی لکھنا چاہتا ہوں۔" (اگر آپ کی تحریر قابل اشاعت ہوئی تو ضرور حوصلہ افزائی ہوگی)

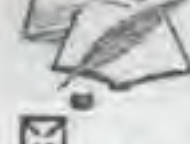
✽ عمران حیدر بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے تمبرہ کر رہے ہیں "سرورق پر موجود ڈرامہ گرل اور نازک تیلیوں نے سماں باندھ دیا۔ محفل کی جانب پیش قدمی کی تو گستاخ انجم کو کرسی صدارت ملنے پر مبارک باد دینے کی گستاخی کی۔ جویریہ، ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھے نمبروں سے نوازیں۔ شیر علی خان برائے مہربانی کیلکولیٹر رکھ دیں کیونکہ ماہ ایمان بھی شائق کو بلاتے بلاتے خود بھاگ چکی ہیں۔ حکیم سید محمد رضا شاہ، عبد الغفور خان و دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ حسین عباس بلوچ، کھسائی ملی کھانا نوچے کیونکہ موصوف کو سخت قید نے دماغی توازن سے محروم کر دیا ہے۔ سعدیہ بخاری کو نے میں ویلنا کر صنف نازک کی لگی دوڑیں دیکھ کر پریشان لگ رہی تھیں۔ چودھری احمد خان بھائی، ہمارا فیکل بزنس کافی وسیع ہے جس کی وجہ سے ہمارے علاقے کے ایک



بد معاش نے ہم سے بہت مانگنا شروع کر دیا، ہم نے انکار کر دیا تو فائرنگ کی اور ہمارے رشتہ دار جو بھی اس کے ہتھے چڑھ جاتے تھے وہ معمول بن گیا۔ مجبوراً ہم نے بھی اسلحہ اٹھایا اور میدان میں آ گئے۔ اس کے گروہ کا ایک آدمی میرے کزن کے ہاتھوں فائرنگ کے دوران مارا گیا جو کہ ہمیں ہراساں کرنے آیا تھا تو میرے خلاف بھی ایف آئی آر درج کر دیا گئی کیونکہ میری شہرت مخالف پارٹی سے ہمیں نہ ہو رہی تھی۔ پولیس نے تفتیش میں بے گناہ کر دیا مگر صرف جھوٹی گواہیوں کی بنا پر جج صاحب نے سزا دے دی اب سزائے موت کی قید کاٹ رہا ہوں۔ 2014ء کے آخر تک ہائی کورٹ میں کیس سماعت ہو جائے گا۔ بڑی امید ہے اللہ تعالیٰ کی ذات سے کہ بری ہو جاؤں گا۔ تمام دوستوں اور تمام اسٹاف کو دل سے عید مبارک! مسافر کی یہ قسط بھی زبردست رہی۔ میڈم شکیلہ کی حکمت عملی کی وجہ سے دشمن کو منہ کی کھانا پڑی۔ سکھول میں لیاقت حسین تیزی سے کامیابی حاصل کر رہا ہے، خوش آئند ہے۔ اورنگ زیب کی حکمت عملی بھی کامیاب ہے۔ شیخ حامد ٹریپ ہوتا جا رہا ہے۔ رضوانہ ساجد کی بیان کردہ حضرت سلیمان کی روداد حیات میں اس دفعہ کے واقعات دلچسپ اور ایمان افروز تھے۔ نجم شکور کی چھوٹا بخش مختصر مگر دلچسپ روداد تھی۔ چھوٹے بخش کا ٹھکانا آخر دروزی ہی ہوا۔ بابر نعیم کی امانت، مسٹر ہولڈنگ کو میری پر بہت بھروسہ تھا اور اسی نے اس کا نقصان کیا۔ شمر عباس نے وارث میں ہال کی چالاک بیان کی۔ نئی دنیا کاشف زبیر کی ہمیشہ کی طرح عمدہ تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں سنیہ منظور اور محمد جاوید راؤ کا انتخاب اچھا تھا۔

روشنی رشید، راولپنڈی، دھیمال ٹیکس سے محفل میں شریک ہوئی ہیں "تقریباً 2 سال کے بعد حاضر ہوں، اس عرصے میں مجھے کسی نے بھی یاد نہیں کیا (بہی تو آپ کی بھول ہے) لیکن روشنی کسی کو بھی نہیں بھول سکی۔ ہر ماہ باقاعدگی سے سہنس پڑھتی تھی۔ سب پرانے ساتھی بہت یاد آتے ہیں۔ این ایس آر مدثر آپ کا کیا حال ہے؟ فیملی کا کیا حال ہے؟ انکل جی آپ کی وجہ سے ہی مجھے اتنے پیارے دوست ملے۔ اتنی خوب صورت محفل خط آپ ہی کی وجہ سے ہے۔ عبدالرؤف عدم آپ کی محفل خط میں بہت کئی محسوس کی۔ میں ہر ماہ محفل خط میں آپ کا خط تلاش کرتی تھی۔ اس بار خطوط کی محفل دیکھی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ تھا عبدالرؤف عدم محفل خط کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اے بے کسان، لیاقت بلوچ، رانا ادیب الرحمن، رائے قیصر عباس کھرل، حسنین عباس بلوچ، عمران حیدر بلوچ آپ سب کی رہائی کے لیے روشنی رشید ہر وقت دعا کرتی ہے۔ میں آپ سب کی رہائی کے لیے آیت کریمہ کا سوا لاکھ ورد کروں گی۔ انشا اللہ تعالیٰ آپ کی مشکل آسان ہوگی۔ دل کرتا ہے کہ آپ سب کو اپنے ہاتھ سے بنا ہوا کھانا بھیجوں خصوصاً بیانی (واہ واہ ننکی اور پوچھ پوچھ... دیر نہ کریں جی) اب آتے ہیں کہانیوں پر تبصرے کی طرف۔ سب سے پہلے اپنے پیارے مصنف طاہر جاوید محفل صاحب کی کہانی غیر ضروری پڑھی جس میں معاشرے کا چھپا ہوا رخ نظر آیا۔ کافی دیر اسی کہانی کے بارے میں سوچتی رہی کہ دنیا کیسے کیسے رنگ میں ہے، اعتماد کا خون کیسے لوگ کرتے ہیں یہ کہانی پڑھ کر بہت دکھی ہوئی۔ اس کے بعد مسافر پڑھی۔ مصنف نے ایک دم سے شہر یار کو دیہاتی ماحول سے نکال کر جرائم کی دنیا میں ڈال دیا ہے۔ مصنف کو ابھی دل جیت شاہ کو نہیں مارتا چاہیے تھا، اس کردار سے بہت تجسس تھا کہ پتا نہیں ابھی آستانے سے اور کیا کچھ برآمد ہوگا۔ ابھی شہر یار کو چار پانچ اقساط میں گاؤں کے ماحول میں رہنے دیا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اس کے بعد محفل شعر و سخن میں حاضری دی جہاں تمام اشعار اپنے انتخاب میں بہت بہترین تھے۔ اختر شاہ عارف، جہلم کی کترین اور اقوال زریں بہت اچھے ہوتے ہیں۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ سہنس ڈائجسٹ اپنی محنت اور لگن سے ہمیشہ فرسٹ پوزیشن پر ہی رہے گا۔ یہ سب تمام اسٹاف کی محنت شاقہ کا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ سہنس، سرگزشت، جاسوسی اور پاکیزہ کو دن دینی اور رات چوگنی ترقی دے، آمین۔ رجنی ٹیل کی کہانی بہت اچھوتی اور پیاری ہوتی ہے رجنی ٹیل کو خوش آمدید! انور یوسف ذی کو محفل خط میں خوش آمدید۔ عمران حیدر بلوچ، روشنی رشید آپ کو ساگر کا کیا تحفہ بھیجے؟ اگلے خط میں ضرور بتانا۔ حاجی عبدالحمیم صاحب آپ کے خطوط بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں فیس بک پر روشنی رشید کے نام سے ہی آتی ہوں۔ محفل کے دوست فیس بک پر ضرور رابطہ کریں۔"

عبدالرؤف عدم، راولپنڈی سے تبصرہ کر رہے ہیں "سردرق کی دوشیزہ نے اک ادائے دلربائی سے ہمیں اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ہم نے یہ کہہ کر اس کی کوشش کا کام بنادی کہ "مجھ سے مت کرگفتار، میں روزے سے ہوں" جون ایلیا کی آزادی کے بارے میں کڑوی مگر سچی باتیں پڑھنے کے بعد محفل کا رخ کیا، مگر ہاں کرسی صدارت پر کسی گستاخ کو بیٹھا دیکھ کر خشک گئے۔ ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس گستاخی کے لیے انہوں نے نقل اردو کے سمندر کی آقاہ گہرائیوں میں غوطہ زنی کے جوہر دکھائے ہیں۔ جویریہ، خوش آمدید۔ اللہ آپ کو امتحان میں شاندار کامیابی عطا فرمائے۔ ریاض شاہد، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ رمضان کریم کے عمدے تمام بے گناہ قیدیوں کو آزادی کی نعمت سے نوازے۔ سب سے پہلے فیصلہ فقیروں کے پڑھے یا پڑھی۔ یہ فقیر لوگ بھی اپنی دنیا کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ سلطان محمد غفلت کی بے تحاشا قتل و غارت گری نے ہمیں حیرت و آنسوؤں کے سمندر میں غرق کر دیا۔ کاشف زبیر کی نئی دنیا ایک الگ طرز کی خوب صورت تحریر ہے۔ موبی اور اس کے مختصر ساتھیوں کی جدوجہد نئی دنیا بسانے والوں کے لیے عملی نمونہ ہے۔ آدم خور گلز بھگامیں نجمہ مودی نے اپنے مخصوص طراوت بھرے انداز میں ایک منفرد شکاری مہم کا تذکرہ بیان کیا۔ کہانی کا آخری جملہ ہماری قوم کے جمہوی رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ قرض حسنہ میں ایم اے راحت نے دلچسپ انداز میں خوابوں کی دنیا میں رہنے والے ایک نادان شخص کا تذکرہ بیان کیا۔ ملک مسند حیات ہمیشہ کی طرح ایک اچھی ہوئی تھی کو سلجھاتے ہوئے نظر آئے۔ جانے برے لوگ برا کام کرتے ہوئے برے نتیجے کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ خویر ریاض کی جنت بہت سنسنی خیز اور دلچسپ تحریر ثابت ہوئی۔ امانت بہت خوب صورت تحریر ہے۔ بعض اوقات ہم جن رشتوں پر بہت زیادہ اعتماد کرتے ہیں وہی ہمیں دھوکا دے جاتے ہیں۔ چھوٹا بخش بے سرو باخبر رہ گئی جسے کہانی بنانے کی کوشش کی گئی۔ پانچواں آدمی آخری صفحات کو جگمگاتی ہوئی تحریر ہے جسے اقبال نے اپنے زور بیاں سے خوب صورتی بخشی۔ کہانی کی بعض جگہ شمر عباس کی محسوس ہوئیں اور اب اس خوب صورت بات کے ساتھ اجازت کہ "چھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے کہ بول کر ہار جاؤ۔" لہذا انصاری صاحب سے کہیں کہ وہ ڈائریکٹ یا آپ کے ذریعہ ہم سے رابطہ کریں، انشا اللہ ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" (اگر آپ رابطے کے لیے نمبر بھی عنایت کر دیتے تو بہتر ہوتا)



عمر علی، کجرات سے محفل میں تشریف لائے ہیں "18 تاریخ کو میرے چکر میں آگست کا شمار ملا تو جان میں جان آئی۔ اس دفعہ سردرق اچھا لگا۔ ڈاکٹر انکل آپ سے بس ایک گھنٹہ ہے کہ آپ نے شاید خوب صورت مرد (میرے جیسے) دیکھے نہیں ورنہ آپ ان حسیناؤں کی جگہ ہماری تصویر بناتے۔ سب سے پہلے محفل یاراں میں استری دی۔ گستاخ انجم کو مسند اقتدار پر براجمان پایا، مبارکاں جی۔ باقی تبصرے بھی اچھے ہوں گے کیونکہ ہم نے کون سا پڑھے تھے (بہت بری بات ہے) جون ایلیا مرحوم آزادی کا رونا رورہے تھے۔ مسند ہمیشہ بھارت کی ہٹ دھرمی رہی ہے ہماری طرف سے مثبت رد عمل ہی آتا ہے۔ کہانیوں میں مسافر اور سکھول دونوں بہت تیز جاری ہیں۔ اس کے بعد چھوٹا بخش پڑھی، بہت مزہ آیا۔ حضرت سلیمان کی زندگی کے حالات و واقعات پڑھے۔ بنی اسرائیل نے کسی بھی تاریخ نویس چھوڑا۔ قرض حسنہ اس سینے کی تاپ کی کہانی تھی۔ ویل ڈن ایم اے راحت صاحب۔ پردہ نہیں اور پانچواں آدمی نارل کی کہانیاں تھیں۔"

راشد حبیب تالیش، حجب، ضلع انک سے ملے آ رہے ہیں "بوجہ مجبوری کچھ ماہ سے محفل سے رابطہ منقطع رہا کیونکہ میں آج کل ایسی جگہ پر ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہوں جہاں پر نہ تو وقت پر سہنس ملتا ہے اور نہ ہی ڈاک کا نظام ہے۔ میں نارمان شہر سے کوئی پچاس کلومیٹر کی دوری پر ہوں کبھی کبھار نارمان آتا ہوتا ہے (واقعی وادی نارمان بہت ہی خوب صورت ہے ساتھ ہی نزدیکی وادیوں شوگران و دیگر بھی حسین قدرتی مناظر سے بھرپور ہیں) مگر پہلا شہر دیکھا جہاں سہنس نہیں ملتا۔ اس دفعہ چھٹی پر گھر گیا تو دعا مانگی کہ اللہ کرے 20 کو شمارہ آچکا ہو کیونکہ 20 کو میری واپسی تھی۔ ہنڈی بیچ کر سب سے پہلے شمارے کا پتا کیا اور بے انتہا خوشی ہوئی کہ شمارہ آچکا تھا۔ سب سے پہلے اپنی پسندیدہ کہانی سکھول پڑھی کہ جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ آکٹوپس کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے شاید وہ اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ اب اک نیا کردار پر تاب سامنے آ رہا ہے جانے وہ کیا گل کھلاتا ہے۔ محفل شعر و سخن میں معیاری اشعار پڑھنے کو ملے۔ سعدیہ بخاری، ریاض بٹ، بزمی اور ماری علی کے اشعار پسند آئے۔" (آپ کی محبت کے کیا کہنے)

سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "اس مرتبہ ٹائل کچھ خاص نہ تھا۔ جون ایلیا اور انکل معراج رسول صاحب کے سوالوں کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ آزادی کی قدروقیمت کا احساس ہمارے ہاں کسی کو نہیں۔ گستاخ انجم صاحب آپ کی باتیں سچ اور سچ ہیں۔ عمران حیدر بلوچ صاحب آپ کی رہائی کے لیے خدا سے دعا گو ہوں۔ سعدیہ بخاری کو ناک بری لگی لیکن شکر ہے کچھ تو اچھا لگا۔ رمضان پاشا آپ کا تبصرہ اچھا لگا۔ مسافر میں شہرے اور کھالے کی خان آزادی کی وجہ سے خوب لڑائی ہوئی۔ میڈم پر شہرے کا جاوید سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ اختتام پر ملنے والی لاش شہرے کی بہن کی ہو سکتی ہے مگر ہونی نہیں چاہیے۔ ناصر ملک صاحب کا قلم جو بن پر ہے، ویلڈن سر۔ سکھول میں لیاقت حسین مصیبت سے اپنے تبدیل ہونے والے صاحبان کی جان بچاتا جا رہا ہے۔ تبدیلی جو پسند آئی وہ پر تاب گھوش کی وجہ سے ہے۔ وہ شاید اپنا جاپ مکمل کر کے آیا ہے۔ اچھا اقبال کی پانچواں آدمی بازی لے گئی۔ آج پاکستان کی سیاست میں بھی شوکت باجوہ جیسے لوگ ہیں جو بھی جیسے بدل کر تو کبھی ایمان سچ کر اس ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ کاشف زبیر کی نئی دنیا اور نجمہ مودی کی آدم خور گلز بھگامیں پسند آئیں۔ اشعار اور کترین زبردست تھیں۔ تمام دوستوں اور انکل آئی کو ایڈوانس عید مبارک۔"

کومل رباب، لاہور سے تبصرہ کر رہی ہیں "ارے بھی رکھیے تو تھوڑی سی جگہ تو دے دیں پلیز۔ اوہو پیچھے مڑ کر تو دیکھتے مابعد دولت اتنے مومے بھی نہیں کہ تھوڑی سی جگہ میں نہ آسکیں دیکھیے مانا کہ ہمارا نام آپ سب کے لیے بنا ہے (تو کیا کیوں نہ ہوتا جب آپ پہلی بار محفل میں شرکت کر رہی ہیں، خوش آمدید) لیکن ہم تو سہنس کو ایک مدت سے پڑھ رہے ہیں (ہمیں تو آج معلوم ہوا لیکن کہانیوں پر مختصر تبصرہ کیوں؟) ارے جویریہ یہ پڑھا تھا پڑھا میں بھی تمہاری طرح پہلی بار ہی لکھ رہی ہوں ارے بچا کر روئی کی نوکری کی نظر پڑ گئی تو خیر نہیں۔ جی جناب ٹائل گرل زیادہ اچھی نہیں تھی، بس آنکھیں خوب صورت تھیں۔ تبصرے کبھی کے اچھے تھے۔ اللہ تعالیٰ عمران حیدر بھائی اور تمام قیدیوں کو رہائی دیں، آمین۔ ویسے بھی میں تو عمران علی جھنگ کی جگہ لے رہی ہوں وہ کچھ مصروف تھے۔ محفل شعر و سخن میں سب کے اشعار اچھے تھے لیکن حاجی محمد ابراہیم، رضوان، لاہور، محمد اقبال، کراچی، محمد رشید سیال، قاری محمد رمضان، محمد لطیف ساحل کے سب سے اچھے رہے۔ لطائف کبھی اچھے تھے، خوف خدا، جنت میں داخلے کا سبب، بد صورتی اور میک اپ۔ کہانیاں صرف دو ہی پڑھی ہیں، باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ سب کو رمضان مبارک اور عید بھی۔ اچھا میں اب انتظار کر لوں۔"

حسنین عباس بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "دل کی گہرائیوں سے عید کی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ انشا اللہ میں جون انکل آزادی کے پہلو پر روشنی ڈال رہے تھے۔ گستاخ انجم صاحب کرسی صدارت پر براجمان تھے مبارک ہو جی۔ حکیم محمد رضا شاہ محترم واقعی انکل بابر عباس محفل کی جان ہیں۔ ماہ ایمان شاید بہت زیادہ مصروف ہیں۔ حمیرا رضا بہن بھی محفل میں شامل ہونے سے قاصر رہیں سب سے پہلے نمبر پر مسوٹ فیورٹ کاشف زبیر کی نئی دنیا پڑھی۔ سکھول اور مسافر حقیقت میں بے حد اچھی اسٹوری ہیں اپنی اپنی جگہ کی بے مثال اسٹوری ہیں۔ مسافر میں ناصر ملک صاحب جس جگہ کی آج کل سیر کر رہا ہے ہیں وہ جگہ میں نے دیکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد، فیصلہ فقیروں میں نمودار ہوئے۔ ماضی کی لازوال تحریر تھی۔ دیگر تمام اسٹوریز سہنس کی شان و شوکت کی عکاسی کر رہی تھیں۔" (آپ کا خوب صورت عید کا رڈ بھی ملا جو اسی خط پر آپ نے بنایا، بہت شکریہ)

اب ان قارئین کے نام جن کے نام سے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
چودھری احمد خان، راولپنڈی۔ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی۔ عبدالرحمان، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ رائے قیصر عباس کھرل، سینٹرل جیل گوجرانوالہ۔ صوبیہ فقیر، اوکاڑہ۔ جمال اعجاز، تربت۔ جویریہ، مانسہرہ۔ دلدار احمد چٹھہ، حیدرآباد۔ ریاض بٹ، حسن ابدال۔ جمال اعجاز، تربت۔ حکیم سید محمد رضا شاہ نورنگ۔ رانا حبیب الرحمن، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد ہمایوں خونی، مانسہرہ۔ محمد خواجہ کورنگی، کراچی۔

چچ نامہ

ڈاکٹر صاحب امجد



بقول راجا رائے سی ہرس ”جس راجا کی پرچاس سے خوش ہو، اس کی طرف کوئی دوسری قوم میلی انکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتی“ اگرچہ یہ اقتدار کا ایک سنہرا اصول ہے مگر اسے اپنایا چیدہ چیدہ شاہوں نے تھا۔۔۔ میدان جنگ میں گھمسان کا رن پڑے یا سازشوں سے پانسلا پلٹا جائے، توازن اور ذہانت کا امتزاج نہ ہو تو کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ جیسے کہ تلوار کی جنگ تدبیر سے جیتنے والا راجا ”چچ“ کی ذہانت ضرب المثل تھی۔ جس نے چالیس سال انتہائی کروفر سے حکومت کی اور پھر چٹا کی آگ میں جل بجھا۔ سندھ کے حصے میں باب الاسلام کا اعزاز ملنے تک جانے کتنی داستانیں رقم ہو چکی تھیں۔۔۔ تاریخ کے اوراق پلٹتے پلٹتے جب چچ کے بیٹے راجا داہر کا نام آتا ہے تو ایک لمحے کو ہاتھ یوں رک جاتے ہیں جیسے اس کے شرمناک فعل پر کائنات کو سکتہ ہو گیا تھا۔۔۔ جو محض جاہ و حشم کی طمع میں عہد گزشتہ میں ناپسندیدہ شخصیت ٹھہرایا گیا۔ دن اور رات کے تسلسل میں جانے کیا جادو ہے کہ زمین پر جتنے انسان اتنی ہی داستانیں جنم لیتی ہیں۔۔۔ مقدر کی لوح پر کسے فقیری اور کسے سلطانی عطا ہو، یہ تو ایک رمز ہے جسے آج تک کوئی نہ سمجھ سکا۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

جواب میں اس کی رعایا بھی اس کی اطاعت کو اپنا فرض سمجھتی تھی۔ پھر فتنہ و فساد کیسا، شور و ہنگامہ کیسا۔

رائے سی ہرس کی حدود حکومت بہت وسیع تھیں۔ اس کی حکومت مشرق میں کشمیر، مغرب میں مکران، جنوب میں دریائے محیط اور دہلیل اور ساحل سمندر تک اور شمال میں کوہ کردان اور کاکانان تک پھیلی ہوئی تھی۔

وہ ایک اچھا منتظم تھا لہذا اتنی وسیع مملکت کے انتظام کو درست رکھنے کے لیے اس نے اپنی مملکت کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان چاروں صوبوں میں چار صوبے دار مقرر کیے تھے۔

یہ چاروں صوبے، صوبہ برہمن آباد، صوبہ سیوستان، صوبہ اسکند رہ اور صوبہ ملتان کے نام سے موسوم تھے۔

آخری صوبے کی سرحد کشمیر سے جالمتی تھی۔

راجا خود اروڑ میں رہتا تھا اور صوبوں کی نگرانی کرتا تھا۔ اس نے ان صوبوں کے صوبے داروں کو حکم دے رکھا تھا کہ ہمیشہ سچ جتنے تیار رکھا کریں تاکہ کوئی دشمن حملہ آور نہ ہو سکے۔ یہ بھی تاکید تھی کہ رعایا کے مفاد کو ہر حال میں پیش نظر رکھا جائے۔

اس کا قول تھا کہ جس راجا کی پرچاس سے خوش ہو،

سندھ ابھی سندھ تھا۔ اس خطہ زمین کو باب الاسلام کا اعزاز ملنا تھا لیکن ایک صدی درمیان میں تھی۔ اس ایک صدی میں اسے کئی نشیب و فراز دیکھنے تھے۔

اسلام کا سورج طلوع ہو چکا تھا لیکن اس کی کرنیں ابھی مدینہ منورہ کے گلی کو چوں کو منور کر رہی تھیں۔ باقی دنیا گہرے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سندھ کی زمین بھی کفر و ضلالت کے قدموں سے آباد تھی۔ یہاں جو راجا حکومت کرتے تھے وہ رائے کہلاتے تھے اور عقیدہ تابدہ مذہب کے پیرو تھے۔

جب رسول اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی، اس وقت جو راجا یہاں حکومت کر رہا تھا اس کا نام رائے سی ہرس تھا۔ اس نے اپنا دارالحکومت شہر اروڑ (الور) کو بنایا تھا۔ یہ شہر پچھلے تین حکمرانوں کے دور حکومت دیکھ چکا تھا اس لیے خوب ترقی یافتہ تھا۔ عالی شان عمارتیں، سرسبز باغات، ہری بھری کھیتیاں، خوش حال لوگ۔ کیا تھا جو یہاں نہیں تھا۔ رائے سی ہرس نہایت دولت مند تھا۔ اس کے ساتھ ہی فیاض اور سخی بھی تھا۔ اس نے دولت کو خزانے میں بند کر کے نہیں رکھا تھا بلکہ عمارتوں میں اضافہ اور باغوں کو کشادہ کیا تھا۔ ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔

گچی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کے شال مجموعہ

سرگزشت

ماہنامہ

ستمبر 2012ء

کی جھلکیاں

اوج مناظر

اس پیکر علم عرفان کا تذکرہ جو فقیرانہ روش پر گامزن تھا

خونخوار لڑکیاں

ایسی ظالم لڑکیاں تارن نہیں کہیں نظر نہیں آتیں

شوبھوگیاں

پاکستان کے ایک ولولہ انگیز لیڈر کی کتھا

سفیر موسیقی

بولی ووڈ کے نامور موسیقار کا عکس زندگی

سحر و ساحری

جادو ٹونے پر ایک معلومات بھرا مضمون

لکھنے کے علاوہ

بھی بہت ساری سچ بیانیاں، سچے

واقعات، دلچسپ حقائق، فلمی الف لیلا اور

معرکہ الا راقط وارروداد "سراب"

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ

محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے آدمی کٹ کٹ کر گرے
رہیں اور کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ میں سندھیوں کو بھاگتے ہوئے
دیکھنا چاہتا ہوں۔"

تقریر ہی ایسی تھی کہ اس کے جنگ آزماؤں نے
جان پر کھیل کر ایک بڑا حملہ کر دیا۔ وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ مرنا
ہے یا فتح یا ب ہونا ہے۔

ایرانی فوج کا یہ حملہ ایسا زبردست تھا کہ ایک طویل
کشکش کے بعد سندھ کے سپاہی تاب نہ لاسکے اور بھاگ
کھڑے ہوئے۔ رائے سی ہرس ابھی تک اپنی جگہ ڈٹا ہوا
تھا۔ اس نے اپنی فوج کو بھاگتے ہوئے دیکھا لیکن اس کے
قدموں کو جنبش نہ ہوئی۔ اس کا بیٹا ایک مرتبہ پھر اس کے
قریب آیا اور مشورہ دیا کہ وہ جنگ سے ہاتھ کھینچ لے لیکن
راجا نے بڑی حقارت سے اس کا مشورہ ٹھکرادیا۔ بہت
تھوڑی فوج رہ گئی تھی جو راجا کے ساتھ تھی اور ابھی تک حق
وفاداری ادا کر رہی تھی۔ راجا نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا
کہ ناگہاں دشمن کی جانب سے ایک تیرا یا اور اس کے گلے
میں بیوست ہو گیا۔ تیرا یا کا رے تھا کہ وہ فوراً گھوڑے سے
نیچے گر گیا۔ اس کے گرتے ہی باقی ماندہ فوج بھی پریشان
ہو کے بھاگنے لگی۔ اس کا بیٹا ساہسی گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور
باپ کی لاش کو اپنے گھوڑے پر لے لیا۔

شاہ نیم روز کے لشکر میں فتح کے نقارے بجنے لگے۔
ایرانی لشکر نے بھاگتے ہوئے سندھیوں کا دور تک تعاقب
کیا۔ خوب لوٹ مار مچائی اور پھر علاقہ نیم روز کی طرف
واپس لوٹ گیا۔

سندھی لشکر ادھر ادھر منتشر ہو گیا تھا۔ دوسرے دن
خطرہ سر سے ٹلا تو منتشر لشکر ایک جگہ جمع ہوا شکست خوردہ
سندھی مضطرب و حیران اس قیامت خیز سانحے کی خبر لے کر
دارالحکومت میں داخل ہوئے۔ یہ خبر ہی ایسی تھی کہ ہر جانب
صف ماتم بچھ گئی۔ راجا ایسا ہر دل عزیز تھا کہ کوئی آنکھ ایسی نہیں
تھی جس نے آنسو نہ بہائے ہوں۔ لوگ گھروں سے نکل
آئے۔ راجا کے محل کے سامنے سو گواروں کا ہجوم تھا۔ ان کی
آہوں اور سسکیوں کا شور آسمان تک جا رہا تھا۔ یہ معلوم ہوتا
تھا کہ یہ شور کبھی نہیں ختم سکے گا۔ جیسے اردوڑ کے رہنے والوں
کے ہونٹوں پر کبھی ہنسی نہیں آ سکے گی۔

شہر کے رہنے والوں کو دہرے صدے سے واسطہ
تھا۔ شکست کا دکھ بھی تھا اور راجا جاتھ سے چلا گیا تھا یہ صدہ
بھی تھا۔

نم داندوہ کی اسی فضا میں راجا کی آخری رسومات ادا

جو تمہارے پاس ہیں۔ ہم دشمن کو یہاں سے بھگا کر ہی
لیں گے۔"

اس کی اس تقریر سے اس کے آدمیوں میں بے حد
جوش و جذبہ پیدا ہو گیا۔ اسی وقت اس کا بیٹا ساہسی ہجوم سے
نکلا اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"پتا جی، ہمارے لیے یہی بہت ہے کہ آپ اس جنگ
میں ہمارے ساتھ ہیں۔ آپ لڑائی میں حصہ نہ لیں، کسی محفوظ
جگہ بیٹھ کر سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتے رہیں۔ لڑائی میں سب
کچھ ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کی جان کو کوئی نقصان پہنچا تو سب
کے حوصلے ٹوٹ جائیں گے۔ آپ کو زندہ رہنا چاہیے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو، میں تمہاری یہ بات مان لوں گا۔
میرے سپاہی مرتے رہیں اور میں کسی جگہ محفوظ بیٹھا رہوں
یہ تم نے سوچا بھی کیسے۔ میرا باپ آج اس دنیا میں نہیں، اس
کی جگہ میں پوری کر رہا ہوں۔ جب میں نہیں رہوں گا تو
میری جگہ تم لے لو گے۔ پھر مجھے فکر کس بات کی۔ جاؤ لڑائی
کی تیاری کرو۔"

ساہسی مایوس لوٹ آیا۔
راجا اس وقت مکران میں تھا جہاں شاہ نیم روز لوٹ
مار مچا رہا تھا۔ مکران کا علاقہ رائے سی ہرس کے ماتحت تھا۔
اس لیے اس کی حفاظت اس کی ذمہ داری تھی۔ یہ خطرہ بھی
صاف نظر آ رہا تھا کہ مکران میں لوٹ مار مچانے کے بعد وہ
سندھ کی طرف آئے گا۔

شاہ نیم روز کو جب معلوم ہوا کہ رائے سی ہرس
مقابلے کے لیے نکلا ہے تو اس نے بھی تیاری پکڑی۔ اب
تک وہ محض لوٹ مار کرتا رہا تھا۔ کسی باقاعدہ فوج سے اس کا
سامنا نہیں ہوا تھا لیکن اب لشکر جرار سے مقابلہ تھا۔ اس نے
اپنی فوجوں کو اچھی طرح ترتیب دیا اور خوب تیاری سے
مقابلے پر آ گیا۔

دونوں طرف کے بہادر جب آپس میں نبرد آزما
ہوئے تو نہایت گھمسان کا رن پڑا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی تھی۔
دونوں طرف کے سو ماہی شجاعت کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ
جنگ کا فیصلہ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں حریفوں کے
سیکڑوں سپاہی قتل ہو گئے تھے لیکن کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار
نہیں تھا۔ شاہ نیم روز اس صورت حال سے بہت پریشان
تھا۔ اس نے اپنے خاص آدمیوں کو اپنے حضور طلب کیا اور حکم
دیا کہ جنگ جیتنے کے لیے نئی حکمت عملی ترتیب دی جائے۔

"یاد رہے کہ یہ حملہ آخری ہونا چاہیے۔ اس حملے کے
بعد فتح یا شکست مجھے دونوں قبول ہوں گی۔ میں یہ

کوئی دوسری قوم اس کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکی۔
وہ خود بھی اپنے اس قول پر عمل پیرا تھا۔ اپنے راج
کنوروں کو اس نے فنون جنگ سے بہ خوبی واقف کیا
تھا۔ لڑائی کے لیے انہیں ہر وقت تیار رکھتا تھا اور ہر قسم کا
سامان جنگ، اسلحہ اور گھوڑے ان کے لیے موجود رہتے
تھے۔ رعایا کو بھی ہمیشہ راضی رکھتا تھا اور جاہ جا عالی شان
عمار میں تعمیر کراتا تھا۔

سلطنت میں فتنہ جو اور باغی لوگ نہ تھے کہ جھگڑے
پیدا ہوں اور رعایا کے امن و امان میں خلل پڑے۔ یہ امن
وامان ایک مدت سے قائم چلا آ رہا تھا کہ ناگہاں بادشاہ نیم
روز سندھ پر چڑھ دوڑا۔ بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا اور
خوب لوٹ مار مچائی، (تاریخ سندھ کے مولف عبدالحلیم شرر
کے مطابق بادشاہ نیم روز سے مراد ساسانی تاجدار نجم ہے)
راجا کو جب معلوم ہوا کہ کوئی دشمن سندھ میں داخل
ہوا ہے تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے فوراً اپنے راج
کنوروں کو طلب کیا۔ نہ فوج کی کمی تھی نہ گھوڑوں اور سامان
حرب کی۔ طویل امن و امان کے دور نے جنگی تیاری کا خوب
موقع دیا تھا۔ سپاہی بھی ایسے کہ راجا پر جان دینے کے لیے
بے چین۔ راجا نے پکارا تو دوڑے چلے آئے۔ راجا ان
سورماؤں کو لے کر اردوڑ (الور) سے نکلا اور ایک کھلے
میدان میں پہنچ گیا جہاں سے دشمنوں کی صفوں کو آسانی سے
دیکھا جاسکتا تھا۔

راجا نے اپنی فوج کو مخاطب کیا۔ "سندھ کے باسیو!
میرے بچو! میں نے حکمرانی اس لیے حاصل نہیں کی تھی کہ
تمہیں جلتی زمین پر دھوپ برساتے آسمان کے پتے لاکر کھڑا
کر دوں۔ میں نے تمہیں ہمیشہ امن و امان کے باغوں میں
رکھا۔ کسی اور کے علاقے پر کبھی کوئی بری نظر نہیں ڈالی کہ
تمہیں تلواریں کے منہ دیکھنے پڑیں، تمہارا خون میرے
نزدیک اتنا سستا نہیں تھا کہ اسے جنگوں میں بہاتا پھرتا لیکن
اب مجبوری ہے۔ شاہ نیم روز نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں
تمہیں یہاں لے کر آؤں۔ سندھ دھرتی ہماری ماں ہے۔
ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں۔ یہ جنگ میں اپنی
حفاظت کے لیے نہیں، سندھ کی حفاظت کے لیے لڑ رہا
ہوں۔ اگر مجھے اپنی جان کی پروا ہوتی۔ تو میں تمہارے
ساتھ نہ آتا۔ دیکھ لو میں تمہارے ساتھ ہوں اور ایک سپاہی
کی طرح تمہارے شانہ بشانہ لڑوں گا، آخر دم تک لڑوں
گا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں نے اپنی حفاظت کے لیے کوئی
اضافی انتظام نہیں کیا ہے۔ وہی ہتھیار میرے پاس ہیں

کردی گئیں۔

راجا کا محل غم کی سیاہ چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ امرا اور وزرا کو یہ فکر تھی کہ تخت ابھی تک خالی پڑا ہے۔ یہی حال رہا تو ملکی معاملات دگرگوں ہو جائیں گے۔ کوئی تقسیم اس طرف آنکلا تو لشکر کس کے حکم کی پاسداری کرے گا۔ راجا کے مرنے کا دکھ اپنی جگہ لیکن دنیا تو اپنی جگہ چلتی ہی رہتی ہے۔ تخت پر کسی کو تو بیٹھنا چاہیے۔ لیکن کس کو؟ راجا کا بیٹا ساہسی سب سے مضبوط امیدوار تھا۔ وہ راجا کی زندگی ہی میں اپنی دونوں خوبیوں کی بدولت عوام میں بہت مقبول تھا۔ امرا بھی اسے بہت عزیز رکھتے تھے لہذا اسی کا نام پیش کیا گیا۔ کسی طرف سے بھی مخالفت کی آواز بلند نہ ہوئی۔ اب سوال یہ تھا کہ کسی طرح ساہسی کو تیار کیا جائے جو اپنے باپ کے سوگ میں محل چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھا تھا۔

امرا میں سے چند بااثر لوگ اس کے پاس گئے تاکہ اسے تخت نشینی کے لیے آمادہ کر سکیں۔ ساہسی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب پانی کا ایک برتن رکھا تھا۔ امرا نے اس پر تاسف کیا اور اسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔ ”کنور ساہسی، شہزادوں کو یوں فقیری لینا اچھا نہیں لگتا۔ اٹھ اور راج پاٹ سنبھال۔“

”دنیا سے میرا دل اچاٹ ہو گیا ہے۔ گدی جس کو جی چاہے دے دو۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

”کیا تمہیں راجا کی وصیت یاد نہیں۔ شاہ نیم روز سے مقلبے کے وقت ہم قریب ہی کھڑے تھے جب اس نے تم سے کہا تھا کہ اگر میں نہ رہا تو میری جگہ تم سنبھالو گے۔ پر لوگ سدھارنے والوں کی وصیت کو نظر انداز نہیں کرتے۔ جگ میں اندھیرا ہے۔ تم تخت پر بیٹھو تو لوگوں کی ڈھارس بندھے۔“ اس کے بعد بھی ساہسی نے بہت حیل و حجت کی لیکن امرا کی ضد سے مجبور ہو گیا۔ وہ سب اسے شہر میں لے آئے۔ وہی خلقت جو راجا کے سوگ میں ڈوبی ہوئی تھی، ساہسی کے جلوس کو دیکھ کر خوشی سے نعرے بلند کرنے لگی۔

دربار میں تخت نشینی کے ساتھ ہی عیش و عشرت کے شادیاں بجنے لگے۔ بہت بڑا جشن طرب منعقد کیا گیا۔ زرو جو اہر نچھاور ہوئے۔ پورے شہر میں خوشیوں کا وہ رقص ہوا کہ غم کے بادل چھٹ گئے۔

تخت نشینی کے ایک سال بعد وہ ملک کے دورے پر نکلا۔ ہر شہر میں پہنچا۔ وہاں کے لوگوں سے ملا۔ ان کے دکھ درد کو معلوم کیا۔ مفیدین اور باغیوں کا قلع قمع کیا۔ ملک کے حالات سے جب اچھی طرح واقف ہو گیا تو

واپس آیا اور حکومت کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے ضوابط اور قواعد مرتب کیے۔

پہلا ضابطہ لشکریوں سے متعلق تھا۔ وہ یہ جان چکا تھا کہ لشکریوں کی مدد و تعاون کے بغیر کوئی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔ انہیں خوش رکھنا اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ اس نے ضابطہ جاری کیا کہ فوجیوں کی جو بھی تنخواہ مقرر ہے وہ انہیں بروقت ملنی چاہیے۔

دوسرے ضابطے میں تحریر کیا کہ رعایا سے جو بھی خراج وصول کیا جاتا ہے وہ تین قسطوں میں وصول کیا جائے تاکہ ان پر بوجھ نہ پڑے۔

تیسرے ضابطے کے مطابق اس نے ملک کے تاجروں کو حکم دیا تھا کہ حکومت کی جانب سے جو ان پر ٹیکس عائد ہے وہ کسی مطالبے کے بغیر بروقت ادا کرنا چاہیے۔

چوتھا ضابطہ اہل صنعت و حرفت سے متعلق تھا۔ یہ ضابطے جب رو بہ عمل ہوئے تو ہر طرف امن و امان ہو گیا۔ ملک کے چاروں صوبوں میں بھی چین ہی چین تھا۔ سب کام اپنی اپنی جگہ بہ خوبی چل رہا تھا۔ نہ کہیں کوئی شکایت تھی نہ سرکشی۔ فرصت کے یہ لمحات میسر آئے تو رائے ساہسی عیش و عشرت میں مشغول رہنے لگا۔ مملکت کے تمام کام رام نامی وزیر کے سپرد کر دیے جو نہایت لائق اور ایماندار تھا۔ ساہسی کو اس پر بھروسہ بھی بہت تھا۔ رام تمام گتھیاں خود سلجھا رہا تھا البتہ جب مشورے کی ضرورت ہوتی تو رام محل میں حاضر ہوتا اور احکام وصول کر لیتا، وزیر رام نے بہت سے لائق فائق لوگ اپنے گرد جمع کر لیے تھے جن کی مدد سے وہ امور مملکت چلا رہا تھا۔ دربار شاہی پر وہ اس قدر حاوی تھا کہ اس کی وساطت کے بغیر نہ تو کوئی شخص راجا کی ملازمت میں داخل ہو سکتا تھا اور نہ اس کی منظوری کے بغیر ہر طرف کیا جاتا تھا۔ خود راجا کا یہ حال تھا کہ اس کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتا تھا۔ اہل سندھ میں مشہور ہو گیا تھا کہ اصل راجا تو رام ہے۔ اس سے ملے بغیر راجا تک پہنچنا محال ہے۔

۴۹۹۹۹۹

وزیر رام اپنے محل میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ بڑے بڑے پنڈت اور لائق فائق لوگ مؤدب بیٹھے اس کی باتیں سن رہے تھے کہ کسی نوجوان کی آمد کی اطلاع ملی۔ دوستوں نے کہا بلایا جائے ملا جائے۔ دیکھا تو جائے کیوں آیا ہے، کیا چاہتا ہے؟

وہ نوجوان سامنے آیا تو سب کی نگاہیں یک بہ یک

چچ نامہ

انہیں۔ وہ نہایت خوب صورت تھا۔ قد لمبا، اعضا متناسب اور رخسار چمک دار تھے۔ پیشانی سے خوش قسمتی ظاہر تھی۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ اجنبی تھا مگر واقف کار لگتا تھا۔ رام کے لیے انجانا تھا مگر رام بڑا سیانا تھا۔ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ آنے والا کوئی قابل ہے۔ عقل مندوں میں شامل ہے۔ بیٹھے کو کہا اور تعارف کے لیے زبان کھولی۔

”اے شخص تو کون ہے؟“

”میں اپنے باپ کی بدولت مشہور ہوں ورنہ گم نام ضرور ہوں۔ پھر بھی ہر انسان کا ایک نام ہوتا ہے میرا نام چچ ہے۔ میرے والد کا سیلا ج ہے جو اسی الور میں ایک مندر کے پجاری ہیں جناب۔۔۔ ان کی تربیت نے مجھے کندن بنایا ہے۔ اتنا حوصلہ بڑھایا ہے کہ اس وقت آپ کا ہم صحبت ہوں۔ اس رام کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے رام سے ملایا ہے۔“

”اہل سندھ تیرے باپ کے فضل و کمال کے معترف ہیں یقیناً تو ان صفات سے آراستہ ہوگا۔ یہ بتا یہاں تک آنے کی غرض کیا ہوئی؟“

”آپ جس خوبی سے مملکت کا نظام چلا رہے ہیں کیا اس کے بعد بھی آپ سے نہ ملا جاتا۔ غرض یہی تھی کہ اس شخص کو دیکھوں، اس کی باتیں سنوں جو پتھر کو سونا بناتا ہے، جو غریبوں کو دھنواں بناتا ہے۔ اس کو دیکھا، راجا کو دیکھا برابر ہے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جو علم میں نے اپنے باپ سے حاصل کیا ہے اس علم سے ملک و قوم کی خدمت کروں۔“

چچ نے یہ باتیں کچھ ایسے ڈھنگ سے کہیں۔ ایسی فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کیا کہ رام اس کی قابلیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس وقت جو لوگ رام کے پاس بیٹھے تھے، وہ بھی اش اش کراٹھے۔

رام نے اسے مخاطب کیا۔ ”تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم غیر معمولی صلاحیت و ذہانت رکھتے ہو۔ بلاشبہ تمہاری فصاحت میں شک نہیں لیکن کیا تم قانون اور اخلاق سے بھی واقف ہو؟“

چچ نے جواب دیا۔ ”میں چاروں ویدوں کا حافظ ہوں اور معنی و مفاہیم سے بہ خوبی واقف ہوں، ہر مسئلے کا حل ویدوں سے تلاش کر کے دکھا سکتا ہوں اور وہ بھی زبانی، ویدوں کو ہاتھ لگائے بغیر۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ جو بھی خدمت میرے سپرد کی جائے گی۔ میں اس کو ذمے داری، خلوص، دیانت اور احتیاط کے ساتھ انجام دوں گا۔“ اتفاق سے جب یہ دونوں باتیں کر رہے تھے، دیمل سے چند ضروری خطوط جواب طلب موصول ہوئے۔ رام

نے وہ خطوط اس کی طرف بڑھا دیے کہ ان کو پڑھ کر سنائے۔ چچ نے بہترین طریقے پر ان خطوط کے مضامین کو پڑھ کر سنایا۔ رام نے فرمائش کی کہ ان خطوط کے جواب بھی وہی لکھے۔ چچ نے اسی وقت نہایت اچھے الفاظ میں ان کے جواب لکھ کر رام کے سامنے رکھ دیے۔ رام نے جوابات کو ملاحظہ کیا تو بہت خوش ہوا۔

”تم اس قابل ہو کہ میرے نائب بن کر کام کرو۔“

چچ نے اس کی یہ پیش کش قبول کر لی اور باقاعدگی سے دربار میں آنے لگا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے، رام اس کی تحریروں سے مرغوبیت کی حد تک خوش رہنے لگا اور بیش قیمت انعامات سے نوازنے لگا۔ کارہ کثرت کے مصداق اسے اپنے کام میں مہارت حاصل ہوئی چلی گئی۔ اپنے حسن اخلاق سے بھی اس نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا یہاں تک کہ وہ وزیر مراسلات کے نام سے پکارا جانے لگا۔ شہر میں اس کی قابلیت کے چرچے ہونے لگے۔ اس کی ہر دل عزیزی نے یہ حالت کر دی کہ ملک بھر میں تمام لوگ اس کے والد و شیدا ہو گئے۔ رام وزیر کا نام ہی لوگوں کے صفحہ دل سے مٹ گیا۔

چچ کا اقبال روز بہ روز ترقی کرتا جا رہا تھا کہ ایک دن راجا کا دربار سجا ہوا تھا۔ اکابر و امرا سب جمع تھے کہ سیوستان سے کچھ ضروری کاغذات آئے جن کا اسی وقت جواب دینا ضروری تھا۔ راجا نے فوراً رام کو طلب کیا۔

رام اس وقت دفتر میں موجود نہیں تھا۔ چچ کے آجانے کے بعد رام کچھ بے فکر سا ہو گیا تھا۔ اسے بھروسہ تھا کہ چچ اس کی غیر موجودگی میں ہر کام سنبھال لے گا۔

راجا کے قاصدوں نے جب رام کی بابت دریافت کیا تو چچ سامنے آ گیا۔ ”رام تو اس وقت موجود نہیں۔ میں اس کا نائب ہوں۔ اگر کوئی ضروری اور فوری کام ہے تو میں حاضر ہوں۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”کیا خبر راجا کو تمہاری ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ پہلے ہم راجا سے پوچھ لیں۔ اگر وہ کہے گا تو ہمیں تمہاری حاضری پر اعتراض نہیں۔“

راجا کے آدمیوں نے راجا کو ساری کیفیت سے آگاہ کر دیا۔ راجا کو خود بھی چچ سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ چچ حاضر ہو۔

چچ دربار میں پہنچا تو راجا نے سیوستان سے آئے ہوئے کاغذات اس کے سامنے رکھ دیے۔ اسے ان کاغذات کو پڑھنا تھا اور جواب تحریر کرنا تھا۔

چچ نے جواب لکھا اور نہایت عمدگی سے راجا کے

سامنے پیش کر دیا۔ راجا خود بھی خوش خطی سے انس رکھتا تھا اور بلاغت کے اصولوں سے واقف تھا۔ اس نے چچ کی قابلیت کی تعریف کی اور اسے عزت و تکریم سے رخصت کیا۔ رام کو جب معلوم ہوا کہ راجا نے اسے طلب کیا تھا اور اس کی جگہ چچ نے جوابات تحریر کیے ہیں تو اسے یہ فکر ہوئی کہ راجا کو چچ کا کام پسند بھی آیا یا نہیں۔ وہ اپنی غیر موجودگی کا عذر پیش کرنے راجا کے سامنے حاضر ہوا اور اس بات کی خواہش کی کہ اگر جوابات روانہ نہیں ہوئے ہیں تو وہ انہیں دوبارہ تحریر کر دے لیکن وہ اس وقت حیران ہوا جب راجا کی زبان پر چچ کی تعریف کے سوا کچھ نہ تھا۔

”تمہارا نائب نہایت ذہین اور خوش قلم ہے۔ یہ عقل مند انسان تمہیں ملا کہاں سے؟“

”حضور، یہ سیلاج پنڈت کا بیٹا ہے۔ میں نے اسے انہی خوبیوں کی بدولت اپنا نائب بنایا ہے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میرا انتخاب آپ کو پسند آیا۔“

”میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اس کا خاص خیال رکھنا اور اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا۔ ایسے قیمتی لوگ روز بروز نہیں ملتے۔“

رام نے جب راجا کی مہربانی کو دیکھا تو بے خوف ہو کر تمام امور مملکت جنہیں وہ اب تک خود انجام دیتا تھا، اس کے سپرد کر دیے۔ چچ ان امور کو سرانجام دینے لگا۔ راجا جب بھی دربار منعقد کرتا چچ کو حاضر ہونا پڑتا اور ہر مرتبہ اس کی ایک نئی خوبی راجا پر ظاہر ہوتی۔ وہ خوش ہو کر اسے انعامات سے نوازتا رہتا تھا۔

راجا اس کی کارگزاریوں کو دیکھ کر اکثر کہا کرتا تھا۔ ”مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نوجوان سے ہمارے ملک کی انتظامی حالت درست ہوگی اور یہ شخص ملک کی کوئی اہم خدمت انجام دے گا۔“

چچ ہاتھ باندھ کر عرض کرتا۔ ”نوکرا اسی لیے پیدا ہوتے ہیں کہ آقا کی خدمت کرتے رہیں لیکن نوکرا اس سے بھی ڈرتا رہتا ہے کہ خدمت میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔“

رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ رام بالکل ہی گنہگار ہو گیا۔ پھر وہ بیمار بھی پڑ گیا تھا۔ اس کا دربار میں جانا بالکل ہی موقوف ہو گیا۔ اس کی نیا سندی چچ کر رہا تھا۔ وہ نائب وزیر تھا۔ راجا کی خواہش تھی کہ رام کو ہٹا کر اسے اپنا وزیر بنائے۔ اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار چچ کے سامنے بھی کیا لیکن چچ نے اس کی مخالفت کی۔

”آپ سے پہلے رام نے مجھے اپنی ملازمت میں رکھا

تھا۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ اس کا عہدہ اپنے پاس رکھوں۔ آپ مجھ پر مہربانی فرماتے ہیں، آپ کا یہ حسن ظن میرے لیے وزارت کے عہدے سے بھی زیادہ ہے۔ اگر آپ نے مجھے یہ عہدہ دیا تو آپ کے انصاف پر حرف آئے گا۔ عام لوگوں کو یہ تاثر ملے گا کہ میں نے کوئی ساز باز کر کے اپنے آقا رام کو نیچا دکھایا ہے اور خوشامد سے یہ عہدہ حاصل کر لیا ہے۔ کیا آپ اپنے بارے میں یہ سننا پسند کریں گے کہ آپ خوشامد سے خوش ہوتے ہیں اور عدل و انصاف کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔“ راجا کو بھی رام کی خدمات یاد آئیں اور اس نے یہ ارادہ منسوخ کر دیا۔

راجا نے اپنا ارادہ منسوخ کر دیا تھا لیکن چچ کی قسمت میں وزارت کا عہدہ لکھا جا چکا تھا۔ رام وزیر بیمار تو تھا ہی، ایک دن اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ رام کے انتقال کے بعد رائے ساہسی نے چچ کو بلوایا اور باقاعدہ قلم وزارت اس کے سپرد کر دیا۔ اب چچ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے اس عہدے کو قبول کیا اور نہایت عمدگی سے امور وزارت انجام دینے لگا۔

ایک دفعہ راجا اپنے محل میں تھا۔ اس کی رانی اس کے پاس ہی بیٹھی تھی کہ چچ کسی ضروری مشورے کے لیے محل میں آیا اور راجا سے ملاقات کا متمنی ہوا۔ کوئی اور ہوتا تو راجا اس سے کبھی ملاقات نہ کرتا لیکن وہ تو چچ تھا، اس کا منظور نظر وزیر۔ اس نے فوراً چچ کو اجازت باریابی دے دی اور رانی سے کہا، چچ آ رہا ہے وہ پردے میں چلی جائے۔

”چچ تو برہمن ہے اس سے پردہ کیسا؟“

”کیا تمہیں یہ پاس نہیں کہ تم رانی ہو؟“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ میں رانی ہوں اور وہ ہمارا نوکر ہے اور پھر برہمن ہے۔“

راجا کو بھی چچ پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے زیادہ بحث نہیں کی۔ اسے اندر بلا لیا۔ وہ اندر آتے ہی رانی کے سامنے متوجہ کھڑا ہو گیا اور ایسی شائستگی سے اپنا مطلب بیان کیا کہ راجا محفوظ ہوا۔

رانی کا حال وہی ہوا جو چچ کو دیکھ کر سب کا ہوتا تھا۔ اس کی خوب صورتی نے رانی کی آنکھیں چکا چوند کر دیں اس کی با محاورہ گفتگو سن کر تو جیسے دل ہی ہار بیٹھی، اس وقت راجا سامنے بیٹھا تھا لہذا رانی نے پلکوں کی جھالر آنکھوں پر ڈال لی۔ جتنی دیر وہ بیٹھا رہا اس کی طرف کن اکیوں سے دیکھتی بھی رہی لیکن دل میں سوچ ضرور رہی ہوگی کہ یہ طوطی مقال کا ش صرف اس سے مخاطب ہو۔

راجا نے اسے خلعت سے سرفراز کیا اور یہ اجازت خاص بھی مرحمت فرمائی کہ جب کوئی ضروری امر پیش آئے وہ بے تکلف محل میں حاضر ہو کر عرض کر دیا کرے۔

اب رانی سے تو پردہ رہا ہی نہیں تھا، وہ بے تکلف محل میں آنے جانے لگا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ راجا محو خواب ہوتا اور رانی اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی اور اس کی گفتگو سے اپنا دل بہلاتی۔ اس قربت نے رانی کی آتش عشق کو ایسا فروزاں کر دیا کہ دل پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ راتوں کی نیند جاتی رہی۔ اپنا مقام و مرتبہ بھول کر ایک وزیر کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔

اس روز راجا محل سے باہر کہیں گیا ہوا تھا کہ چچ آگیا۔ ملازموں نے بتا دیا تھا کہ راجا محل میں نہیں ہے اس لیے وہ واپس جانے کے لیے مڑ گیا تھا، اسی وقت رانی کا پیغام آگیا کہ وہ رانی سے ملے بغیر واپس نہ جائے۔ چچ کو اس کا حکم ماننا پڑا۔ دل میں یہ بھی سوچا کہ شاید کوئی اہم بات ہوگی اسی لیے رانی نے اسے بلایا ہے۔ وہ اسی کمرے میں آکر بیٹھ گیا جہاں راجا سے ملاقات کیا کرتا تھا۔

رانی اس روز خوب اچھی طرح تیار ہوئی۔ اپنے آپ کو خوشبوؤں میں بسایا اور اٹھلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ چچ اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”چچ پیارے، یہ کیا کرتے ہو۔ راجا نے تم سے کہا تھا بے تکلف محل میں آیا جایا کرو۔ اول تو تم آتے ہی بہت کم ہو، اوپر سے یہ تکلیف کرتے ہو۔“

”آپ رانی ہیں اور میں معمولی وزیر۔ آپ کا ادب تو مجھ پر لازم ہے۔“

”یہ تم سے کس نے کہا دیا کہ ہم تم غیر ہیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بالکل اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ چچ نے گھبرا کر اٹھنا چاہا لیکن رانی نے اس کے کندھے پر زور دے کر دوبارہ بٹھا دیا۔

”رانی جی، ہم غیر نہ سہی لیکن اپنے بھی نہیں ہیں۔“

”تم کتنے کٹھن ہو۔“ رانی نے کہا۔ ”وہ تو اتنے عقل مند ہو لیکن میرے دل کی بات اب تک نہیں سمجھے۔ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے تم پر مرنے لگی ہوں۔ میری محبت کا جواب محبت سے دو۔“

”رانی جی، مجھے جانے دیں۔ میں نے راجا جی کا نمک کھایا ہے۔“

”تم دیکھ رہے ہو راجا اس وقت محل میں نہیں ہیں۔ وہ ابھی دو دن نہیں آئیں گے۔ رات کو بھی نہیں۔ کیا سمجھے، رات

کو بھی نہیں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم رات کو نہیں جاؤ۔ تم دیکھ رہے ہو راجا مجھ سے عمر میں کتنے بڑے ہیں۔ میرے ہم عمر ہو۔ راجا کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ میں سنبھال لوں گی۔ خوش قسمت ہو کہ تم پر میرا دل آیا ہے۔“

”یہ میری خوش قسمتی نہیں۔“

”کیا میں خوب صورت نہیں؟“

”آپ بہت خوب صورت ہیں۔“

”میں جوان نہیں؟“

”آپ جوان بھی ہیں۔“

”آپ مرد نہیں؟“

”مجھے پر ماتما نے مرد بنایا ہے۔“

”تم ایک رات میرے ساتھ نہیں گزار سکتے؟“

”یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔“

”تمہیں اس حکم عدولی کی جرأت کیسے ہوئی۔“

”اس لیے کہ میں برہمن ہوں۔ میرا باپ اور بھائی اب بھی پجاری ہیں۔ وہ اس وقت بھی خدا کی عبادت میں مصروف ہیں۔ مجھ سے آپ کو کسی نمک حرامی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ میں اس بدنامی کا داغ اپنے دامن پر نہیں لے سکتا۔“

”کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔“

”بھگوان دیکھ رہا ہے۔“

”وہ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ میں تمہارے عشق میں گرفتار ہوں۔“

”تم کسی کی بیوی ہو۔“ چچ نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں چاہوں تو تم یہاں سے نہیں جاسکتے۔“

”آپ کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔“

”اگر میں شور مچا دوں کہ تم نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔“

”مجھے تو معلوم ہوگا کہ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ اس کے بعد مجھے موت کی سزا بھی سنادی جائے تو مجھے افسوس نہیں ہوگا کیونکہ میرا ضمیر صاف ہوگا۔“

”چچ پیارے، میں شور نہیں مچاؤں گی۔ میں تمہیں سزا ہوتے نہیں دیکھ سکتی لیکن یہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔“

رانی نے کہا اور بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ کو یہ کڑوی دوا اپنی پڑے گی۔“ چچ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی رانی اپنے بستر پر گر گئی۔ اس کی

آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اسے ٹھکرائے جانے کا سوس تھا جو اسے رلا رہا تھا۔

کوئی معمولی درجے کی عورت بھی ہوتی تو اپنی بے لوثی کا بدلہ ضرور لیتی لیکن وہ چچ کے عشق میں گرفتار تھی۔

سے سزا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس رات اس کے ستر پر کانٹے بچھے تھے کہ کسی کروٹ چپن ہی نہ آتا تھا۔

دوسری رات بھی اسی طرح جاگ جاگ کر گزار دی۔

تیسرے دن راجا واپس آیا تو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا، وہ رسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔

”سوئمن دیوی، کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تمہارا رنگ پیلا کیوں پڑ گیا ہے؟“

”دورات دن سے سوئی جو نہیں ہوں۔“

”کیوں، نیند کیوں نہیں آتی؟“

”آپ کے بغیر کیسے نیند آتی؟“ وہ تصور ہی تصور میں یہ سب کچھ چچ سے کہہ رہی تھی۔

”کیا تم مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو؟“

”آپ کے بغیر جینے کا تصور ہی نہیں کر سکتی لیکن آپ اتنے کٹھن ہیں کہ کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ ویسے تو بہت عقل مند ہیں لیکن میرے دل کی بات نہیں سمجھتے۔“ رانی نے تقریباً وہی جملے دہرائے جو وہ چچ سے کہہ چکی تھی۔ وہ تصور میں راجا سے نہیں چچ سے مخاطب تھی۔

”یہ کس نے کہا دیا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔“

”محبت کرتے ہیں تو پھر ہاتھ کیوں جھٹک دیا۔ آگے بڑھتے اور مجھے گلے سے لگا لیتے۔“

”سوئمن دیوی، تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ نہ تم نے ہاتھ پڑا نہ میں نے جھٹکا۔ تم جاگتے میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہو۔“

رانی کو اچانک اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے بہانہ بنایا۔

”کل رات تھوڑی دیر کو میری آنکھ لگی تھی۔ میں نے سنے میں دیکھا تھا کہ تم میرا ہاتھ جھٹک رہے ہو۔“

”سپنوں پر یقین کرتی ہو۔ سنے میں جو کچھ دیکھو اس کا الٹ ہوتا ہے۔“ راجا نے کہا اور رانی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

رانی اب بھی پُر امید تھی کہ چچ کو کسی نہ کسی دن راہ پر لے آئے گی۔ وہ برہمن ہے مگر انسان بھی تو ہے۔ میں اسے مجبور کر رہی دوں گی۔

وہ بڑی بے چینی سے چچ کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ راجا سے ملاقات کے لیے ضرور آئے گا لیکن

کئی دن گزر گئے چچ نہیں آیا۔ رانی کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اس سے خفا ہو کر گیا ہے۔ یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ کسی دن وہ سب کچھ راجا کو نہ بتا دے۔ اس سے ملنا ضروری تھا۔ راجا سے پوچھ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس نے آنا کیوں چھوڑ دیا۔

وہ آتش فراق میں جلتی رہی لیکن موقع کی تاک میں لگی رہی۔ جلد ہی اسے موقع مل گیا۔ راجا برہمن آباد گیا ہوا تھا۔ محل کے بہت سے نوکر جا کر بھی اس کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ایک نوکر کو چچ کے بلانے کے لیے بھیجا۔

اس سے کہہ دیا کہ راجا ایک پیغام چھوڑ گیا ہے۔ چچ سے کہنا وہ پیغام آکر سن جائے۔ نوکر نے یہی جا کر چچ سے کہہ دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ رانی نے اسے دھوکے سے بلایا ہے لیکن انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ رانی سے ملنے محل پہنچ گیا۔ رانی بن سنور کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”چچ پیارے، آخر تمہیں میری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا؟“

”رانی جی، آپ جو کچھ چاہتی ہیں وہ پاپ ہے۔ میں آپ کو اچھا لگتا ہوں اس میں کوئی برائی نہیں لیکن اس سے آگے جو کچھ ہوگا وہ راجا سے نمک حرامی ہوگی۔ مجھ سے اس پاپ کی امید نہ رکھیں۔“

”اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں خودکشی کر لوں گی۔“

”دیکھو رانی جی، اس زبردستی سے کوئی فائدہ نہیں۔ جس سے عشق کرتے ہیں اس کی خوشی کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے عشق کی دعویدار ہیں تو مجھے وہ حکم دیں جس پر میں یہ خوشی تیار ہو جاؤں۔“

رانی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ چچ اسے سمجھاتا رہا اور وہ روتی رہی۔ بڑی دیر بعد رانی نے سر اٹھایا۔

”اگر تم کو یہ پسند نہیں تو کم از کم مجھے ہر روز اپنے دیدار سے مشرف کرتے رہو۔ میں اس پر بھی خوش ہو جاؤں گی۔ تم نے تو آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔“

”میں آپ کے بے جا مطالبے سے ڈرتا تھا۔ اب وعدہ کرتا ہوں کہ آتا رہوں گا۔ اگر مجھے دیکھنے سے آپ کے من کو خوشی ملتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس سے آگے کچھ نہیں۔“

رانی اس پر راضی ہو گئی۔ چچ ضرورت بے ضرورت محل میں آنے جانے لگا۔ رانی سے اس کا پردہ ختم ہو ہی چکا

تھا۔ اب راجا کی موجودگی غیر موجودگی سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ رانی اسے دیکھ دیکھ کر جیتی رہی۔ اکیلے میں جیج کے بارے میں سوچ سوچ کر آہیں بھرتی رہتی تھی۔ وہ سامنے آجاتا تو کھل اٹھتی۔

یہی شب وروز تھے۔ محبت کی منزلیں طے ہو رہی تھیں کہ راجا بیمار پڑ گیا۔ امرا اور وزراء اس کی تیمارداری میں لگے ہوئے تھے۔ جیج کا تو یہ حال تھا کہ راجا کے سرہانے سے اٹھنا ہی بھول گیا تھا۔ وید اور حکیم پریشان تھے کہ کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا ہے۔ رانی کو یقین ہونے لگا تھا کہ راجا کا مرض، مرض الموت ہے۔ اب وہ بچے گا نہیں اس نے راجا کو ایک کوشٹری میں منتقل کر دیا۔ امرا پر پابندی لگا دی کہ کوئی راجا کے پاس نہ جائے۔ چند با اعتبار وید تھے جو علاج کی غرض سے راجا کے پاس جاسکتے تھے۔

ایک دن رانی نے جیج کو خلوت میں بلوایا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ رائے کی بیماری کس قدر طول پکڑ چکی ہے۔ مجھے اس کی موت کا یقین ہو چلا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے مستقبل کی فکر ستانے لگی ہے۔ جیج پیارے! میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔ راجا کے کچھ رشتہ دار ہیں۔ ان کی آنکھوں کی ہوس بتا رہی ہے کہ ادھر راجا کا دیہانت ہوگا اُدھر وہ تخت پر جھپٹ پڑیں گے۔ یہ لوگ راجا کی زندگی ہی میں مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس کے مرنے کے بعد مجھے کیا پوچھیں گے۔ ایک تم ہی میرے ہمدرد ہو۔ اگر تم مجھے یقین دلاؤ کہ مجھ سے شادی کر لو گے تو میں تمہارے لیے تخت نشینی کی تدبیر کروں۔ اسی پر میرے اور تمہارے تعلقات کا انحصار ہے۔“

جیج ابھی تک رانی سے کوئی تعلق رکھنے سے انکار کرتا رہا تھا لیکن تخت و تاج کا سن کر اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ رانی کی آرزو پوری کرے گا۔ رانی نے بھی وعدہ کر لیا کہ وہ اپنی تدبیر پر عمل کرے گی۔ رانی کی طرف سے یہ حکم جاری ہوا کہ کل دربار منعقد ہوگا۔ سب امیر و کبیر جمع ہوں۔

ہر کاروں اور چوب داروں نے اس خبر کو عام کر دیا۔ دوسرے دن جب دربار منعقد ہوا تو رانی نے نیم بے ہوش راجا کی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور اسے لے کر دربار میں آئی اور امرا سے مخاطب ہوئی۔

”راجا کی حالت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ وہ ضعف کی وجہ سے دربار میں حاضر نہیں ہو سکتے ورنہ جو اعلان میں کر رہی ہوں وہ خود کرتے۔ انہوں نے حکم دیا ہے میں تم

سے کہوں کہ جیج کو تخت نشین کر کے اس کے حکم پر چلیں۔ کے طور پر اپنی انگوٹھی مجھے دی ہے کہ میں اسے جیج کی میں پہنا دوں۔“

راجا اور جیج کے تعلقات ہی ایسے تھے کہ رانی بات کا سب کو یقین آ گیا۔ راجا کا کوئی بیٹا تھا نہیں جو دے کرتا۔ تمام درباریوں نے اسی وقت جیج کو راجا تسلیم کر سرباز جھکا دیا۔

اس تخت نشینی کو دو چار روز ہی گزرے تھے کہ راجا فو ہو گیا۔ عقل مند رانی نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی راجا مر گیا ہے۔ صرف جیج کو اس کی موت سے باخبر کیا۔ ”کیا میں اب بھی اس لائق نہیں ہوں کہ تم میری پوری کرو؟“

”اب راجا اس دنیا میں نہیں رہا تو تمہیں اپنا میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”پھر مجھے وہ کرنے دو جو میں کروں۔“

”تم کیا کرنے والی ہو؟“

”راجا کے عزیز و اقارب کو جیسے ہی معلوم ہوگا کہ اب اس دنیا میں نہیں وہ فتنہ پیدا کریں گے اور اپنا جتا کریں گے۔ میں ان فتنوں کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند دینا چاہتی ہوں۔“

”تم کیا کرو گی؟“

”دیکھتے جاؤ میں کیا کرتی ہوں۔“

دوسرے دن رانی نے پچاس طوق و سلاسل منگوائے اور نہایت رازداری سے حرم سرا کی مختلف کوشٹریوں میں رکھ دیے۔ اس کے بعد راجا کے ہر عزیز کو چوبدار جیج کے بلکہ کہ مہاراج نے آپ کو آخری وصیت کے لیے بلایا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اب راجا اس دنیا میں رہا نہیں لہذا ان میں سے ہر ایک بڑی بڑی امیدیں لے کر کے سامنے پہنچ گیا۔ بعض کو تو یہ بھی امید تھی کہ اسے دلی مقرر کیا جائے گا۔

رانی نے یہ انتظام کیا تھا کہ ان سب کو شاہی محل سے باہر ہی روک لیا جائے اور ایک ایک کے اندر بھیجا جائے خاندان شاہی کے یہ ارکان محل کے باہر قطار بنا کھڑے تھے۔ چوبدار باہر آیا اور قطار میں جو سب آگے تھا، اسے لے کر اندر چلا گیا۔ اندر آتے ہی اسے ایک کوشٹری میں پہنچا دیا گیا کہ راجا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے جیسے ہی کوشٹری میں قدم رکھا اسے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ باہر والوں کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

چوبدار باہر آیا اور دوسرے کو لے کر اندر چلا گیا۔ اس طرح باری باری سب کو اندر بلا لیا گیا اور زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔

یہ پچاس اقربا وہ تھے جو با اثر اور دولت مند تھے۔ راجا کے کچھ عزیز وہ تھے جنہیں راجا نے بھی نظر انداز کر رکھا تھا، یہ لوگ نہایت غریب تھے۔ رانی نے ان سب کو بھی بلوایا اور انہیں زنجیروں میں جکڑے ہوئے دولت مند رشتہ داروں کے پاس لے کر گئی۔

”دیکھو، یہی وہ لوگ ہیں جو تمہارے خلاف راجا کے کان بھرتے رہتے تھے۔ تمہیں غریب رکھا اور خود دولت مند بن گئے۔ میں نے ان سب کو قید کر لیا ہے۔ میں ان سب کا مال و اسباب تمہیں دوں گی مگر شرط یہ ہے کہ جو جس کو قتل کرے گا وہی اس کا مال پائے گا۔“

رانی کا حکم پاتے ہی ان غریبوں نے اپنے مالدار رشتہ داروں کو قتل کر ڈالا اور پھر ان کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار شروع کر دی۔

رانی کی تدبیر نے راجا کے با اثر رشتہ داروں کا خاتمہ کر دیا۔ غریب لوگ مال و دولت لوٹ کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

اب کسی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ رائے ساہسی کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔ پورے ملک میں سوگ ہوا اور شاہی اعزاز کے ساتھ راجا کی اٹھی اٹھائی گئی۔

راجا کی موت کے بعد جیج نے اپنا وعدہ پورا کیا اور رانی سوئمن دیوی سے شادی کر لی۔

رانی کی دلی مراد برآئی تھی۔ اس کا محبوب اسے مل گیا تھا اور وہ بھی راجا کے روپ میں۔ ہر طرف امن و امان تھا۔ راجا کا کوئی رشتہ دار اس قابل نہیں تھا کہ تخت کا دعویٰ کرتا۔ رانی کی تدبیر نے سب کے منہ بند کر دیے تھے۔

چوڑ کا راجا مہرت راج سنگھان پر بیٹھا تھا۔ اس کے درباری ہاتھ باندھے افسردہ کھڑے تھے۔ خبر ہی ایسی آئی تھی کہ داسیوں نے اپنے بال کھول لیے تھے اور تخت کے پائے پکڑے بیٹھی تھیں۔ راجا مہرت نے اپنی قلمرو میں سوگ منانے کا اعلان کر دیا تھا۔

راجا مہرت رائے ساہسی کا بھائی تھا۔ اسے بھائی کی موت کی خبر بہت بعد میں ہوئی تھی۔ یہ خبر بھی آئی تھی کہ رانی نے بڑی چالاکی سے رائے ساہسی کے رشتہ داروں کو قتل کرا دیا ہے اور ایک برہمن جیج نامی کو تخت پر بٹھا دیا ہے۔ راجا

مہرت نے اس خبر کی تصدیق کے بعد اپنے امرا کو مشورے کے لیے بلایا تھا۔

”میرے بھائی کا دھیانت ہو گیا ہے اور اس کی بیوی نے حکومت کو رائے ساہسی کے خاندان سے نکال کر اپنے عاشق جیج کے حوالے کیا ہے جبکہ اسے چاہیے تھا کہ وہ مجھے اطلاع کرتی۔ بھائی کے مرنے کے بعد میں اس کا وارث تھا۔ اب آپ لوگ بتائیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

سب نے یہ ایک آواز مشورہ دیا کہ اروڑ پر چڑھائی کر کے اپنا حق حاصل کر لے۔

راجا خود بھی یہی چاہتا تھا۔ تین دن تک بھائی کا سوگ منانے کے بعد اپنی فوجوں کو اکٹھا کیا اور جیج کو سبق سکھانے کے لیے چل دیا۔

جب اروڑ تین میل کے فاصلے پر رہ گیا تو راجا مہرت خیمہ زن ہوا۔ اس نے ایک خط لکھا اور ایک وفد کے ذریعے یہ خط جیج تک پہنچا دیا۔

”میں اس تخت کا جائز وارث ہوں جس پر تم قبضہ جمائے بیٹھے ہو۔ یہ تخت ہمارے آباؤ اجداد کی ملکیت ہے۔ اگر تم یہ تخت میرے حوالے کر دو گے تو میں تم سے اچھا سلوک کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔“

تم ذات کے برہمن ہو۔ جنگ اور لڑائی تمہارے بس کا روگ نہیں۔ میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ لڑائی سے باز آؤ، تخت میرے حوالے کرو اور خود کسی گوشے میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرو۔ مفت میں اپنی جان نہ گنواؤ۔“

جیج واقعی ذات کا برہمن نکلا۔ اسے جنگ و جدل سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ایک چڑیا تک کبھی نہیں ماری تھی۔ تخت پر بیٹھنے سے قبل اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ راجاؤں کو لڑنا بھی پڑتا ہے۔ یہ خط ملا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ بھاگا ہوا رانی کے پاس پہنچا اور اسے وہ خط دکھایا۔

”ساہسی کا بھائی آگیا ہے اور تخت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ جنگ سر پر کھڑی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ تم ہی مجھے اس مشکل سے نکال سکتی ہو۔“

”جنگ لڑنا عورتوں کا کام نہیں، تم مرد ہو۔ شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے نکلنا اور دشمن پر ٹوٹ پڑو۔“

”تم جانتی ہو یہ میرا کام نہیں۔“

”تو پھر ایسا کرو، میری ساری تم باندھ لو اور اپنے کپڑے مجھے دے دو تا کہ میں مرد بن کر نکلوں اور دشمن سے مقابلہ کروں۔“

یہ سن کر جیج پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مارے غیرت کے

اس کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ رانی کو اس کی حالت پر ترس آیا اور سمجھانا شروع کیا۔

”بھگوان نے بے شمار دولت آپ کو دی ہے۔ لوگوں پر اپنی دولت کو نثار کیجئے تاکہ لوگ آپ کے جھنڈے تلے جمع ہوں۔ جو صلے سے کام لیں۔ جب تک آپ کے وفادار زندہ ہیں آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔“

چچ نے اس مشورے کو قبول کیا۔ اس نے سرداران فوج کو بلایا اور ان میں روپیہ تقسیم کیا۔ تمام افسر اور سپاہی اس کے جھنڈے کے نیچے آئے اور جان دینے پر آمادہ ہو گئے۔ چچ نے فوج کو ساتھ لیا اور لڑائی کے لیے اروڑ سے نکلا۔ دونوں فوجوں کے درمیان مقابلہ شروع ہوا۔ گھمسان کارن پڑا تھا۔ دونوں طرف کے جوان مرد کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔

چچ کے فوجی افسر جانتے تھے کہ چچ میدان جنگ کا مرد نہیں اس لیے یہ لوگ اسے دور دور رکھ رہے تھے اور بہت سے جوان اسے گھیرے ہوئے چل رہے تھے۔

جب بہت سے سپاہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تو راجا مہرت نے چچ کے پاس پیغام بھیجا۔

”سپاہیوں کی جان لینا اور ان کو اپنے فائدے کے لیے کٹوانا مردوں کا شیوہ نہیں۔ یہ جھگڑا میرا اور تمہارا ہے، کیوں نہ ہم سواری سے اتر کر آپس میں مقابلہ کر لیں جو زندہ بچے گا وہی سندھ کے تخت کا مالک ہوگا۔“

برہمن چچ کے لیے یہ پیغام افتادنا گہانی کی طرح تھا۔ اس قسم کے مقابلوں کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس کے سرداروں نے بھی منع کیا کہ وہ اس مقابلے سے انکار کر دے اور سپاہیوں کو لڑنے دے۔

چچ سپاہی نہ تھا لیکن عقل و فہم میں تو بے مثال تھا۔ اس نے اپنے ایک نوکر سے کہا۔ ”جب میں مہرت سے دو بدو مقابلے کے لیے نکلوں تو تم اپنا گھوڑا آہستہ آہستہ میرے پیچھے لانا اور مجھ سے قریب رہنا۔“ نوکر نے یہی کیا۔ مہرت اپنے لشکر سے پیدل نکلا۔ چچ بھی اسے دیکھ کر اپنے گھوڑے سے اتر اور مہرت کی طرف چلنا شروع کیا۔

مہرت دل میں یہ سوچتا ہوا آ رہا تھا کہ ایک برہمن جس کا واسطہ بھی تلوار سے نہیں پڑا میرا مقابلہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ میں تلوار کے ایک ہی وار میں اس کا سر، تن سے جدا کر دوں گا۔

چچ کے ذہن میں وہ ہدایت گردش کر رہی تھی جو وہ اپنے نوکر کو دے کر مہرت کی طرف چلا تھا۔ میں تلوار کا دھنی نہ کئی لیکن جو ترکیب میں نے اختیار کی ہے اس کے بعد

مہرت کی موت یقینی ہے۔

جب مہرت اور چچ بالکل قریب پہنچ گئے تو چچ کے نوکر نے گھوڑا چچ کے برابر لا کر کھڑا کر دیا۔ چچ اچک کر گھوڑے پر سوار ہوا اور چھٹ کر مہرت پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ اس سر اس کے تن سے جدا ہو گیا۔

یہ سب ذرا سی دیر میں ہو گیا۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ چچ نے کیا ہوشیاری کی تھی۔ لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ مہرت مارا گیا۔ اس کے قتل ہوتے ہی چچ کی فوج نے مہرت کی فوج پر بھرپور حملہ کر دیا۔ مہرت کی فوج میں ایسی بے دلی پھیلی کہ مقابلے کی سکت ہی جاتی رہی۔ ایک بڑا حصہ تہ تیغ ہو گیا۔ کچھ بھاگ گئے اور کچھ معافی کے طلب گار ہوئے۔

چچ فاتحانہ شان سے چلتا ہوا اروڑ پہنچا تو شہر کے لوگوں نے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔ رانی سوئسن محل کی چھت سے اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی، چچ نے برہمن ہوتے ہوئے کیسی بہادری کا کام کیا ہے۔ رائے ساہسی کا آخری رشتہ دار بھی رخصت ہوا۔

اس جنگ کے بعد چچ کے حوصلے بڑھ گئے۔ اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ اب اسے واقعی حکمرانی کرنی ہے۔ اس حکمرانی میں حریفوں سے نمٹنا بھی پڑے گا۔ اس کے لیے ضروری انتظامات درکار ہیں۔ بھروسے کے آدمیوں کی بھی ضرورت ہے۔ اس کا دھیان اپنے بھائی چندر پر گیا۔ اس نے ایک آدمی کے ذریعے اس کے پاس پیغام بھیجا۔

”ہمارے بزرگوں کا طریقہ پوجا پاٹ ہے اور ہم بتوں کی پوجا میں خاص رغبت رکھتے ہیں۔ ہمارے باپ نے بھی اپنے بزرگوں کی طرح اس پر عمل کیا ہے لیکن ہند کی مذہبی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی روح کی اصلاح کرتا ہے تو اس کی روح اس کے جسم سے جدا ہو کر کسی بادشاہ کے گھر میں اس کی اولاد کی صورت میں دوسرا جنم لیتی ہے یا کسی بڑے آدمی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے جس کے جسم میں وہ ہر طرح کی راحت اور آرام حاصل کرتی ہے چنانچہ ہمارے باپ سیلاج کے خدا نے ہم پر رحمت کی ہے اور ہمیں تاج و تخت سے سرفراز کیا ہے۔ ایک بڑا ملک ہمارے زیر نگیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اروڑ کے شہر کا حاکم بنادوں اور اپنے بعد تمہیں اپنا ولی عہد مقرر کروں۔“

چندر اگرچہ عبادات میں مصروف رہتا تھا۔ عہدے اور مناصب سے اسے کوئی رغبت نہیں تھی لیکن بھائی کا حکم نہ ٹال سکا اور بھائی کے پاس چلا آیا۔ چچ نے اروڑ کا تمام نظم و نسق اس کے ہاتھوں میں دے دیا۔

پورے شہر میں فرمان شاہی پڑھ کر سنایا گیا۔

”ہمارا فرض ہے کہ ہم اس ملک کے لوگوں کے ساتھ چچی طرح پیش آئیں اور عدل و انصاف سے ان کو خوش رکھیں تاکہ خدا کے یہاں ہم سے ظلم و بے انصافی کا مواخذہ نہ ہو۔ اس لیے میں اپنے بھائی چندر کو جو راہبوں کا سردار ہے یہ اہم کام سپرد کرتا ہوں۔ وہ ہماری موجودگی اور عدم موجودگی میں تمام امور کا ذمے دار ہے۔ تمام امرا اور رعایا پر اس کی اطاعت واجب ہے۔“

رائے ساہسی کے فوت ہو جانے کے بعد اس کی حدود و مملکت کا بہت سا حصہ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ساہسی نے مملکت کو چار حصوں میں تقسیم کر کے وہاں حاکم مقرر کر دیے تھے۔ اب یہ حاکم بھی بغاوت پر اتر آئے تھے، ظلم و نسق منتشر ہو کر رہ گیا تھا۔ چچ کو ان حاکموں کی سرکشی کو بھی رفع کرنا تھا اور ہاتھ سے نکلے ہوئے حصوں کو بھی مملکت میں شامل کرنا تھا۔ اسی لیے اس نے چندر کو اروڑ کا حاکم بنایا تھا تاکہ وہ باہر نکلے تو چندر شہر کی دیکھ بھال کر سکے۔

چچ نے بھاری لشکر جمع کیا اور شہر بھامیہ پر حملہ آور ہوا۔ یہ شہر اروڑ اور ملتان کے درمیان دریائے پیاس کے جنوبی کنارے پر تھا۔ یہاں کے حاکم نے چچ سے سرکشی کی تھی۔ چچ اسے سزا دینے کے لیے بھامیہ پہنچا تھا۔

دونوں کی فوجوں میں خوں ریز جنگ ہوئی۔ چچ کی اقبال مندی اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ چچ کو فتح ہوئی۔ حاکم بھامیہ فرار ہو کر دریائے راوی کے جنوبی کنارے پر ایک مضبوط قلعے ”اسکندہ“ میں پناہ گزیں ہو گیا۔

چچ اس کا پیچھا کرتا ہوا اسکندہ پہنچ گیا اور قلعے کے باہر اپنا خیمہ لگا کر بیٹھ گیا۔ چچ کی ذہانت ضرب المثل تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا تھا اور مسائل کا حل دریافت کر لیتا تھا۔ چند روز خیمہ زن رہنے کے بعد اس مسئلے کا حل بھی دریافت کر ہی لیا۔

اس قلعے میں شجاع نام کا ایک با اثر شخص تھا۔ اس شخص کو اہل فوج اور معززین اپنا رہبر اور صاحب رائے خیال کرتے تھے۔ چچ نے اس کے پاس ایک خفیہ پیغام بھیجا۔ ”اگر تم بھامیہ اور اسکندہ کے حاکم کو قید یا قتل کروادو گے تو میں تمہیں ان قلعوں کا سردار بنادوں گا۔“

شجاع کی طرف سے پیغام آیا کہ اسے قبول ہے۔ اپنے بیٹے کو بے طور ضمانت چچ کے پاس بھیج دیا اور پھر چند ہی روز میں حاکم کو قتل کر کے اس کا سر بھی چچ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ چچ نے وعدے کے مطابق بھامیہ اور اسکندہ

ڈاکٹریٹ

ڈاکٹر صاحب۔ ”جب سے آپ نے میرے دل کا آپریشن کیا ہے، میرا دل ہر وقت ٹک ٹک کرتا رہتا ہے۔“

”اوہ تمہی تو میں سوچ رہا تھا کہ میری گھڑی کہاں گئی؟“

☆.....☆.....☆

ناراضگی

میاں بیوی میں بول چال بند تھی۔ گھر میں کوئی تیسرا فرد نہیں تھا۔

ایک دن میاں نے ایک پرچی پر لکھا۔ مجھے صبح چھ بجے جگا دینا اور پرچی بیوی کے سرہانے کے نیچے رکھ دی لیکن جب صبح خود ہی میاں کی آنکھ کھلی تو سات بج چکے تھے۔

بیوی باورچی خانے میں ناشتہ بنا رہی تھی۔ وہ سیدھے وہاں گئے اور غصے سے بولے۔ ”میں نے تمہارے سرہانے کے نیچے لکھ کر پرچی رکھی تھی۔“

بیوی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے بول اٹھی۔ ”میں نے بھی پرچی پر لکھ کر آپ کے سرہانے کے نیچے پرچی رکھ دی تھی کہ چھ بج چکے ہیں، اٹھ جائیے۔“

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

پراسے حاکم مقرر کیا۔

ان انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد ملتان کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں کا حاکم بجھڑا نامی ایک شخص تھا جو راجا ساہسی کا قرابت دار تھا۔ یہ حکمران نہایت طاقتور اور دانا تھا۔ ایک وسیع سلطنت اس کے قبضہ اقتدار میں تھی۔

بجھڑا نے جب چچ کی آمد کی خبر سنی تو جنگی ہاتھیوں اور ایک زبردست فوج کو لے کر چچ کے مقابلے کے لیے نکلا۔

(ان دنوں دریائے راوی ملتان کے گرد بہتا تھا) بجھڑا اس قدر تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ مست جنگی ہاتھیوں پر ایسا ناز تھا کہ صفیں ترتیب دینے کا انتظار بھی نہیں کیا اور حملہ آور ہو گیا۔ چچ بھی پوری طرح تیار تھا۔ بجھڑا کے سپاہیوں کی تلواریں، ڈھالوں کا منہ دیکھ کر چنگاریاں

اڑانے لگیں۔ دیر تک مقابلہ ہوتا رہا۔

بجھڑا کے سپاہیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ چچ کامیابی کی امید کھو بیٹھا تھا لیکن اس کی قسمت کے ستارے عروج پر تھے۔ کئی گھنٹوں کی لڑائی کے بعد دشمن کے قدم اکھڑنے لگے۔ پھر یہ موقع بھی آیا کہ بجھڑا فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ وہ قلعہ ملتان میں محصور ہو گیا۔

قلعہ ملتان میں داخل ہوتے ہی بجھڑا نے اپنے قاصد کو ایک خط دے کر کشمیر کے راجا کے پاس دوڑایا۔ اس خط میں تحریر تھا ”ایک برہمن اروڑ پر قابض ہو کر دولت سندھ کا تاجدار بن گیا ہے۔ وہ ایک لشکر کے ساتھ ہمارے ملک پر حملہ آور ہوا ہے۔ اطراف و نواح کے مضبوط قلعے فتح کر لیے ہیں اور کوئی راجا بھی اس کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس وقت وہ ملتان پر حملہ آور ہے۔ مجھ میں اس سے مقابلے کی سکت نہیں۔ آپ ہی مدد کیجیے ورنہ خیریت نہیں۔“

بجھڑا نے قاصد کو روانہ کیا اور قلعے کے حفاظتی انتظامات مضبوط کر کے قاصد کا انتظار کرنے لگا۔

قاصد منزل میں سر کرتا ہوا کشمیر پہنچ گیا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا راجا کشمیر کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کا نابالغ لڑکا تخت پر بیٹھا ہے۔

وزرا اور امرا نے معذوری ظاہر کر دی کہ راجا کی موت کے بعد ہمارے ملک میں تو خود آثار بغاوت پائے جا رہے ہیں ہم کسی کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔

قاصد نے واپسی کی راہ لی اور ملتان پہنچ گیا۔ بجھڑا اس کی نامراد واپسی سے سخت پریشان ہوا۔ مقابلے کی تاب نہیں تھی، صلح کی درخواست کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے چچ کی خدمت میں عرض گزاری کہ اس کی جاں بخشی کی جائے اور اجازت دی جائے کہ وہ اہل و عیال کے ساتھ جہاں چاہے چلا جائے۔

چچ نے اس درخواست کو قبول کر لیا اور وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ کشمیر کی پہاڑیوں میں چلا گیا۔ چچ قلعے میں داخل ہو کر ملک پر قابض ہو گیا۔

بجھڑا کو مغلوب کرنے کے بعد اس کی دھاک ایسی بیٹھی تھی کہ کئی حکمرانوں نے سرطاعت جھکا دیا۔ اب وہ آگے بڑھا اور کشمیر کی طرف چلا۔ یہاں تک کہ شاکلہا کے قلعے پر پہنچا جو کمیا کے نام سے مشہور تھا اور ہندوستان کی سرحد پر واقع تھا۔ یہاں ایک مہینے تک پڑاؤ ڈالے پڑا رہا۔ گرد و نواح کے سردار اس کی اطاعت کا دم بھرنے آئے اور وفاداری کا عہد کیا۔ گویا اپنی سلطنت کو یہاں تک وسیع

کر لیا۔ ایک چشمے کے کنارے پر جو پنجاب کہلاتا تھا اور قلمرو اور مملکت کشمیر کے درمیان سرحد قائم کرنے کے لیے بڑے درخت نصب کرائے۔ جب اتنا زمانہ گزر گیا دونوں درخت بڑھے اور ان دونوں کی شاخیں ایک دوسرے سے مل گئیں تو وہ اروڑ کی طرف واپس آیا۔

رانی کی صحبت میں دن رات بسر کرتے ہوئے جب ایک سال گزر گیا تو ایک دن اس نے اپنے وزیر کو بلا کر کہ اب میں مشرق کی طرف سے مطمئن ہو گیا ہوں۔ طاقت میں اب اتنا حوصلہ نہیں کہ میرے خلاف سر اٹھائے مغرب اور جنوب میری توجہ کا منتظر ہے۔

برہمنوں کے بارے میں عام طور پر یہ تاثر تھا کہ ذات مندروں میں پوجا پاٹ کے لیے پیدا ہوئی ہے، اسے راج پاٹ اور تلواروں کی دنیا سے کیا واسطہ لیکن چچ نے سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ دور دور تک اس کی بہادری کی چرچے سنے جا رہے تھے۔ بڑے بڑے جابر حکمران اس کی اطاعت اختیار کر رہے تھے یا شکست کھا کر پہاڑوں اور گھاٹیوں میں چھپ رہے تھے۔

چچ نے مغرب کی طرف بلغار کرنے کا عندیہ دیا تو اس کے وزیر نے بھی اس کی حمایت کی۔

”آپ نے بالکل درست فیصلہ کیا۔ جنوبی امرا بے فکر ہو گئے ہیں کہ رائے ساہسی کے بعد اب ان سے خزانہ وصول کرنے والا کوئی نہیں۔“

وزیر کی تائید ملتے ہی چچ نے بدھیمہ اور سیوستان کا رخ کیا۔ بدھیمہ، قدیم سندھ کا شمال مغربی صوبہ تھا اور موجودہ پورے ضلع لاڑکانہ اور ضلع جیکب آباد کے مغربی حصے پر مشتمل تھا۔

سیوستان کے قلعے میں مٹا نامی حاکم متعین تھا۔ چچ دریائے سندھ عبور کر کے بدھیمہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں حاکم بھندر گو بھاگو تھا اور اس کا دار السلطنت کا کاراج تھا۔ وہاں کے لوگ سیویس کہلاتے تھے۔ بعض کا خیال یہ بھی ہے کہ ”کا کاراج“ کو وہاں کے لوگ سیویس کہتے تھے۔

چچ نے حملہ کیا اور سیویس کو فتح کر لیا۔ یہ دیکھ کر اس طرف کے دوسرے حاکم کا کا کے لڑکے وکیہ بن کا کا نے خراج ادا کرنے کا عہد کر کے اطاعت قبول کر لی۔

اس مہم سے عہدہ برآ ہونے کے بعد وہ سیوستان پہنچا۔ سردار مٹا اس سے مقابلے کے لیے نکلا لیکن شکست کا منہ دیکھنے کے بعد قلعے میں محصور ہونا پڑا۔ چچ کی فوج نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

سردار مٹا اس محاصرے کی تاب نہ لاسکا اور صرف ایک ہفتے بعد ہی اس کے حواس گم ہو گئے۔ اس نے امان طلب کی اور قلعے کی چابیاں چچ کے پاس بھیج دیں۔ چچ نے اس پر مہربانی کی۔ نہ صرف اسے معاف کر دیا بلکہ بہ دستور سے وہاں کا حاکم مقرر رکھا۔

اپنے ایک افسر کو اس کی نگرانی پر متعین کیا۔ برہمن آباد کے حاکم آکھم لوہانہ نے خراج دینا بند کر دیا تھا اس کی گوشاہی بھی ضروری تھی لہذا چچ برہمن آباد کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ برہمن آباد کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس کی فوج کو ایک شخص تیزی کے ساتھ سیوستان کی طرف بلاتا نظر آیا۔ چند سپاہیوں نے اس کا تعاقب کیا اور اسے پکڑ لیا۔ اس کی تلاشی لی گئی تو اس کے پاس سے ایک خط برآمد ہوا۔ یہ خط آکھم لوہانہ کی جانب سے سردار مٹا کے نام لکھا گیا تھا۔ سپاہیوں نے یہ خط چچ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ چچ نے خط پڑھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

خط میں لکھا تھا۔ ”میں ہمیشہ تمہارے ساتھ مخلصانہ طریقے سے پیش آیا ہوں اور ابھی تمہارا مخالف نہیں رہا ہوں۔ میں تمہارے خط کی جو تم نے مجھے لکھا ہے رسید بھیج رہا ہوں۔ تم میں اور ہم میں مکمل اتحاد ہے۔ تمہیں اجازت ہے کہ تم برہمن آباد سے دیہل تک جہاں بھی تم مناسب سمجھو اپنا ٹھکانا بنا سکتے ہو، جب تم کسی جگہ پہنچ کر مطمئن نہ ہو جاؤ تو میں تمہیں مالی اور فوجی ہر طرح کی مدد دوں گا۔“

اس خط نے جلتی پر کھیل کا کام کیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ آکھم لوہانہ، سردار مٹا کو کسار ہا ہے۔

چچ نے اسی وقت آکھم لوہانہ کے نام خط لکھوایا۔ ”تم خاندانی نسب کے لحاظ سے بادشاہ ہونے کے دعویدار ہو جبکہ مجھے یہ دولت، قوت و عزت ورثے میں نہیں بلکہ ایشور کی مہربانی سے ملی ہے۔ اس سبب سے میں ہر حال میں اسی کی مدد پر بھروسہ کرتا ہوں۔ اسی کی مدد سے میں سب لڑائیوں میں کامیاب ہوا۔ تمہیں چونکہ ایشور کے سوا اپنے خاندان اور اپنی قوت پر بھروسہ ہے اس لیے ان سب چیزوں کو کھو بیٹھو گے اور اسی بنا پر میں تمہاری جان لینے کو جائز سمجھتا ہوں۔“

خط آگے روانہ ہوا اور چچ اس کے پیچھے پیچھے برہمن آباد پہنچ گیا۔ آکھم لوہانہ اس وقت برہمن آباد میں نہیں تھا اس نے سنا کہ چچ حملہ آور ہوا ہے تو راستے سے پلٹ آیا۔

برہمن آباد کے قریب معرکہ داروگیر گرم ہوا۔ جب برہمن آباد کی فوج پسپا ہونے لگی تو آکھم نے بھاگ کر جان

بچائی اور قلعے میں محصور ہو گیا۔

کسی کا قلعے میں محصور ہو جانا کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا چچ کو یہ نئی بات نکلنے لگی کیونکہ بے پناہ طاقت کے باوجود قلعہ فتح نہیں ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک سال گزر گیا۔ اب چچ کا فکر مند ہونا جائز تھا۔ کوئی ایسی نادریدہ طاقت تھی کہ قلعہ فتح نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے سپاہی رات کے وقت قلعے کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اس نے ارد گرد کے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی آسیب ہے؟ کسی نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ اسی تک دو دو میں اسے ایک آدمی ملا۔ اس نے ایک عجیب بات بتائی۔ اس نے بتایا کہ ایک بودھ راہب ہے جو بدھ کو کے نام سے مشہور ہے۔ وہ آکھم کے لیے جاب کر رہا ہے۔ یہ اس کی روحانی طاقت ہی کا اثر ہے کہ قلعہ فتح نہیں ہو رہا ہے۔

چچ کو اس راہب پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے اسی وقت قسم کھائی کہ اگر یہ قلعہ فتح ہو گیا تو میں اس راہب کی کھال کھنچواؤں گا۔

چچ کی اس قسم کا حال ”بدھ کو“ تک پہنچا تو وہ بے اختیار ہنسنے لگا اور آکھم سے کہا۔ ”چچ کی یہ مجال نہیں کہ وہ مجھے ہلاک کر سکے۔“

اس راہب کو ہر چیز پر اختیار ہو سکتا تھا لیکن موت اور زندگی تو اس کے اختیار میں نہیں تھی۔ ایک رات اچانک آکھم کا انتقال ہو گیا۔ راہب کو اس کی موت کا سخت صدمہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ایشور، چچ کے ساتھ ہے۔ ایسے اسباب مہیا ہوتے جا رہے ہیں کہ چچ کا قبضہ قلعے پر ہو جائے گا۔

اس نے حساب کتاب لگایا تو معلوم ہو گیا کہ یہ ملک یقیناً چچ کے قبضے میں چلا جائے گا۔ اس نے قلعہ چھوڑ دیا اور اپنے بنائے ہوئے مندر میں جا کر بیٹھ گیا۔

راہب کا قلعے سے جانا تھا کہ آکھم کا بیٹا جو باپ کی جگہ اس کا جانشین ہوا تھا، مغلوب ہو گیا۔

برہمن آباد کے برجوں پر چچ کا جھنڈا بلند ہو گیا۔ چچ نے آکھم کے لڑکے سریند کو وہیں رہنے کی اجازت دے دی اور خود بھی برہمن آباد ہی میں قیام اختیار کر لیا۔

اس قیام کے دوران اس نے آکھم کی بیوہ سے شادی کر لی اور تقریباً ایک سال تک اسی شہر میں رہنے کو ترجیح دی۔ وہ اپنی قسم بھولا نہیں تھا کہ راہب کی کھال کھنچوائے گا۔ صرف وقت گزرا رہا تھا تا کہ لوگ بھول بھال جائیں۔

ایک روز اس نے کچھ لوگوں سے پوچھا کہ وہ بڑا منتر کرنے والا پنڈت کہاں رہتا ہے۔ لوگوں نے اس کے مندر کا پتا بتا دیا، چچ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہوا۔ ان جوانوں کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ میں اس راہب سے ملوں گا۔ اس سے باتیں کروں گا اور جب اشارہ کروں تو جھپٹ پڑنا اور بلا تامل اس کا سراڑا دینا۔

چچ جب راہب کے مندر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا راہب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا اپنی عبادت میں مشغول ہے۔ اس کے ہاتھ میں گندھی ہوئی مٹی تھی۔ اس مٹی سے وہ بت بناتا تھا اور ایک مہر جیسی چیز اس پر لگاتا جاتا تھا، جس کی وجہ سے بتوں پر گوتم بدھ کی تصویر نقش ہو جاتی تھی۔

چچ اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا لیکن اس نے راہب کی عبادت میں دخل نہیں دیا۔ اس کے پاس خاموش کھڑا رہا۔ راہب نے بھی اس کی طرف مطلق توجہ نہیں دی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس نے سر اٹھا کر چچ کی طرف دیکھا۔

”سیلاج بھگت کا بیٹا آیا ہے۔“ راہب نے کہا۔

”ہاں اے عبادت گزار پروہت۔“

”کیوں آئے ہو؟“

”میں تم سے عقیدت رکھتا ہوں اور تمہیں دیکھنے آیا ہوں۔“

”صاف صاف بتاؤ کیا کام ہے؟“

”میں چاہتا ہوں تم قلعے میں واپس آ جاؤ۔ میں تمہیں اپنا مشیر بناؤں اور بعض کام تمہارے سپرد کروں۔“

”مجھے تیری حکومت سے کیا سروکار۔ مجھے حکومتی کاموں سے کوئی رغبت نہیں۔“

”اگر رغبت نہیں تو برہمن آباد کے قلعے میں میرا مقابلہ کیوں کیا تھا؟“

”میں نے جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ صرف صبر کی تلقین کرتا رہا اور طرفین کے درمیان صلح کی دعا کرتا رہا۔ اس کے سوا میرا کوئی کام نہیں تھا کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ دنیاوی کاموں سے بہتر عبادت اور نجات کی طلب ہے۔ تو کیوں مجھے پریشان کرنے آ گیا؟“

”تم نے ٹھیک کہا۔“ چچ نے کہا۔ ”بدھ کی بندگی زیادہ بہتر ہے۔ تمہاری کوئی حاجت ہو تو مجھ سے بیان کرو۔“

”میں اسے پورا کرنا سعادت سمجھوں گا۔“

”میری کوئی دنیاوی غرض نہیں۔“

”کوئی دینی خدمت؟“

”میرا مندر جیسا کہ تو دیکھ رہا ہے بہت قدیم اور خستہ

ہے، اس کی عمارت از سر نو تعمیر کرادے۔“

”میں بہت جلد اپنے آدمی بھیج کر اس کی مرمت کراؤں گا۔“

چچ نے اپنے آدمیوں کو کوئی اشارہ نہیں کیا کہ وہ راہب کو قتل کرتے۔ راہب کے پاس سے اٹھ کر باہر آیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔

اس کے وزیر نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”آپ تو اس راہب کو قتل کرنے کے ارادے سے آئے تھے مگر ملاقات ہوتے ہی اس پر فریفتہ ہو گئے۔ اس کی عبادت گاہ تک تعمیر کرانے پر راضی ہو گئے۔“

چچ نے چلتے چلتے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور وزیر سے مخاطب ہوا۔ ”اگر تو کسی سے نہ کہنے کی قسم کھائے تو میں تجھ پر ایک بھید ظاہر کروں؟“

”کیسا بھید عظیم راجا۔“

”جس وقت میں راہب سے باتیں کر رہا تھا میں نے وہاں ایک ایسی چیز دیکھی جسے میں جادوگوں یا اس راہب کی کرامت۔ اس راہب کی پشت پر مجھے ایک دیونظر آیا جو اپنا آبدار برچھا میری طرف تانے کھڑا تھا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر میں نے جنبش کی تو وہ یہ برچھا میرے سینے میں اتار دے گا۔ مجھے راہب کو قتل کرنے سے زیادہ اپنی جان کی فکر پڑ گئی تھی۔“

چچ نے اس ہیبت ناک واقعے کے بعد راہب کا پیچھا چھوڑ دیا اور قلعے میں واپس آ کر رعایا کو مطلع بنانے کے لیے بعض اہم قدم اٹھائے۔

جاٹوں اور لوہانوں میں بغاوت اور سرکشی کا جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان کو مغلوب کرنے کے لیے قوانین جاری کیے۔ حکم نامہ جاری کیا کہ مصنوعی تلواریں کے سوا اصلی تلواریں نہ پائیں۔ ریشم کے زیر جامے نہ پہنیں۔ اوپر کے کپڑے ریشمی پہن سکتے ہیں لیکن صرف سرخ یا سیاہ رنگ کے ہوں۔ گھوڑوں پر زین نہ رکھیں، نگلی پیٹھ پر سوار ہوں۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں رہا کریں۔ آکھم کے بیٹے سر بند کی ہمیشہ اطاعت کریں۔ ملک پر غنیمت حملہ کرے تو سر بند کے ساتھ مل کر لڑیں۔

ان انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد وہ کرمان کی طرف بڑھا۔ کرمان پر ایرانیوں کا قبضہ تھا اور اس سے دولت سندھ کی سرحدیں ملی ہوئی تھیں۔

ایران کا بادشاہ کسری بن ہرمز مرچکا تھا اور زمام حکومت ایک عورت کے ہاتھوں میں تھی۔ اس عورت کا نام

بوران دخت بتایا جاتا ہے۔ یہ عورت تخت پر بیٹھ ضرور مگی تھی لیکن اس میں انتظامی صلاحیتیں نہیں تھیں۔ امرا اور اراکین حکومت کے کام چلا رہے تھے جن میں ہمیشہ آپس میں اختلافات رہتے تھے۔ آپس کے تنازعات نے سلطنت کو آخری ہچکیاں لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

چچ کو کرمان کی اس نازک حالت کا علم ہوا تو اسے یقین ہو گیا کہ دولت عجم اس کی مزاحمت نہیں کر سکتی اگر وہ حملہ کر دے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں ہوگا۔

رانی سوہمن دیوی اب تین بچوں کی ماں بن گئی تھی لیکن چچ سے اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ راجا بننے کے بعد چچ کو اردوڑ میں رہنے کا بہت کم موقع مل سکا تھا۔ رانی اس پر بجا طور پر فخر کر رہی تھی کہ اس نے نہ صرف رانی کے سابق شوہر کی حکومت کی حفاظت کی تھی بلکہ اسے وسیع بھی کر دیا تھا۔ وہ تو ساری دنیا کی طرح یہ سمجھ رہی تھی کہ چچ ایک برہمن ہے، وہ حکومت کو کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکے گا لیکن

چچ نے سب کے اندازے غلط ثابت کر دیے تھے۔ وہ ناقابل شکست راجا بن کر ابھرا تھا۔ گرد و نواح کا کوئی راجا اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکا تھا، منتظم بھی ایسا تھا کہ جو علاقے اس نے فتح کر لیے وہاں دوبارہ کسی کو بغاوت کا خیال تک نہیں آیا۔ یہ فخر و اعزاز اپنی جگہ لیکن اس کی محبت کا تقاضا تھا کہ چچ اس کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس کی آنکھیں چچ کے دیدار کی عبادت میں مصروف رہیں لیکن اب وہ یہ سن رہی تھی کہ چچ کرمان کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اسے روک نہیں سکتی تھی لیکن اس سے گلہ تو کر سکتی تھی۔

”چچ پیارے، تمہیں یاد ہے میں نے کتنی محنت سے تمہیں حاصل کیا تھا۔“

”حاصل کیا تھا یا فتح کیا تھا؟“

”فتح تو تم نے مجھے کیا ہے۔ اپنی شرافت اور نیکی سے۔“

”چلو، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو فتح کیا ہے لیکن اس وقت کون سا موقع ہے یہ بات چھیڑنے کا۔“

”میں سوچتی ہوں میں رانی نہ ہوتی اور تم راجا نہ بنے ہوتے تو ہم کتنے خوش ہوتے۔ تم جب سے راجا بنے ہو میرے ساتھ کتنا کم وقت گزارا ہے۔“

”کیا تم اس سے خوش نہیں کہ آج میں ناقابل شکست راجا ہوں۔ پورا سندھ ایک راجا کے ماتحت ہے اور وہ میں ہوں۔“

”تم ناقابل شکست ہوئے لیکن میں تو شکست کھا

گئی۔“

”رائے ساہی سے تمہارے کوئی اولاد نہیں تھی۔ میں نے تمہیں دو شہزادے دیے ہیں جو میرے بعد تخت نشین ہوں گے اور تم رانی ماں کہلاؤ گی، یہ تمہاری شکست نہیں فتح ہے۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اردوڑ میں یہاں میرے پاس رہو۔ اب کہیں باہر نہ جاؤ مگر تم یہاں کیوں رہو گے۔“

”برہمن آباد میں آکھم لوہانہ کی بیوہ سے بیاہ جو چاہیو۔“

”مجھے طے مت دو سوہمن دیوی۔ راجاؤں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ محل کی مٹی بنے رہیں۔ مزدور، مزدوری کرتا ہے تو روٹی کھاتا ہے۔ راجا علاقے فتح کرتا ہے تو راجا کہلاتا ہے۔“

”اب سنا ہے تم کرمان جا رہے ہو۔“

”ایران کی حکومت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانا ہی دانش مندی ہے۔ ایران والے

سندھ کے قدیم راجاؤں پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ اب ان سے بدلہ لینے کا اچھا موقع ہے۔“

”اگر آپ کا جانا اتنا ہی ضروری ہے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ مجھ سے اب آپ کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔“

”ایسا کبھی ہوا ہے۔ جنگ میں عورتوں کا کیا کام؟“

”ایران میں ایک عورت حکومت کر سکتی ہے، تو کیا میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔“

”سندھ میں کبھی ایسا نہیں ہوا ہے البتہ میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس مہم سے واپسی کے بعد بھی اردوڑ سے باہر نہیں جاؤں گا۔“

”آپ اس جنگ سے واپس آئیں تو کیا خبر آپ سے میری ملاقات ہی نہ ہو۔“

”ایسور جو کرے گا اچھا کرے گا۔ ابھی تو مجھے خوشی خوشی رخصت کرو۔“

راجا چچ نے ایک زبردست فوج ہمراہ لی۔ پنڈتوں سے مارک گھڑی دریافت کی اور اردوڑ سے نکلا۔ رانی نے بھی آنکھوں سے اسے رخصت کیا۔

اس کی فوج کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ چچ ایسے نامور حکمران نے انہیں مالامال کر دیا تھا۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ چچ کے ہمراہ کوئی غیبی طاقت ہے جو اسے ہر معرکے میں فتح یاب کرتی ہے۔ یہی فتح کا نشانہ نہیں اردوڑ سے دور لیے جا رہا تھا۔

سب سے پہلے چچ ارمانیل (ارمن بیلہ) پہنچا۔ یہ موجودہ لیبیلہ کا ایک مشہور شہر تھا جو ساموندی کے ساحل کے قریب تھا۔ یہاں کا راجا بدھ مذہب کا ماننے والا تھا۔ یہ

خدارا © خدارا شوگر مریض ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہتا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبہ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP دی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0308-6627979
0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

چچ نے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ آگے کیوں نہیں بڑھا۔ معاہدے کی تکمیل کے بعد وہ اروڑ واپس آ گیا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی معلوم ہو گیا کہ وہ آگے کیوں نہیں بڑھا تھا۔ پورا شہر سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی عاشق اس کی رانی سوہن دیو سے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ”آپ اگر جنگ سے واپس آئیں تو کیا خبر ملاقات ہی نہ ہو۔“

اس کے جواب میں چچ نے کہا تھا، اس مہم کے بعد اروڑ چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ اس نے بھی اپنا عہد پورا کیا، وہ پھر بھی اروڑ سے باہر نہیں گیا اور ایک مدت کے بعد چالیس سال کروڑ سے حکومت کرنے کے بعد 660ء میں چچ اپنی رانی کے پاس پہنچ گیا۔

یہی وہ چچ تھا جس کی اولاد میں سندھ کا مشہور راجہ داہر ہو کر رہا ہے۔

”اچھا ایک بات بتاؤ۔“ سی ہرس نے کہا۔ ”چچ بھی تو ایک برہمن تھا۔ جدی پستی راجا نہیں تھا پھر اس سے ایسی بہادری کے کارنامے کیسے سرزد ہو گئے اور چندر سے کیوں نہ ہوں گے؟“

”چچ کی پشت پر رانی موجود تھی جواب نہیں رہی۔ دوسری بات یہ کہ چندر کا رجحان بد مذہب کی طرف ہے۔ اس نے لوگوں کو بزور شمشیر مجبور کیا ہے کہ وہ بد مذہب اختیار کریں۔ لوگ اس سے خوش نہیں ہیں۔ چچ نہایت سخی تھا۔ لوگ انعام کے لالچ میں اس کے ساتھ رہا کرتے تھے اور اس کے لیے جان دینے پر آمادہ تھے۔ چندر کا اٹھنا، بیٹھنا پجاریوں کے ساتھ ہے۔“

ان باتوں کو سننے کے بعد سی ہرس کے دل میں سندھ کو فتح کرنے کی خواہش بیدار ہو گئی۔ اس نے اپنے بھائی کسان کے بیٹے ہرماں کو سپہ سالار بنایا اور سندھ کی مہم پر روانہ کیا۔ یہ فوج چندر کے علاقے پر حملہ کرنے کے لیے دریائے ہاسی کے کنارے خیمہ زن ہوئی اور چندر کے ایک قلعہ دیو پورہ پر یہ آسانی قبضہ کر لیا۔ اس قلعے میں جو تھوڑی سی فوج تھی، وہ لشکر عظیم دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہاں سے آگے بڑھے اور ایک مقام ”بندکا ہویا“ پر پہنچ کر راجا چندر کے پاس ایک سفارت بھیجی۔

”نوراً حاضر ہو کر اطاعت قبول کرو۔“

چندر نے اس کے باوجود کہ اسے جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا، اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور قلعہ بند ہو کر مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چچ کے بیٹے دھرسین کو نہایت عجلت میں برہمن آباد کی طرف بھیجا اور چچ کے چھوٹے بیٹے داہر کے ساتھ مل کر قلعہ اروڑ کی حفاظت کا

چچ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھائی چندر کو اروڑ کا حاکم بنا دیا تھا (آج اس نام کا ایک گاؤں قصبہ روہڑی سے جنوب مشرق میں پانچ میل کے فاصلے پر اسی قدیم جگہ آباد ہے)۔

چچ کی وفات ہوئی تو چندر کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ چچ کے دونوں بیٹے دھرسین اور داہر چچا کے احترام میں خاموش تھے۔ امرا کو یہ خیال تھا کہ چچ کی وفات کے ساتھ ہی چھپے ہوئے دشمن سامنے آ جائیں گے۔ جگہ جگہ سرکشی اور بغاوت سراٹھائے گی۔ ان فتنوں سے نمٹنے کے لیے ایک تجربہ کار راجا کی ضرورت ہے۔ یہ اوصاف چندر میں ہیں۔ وہ ایک مدت سے اروڑ کا حاکم چلا آ رہا ہے۔ اس کے انتظامات سے سب متفق تھے لہذا انہوں نے بھی یہی چاہا کہ چندر کو راجا تسلیم کر لیا جائے اور چندر تخت نشین ہو گیا۔

اس کے تخت پر بیٹھتے ہی امرا کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ چچ نے جب سیوستان پر حملہ کیا تھا، وہاں کا حاکم سیوستان سے بھاگ کر ہندوستان کے راجا کے پاس چلا گیا تھا۔ چچ کے خوف سے وہ اب تک خاموش تھا لیکن اس نے جیسے ہی سنا کہ چچ کا انتقال ہو گیا ہے تو اسے چچ سے اپنی شکست یاد آئی۔ وہ اب تک چھپا بیٹھا تھا لیکن اب سامنے آیا۔ اسے کسی ایسے راجا کی تلاش ہوئی جو اس کی مدد کر سکے۔ وہ قنوج کے راجا سی ہرس کے دربار میں پہنچ گیا اور سندھ کے حالات سے اسے واقف کیا۔

”میں اب تک چچ کے خوف سے روپوش تھا لیکن اب وہ مر چکا ہے۔ اس کی جگہ اس کا بھائی چندر تخت نشین ہوا ہے۔“

ہندوستان کے راجا سی ہرس رائے کے حاکموں کی اولاد میں سے تھا جسے اس کی دیانت داری کی وجہ سے وہاں متعین کیا گیا تھا لیکن بعد میں وہ سرکشی اختیار کر کے خود مختار ہو گیا تھا۔ اس راجا کو چچ کی آمد کا علم ہوا تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا کہ شہر سے باہر نکل کر چچ کا استقبال کرے اور اس کے احترام میں سواری چھوڑ دے۔ چچ کو بھی اس کی یہ ادا اچھی لگی۔ چچ اس سے اتحاد باہمی اور موانست کا عہد لے کر آگے بڑھا۔ راستے میں جو سردار ملے انہوں نے اس کی اطاعت قبول کی۔ آگے بڑا دشوار گزار راستہ تھا۔ پہاڑوں کے درمیان سے گزرنا تھا۔ بھول بھلیوں کی طرح بکھرے ہوئے راستے تھے۔ سراٹھائے نوکیلے پتھروں پر چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ دھوپ ان راستوں پر آنا بھول گئی تھی۔

ان پہاڑوں سے بہ وقت تمام گزرنے کے بعد وہ ایک پرانے قلعے میں پہنچا کٹر پور پہنچا جسے عرب فنر پور کہتے ہیں اور عبدالحمید شہر نے اس کا تلفظ کتار پور کیا ہے۔

اس پرانے قلعے کو اس نے از سر نو تعمیر کرایا اور ہندوستانی رواج کے مطابق اس میں نوبت رکھوائی یعنی پانچ سازوں والی نوجو ہندوانہ رسم کے مطابق شام کو اور صبح صادق کے وقت بجائی جاتی تھی۔

اس سے آگے بڑھ کر اس دریا کے کنارے خیمہ زن ہوا جو کرمان و کرمان کے درمیان بہتا ہے۔ یہاں کھجور کے درخت لگا کر اپنی مشرقی سرحد قائم کی جو ایران و سندھ کو علیحدہ کرتی تھی۔ یہاں ایک تختی لگوائی جس پر تحریر تھا۔

”یہ چچ بن سیلاج بن بسا کے زمانے میں قائم ہوئی۔“

یہی حد اس وقت تک قائم ہے۔

کھجور کے یہ درخت اس کی قائم کردہ سرحد کی نشاندہی کر رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھتا اور خوش ہوتا رہا۔ پھر ارماتیل واپس آیا۔ علاقہ توران کو طے کرتا ہوا ریگستانی سرزمین میں پہنچا۔ اب کسی میں اس سے مقابلے کی جرأت نہیں تھی یہاں سے وہ قذاتیل (جس سے قندھار عبارت ہے) ہوتا ہوا دریائے سیست کے کنارے خیمہ زن ہو گیا۔ وہ اس شہر پر دفعتاً حملہ آور ہونا چاہتا تھا مگر اس شہر کے رہنے والے قلعہ بند ہو گئے۔ اس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ کئی مہینے کے محاصرے کے بعد ان لوگوں نے مجبور ہو کر اطاعت قبول کی۔ چچ نے سالانہ سو نچر اور ایک لاکھ درہم سالانہ خراج دینے کا وعدہ لیا۔ ان لوگوں نے ایک سال کا خراج پیشگی ادا کیا اور جان چھڑائی۔

بندوبست کیا۔

سی ہرس کی فوج کو یہ تمام خبریں مل رہی تھیں۔ چندر کی فوجی تیاریوں کو دیکھ کر ان کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ حملہ آور ہوتے۔ چچ کا خوف غالباً اس کے مرنے کے بعد بھی طاری تھا کہ یہ فوج لڑے بغیر ہی واپس ہوگئی۔

اگلے سات برسوں تک کسی کی ہمت نہ ہوئی جو چندر پر حملہ آور ہوتا۔ حملہ کیا تو موت نے۔ چندر اس حملے سے بچنے کے لیے کوئی تیاری نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ یہیں چھوڑ کر پر لوک سدھار گیا۔

چندر کے مرتے ہی چچ کی چھوڑی ہوئی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اروڑ میں چچ کا لڑکا داہر تخت نشین ہوا (اروڑ شمالی سندھ میں روہڑی کے قریب تھا) برہمن آباد میں داہر کے بڑے بھائی دھرسینہ نے تخت پر قبضہ جمالیا۔

داہر نے تخت سنبھالتے ہی سندھ کا دورہ شروع کیا تاکہ ملکی حالات سے واقف ہو کر انتظامات کی دیکھ بھال کر سکے۔ پہلے وہ مشرقی سرحد تک گیا پھر مغربی سرحد پر پہنچا۔ برہمن آباد بھی گیا اور دھرسینہ کی حکومت کی توثیق کی۔ اس کی بہن مائیں رانی برہمن آباد میں دھرسینہ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ داہر نے دھرسینہ کو ہدایت کی کہ وہ مائیں رانی کی شادی کی فکر کرے۔

”ہم دونوں بھائی اپنے اپنے تخت کے وارث ہو چکے۔ یہ کسی طرح بھی اچھا نہیں لگتا کہ دو بھائیوں کے ہوتے ہوئے مائیں رانی کنواری بیٹھی رہے۔ تم اس کی شادی کا بندوبست کرو۔“

یہ ہدایات دے کر داہر مکران پہنچا۔ یہاں چند دن ٹھہر کر کرمان کے بادشاہ سے، جس کی سرحد سندھ سے ملتی تھی، خیر سگالی کے معاہدے کیے۔ کھجور کے ان درختوں کو دیکھا جو چچ نے سرحد کے نشانی کے طور پر لگوائے تھے۔

ان انتظامات سے فارغ ہو کر وہ اروڑ آ گیا۔ مائیں رانی بڑے بھائی دھرسینہ کے پاس برہمن آباد میں تھی کہ بھائیہ کے راجا کا مائیں کے لیے شادی کا پیغام آیا۔ اس سے اچھی کیا بات تھی کہ وہ ایک راجا سے بیاہی جا رہی تھی۔ دھرسینہ نے یہ پیغام قبول کر لیا۔

بھائیہ نے جہیز میں ایک قلعہ طلب کیا تھا۔ دھرسینہ نے اس کا یہ مطالبہ بھی مان لیا۔ سامان جہیز تیار کیا اور داہر کے پاس مائیں کو سات سو گھوڑوں اور پانچ سو ٹھاکروں کے ساتھ بھجوا دیا۔ داہر کو یہ بھی لکھا کہ وہ مائیں کو بھائیہ کی طرف

ردانہ کر دے اور ایک قلعہ بھی بھائیہ کے حوالے کر دے جس کا دینا شادی کے موقع پر طے ہو چکا ہے۔ مائیں کے اروڑ پہنچنے پر داہر بہت خوش تھا۔ اس نے بھی زیادہ خوش اس بات پر تھا کہ مائیں کی شادی ہو رہی ہے۔ اس نے نجومیوں کو بلوایا تاکہ بہن کا زائچہ بنوا سکے۔ نجومیوں نے زائچہ بنایا۔

”مائیں رانی کے زائچے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اس سے شادی کرے گا وہ سندھ کے تاج و تخت کا مالک ہوگا اور ہمیں اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مائیں رانی سے سے باہر نہیں جائے گی۔“

یہ سن کر داہر سخت پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنی پریشانی نجومیوں پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ انہیں انوکھا کرام عطا کر کے رخصت کیا۔

نجومیوں کو رخصت کرتے ہی اس نے وزیر مملکت طلب کیا اور اپنی پریشانی اس پر ظاہر کی۔

”زائچے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مائیں کی شادی جس شخص سے ہوگی وہ سندھ کا مالک بن جائے گا۔ شاید ہو کہ وہ میرے تخت پر قبضہ کر لے گا۔ کیا میں اتنی بڑی سلطنت چھوڑ دوں۔ میں کسی دوسرے کو اس ملک کا بادشاہ بننے ہونے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ اب تو یہی بتا مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں اپنی سلطنت کیسے بچاؤں؟ وہ جس سے شادی کرے گی وہی سندھ کا مالک ہوگا۔ زائچہ تو یہی بتاتا ہے۔“

وزیر نے ڈرتے ڈرتے مشورہ دیا۔ ”مہاراج! بادشاہ اپنے تخت سے جدا ہو کر قطعی اچھا نہیں لگتا، میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا کہ مملکت سے جدا ہو جائیں۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ داہر نے کہا۔ ”زائچہ تو یہ کہتا ہے کہ جو اس سے شادی کرے گا وہی سندھ کا بادشاہ ہوگا۔ اس کی شادی نہ ہونے دوں تو بھی اندیشہ ہے میری سلطنت جاتی رہے۔ اس کی شادی کر دوں تو اس کا شوہر تخت کا مالک ہوگا۔ دونوں صورتوں میں نقصان تو میرا ہی ہے۔“

”مہاراج! ایک مشورہ دوں لیکن محل سے سنبھلے گا اگر ناپسند ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ مشورہ یہ ہے کہ آپ دنیا کو دکھانے کے لیے اپنی بہن سے شادی کر کے اس اپنے ساتھ تخت نشین کر لیں لیکن ازدواجی تعلقات قائم نہ کریں۔ دنیا کے سامنے وہ آپ کی بیوی اور خلوت میں بہن ہو، اس طرح وہ آپ کی بیوی کہلائے گی اور سندھ کا تاج و تخت آپ کے پاس رہے گا۔“

وزیر سے بات کرنے کے بعد داہر نے اپنے

مرداروں اور امرا کو طلب کیا اور ان کے سامنے نجومیوں کا زائچہ اور وزیر کی رائے بیان کی۔ وزیر کی رائے کو سن کر امرا نے بڑی ناگواری کا اظہار کیا اور داہر کا ادب بالائے طاق رکھ کر اس کو اس برے ارادے سے روکنے کی کوشش کی۔

”یہ بہت بڑا پاپ ہے جو آپ کرنے جا رہے ہیں۔ ہمارا مذہب بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ سارے ملک میں بدنامی ہوگی۔ ہر طرف فتنے برپا ہو جائیں گے۔ سندھ میں آج تک ایسا نہیں ہوا۔ لوگ اسے تعجب اور غصے سے دیکھیں گے۔“

کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وزیر، داہر کو قائل کرنے کے لیے کیا جال چل رہا ہے۔ اس نے ایک بھیڑ کے بالوں میں مٹی ڈال کر رانی ڈالی اور اس پر دو تین روز تک خوب مٹی چھڑکتا رہا، پانی ڈالنے سے اس رانی کی کونٹیں پھوٹ گئیں۔ اس نے اس بھیڑ کو بازار میں چھوڑ دیا۔ اس عجیب و غریب بھیڑ کو دیکھ کر لوگوں کو سخت حیرت ہوئی۔ اسے دیکھنے کے لیے لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ وہ جدھر سے گزرتی، لوگوں کا مجمع اس کے ساتھ ساتھ چلتا۔ بچوں کو بھی خوب تماشا ہاتھ لگ گیا۔ لوگوں میں چرچے بھی خوب ہوئے لیکن یہ چرچے چند روز ہی رہا۔ لوگوں کے لیے یہ عام سی بات ہوگئی۔ پھر وہ بھیڑ بازاروں میں ماری ماری پھرتی تھی، کوئی اس کی طرف نہ کھٹکھٹانا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

وزیر، داہر کے پاس گیا اور بھیڑ کا پورا واقعہ سنا کر اس نے کہا۔ ”دنیا میں کتنا ہی غیر معمولی واقعہ ہو جائے، لوگ اسے چند روز ہی یاد رکھتے ہیں پھر اسے بھول کر اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ آپ اگر مائیں رانی سے شادی کر لیں گے تو چند روز ہی چرچا ہوگا اور پھر لوگ اسے بھول جائیں گے لہذا میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اپنی بہن سے شادی کر کے اپنی سلطنت بچالیں۔“

راجا داہر کی نیت میں پہلے ہی فتور آ چکا تھا، وزیر کی دی ہوئی اس مثال نے اسے اپنے ارادے میں مزید پختہ کر دیا۔ اس نے پنڈتوں کو بلوایا اور انہیں حکم دیا کہ میرے اور مائیں کے درمیان گتھ بندھن کی رسم ادا کر دی جائے۔

راجا کا حکم تھا، نہ پنڈت انکار کر سکے نہ مائیں نے انکار کیا۔ داہر کی دھوتی کے کونے سے مائیں کی اوڑھنی کا پلو باندھ دیا گیا۔ اس طرح نجومیوں کی بات رہ گئی اور دونوں کی شادی ہوگئی۔

شادی کی یہ رسم خاموشی سے ادا کی گئی تھی لیکن پورے

سینس ڈائجسٹ 41 ستمبر 2012

ملک میں اس کا چرچا ہو گیا۔ جس نے بھی سنا وہ سر جھکا کر خاموش ہو گیا کہ داہر سے ایسا شرمناک فعل سرزد ہوا ہے۔ یہ خبر برہمن آباد پہنچی تو اس کے بھائی دھرسینہ کو بہت افسوس ہوا۔ اس نے فوراً داہر کے نام خط لکھا اور اپنے غصے کا اظہار اس طرح کیا۔

”تم نے یہ کام اتنا برا کیا ہے کہ ہمارے خاندان کی عزت خاک میں مل گئی۔ تمہارے لیے یہ ہرگز مناسب نہ تھا۔“ داہر نے اس خط کے جواب میں اپنے اس فعل کی وضاحت کی۔

”یہ شادی میں نے رکی طور پر نجومیوں کے کہنے سے کی ہے، ورنہ خدا جانتا ہے کہ میں آج بھی مائیں کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔“

دھرسینہ کی طرف سے پھر جواب آیا۔ ”تم شاید اس تدبیر سے تقدیر کو بدلنا چاہتے ہو لیکن جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اب بھی وقت ہے کہ تو بہ کر کے اس بدنامی کو دور کرو۔“

داہر نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اب طے کر لیا کہ داہر پر حملہ کرے گا۔ وہ ایک فوج لے کر داہر کے مقابلے کے لیے اروڑ کی طرف روانہ ہوا۔ داہر کو اطلاع ہوئی تو اس نے بھی لشکر تیار کیا اور دھرسینہ کا انتظار کرنے لگا۔

دھرسینہ یلغار کرتا ہوا اروڑ پہنچ گیا۔ دھرسینہ کے پہنچنے ہی قلعے کے دروازے بند کر دیے گئے۔ دھرسینہ قلعے کے دروازے پر پہنچا اور دربانوں کو حکم دیا کہ دروازہ کھولو لیکن دربانوں نے یہ کہہ کر دروازہ بند رکھا کہ داہر کا حکم نہیں ہے۔ دھرسینہ نے داہر کو پیغام بھیجا کہ میں جنگ کرنے نہیں آیا ہوں۔ تم بھی جنگ سے گریز کرو اور قلعہ میرے حوالے کر دو۔ داہر کی طرف سے پیغام آیا۔ ”تم قلعے کے اندر نہیں آ سکتے۔ باہر جا کر خیمہ زن ہو جاؤ اور اپنے قابل اعتماد لوگوں کو بھیجنا کہ میں ان سے بات چیت کروں۔“

دھرسینہ نے جب دیکھا کہ داہر جنگ کے لیے تیار ہے اور اسے یہ مروت قطعی نہیں ہے کہ میں اس کا بھائی ہوں تو اس نے دریائے سندھ کے اس طرف جا کر پڑاؤ ڈال لیا اور اپنے معتمد پن سے مشورہ کرنے لگا کہ داہر کو گرفتار کرنے کی کیا تدبیر کرنی چاہیے۔

دوسری طرف داہر اپنے وزیر سے مشورہ کر رہا تھا کہ اسے بھائی کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے یا نہیں؟ وزیر نے اس کی مخالفت کی۔

”آپ کو دھرسینہ کی نرم گفتاری پر یقین نہیں کرنا

سینس ڈائجسٹ 40 ستمبر 2012



جدائیں

طاہر حبیب ویداع

کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کچھ لمحات ایسے مقدر میں رقم کرتا ہے جو کسی کے لیے بھی سرمایہ حیات ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اپنے گھن گلیوں اور رستوں سے محبت کرنے والے اپنی مٹی سے کبھی جدا ہونے کو تیار نہیں ہوتے مگر جب... یہ جدائی ناگزیر ہو جائے تو وہ ایک ایک منظر کو اپنے دل کی دنیا میں نقش کر لیتے ہیں۔ وہ بھی جب آخری بار اس بستی میں مقیم ہوا تو لہو قطرہ قطرہ بن کر دل کی سرزمین پر زیر و بم پیدا کرتا رہا اور... جدائی پر چھائیں بن کر ساتھ رہی۔

عہد گزشتہ سے چند خوشگوار لمحات کشید
کرنے والے ایک دیوانے کا قصہ

زندگیوں کے بہت سے گوشے تاریکی میں تھے۔ میری عمر قریباً 23 سال تھی اور میں ابھی غیر شادی شدہ تھا۔ عدنان مجھ سے دو تین سال چھوٹا مگر شادی شدہ تھا۔ ابھی جب عدنان رومانی معاملات کا ذکر کرتا تو میں اسے بتاتا کہ میری رومانی

عدنان حال ہی میں میرا دوست بنا تھا۔ بس سال ڈیڑھ سالہ تعلق تھا ہمارا۔ تاہم اس مختصر عرصے میں ہی وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے ماضی اور حال کے بارے میں کافی کچھ جان گئے تھے لیکن ابھی ہماری

داہر اپنی خوشی سے ہاتھی پر سوار ہوا تھا لیکن جب کے دروازے کے قریب پہنچا تو خوف زدہ ہو گیا۔ دھرسینہ مجھے حیلے بہانے سے تو ساتھ نہیں لے جا رہا ہے خیال آتے ہی وزیر سے آہستہ سے کہا۔

”مجھے قلعے سے باہر جانے میں خوف ہے۔ تم بتا اب میں کیا کروں؟“

”آپ جب دروازے سے گزرنے لگیں تو چوک پکڑ کر لٹک جائیے گا۔ ہاتھی آگے بڑھ جائے گا۔ بعد میں آپ کو اتار لیا جائے گا اور قلعے کا دروازہ بند کر دیا جائے گا۔“

داہر نے اس مشورے پر عمل کیا اور چوکٹ پکڑ لٹک گیا۔ ہاتھی نے دروازہ پار کر لیا جس پر اب دھرسینہ اٹھ بیٹھا تھا۔ باہر نکل کر دھرسینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو داہر ہاتھ پر نہیں تھا اور دروازہ بند تھا۔ دھرسینہ کو اپنی ناکامی پر سخت کوفت ہوئی۔ وہ بڑی ترکیب سے داہر کو نکال لایا تھا لیکن داہر ہاتھ سے نکل گیا۔

دھرسینہ اس طرف سے مایوس ہو کر اپنی قیام گاہ کی طرف لوٹ گیا لیکن سخت مایوس تھا۔ اس صدمے کا اثر تھا شدید گرمی کا کہ خیمے میں پہنچتے ہی اسے سخت بخار چڑھ گیا اور چوتھے دن اس کا انتقال ہو گیا۔ داہر کو خبر ہوئی تو اس نے تصدیق کے لیے اپنے جاسوس بھیجے۔ جب اسے یقین ہوا تو وہ خود وہاں گیا۔ اس کے کرایا کرم کا انتظام کیا اور اس کے خزانے پر قبضہ کر لیا۔ دھرسینہ کے لشکر نے اس کی فرما برداری اختیار کی۔

داہر ایک ماہ اروڑ میں گزارنے کے بعد برہمن آ گیا۔ یہاں ایک سال قیام کیا۔ اس عرصے میں یہاں کے تمام لوگوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔

راجا داہر کو اب ہر طرف سے اطمینان تھا۔ اس نے بہن سے شادی کر کے اپنی دانست میں اپنی سلطنت کو بچا تھا لیکن یہ داغ بھی اسی کو لگنا تھا کہ خلافت عرب سے مخالف ہو گئی۔ محمد بن قاسم یہاں آیا اور ارض سندھ میں ہندو سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

بہن سے شادی کے باوجود ارض سندھ کا مالک کوئی نہ بن سکا اور ہو گیا۔

چچ کی بنائی ہوئی سلطنت اس کے بیٹے کے ہاتھوں میں ہو گئی!

چاہیے۔ وہ یہ چالیں آپ کی گرفتاری کے لیے چل رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ وہاں جائیں اور آپ کو نقصان ہو۔ میرا مشورہ ہرگز یہ نہیں ہوگا کہ آپ اس کے پاس جائیں۔“

ابھی داہر کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ دھرسینہ نے اس کی خدمت میں پھر ایک پیغام بھیجا۔

”میں تمہارے اعتماد کی خاطر قلعے کے دروازے پر تنہا آؤں گا اور تم لشکر کے ساتھ قلعے سے باہر آنا۔ ہم دونوں بھائی ہیں۔ کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

دوسرے دن وعدے کے مطابق دھرسینہ نے قلعے کے دروازے پر پہنچ کر اطلاع دی۔ داہر نے حکم دیا کہ قلعے کا دروازہ کھول کر دھرسینہ کو اندر لایا جائے۔

جب دھرسینہ قلعے کے اندر آچکا تو وزیر نے ایک مرتبہ پھر داہر کو بھڑکایا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دونوں بھائی آپس میں مل جائیں۔ داہر نے مائیں سے شادی چونکہ اس کے مشورے سے کی تھی اس لیے وہ خوف زدہ تھا کہ غلط فہمی دور ہونے کے بعد کہیں اسے سزا نہ دی جائے۔ اس نے داہر کو مشورہ دیا کہ دھرسینہ کو قتل کر دیا جائے۔

”مجھے دھرسینہ کے لشکر سے خبریں مل رہی ہیں کہ وہ آپ کو دھوکا دینے کی فکر میں ہے۔ اب جبکہ وہ قلعے میں آچکا ہے اور تنہا ہے تو اسے قتل کرادیں یا کم از کم قید کر لیں اور کسی مناسب معاہدے کے بعد رہا کریں۔“

داہر نے وزیر کا مشورہ نہیں مانا۔ اس عرصہ میں دھرسینہ داہر کے محل کے دروازے تک آ گیا۔ داہر اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھا اور اسے محل کے اندر بلاتا چاہا۔

”میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ تمہارے محل میں قدم نہیں رکھوں گا۔ بہتر یہ ہے کہ تم میرے ہاتھی پر سوار ہو جاؤ، ہم ایک ہی ہاتھی پر سوار ہو کر باہر چلیں گے تو خاص و عام کو تاثر ملے گا کہ ہم دونوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ کسی جگہ بیٹھ کر دیکھ سکھ کی باتیں کریں گے۔“

داہر نے اس کی تجویز کو بہ خوشی قبول کر لیا۔ دھرسینہ کے محل بان نے ہاتھی کو آگے بڑھایا۔ داہر ہاتھی پر سوار ہو گیا۔ دونوں ایک ہی ہاتھی پر روانہ ہوئے۔ داہر کا وزیر گھوڑے پر سوار ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

تاریخ سندھ، اعجاز الحق قدوسی۔ تاریخ سندھ، عبدالحلیم شرر۔ چچ نامہ، ترجمہ اردو۔

ساختات

زندگی دراصل تین دوستوں کی کہانی ہے۔ وہ ان تین دوستوں کے بارے میں جانتا چاہتا تھا مگر پتا نہیں کیوں، میں جو اس سے ہر معاملے پر کھل کر بات کر لیتا تھا اس معاملے پر بات کرتے ہوئے خاموشی سادھ لیتا تھا۔ کوئی دیواری میرے اور اس کے درمیان آ جاتی تھی..... لیکن پھر ایک دن ایسا آیا جب مجھ پر اداسی ٹوٹ کر برسی۔ دل کی رگیں غم کی یورش سے ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ مجھے لگا جیسے میرے گھر کی دیواریں مجھ پر ڈھسے جائیں گی اور میں زندہ دفن ہو جاؤں گا۔ اس روز شام چار بجے کے لگ بھگ میں نے عدنان کو ساتھ لیا اور ہم موٹر سائیکل پر سوار ہو کر چوہر جی کے قریب وینس سنیما میں پہنچ گئے۔ بڑا اداس ماحول تھا۔ کوئی ڈبا قسم کی اردو فلم لگی ہوئی تھی۔ پارکنگ میں اکاؤنٹ موٹر سائیکل اور سائیکل دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا کہ فلم میں کتنی دلچسپی لی جا رہی ہے۔ سنیما کے اندر کھانے پینے کی دکانیں بھی ویرانی کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ دہی بڑے کے اسٹال پر باہر چیزوں کے اوپر کھیاں بچھنا رہی تھیں اور ایک ادھیڑ عمر شخص انہیں بے دلی سے اڑانے میں مصروف تھا۔ سنیما کی عمارت کا رنگ و روغن اڑا ہوا تھا اور کئی جگہ سے پلاسٹر بھی جھڑتا نظر آتا تھا۔

اگلا شو شروع ہونے میں ابھی کافی دیر تھی ہم اوپر گیلری کی طرف چلے گئے اور وہاں موجود ایک طویل صوفے پر بیٹھ گئے۔ صوفے کی حالت بھی سنیما کی مجموعی حالت سے مختلف نہیں تھی۔ ”ریگ زین“ پھٹ چکا تھا۔ ایک دو جگہ سے اسپرنگ جھانک رہے تھے۔ ہمارے بیٹھنے سے وہ جیسے کراہ اٹھا۔ یہاں موجود سنیما کا چھوٹا سا اندرونی ریسٹوران بند پڑا تھا اور کاؤنٹر پر ایک بلی خاموش بیٹھی تھی۔ ہال کے اندر سے فلم کے ڈائلاگز کی مدھم آواز ابھر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”عدنان! تم نے کئی بار پوچھا ہے کہ میری رومانی کہانی کے تین کردار کون کون سے تھے۔ میں آج تمہیں انہی سے ملانا چاہ رہا ہوں۔ یہ دراصل تین گہرے دوستوں کی کہانی ہے۔ بہار کی ایک خوشگوار شام کو وہ تینوں دوست اسی جگہ اکٹھے ہوئے تھے اور ایک یادگار کہانی کو آغاز ملا تھا۔ آج میں تمہیں ان تینوں دوستوں سے ملانا چاہتا ہوں۔ یہ بس ان تین کرداروں ہی کی کہانی ہے۔ لیکن میری ایک چھوٹی سی شرط بھی ہے۔ امید ہے تم مان لو گے۔ ہم یہاں اکٹھے بیٹھ کر فلم نہیں دیکھیں گے۔ علیحدہ علیحدہ بیٹھیں گے۔“

”یہ کیا بات ہوئی یا؟“

”بس ہے نا بات۔“ عدنان الجھا ہوا تھا مگر خاموش

رہا۔ وہ پُر تجسس نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جیب سے پرس نکالا اور اس کے اندرونی خانے سے شہلا کی تصویر برآمد کی۔ میں نے عدنان کو بتایا۔ ”یہ ہے پہلا کردار..... شہلا..... اپنے چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہن تھی۔ جب اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی، وہ آئی سی ایس کر رہی تھی۔ اس کہانی کا دوسرا کردار میں طارق احمد ہوں اور میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ اس کہانی کا تیسرا کردار بھی تمہارے سامنے ہے اور تم تھوڑی سی کوشش کے ساتھ اسے ڈھونڈ سکتے ہو۔“

عدنان ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ گرد آلود کاؤنٹر پر اٹھتی ہوئی بلی کے علاوہ یہاں لابی میں فقط تین افراد اور نظر آرہے تھے۔ ایک تو سنیما ہی کا خستہ حال گیٹ کپہر تھا۔ اس کا نام غالباً ریاض تھا۔ ایک کوئی مسافر ٹائپ شخص تھا جو شاید کسی گاؤں سے آیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کی مطلوبہ ٹرین یا بس کے روانہ ہونے میں ابھی چند گھنٹے باقی ہوں اور وہ وقت گزاری کے لیے فلم دیکھنے چلا آیا ہو۔ تیسرا ایک بچی عمر کا شخص تھا۔ اس کی آنکھوں پر مونے شیشوں کی عینک تھی۔ عین ممکن تھا کہ کسی نہ کسی طور اس شخص کا تعلق یہاں دکھائی جانے والی ڈبا فلم سے ہی ہو۔

عدنان نے تینوں افراد کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ”ان تینوں میں سے تو مجھے کوئی نہیں لگتا۔“

”ہاں ان تینوں میں سے کوئی نہیں۔ لیکن وہ یہیں ہے اور تم اسے دیکھ بھی رہے ہو۔“

”کیا مطلب؟“ عدنان گڑبڑا سا گیا۔ شاید اسے میری ذہنی صحت پر شک ہو رہا تھا۔ میں نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ ”عدنان! وہ تیسرا کردار..... یہ سنیما ہے..... وینس سنیما۔“

”سنیما؟“

بقیہ تھا لیکن وینس سنیما کی خوبی یہ تھی کہ یہ گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بہ مشکل ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ انٹرول کے وقت میں پارکنگ سے اپنی سائیکل نکالتا اور بھاگ بھاگ گھر پہنچ کر گھر والوں کو اپنی صورت دکھاتا اور باقی فلم دیکھنے واپس سنیما پہنچ جاتا۔

یعنی اس سنیما سے ایک انسیت شروع سے ہی تھی۔ اصل دوستی تب ہوئی جب اپریل کی ایک خوشگوار شام کو میں نے شہلا کو لیڈیز وینٹنگ روم کے دروازے پر دیکھا تھا۔ بس کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جو دو لوگ ہوں کو آپس میں ملاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دو زندگیوں کو بھی ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ شہلا میرے دل کو بھاگتی تھی اور شاید میں بھی اسے برا نہیں لگا تھا۔ ہفتے کی وہ شام ایک کہانی کا نقطہ آغاز بن گئی۔

ہماری اگلی ملاقات بھی سنیما کے رومان پرور ماحول میں ہی ہوئی۔ وہ بھی ہفتے کا ہی روز تھا اور شو بھی شام کا تھا۔ ہماری نظریں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہیں۔ انٹرول پر میں چہل قدمی کے انداز میں ان نشستوں کی طرف چلا گیا جہاں شہلا اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ یہ وہی جانا پہچانا عمل تھا، پروانے کو شمع کے گرد چکرانا ہوتا ہے اور ہر صورت چکرانا ہوتا ہے۔ اس روز میں نے شہلا کا گھر بھی دیکھ لیا..... اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ اس کے والد سیکریٹریٹ میں آفیسر ہیں۔

دھیرے دھیرے میرا اور شہلا کا تعلق آگے بڑھتا رہا۔ اس تعلق کو آگے بڑھانے میں مرکزی کردار اس سنیما ہی کا رہا۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنی فیملی کے بجائے اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ فلم دیکھنے آئی۔ اس دن ہم نے اس ریسٹوران کے ایک گوشے میں ایک دوسرے سے باتیں کیں اور فون نمبرز کا تبادلہ بھی کیا۔

عدنان توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اسے بتایا۔ ”ان دنوں یہ سنیما ایسا نہیں تھا، جیسا آج نظر آ رہا ہے۔ یہ تیرہ چودہ سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں ابھی سنیما اور فلم بننے کا رواج زندہ تھا۔ اچھی فلمیں بھی لگتی تھیں۔ جمعہ کے روز فلموں کی نمائش کا افتتاح ہوتا تھا۔ لوگ اہتمام سے فلم دیکھنے جاتے تھے۔ اکثر فلموں پر کھڑکی توڑ رش پڑتا تھا۔ ٹکٹیں بلیک ہوتی تھیں۔ بہتر فلموں کی نمائش کے موقع پر خواتین کے جھگڑے بھی دکھائی دیتے تھے۔ یہ وینس سنیما بھی رونق مچا ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک بڑی شاہراہ کے کنارے واقع ہے۔ فلم بینوں کے لیے یہاں تک رسائی آسان تھی۔ نئی فلم کی نمائش کے موقع پر نیچے والا

سینس ڈائجسٹ

احاطہ کچھا کچھ بھر جاتا تھا۔ یہ نیچے سفید سیڑھیاں دیکھ رہے ہوتا تم۔ ہجوم میں یہ بھی چھپ جاتی تھیں۔ یہ سامنے ہی ”ون ایٹ“ کی ٹکٹ کھلتی تھی۔ یہاں پُر جوش تماشے دیکھنے کو ملتے تھے۔ زور آزمائی کے ذریعے ٹکٹ نکالے جاتے تھے۔ قطاریں ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھیں اور شاہین پر ڈنڈے برستے تھے۔ سنیما کی بائیں طرف جو احاطہ ہے یہاں خوانچہ فروشوں کا اثر دھام ہوتا تھا۔ ان کے پیچھے اشیائے خورد و نوش کی کھوکھا نما دکانیں تھیں۔ دہی بڑے، آلو جے، گرم سموے، حلیم، شامی کباب اور نان، ٹھنڈی بوتلیں اور چائے۔ انٹرول ہوتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ خوانچے والوں کی آوازیں سماں باندھ دیتیں۔ ٹھنڈی بوتلوں کی ٹن ٹن..... کباب والے کی ٹکانک اور ان سب میں سے نمایاں ہو کر ابھرتی ہوئی دہی بڑے والے کی صدا۔

ہاں عدنان! یہ انہی بارونق دنوں کی روداد ہے۔ اس سنیما کی عمارت میری اور شہلا کی محبت کی گواہ ہے۔ یوں تو ہم کئی اور جگہوں پر بھی ملے مگر ہماری ملاقاتوں کا بڑا محور یہی سنیما تھا۔ میری طرح یہ سنیما شہلا کی پہنچ سے بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے گھر سے سنیما کا فاصلہ یہی کوئی ایک کلومیٹر رہا ہوگا۔ ان کے گھر میں فلم بینی کا شوق بھی تھا۔ اس کی آپلی اور بڑے بھائی جاوید اچھی فلموں کے شیدائی تھے۔ ایک بار سنیما کے اندر ہی جاوید بھائی سے میری ملاقات بھی ہوئی۔ وہ خاصے ایڈوائس تھے اور کھلے ذہن کے مالک بھی۔ انہیں کچھ کچھ اندازہ ہو گیا کہ میرے اور شہلا کے درمیان ایک رابطہ پروان چڑھ رہا ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں انہوں نے کوئی خاص رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ اگر کوئی تھوڑا بہت رد عمل تھا بھی تو اسے مثبت ہی کہا جاسکتا تھا۔

کچھ عرصے بعد شہلا اپنی کسی سہیلی کے ساتھ یا پھر تنہا بھی آنے لگی۔ ایک بار ہم نے سنیما کی گیلری میں اکٹھے بیٹھ کر فلم دیکھی اور راز و نیاز بھی کیے۔ پھر ایک بار سنیما کے کبین نے ہمیں تنہائی کا موقع فراہم کیا اور وقت کے کچھ حسین لمحے ہماری جھولی میں ڈالے۔ یہ سنیما ہمارا ہمارا دوست بن گیا تھا۔ ہماری ”محبت گاہ“ کے طور پر اس نے اپنے بازو ہمارے لیے کھول دیے تھے۔ وہ الفت کے اس حسین خوشبودار سفر میں ہمارے ساتھ شریک ہوا تھا۔ ہاں عدنان! میں آج بھی دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہاں کے ایک ایک چہرے پر ہماری محبت کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ ہمارے قہقہے اس کی دیواریں میں سمائے ہوئے ہیں۔ ہماری آوازیں اس کے ہال کی نیم تاریکی میں جذب ہیں۔ ہاں وہ بڑے سنہرے دن

سینس ڈائجسٹ

تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم تینوں دوستوں سمیت ہر شے پر جو بن رہے۔ مجھے سب یاد ہے۔ سنیما جانا ان دنوں اکثر لوگوں کو اچھا لگتا تھا۔ سنیما میں جا کر فلم دیکھنا ایک مختلف طرز کی ”انجوائے منٹ“ تھی۔ سرمایہ کی ٹھہری ہوئی شاموں میں سنیما کے اندر کا نیم گرم ماحول، فلم کے ساتھ ساتھ موزک بھلی، ریوڑیوں اور چائے وغیرہ کا شغل، گرمیوں کی جس زدہ فضا میں سنیما کے اندر کی دلکش ٹھنڈک اور پرسکون تاریکی اور پھر جب انٹروں کے وقت یا فلم کے خاتمے پر باہر نکلتا تو پتا چلتا کہ آندھی آئی ہوئی ہے یا زوردار بارش ہو رہی ہے۔ فلم شروع ہونے سے پہلے سنیما کے طول و عرض میں چکرانا اور فلم کے حوالے سے مختلف اندازے لگانا۔ فلم کے بعد اس پر تبصرے اور اس کی سینہ گزٹ مشہوری۔ ان دنوں اس تفریح کے سارے انداز مختلف تھے، میں نے ذرا توقف کیا اور کہا۔ ”تم نے سنیما کی اوپر گیلری دیکھی ہے نا، کتنی کشادہ ہے۔“

”بچھلی دفعہ تمہارے ساتھ ہی یہاں آیا تھا۔“ عدنان نے جواب دیا۔

”گیلری میں ہم اکثر سب سے بالائی رو میں دائیں کنارے پر بیٹھا کرتے تھے۔ شہلا ایک لمبی چادر میں ہوتی تھی جس میں سے فقط اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے۔ ہمارا دوست یہ سنیما گھر ہماری مدد کرتا۔ خود کو نیم تاریکی میں ڈبو دیتا۔ اپنی اسکرین پر ایک کہانی یکسر دیتا اور لوگوں کی توجہ ادھر ہو جاتی، میں اور شہلا ایک دوسرے سے کندھا ملا لیتے۔ ایک دوسرے کو چھوتے، سرگوشیاں کرتے، وہ عجیب شب و روز تھے۔ ہاں یوں لگتا تھا کہ ہر شے پر شباب ہے۔ ہر طرف محبت کا پُر سکوت بسیرا ہے لیکن سکوت کے نیچے لہریں بھی تو پلا کرتی ہیں۔ ہماری زندگیوں میں بھی دھیرے دھیرے ایک طوفان اٹھا اور پھر اس نے دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ ایک ایسی ہوا چلی جو چند ہی ماہ میں شہلا کو مجھ سے بہت دور لے گئی۔“

”شادی ہو گئی اس کی؟“ عدنان نے پوچھا۔

”نہیں شادی تو نہیں ہوئی لیکن وہ ”شادی“ سے بھی دور چلی گئی۔ اس کے گھر والے امریکا شفٹ ہو رہے تھے۔ وہ لوگ مجھے گھر داماد کے طور پر رکھنا چاہتے تھے۔ ایک عام سی ملازمت کے بجائے میرے لیے ایک نہایت روشن مستقبل کا انتظام کر رہے تھے لیکن میری ڈوریں میری بیوہ ماں اور ایک بیمار بھائی کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ اور میرے قدموں سے میری مٹی کی خوشبو ایک قدیم عہد کی طرح

لپٹی ہوئی تھی۔ میرا ملک جیسا بھی تھا، میرا تھا۔ اس کی میزبانی میزبانی گلیاں، اس کے گجھلک بازار، اس کی بے ہنگم ٹریفک، اس کے کھیت کھلیاں اور اس کے لوگ اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ مجھے پیارے تھے۔ میں اپنی جڑوں سے نکل نہیں سکتا تھا، دوسری طرف شہلا اس زمین پر رہ نہیں سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ سہانے سنے ج چکے تھے۔ وہ رنگ و نور کے سیلاب کی طرف سفر کرنا چاہتی تھی اور اس کی شدید خواہش تھی کہ میں اس کا، ہم سفر بنوں۔ یہ ایک جان لیوا دورا تھا لیکن آخر میں نے وہ راہ چنی جو میری ماں اور بیمار بھائی کی طرف جاتی تھی۔

ایک ایسی ہی اداس شام میں شہلا مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ ہم تین سے دورہ گئے، میں اور ونیس۔ اس شام مجھے ایسے ہی لگا تھا جیسے سنگ و خشت کی یہ عمارت جسے سنیما کہا جاتا ہے، ایک جیتی جاگتی شخصیت بن گئی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر خوب روئے تھے۔ کئی دن تک اشک بار اور افسردہ رہے تھے۔ پھر ہم دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے۔ مجھے لگا کہ شہلا تو چلی گئی مگر اپنی بے شمار یادیں ہم دونوں کے بیچ چھوڑ گئی ہے۔ ہم دونوں ان یادوں کو ایک دوسرے سے شیر کرتے تھے۔ وہ یہاں کھڑی ہوتی تھی۔ یہاں اس نے پہلی بار مجھ سے بات کی تھی۔ اس نیم تاریکی میں ہم نے ایک دوسرے کو پہلی بار چھوا تھا۔ یہاں فلاں واقعہ ہوا تھا، یہاں فلاں۔ پتا نہیں کیسے دھیرے دھیرے یہ عمارت جسے لوگ سنیما کہتے تھے، مجھے عزیز ہوتی چلی گئی۔ میں ہر ہفتے کی شام دوسرے شو پر یہاں آتا تھا۔ فلم کوئی سی بھی ہوتی، مجھے اس سے غرض نہیں تھی۔ میں تو اپنے اس دوست سے ملنے آتا تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر چلنا، اس کی لابی میں بیٹھنا، اس کے خوانچہ فروشوں سے گفتگو کرنا اور اس کے تاریک بال میں تنہائی سے ٹپک لگا کر گئے وقت کو آواز دینا مجھے اچھا لگتا تھا۔ کبھی بھی واقعی ہم دونوں دوستوں کا یہ ملاپ ایک اچھی تفریح کا سبب بھی بن جاتا تھا۔ کوئی خوب صورت فلم لگی ہوتی تھی۔ میں چند گھنٹوں کے لیے اس کے منظر نامے میں ڈوب کر اپنی پریشانیوں اور محرومیوں سے دور ہو جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ آس مر کر بھی نہیں مرنی۔ بدترین تاریکیوں میں بھی سچی یا جھوٹی امید کی کوئی کرن چمکتی رہتی ہے۔ میں جو تقریباً ہر ہفتے کی شام ونیس سنیما کی طرف جاتا تھا تو اس کی وجہ یہ بھی کہ ونیس میرا اور شہلا کا مشترکہ دوست تھا۔ میرے دل میں یہ آس بھی موجود رہتی تھی کہ شاید کسی وقت وہ

مجھ سے نہ سبکی اپنے اس دوست سے ملنے ہی آجائے۔ شاید ابھی ہفتے کی کوئی ایک ایسی شام باقی ہو جس میں شہلا نے فلم کا دوسرا شو دیکھنے کے لیے یہاں آنا ہو۔ شاید..... شاید..... اور پھر اسی طرح بارہ سال بیت گئے۔ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی نکل گیا..... وقت بدل گیا، حالات بدل گئے، سنیما کی جگہ پہلے وی سی آر اور پھر سی ڈی اور انٹرنیٹ نے لے لی..... رجحانات کا دھارا رخ مڑتا ہوا کہیں سے کہیں نکل گیا۔ لیکن میرے جیسے روایت پسند اب بھی اپنی جگہ موجود ہیں۔ وہ اپنے رہن کہن سے جڑے ہوئے ہیں اور اپنی معاشرت سے وابستہ کوئی بھی شے ان کے دل سے نکلتی نہیں ہے۔ میری اور ونیس کی دوستی اب تک قائم ہے۔ میں اب بھی باقاعدگی سے یہاں آتا ہوں اور شاید آتا ہی رہتا لیکن..... اب..... آواز میرے گلے میں اٹک گئی اور میں آگے نہ بول سکا۔ میری آنکھوں کی نمی دیکھ کر عدنان چونک سا گیا۔

”کیا بات ہے طارق۔ تم چپ کیوں ہو گئے۔ بتاؤ نا، کیا کہہ رہے تھے تم؟“

میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”لیکن..... اب..... میری اور شہلا کی جدائی کے بعد میری اور ونیس کی جدائی بھی عمل میں آ رہی ہے۔ ہم دونوں بھی بچھڑ رہے ہیں، آج شام کے بعد شاید اب میں کبھی یہاں نہیں آسکوں گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ کہیں جارہے ہو تم..... میرا مطلب ہے کہیں ملک سے باہر جارہے ہو؟“

”نہیں عدنان! میں نہیں جارہا..... ونیس جارہا ہے۔ یہ سنیما جارہا ہے۔“

”ہاں عدنان!..... یہ سنیما مجھ سے بچھڑ رہا ہے، یہ جارہا ہے، ختم ہو رہا ہے۔ آج کی شام آخری شام ہے۔ اب یہاں جو شو چلے گا وہ آخری ہوگا۔ آج جب شو کے بعد پردہ گرے گا تو پھر کبھی نہیں اٹھے گا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں عدنان! آج شہر کی یہ معروف تفریح گاہ جو لوگوں کے لیے خوشگوار گھڑیوں کا حوالہ رہی ہے، اپنا جانا بیچنا سفر ختم کر رہی ہے..... رجحانوں کے انقلاب نے اسے نکل لیا ہے، کل سے اس کی مسامری کا عمل شروع ہو جائے گا۔ یہاں ایک بہت بڑا پیٹروں پمپ بنے گا۔ سی این جی بکے گی، آہ..... گاڑیوں کا شور، دھوکے کے مرغولے، پیٹرولیم کی بو..... اب یہاں کوئی سہانی شام نہیں اترے گی، نہ اس شام میں کوئی کہانی بنے گی۔ نہ اس کہانی میں کوئی طارق اور شہلا ہوں گے، نہ آنسو نہ مسکراہٹیں، رنگینی نہ سبکدوشی، ملاپ نہ جدائی، بس پیٹروں کی بو

اور سی این جی کی پھنکار۔“

عدنان کم صم ہو گیا۔ اس نے ذرا حیرانی اور تاسف سے دائیں بائیں دیکھا۔ ماحول نے میرے بیان کی تصدیق کی۔ ایک عجیب سی ویرانی نے اس تفریح گاہ کو گھیرا ہوا تھا۔ جیسے سفر کی شام کوئی مسافر اپنے گھر میں اداس بیٹھا ہو، یا کوئی بیمار آخری ہنگی لینے سے پہلے لیٹا ہو، یا پھر کوئی خشک پتا ٹہنی سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والا ہو۔

میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا۔ آغاز اور انجام میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ پینتیس چھتیس سال پہلے ایک دن ونیس کا آغاز ہوا ہوگا۔ کسی ایسی ہی شام میں اس کا کونا کونا مہکا ہوگا۔ رنگین آنچلوں کی بہار آئی ہوگی۔ جلتی بجھتی روشنیوں نے اسے دلہا سا بنا رکھا ہوگا..... اور آج اختتام کی شام تھی، ایک شکستہ درودیوار کی عمارت میں ایک مردہ سی فلم دکھائی جا رہی تھی اور اداسیاں گروہ درگروہ یہاں کے کونوں کھدروں میں بسیرا کیے ہوئے تھیں۔

عدنان نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”مجھے تو بالکل پتا نہیں تھا یار، بس اتنا سنا تھا کہ یہ سنیما شاید گرا دیا جائے گا۔ کیا..... واقعی آج یہاں آخری شو دکھایا جا رہا ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بھی صورت حال کی یاسیت میں ڈوب سا گیا۔ کچھ دیر بعد چونک کر بولا۔ ”یہاں آ کر تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ ہم اکٹھے آئے ہیں لیکن فلم میں اکیلا دیکھوں گا؟“

”یار! اب تو تمہیں وضاحت کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ آج میرا دوست مجھ سے بچھڑ رہا ہے۔ یہ آخری گھڑیاں ہیں، مجھے تھوڑا سا وقت اس کے ساتھ گزار لینے دو۔“

عدنان نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ شاید وہ میری کیفیت سمجھ رہا تھا۔

آس مر کر بھی نہیں مرنی۔ کیوں نہیں مرنی؟ مجھے پتا تھا وہ جو پچھلے گیارہ بارہ برس میں نہیں آئی ہے، اب بھی نہیں آئے گی۔ اس نے اب نہیں آنا تھا، لیکن پھر بھی میں بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا تھا۔ آج آخری شو تھا..... آج کے بعد کوئی امید نہیں تھی اور اب تو سات بجنے والے تھے۔ وہ سات کے بعد کبھی نہیں آتی تھی۔

اور پھر سات بج گئے۔ میں اس آخری امید کو بھی دفن کر اٹھ کھڑا ہوا..... آج بارہ سال بعد مجھے اپنے دوسرے دوست کو بھی الوداع کہنا تھا۔ عدنان اپنی مرضی سے اسٹال

مستحق

کاشف زبیر

اگر غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ مجرم کے پیروں میں قدرت نے سفر کے بہت سارے پھیر رکھ چھوڑے ہیں۔۔۔ اور شاید اسی سبب وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹک پاتا۔ یہ ظاہر آگے بڑھنے کی ہے جینی۔۔۔ درحقیقت اسے اپنے انجام کی جانب دھکیل رہی ہوتی ہے۔ وہ بھی جسے اپنی جائے پناہ تصور کر رہا تھا دراصل اس کی انجام گاہ ثابت ہوئی۔۔۔ کہ قدرت حق داروں کا حق اسی طرح ادا کرتی ہے۔

مقتدر دشمن اور ایک زور آور مجرم کے درمیان پراسرار کھیل



میں نے گھر کے سامنے پورچ میں گاڑی روکی اور لیٹر بکس سے اپنی ڈاک نکالتا ہوا اندر آ گیا۔ رات ہو چکی تھی اس لیے لائٹ جلاتے ہوئے میں لاؤنج میں آیا اور ڈاک کے لفافے صوفے کے سامنے رکھی میز پر ڈال کر پہلے اپنے لیے مگ میں کافی نکالی۔ باہر شدت کی سردی تھی۔ وسطی یورپ میں موسم سرما ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آسٹریا وسطی یورپ میں ہے۔ باہر سڑکوں کے کنارے فنوں کے حساب سے برف پڑی تھی اور مزید برف باری کی پیش گوئی تھی۔

پھر خواجہ وہ بی سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا۔ ٹک شاپ والے کے پاس نان ٹھنڈے اور شامی خستہ حال تھے۔ پھر بھی میں نے انہیں چکھا۔ ہاں مجھے الوداع کہنا تھا، وینس سمیت سب کو الوداع کہنا تھا۔ تب میں دہی بڑے والے چاہے رفیق کے پاس آیا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ میں جانتا تھا اس کے دہی بڑوں پر ویرانی کی گرد پڑی ہوئی ہے۔ پھر بھی میں نے دہی بڑے کھائے اور اسے زبردستی پیسے بھی دیے۔

”اب کہاں ملاقات ہوگی؟“ میں نے چاہے رفیق سے پوچھا۔

”ابھی کچھ پتا نہیں جی۔ شاید اب یہ کام ہی چھوڑ دوں۔ اب اس میں کچھ رہا ہی نہیں۔ اب تو گھر گھر میں سینما ہے جی۔“ اس نے صاف سے اپنے ہاتھ صاف کر لیے اور برتن ڈھک دیے مجھے یوں لگا جیسے سینما کے پردے سے پہلے اس نے اپنا پردہ گرادیا ہے۔

انٹروئل ختم ہو گیا تھا۔ گھنٹی بج گئی تھی۔ میں ہال میں واپس آ بیٹھا۔ ایک بار پھر تصورات میں ڈوبنے ابھرنے اور پھر ڈوبنے لگا۔ اب آخری شو آخری مرحلوں میں تھا۔ میرا دوست اپنا کام ختم کر کے سونے کے لیے جا رہا تھا، ایک نہ ختم ہونے والی نیند۔۔۔ ایسی نیند جو عدم وجود کا دوسرا نام تھی۔ اور پھر شو ختم ہو گیا۔ پردہ آہستہ آہستہ سر کا اور اسکرین نے ہمیشہ کے لیے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ میری آنکھوں میں نمی تھی۔ دس پندرہ دیگر تماشا نیوں کے ساتھ میں بھی سر جھکائے ہوئے باہر نکلا۔ قدم تو اٹھ رہے تھے مگر میں خود آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ مجھے جیسے خود کو گھسیٹ گھسیٹ کر اس چھت کے نیچے سے نکالنا پڑ رہا تھا۔ میں سیرھیوں کی۔۔۔ رینگ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا ہوا نیچے اترا۔ درودیوار کو دیکھا۔ احاطے میں کچھ ملازم فلموں کے اشتہاری بورڈ اکھاڑ رہے تھے۔ میں اس منظر سے نگاہیں چراتا ہوا باہر نکل آیا۔ اب سینما کی بیرونی دیوار میرے سامنے تھی۔ میں چلتا گیا اور اپنا ہاتھ بھی اس پر چلاتا گیا۔ یہ سنگ و خشت کی بے جان دیوار تھی لیکن میرے لیے نہیں، میرے لیے یہ زندہ تھی۔۔۔ پورا وینس زندہ تھا، اور بے حد۔۔۔ بے حد بھاری دل کے ساتھ مجھ سے جدا ہو رہا تھا۔ دیوار ختم ہو گئی، بس ختم ہو گیا۔ بس اسی طرح ختم ہوتے ہیں۔ میں آگے نکل گیا۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔۔۔ ہاں، مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔



”الوداع دوست!“ میں نے بس اتنا ہی کہا۔

کلاس کی بنگ کی طرف چلا گیا۔ میں گیلری کی بنگ کی طرف آیا۔ میں نے اپنا ہاتھ آخری بار ٹکٹ گھر کی کھڑکی میں داخل کیا، ہاتھ کو اندر کی خوشگوار ٹھنڈک نے بوسا دیا۔

”ڈونٹ!“ میں نے کہا۔

چپ چاپ بیٹھے بنگ ٹکٹ نے پیسے لے کر ڈونٹ میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ میں آخری بار گیلری کی سیرھیاں چڑھا، آخری بار اپنا ٹکٹ کنوایا اور اپنے جانے پہچانے ہال میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے تصور کو تیرہ چودہ برس پیچھے لے گیا تھا۔ طویل چادر میں لپٹی ہوئی شہلا میرے ساتھ تھی۔ ہمارے قدم زمین کے بجائے آسمان پر پڑ رہے تھے۔ گیلری میں بس آٹھ دس افراد ہی نظر آرہے تھے۔ میں نے سب سے اوپر والی رو پر نگاہ دوڑائی۔ ہم دونوں کی مطلوبہ نشستیں خالی تھیں۔ دائیں کونے والی آخری دو نشستیں، میں اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور کنارے والی نشست شہلا کے لیے خالی چھوڑ دی۔ سارے بھولے ہمارے منظر نگاہوں میں تازہ ہو گئے۔ ہال کی مخصوص ٹھنڈی ٹھنڈی باس سانسوں میں سرایت کرنے لگی۔ میں نے نشست کے کس کو محسوس کیا۔ فرش کی ہموار سطح کو، دروازے کھلنے اور بند ہونے کی مانوس آوازوں کو۔ ہال کے اندر پھیری لگانے والوں کی صداؤں کو اور پھر اسکرین کے سرسراتے ہوئے پردے کو۔ یہ سب کچھ آخری بار تھا۔۔۔ اور میں اسے ہمیشہ کے لیے اپنی حیات میں جذب کر لیتا چاہتا تھا۔

”ٹھنڈی بوتل صاحب۔“ پھیری والے نے کہا۔

”دو۔ ایک کوک ایک کیمن۔“ میں نے کہا۔

اس نے ذرا حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں نے لیمن شہلا کی نشست کی طرف رکھ دی۔ سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن نہیں۔۔۔ سگریٹ ممنوع تھا اور شہلا کی ”موجودگی“ میں تو بالکل نہیں۔ میں نشست پر نیچے کوکھکا اور میرا سر بے ساختہ تھوڑا سا بائیں طرف جھک گیا۔ یہاں شہلا کا شانہ ہوا کرتا تھا۔ آج وہ نہیں تھا۔ مگر تصور تو تھا۔ فلم شروع ہو چکی تھی لیکن فلم ہم کم ہی دیکھا کرتے تھے۔ آج بھی مجھے فلم نہیں دیکھنا تھی۔ مجھے تو صرف وینس کو الوداع کہنا تھا۔

ایک فلم اسکرین پر چلتی رہی اور ایک میرے ذہن میں۔

انٹروئل کے وقت میں باہر نکلا۔ عدنان کہیں نظر نہیں آیا اور اسے آنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ واپس جا چکا ہے۔ شاید گھر میں بیٹھ کر کوئی نئی انڈین فلم دیکھ رہا تھا۔ میں گنڈیری والے کے پاس آیا۔ چند ٹھنڈی گنڈیریاں لیں،

صوفے پر نیم دراز ہو کر میں نے ڈاک دیکھنا شروع کی اور پھر ایک لفافے نے مجھے سیدھا ہوجانے پر مجبور کر دیا۔ خط جرمنی کے شہر فرینکفرٹ سے آیا تھا۔ میں نے لفافہ کھولا اندر سے نکلنے والا خط جرمن زبان میں تھا لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا آسٹریا میں بھی جرمن بولی جاتی ہے۔ درحقیقت میرا تعلق بھی جرمن نسل سے تھا اور ہنگر اصل میں آسٹریا میں ہی پیدا ہوا تھا۔

میں اپنا تعارف کرا دوں میرا نام زیوف ملر ہے اور ویانا کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں۔ اکیلا رہتا ہوں۔ بیوی میں سال پہلے مجھ سے الگ ہو گئی تھی۔ ہماری اکلوتی بیٹی بھی عدالت کی طرف سے اسے مل گئی تھی اور پھر وہ اسے لے کر جرمنی چلی گئی۔ اس نے مجھ سے ہر رابطہ توڑ لیا اور میں دوبارہ شرمین کی صورت نہیں دیکھ سکا تھا۔ شرمین میری بیٹی کا نام ہے۔ جب کارلا مجھ سے الگ ہوئی تو وہ صرف دو سال کی تھی۔ عدالتی حکم کے باوجود کارلا نے شرمین کو دوبارہ مجھ سے ملنے نہیں دیا بلکہ وہ اسے لے کر غائب ہو گئی۔ میں چاہتا تو عدالتی احکام کا سہارا لے کر اسے پولیس کی مدد سے تلاش کروا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بعد میں نے شادی نہیں کی اور آج پچاس سال کی عمر میں بھی اکیلا ہوں۔ یونیورسٹی میں بائیو کیمسٹری کا مضمون پڑھاتا ہوں۔ میں نے اس مضمون میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ میرے کئی تحقیقی مقالے بین الاقوامی پرچوں میں شائع ہو چکے تھے۔

میں نے لفافے سے نکلنے والا خط پڑھا۔ کئی بار پڑھا اور حتیٰ کہ یہ مجھے حفظ ہو گیا تو میں نے اسے لفافے سمیت برقی آتش دان میں ڈال دیا۔ وہ لمحوں میں جل کر راکھ ہو گیا۔ میں نے اپنے لیے دوبارہ کافی نکالی اور صوفے پر بیٹھ کر سوچتا رہا۔ فرینکفرٹ سے آنے والے اس لفافے میں میرے لیے نہایت اہم اطلاع تھی اور مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا۔ دس منٹ بعد میں غسل کر رہا تھا۔ نہا کر میں نے کھانا کھایا اور ایک گھنٹے بعد میں سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔ میں نے صبح چھ بجے کا الارم لگا رکھا تھا۔ جو ٹھیک وقت پر شور کرنے لگا۔ مجھے رات زیادہ اچھی نیند نہیں آئی تھی۔ عام طور سے میں گہری نیند سوتا ہوں اور اپنے وقت پر ہی بیدار ہوتا ہوں۔ سر میں ہلکا سا بوجھل پن تھا جو گرم پانی سے نہا کر دور ہو گیا۔ اپنے لیے سیاہ کافی تیار کر کے میں نے کمپیوٹر آن کیا اور یونیورسٹی ای میل کر کے اطلاع دی کہ میں ایک سال کی چھٹی پر جا رہا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس طرح چھٹی نہیں ملتی لیکن میں نے کوئی وضاحت نہیں کی اور نہ مجھے یونیورسٹی حکام کے رد عمل کی پروا تھی۔

گھر کی بجلی اور گیس کے کنکشن بند کیے۔ ہر اس چیز جس کو گرد سے بچانا تھا، اس پر پتے سے پلاسٹک کی چادر چڑھا دی۔ تمام خراب ہوجانے والی چیزیں ایک بڑے شاہر میں ڈال کر باہر ڈسٹ بن میں پھینک دیں۔ پانی کا کنکشن بند کیا اور پھر تمام نلکوں اور فلیش ٹینکس سے پانی خارج کیا۔ سیوریج سے آنے والے تمام سوراخوں پر اچھی طرح حشرات کش پاؤڈر چھڑکا۔ فریج کو خالی کر دیا۔ تمام کھڑکیوں اور دروازے کے نیچے موجود خلا پر پلاسٹک ٹیپ چپکا دیا۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے اچھی طرح بند کیں اور داخلی دروازے کو لاک کر کے باہر آ گیا۔ میں نے ایک چھوٹا سا بیگ لیا تھا جس میں میرا ایک سوٹ اور ٹائٹ سوٹ تھا۔ میری تمام دستاویزات مع کریڈٹ کارڈز اور اسے ٹی ایم کارڈ کے میرے پاس موجود تھیں۔

میرے پاس مرسیڈیز کا چند سال پرانا ماڈل تھا مگر مکمل طور پر آنوٹیک یہ کار طویل فاصلوں کے لیے نہایت موزوں تھی۔ میں ویانا سے نکلا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ میں نے ایک ہائی ویے ٹرک ان میں لے کر لیا۔ کھانا سادہ تھا لیکن قیمت بہت زیادہ تھی۔ شام چھ بجے جب تاریکی چھا چکی تھی، میں آسٹریا اور جرمنی کی سرحد تک پہنچ گیا تھا۔ میرا پاسپورٹ دیکھ کر حکام نے مجھے بہ آسانی جانے دیا۔ یورپی یونین کے ممبر ممالک کے شہریوں کو سرحد پار جانے کے لیے ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی انہیں صرف پاسپورٹ یا اپنی شناختی دستاویزات دکھا دینا بھی کافی تھا۔ میں نے اپنی دوسری دستاویز کے بجائے پاسپورٹ دکھانا زیادہ مناسب سمجھا۔ کیونکہ دوسری دستاویزات سے پتا چل جاتا کہ میں ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں اور ممکن ہے یہ بات سرحدی چوکی کے ریکارڈ میں شامل کر لی جاتی۔ جبکہ پاسپورٹ کا صرف نمبر درج کیا جاتا ہے اور سال میں دو تین بار اس کی جانچ کی جاتی ہے کہ ملک میں آنے والا فلاں پاسپورٹ کا حامل شخص واپس گیا یا نہیں۔ اگر وہ واپس نہیں جاتا تو اس کی تلاش شروع کر دی جاتی ہے لیکن واپس نہ جانا کوئی جرم بھی نہیں، ایسا صرف احتیاط کے طور پر کیا جاتا ہے۔

جرمن سرحدی حکام نے مجھے جانے کی اجازت دیدی۔ میں جس جگہ سے جرمنی میں داخل ہوا وہاں کوئی خاص شہر پاس نہیں تھا۔ معمولی سے قصبات تھے یا ایک دو کا فارم ہاؤس بنے ہوئے تھے۔ راستے میں آنے والا پہلا بڑا شہر میونخ تھا۔ یہ وہ شہر ہے جہاں سے نازی انقلاب نے جنم لیا اور بالآخر اس نے پورے جرمنی کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ اگرچہ

میں میونخ میں رکنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن اچانک شروع ہو نے والی برف باری نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس موسم میں رات کے وقت ڈرائیو کرنے کے بجائے کہیں رک جاؤں اور صبح اپنے سفر کا آغاز کروں۔ اس کا آسان حل یہ تھا کہ میں کسی ہائی وے موٹل میں رک جاؤں لیکن اس میں مسئلہ یہ تھا کہ مجھے اپنا پاسپورٹ دکھانا پڑتا اور اس... موٹل کے رجسٹر میں انٹری ہوتی۔ یہ چیز بعد میں میرے لیے مسئلہ کر سکتی تھی اس لیے میں نے ہائی وے موٹل کے بجائے کار کارخ میونخ شہر کی طرف موڑ دیا۔ شہر میں مجھے راستے تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ کار میں ڈیجیٹل میپ موجود تھا اور ایک اسکرین پر شہر کا تفصیلی نقشہ بھی موجود تھا۔

ایک خاموش ہوٹل میں ڈنر کر کے میں نے ایک نزدیکی بار کارخ کیا۔ بار ٹینڈر سے وہسکی کا کہہ کر میں نے بار کا جائزہ لیا اور فوراً ہی مجھے مطلوبہ فرد نظر آ گیا۔ میں نے وہسکی کا گلاس خالی کیا اور پانچ یورو کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ بار ٹینڈر نے مجھے باقی رقم کی ادائیگی کی اور میں نے کونے میں موجود اس لڑکی نما عورت کو سر کی خفیف جنبش سے اشارہ کیا۔ وہ پہلے ہی میری طرف متوقع نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اشارہ پاتے ہی وہ خود بھی باہر کی طرف چل پڑی۔ ہم دونوں ظاہر کر رہے تھے کہ ہم الگ الگ جا رہے ہیں۔ باہر آتے ہی وہ میری طرف آئی۔ میں نے بلا تمہید پوچھا۔ ”ایک رات کا کیا لیتی ہو؟“

اس نے بھی بلا تمہید جواب دیا۔ ”اگر اپنے ساتھ لے جاؤ گے تو سو یورو اور میرے ساتھ چلو گے تو پچاس یورو مزید ادا کرنے ہوں گے۔“

وہ ایک ڈھلکتے جسم کی اور جوانی میں بوڑھی ہو جانے والی عورت تھی جو اپنے حلیے اور انداز سے لڑکی نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ اس کا ایک رات کا معاوضہ اتنا ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

”ٹھیک ہے اس معاوضے میں وہسکی کی ایک بوتل بھی شامل ہوگی لیکن مجھ سے کافی یا ناشے کی توقع مت رکھنا۔“

”مجھے منظور ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارا گھر کہاں ہے؟“

”تمہارے پاس گاڑی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں ہم پیدل چلیں گے۔“

اس نے شانے اچکائے۔ ”تب بہتر ہے ٹیکسی کر لو اس موسم میں پیدل چلے تو ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے سے پہلے ہی ہاتھ پیر تھرمیا ہوجائے گا۔“

اس نے بہت کم لباس پہنا تھا اور اپنے بارے میں اس کا اندیشہ درست تھا۔ میرا ارادہ تو نہیں تھا لیکن اس کی وجہ سے مجبوراً ٹیکسی کی۔ پانچ منٹ میں ہم اس عمارت کے سامنے تھے جہاں وہ رہتی تھی۔ یہ تھرڈ کلاس اور گندی سی جگہ تھی۔ اس کے پاس صرف ایک کمر تھا جس میں ایک ڈبل بیڈ تھا اور فرش پر گھسا پٹا قالین بچھا ہوا تھا غنیمت یہ تھا کہ وہاں ہیٹر تھا اور میں آرام سے قالین پر بھی سو سکتا تھا۔ جب میں نے ہلکا کبل اور ٹکیے لے کر فرش پر ڈالا تو عورت نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”تم بستر پر سو سکتی ہو۔“

”لیکن تم...؟“ اس نے کہنا چاہا۔

”میں صرف رات گزارنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اگر تمہیں اعتراض ہے تو میری رقم واپس کر دو میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔“

وہ بے وقوف نہیں تھی۔ اسے ایک ایسا گاہک ملا تھا جو صرف سونا چاہتا تھا اور اس کی وہسکی کی بوتل بھی بچا رہا تھا جبکہ وہ اس کی رات کا پورا معاوضہ بھی دے رہا تھا۔ اس نے فوراً سر ہلا دیا۔ ”مرضی تمہاری... اگر تمہارے ساتھ کوئی جسمانی یا نفسیاتی...“

میں نے اس کی بکواس سننے کے بجائے سونا بہتر سمجھا۔ اس کا معاوضہ اندر آتے ہی ادا کر دیا تھا اور اب میری جیب میں صرف تیس یورو تھے۔ میرے تمام کاغذات اور دوسری چیزیں کار میں تھیں اور اس کا ریسیٹ میں نے کار میں ہی رکھ دیا تھا، وہ میری آواز سے بھی کام کرتی تھی۔ مجھے معلوم تھا اس قسم کی سستی طوائفیں اپنے گاہکوں کو لوٹ لیتی تھیں اور اگر گاہک لٹنے کے بعد شور مچاتا تو وہ غنڈے بد معاش فوراً آجاتے جو اصل میں طوائفوں کی آمدنی میں حصے دار ہوتے تھے۔ وہ شور کرنے والے کا دماغ درست کر دیتے تھے اور وہ چپ ہو کر نکل جانے میں عافیت سمجھتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے پاس ایسی کوئی چیز نہیں رکھی تھی سوائے تیس یورو کے۔ میں صبح اٹھا تو توقع کے عین مطابق میرے کوٹ کی جیب سے تیس یورو غائب تھے۔ میں نے جیب ٹٹولتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ”اس میں کچھ رقم تھی۔“

وہ بے پروائی سے سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔ ”اگر تھی تب بھی مجھے نہیں معلوم... میرا خیال ہے اب تمہیں رخصت ہو جانا چاہیے۔“

میرا تیس یورو کے پیچھے کوئی تنازع کھڑا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے میں نے اس سے اتفاق کیا اور کوٹ

پہن کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ عقب سے اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے جو بکواس کی اسے بھی میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا۔ میری کار اس ریسٹوران کے سامنے کھڑی تھی جہاں میں نے رات ڈنر کیا تھا۔ ناشتا بھی اسی ہوٹل سے کیا اور وہاں واش روم میں ضروریات سے فارغ ہونے کے ساتھ میں نے منہ ہاتھ بھی دھو لیا۔ ناشتا کرتے ہی میں روانہ ہو گیا تھا اور آدھے گھنٹے بعد فرینکفرٹ جانے والی ہائی وے پر سفر کر رہا تھا۔ میونخ سے فرینکفرٹ کوئی پونے تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

دوپہر ایک بجے میں فرینکفرٹ میں تھا۔ یہاں بھی برف پڑ رہی تھی لیکن شہر کے اندر کی صورت حال کسی قدر بہتر تھی۔ سب سے پہلے میں نے لچ کیا۔ سڑکوں اور گلیوں سے برف ہٹانے کا کام جاری تھا اور آمد و رفت کے راستے کھلے تھے۔ لچ کے بعد میں دوبارہ روانہ ہوا اور گلیوں میں گاڑی گھمانے لگا۔ بالآخر ایک جگہ اپنے کام کے لیے موزوں لگی۔ وہاں گلی میں کھڑی گاڑیوں پر برف جمی تھی یعنی ان کو کوئی دن سے وہاں سے ہٹایا نہیں گیا تھا۔ میں نے اپنی گاڑی ایک طرف روکی اور ایک چھوٹا سا ٹول بکس لیتا ہوا گاڑی سے اتر آیا۔ میں نے ایک تقریباً نئی گاڑی کا انتخاب کیا۔ اس کی نمبر پلیٹیں بھی نئی جیسی تھیں۔ صاف ستھری اور چمکتی دکتی۔ اسکو دیکھ کر میں نے ٹول بکس سے اسکو ڈرائیور نکالا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میں نے پہلی نمبر پلیٹ اتار لی۔ گلی ویران تھی اور اوپر مکانوں کی کھڑکیاں بند تھیں، ان کے شیشوں پر کھرجا ہوا تھا اس لیے مجھے امید تھی کہ کوئی میری کار روکی نہیں دیکھ رہا ہوگا۔

پانچ منٹ بعد میں دونوں نمبر پلیٹیں لیے واپس آیا۔ نمبر پلیٹیں کار کے فٹ میٹ کے نیچے چھپا دیں اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ کار کے ڈیجیٹل نقشے کی مدد سے میں نے ایک ایسی کار پارکنگ کا پتا چلایا جس میں طویل مدت کے لیے گاڑیاں پارک کی جاتی تھیں اور وہ اس کی فیس لیتے تھے۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے میں نے ایک پارک کے کنارے جہاں دور تک کوئی نہیں تھا اپنی کار کی نمبر پلیٹیں تبدیل کیں اور اس میں مقامی پلیٹیں لگا دیں۔ اب یہ مقامی کار نظر آرہی تھی اور کوئی مجھ سے میری شناختی دستاویزات طلب نہ کرتا۔ کار پارکنگ کئی منزلہ تھی۔ میں نے ایک سال کی پارکنگ کا ٹکٹ لیا، اسے اسکرین پر اندر لگا دیا۔ کار کو سب سے اوپر والے فلور پر لے آیا اور ایک کونے میں کھڑا کر دیا جہاں کار کو چھوڑے جانے کا امکان بہت کم تھا۔ میں نے گاڑی

کے کمپیوٹر انٹرڈسٹم میں سینک کی۔ یہ خود کار سسٹم ہر دوسرے دن دس منٹ کے لیے گاڑی کا انجن چلا دیتا اور اس کی بیٹری چارج ہوتی رہتی۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے کیس ٹینک فل کر لیا تھا اور مجھے امید تھی کہ یہ سال بھر نہیں تو چھ سات مہینے ضرور چل جائے گا۔ اپنا پاسپورٹ اور دستاویزات میں نے اگلی نشست کے نیچے لاک ہو جانے والے خانے میں رکھ دیے، یہ خانہ نمبروں سے لاک ہوتا تھا۔ پھر اپنا بیگ لے کر میں نیچے اتر آیا۔ اس میں میرے دو جوڑے تھے اور میرے پاس تقریباً پانچ سو یورو کی رقم تھی۔ گاڑی میں دو ہزار یورو کی رقم تھی اگر مجھے ضرورت ہوتی تو میں دوبارہ نکال سکتا تھا۔ میرے پاس اسے فی ایم اور کریڈٹ کارڈ تھے لیکن میں انہیں استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا درنہ یہ ریکارڈز پر آجاتے۔

سب سے پہلے ایک بار برشاپ میں جا کر میں نے سر پر مشین پھروائی اور چہرے کی ایک دن بڑھ جانے والی ڈاڑھی کو فریج کی صورت دی۔ ان سارے کاموں سے نمٹتے ہوئے رات ہو گئی تھی۔ رات گزارنے کے لیے میں نے پھر وہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ ایک بھدی اور بوڑھی ہو جانے والی کال گرل کا انتخاب کیا جس نے آسانی سے مجھے اپنے بستر پر سو جانے کی اجازت دی اور خود صوفے پر جا کر لیٹ گئی۔ یہ رات میں نے سکون سے گزاری۔ وہ اچھی عورت تھی صبح اس نے مجھے نہانے دھونے کے موقع کے ساتھ ناشتا بھی دیا تھا۔ میں نے اس سے آنے والی رات کی بات بھی کر لی اور اسے کچھ رقم پیشگی دیدی۔ وہ خوش تھی اور میں بھی خوش تھا کہ مجھے رہائش کے سلسلے میں بھاگ دوڑ نہیں کرنا پڑے گی۔ جرمن میری مادری زبان تھی اور میں اسے جرمن لہجے میں بولنے پر قادر تھا۔ آسٹریا میں لہجہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔

میں دس بجے اس کے گھر سے نکلا اور سارا دن سردی میں فرینکفرٹ کے مخصوص علاقوں میں گھومتا رہا۔ مجھے ایک خاص کام کرنا تھا اور یہ کام کیے بغیر میرا اگلا قدم بیکار تھا۔ اس دن مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا دن بھی اسی چکر میں گزر گیا۔ اب میرے پاس رقم کم رہ گئی تھی اور میں فکر مند تھا کہ رقم کم پڑ گئی تو مجھے بینک سے نکلوانا پڑے گی۔ تیسرے دن میں پھر نکلا اور خلاف توقع اس روز کامیابی مل گئی۔ وہ دونوں لڑکے خود میرے پاس آئے تھے اور چھٹے ہوئے بد معاش لگ رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے جارحانہ انداز میں پوچھا کہ میں بار بار اس علاقے میں کیوں نظر آ رہا ہوں۔ میں نے ان سے کہا۔ ”مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جو بڑا کام کر سکے۔“

وہ مجھے فرازن نامی ایک بڑے بد معاش کے پاس لے گئے اور میں نے اسے بتایا کہ مجھے کیا کام کرانا ہے۔ اس نے یقین دلایا کہ کام ہو جائے گا بشرطیکہ میں اسے ایک ہزار یورو ادا کروں۔ میں نے اس سے کہا کہ پانچ سو یورو میں پہلے ادا کروں گا اور پانچ سو کام ہو جانے کے بعد۔ اس نے اعتراض کیا کہ میں بعد میں کیسے ادا کروں گا لیکن میں نے اسے مطمئن کر دیا ویسے بھی وہ بد معاش ہوتے ہوئے بھی میرے پر اعتماد انداز سے دب گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”یہ میری حفاظتی تدبیر ہے۔ جو شخص مجھے مطلوبہ چیز لادے گا میں اسے بتاؤں گا کہ باقی کے پانچ سو یورو کہاں سے مل سکتے ہیں۔“

وہ غور کر کے بولا۔ ”مجھے منظور ہے لیکن پانچ سو ابھی۔۔۔“

”نہیں، یہ میں تمہیں کل دوں گا۔ ساتھ ہی وہ انتظام بھی بتا دوں گا جس سے تمہیں باقی رقم مل سکے۔“

اس کے پاس سے نکلنے کے بعد میں مطمئن تھا۔ تین دن میں میری فریج باقاعدہ نمایاں ہو گئی تھی۔ یہ فریج مونچھوں سمیت تھی اس لیے میری شخصیت منفی تاثر دے رہی تھی۔ میں تین دن سے برش نہیں کر رہا تھا اور سگار پینے کے بجائے تمباکو چبا کر گزارا کر رہا تھا اس لیے دانت خوب میلے نظر آنے لگے تھے۔ اس دوران میں جان بوجھ کر تیوریاں چڑھا کر اور آنکھیں زیادہ کھول کر رکھنے کی مشق کرتا رہا تھا۔ اس سے میرے چہرے کا تاثر بالکل مختلف نظر آنے لگا تھا۔ اگلے دن پرانے کپڑوں کی دکان سے ایک خستہ حال ترین سوٹ لیا جو شاید کوئی بھکاری بھی لینا پسند نہ کرتا۔ اسے لے کر میں پارکنگ بلڈنگ میں آیا۔ آواز سے کار کو ان لاک کیا۔ اندر گھس کر میں نے ہزار یورو نکالے۔ سوٹ اتار کر پرانا لباس پہنا اور اپنے کپڑے سلیفے سے ملے کر کے بیگ میں رکھ دیے اور بیگ ڈکی میں رکھ دیا۔

میں نے ایک ایسی کوریئر کمپنی کا رخ کیا جو ماتیں بھی رکھتی تھی اور مخصوص طریقہ کار کے تحت انہیں کسی کے سپرد کر سکتی تھی۔ میں نے پانچ سو یورو ایک لفافے میں بند کر کے لفافہ ان کے سپرد کیا اور بتایا کہ کوئی اس پارسل کا نمبر بتائے تو اس سے کوڑ پوچھا جائے اور جواب میں وہ ایک مخصوص نمبر بتائے تو لفافہ اس کے حوالے کر دیا جائے۔ یہاں سے میں فرازن کے پاس پہنچا، اسے پانچ سو یورو نقد دیے۔ پھر میں نے اسے کوریئر کمپنی کا بتایا۔ ”ایک مہینے بعد کوئی جا کر وہاں پارسل نمبر بتائے اور پھر مخصوص کوڈ بتائے گا تو اسے ایک لفافہ

دیدیا جائے گا جس میں پانچ سو یورو ہوں گے۔“

فرازن نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”مسٹر کارل، تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

میں نے اسے اپنا نام کارل بتایا تھا۔ اس کا سوال نظر انداز کر کے میں نے اسے ایک چھوٹا سا چکیلا سلیڈر دیا، یہ مشکل سے دو انچ لمبا اور نصف انچ گول تھا اور بہ ظاہر ہر طرف سے بند تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اسے کس طرح کھولتے ہیں۔ ”پارسل نمبر یاد رکھنا۔ کوڈ میں اس شخص کو بتاؤں گا جو مجھے یہ چیز لاکر دے گا۔“

”یہ کیا ہے؟“ اس نے دوسرا سوال کیا۔

”اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے اور اسے کھولنے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ یہ بند نہیں ہوگا اور بیکار ہو جائے گا میرے کام کا بھی نہیں رہے گا اور ظاہر ہے تمہیں بھی باقی رقم نہیں ملے گی۔“

میں وہاں سے نکل آیا۔ میرے پاس کچھ رقم رہ گئی تھی وہ بھی میں نے ایک فقیر کے سپرد کر دی۔ کچھ دیر بعد میں ایک پوش علاقے میں فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ یہاں سردی کے باوجود خاصی گہما گہمی تھی، لوگ آ جا رہے تھے۔ میں نے ایک عمر رسیدہ شخص کو دیکھا جو ایک چرمی بیگ لے کر جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ میرے پاس آیا میں نے جھپٹ کر اس کا چرمی بیگ پکڑ لیا اور چھیننے کے لیے زور لگانے لگا لیکن یہ زور اتنا نہیں تھا کہ بیگ آسانی سے میرے ہاتھ میں آ جاتا پھر بوڑھا بھی کمزور نہیں تھا اس نے بیگ پر گرفت مضبوط کی اور چلا چلا کر پولیس کو بلانے لگا۔ دو تین منٹ کی کشمکش کے بعد میں نے اس سے بیگ چھین لیا۔ اس دوران میں ہمارے چاروں طرف اچھا خاصا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ لیکن کسی نے مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بیگ چھیننے ہی میں نے بھاگنے کی کوشش کی اور بہ ظاہر بدحواسی میں کھبے سے جا نکرایا۔ مگر سچ شہید بھی میرا منہ اور گھٹنے متاثر ہوئے تھے اور میں وہیں گر گیا۔ اس پر چند نوجوانوں نے حوصلہ کر کے مجھے قابو کر لیا۔ میرا ویسے بھی بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بوڑھے آدمی نے اپنا بیگ دوبارہ مجھ سے چھین لیا تھا۔

دس منٹ سے بھی پہلے پولیس آگئی اور دو پولیس والوں نے میرے خلاف فرد جرم سن کر مجھے ہتھکڑیاں لگا کر پولیس کار کے پیچھے ٹھونس دیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں پولیس اسٹیشن پر تھا جہاں مجھے ایک سیل میں بند کر دیا گیا۔ میں سلاخوں کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا، بوڑھا اپنا بیگ سینے سے لگائے میرے بارے میں رپورٹ درج کر رہا تھا۔ میرے پاس سے

پولیس کو کوئی ہتھیار نہیں ملا تھا جس کی بنیاد پر وہ مسلح ڈکیتی کی رپورٹ درج کرتے۔ انہوں نے رہزنی کی رپورٹ درج کی تھی۔ بڑے مہاں مصر تھے کہ ان پر حملہ بھی ہوا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی خراشیں دکھا رہے تھے جو بیگ چھیننے کی کوشش کے دوران آئی تھیں۔ مگر پولیس والے بیوقوف نہیں تھے۔ بوڑھے کے جانے کے بعد ایک پولیس آفیسر نے مجھے پوچھ گچھ کے مخصوص کمرے میں طلب کیا۔ وہاں میرے منکر پرنٹ لیے گئے اور پھر تصویریں لیں۔ پھر پولیس افسر نے سوالات شروع کیے۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”کارل۔“

”تمہارے پاس سے کوئی شناختی دستاویز نہیں نکلی ہے۔“

”میرے پاس کوئی شناختی دستاویز نہیں ہے۔“

”ڈرائیونگ لائسنس؟“

”میرے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے اور مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی ہے۔“

”کوئی شناختی کارڈ... جاب کارڈ؟“

”کچھ نہیں ہے، میں نے کبھی کوئی جاب نہیں کی۔“

”رہائش؟“

”میں فٹ پاتھ پر رہتا ہوں میری کوئی رہائش نہیں ہے۔“

”گزر اوقات کیسے ہوتی ہے؟“

”بس ہو جاتی ہے۔“ میں نے شانے اچکائے۔

آدھے گھنٹے کے اس انٹرویو میں، میں نے خود کو ہر طرح سے لاوارث اور بے گھر جرائم پیشہ شخص ثابت کیا۔ میں نے جان بوجھ کر اپنی زبان اور لہجہ تجلے طبقے کے لوگوں کا سا رکھا تھا اور چہرے کے تاثرات سخت اور منفی رکھے تھے۔ البتہ میں نے جرم کا اعتراف کر لیا۔ ”مجھے رقم کی ضرورت تھی اس لیے اس بڑھے سے بیگ چھیننے کی کوشش کی لیکن بد قسمتی سے پکڑا گیا۔“

پولیس افسر خوش ہو گیا اسے امید نہیں تھی کہ میں اتنی آسانی سے اعتراف جرم کر لوں گا۔ اس نے فوراً میرا اعترافی بیان ریکارڈ کرایا اور پھر اسے پرنٹ کروا کر اس پر میرے دستخط بھی لے لیے۔ اس خوشی میں اس نے یہ بات بھی نظر انداز کر دی کہ اگر میں جرائم پیشہ تھا تو پولیس کے پاس میرا ریکارڈ پہلے سے کیوں نہیں تھا۔ شاید اس نے فرض کر لیا ہوگا کہ میں ان لوگوں میں سے تھا جو بہت احتیاط سے جرم کرتے

ہیں اور مشکل سے پولیس کی گرفت میں آتے ہیں یا پھر قسمت ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی ہے بالآخر میں پہلی بار پکڑا گیا تھا۔ اگلے دن مجھے ایک عدالت میں پیش کیا گیا اور وہاں میرے کيس کی سماعت شروع ہوئی۔ میری طرف سے اعترافی بیان نے پولیس اور عدالت کے لیے سہولت پیدا کر دی تھی۔ میرے نوجوان سرکاری وکیل کی کوشش کے باوجود جیوری نے مجھے رہزنی کا مرتکب قرار دیا۔

جج نے مجھے پانچ مہینے کی سزا دے کر فرینکفرٹ کی ڈسٹرکٹ جیل بھیجے کا حکم دیا۔ اگر میں جیل میں اپنا چال چلن درست رکھتا تو مجھے تین مہینے بعد ہی رول پر رہا کیا جاسکتا تھا۔

پولیس نے جو برائے نام تحقیقات کیں ان سے اسے یہ معلوم ہوا کہ میں بارہ سال کی عمر سے بے گھر تھا اور فٹ پاتھوں پر پل رہا تھا۔ جرمنی میں ایسے افراد کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ ہے جن کے پاس کوئی گھر نہیں ہے اور وہ فٹ پاتھ یا بارکوں میں سوتے ہیں۔ میرا کوئی ریکارڈ نہیں تھا لیکن پولیس یا عدالت نے اس پر بھی توجہ نہیں دی ان کی اصل توجہ جرم اور مجرم پر تھی۔ مجھے سزا دے کر وہ اپنے فرض سے سبک دوش ہو گئے تھے۔ صرف دس دن کے اندر مجھے سزا ہو گئی تھی۔ گیارہویں دن پولیس حکام نے مجھے جیل حکام کے حوالے کر دیا۔

جیل میں پہنچنے ہی سب سے پہلے مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ تمام کپڑے اتار کر میری دوسری چیزوں کے ساتھ ایک ڈبے میں بند کر کے جیلر نے اسے سیل بند کر دیا۔ پھر مجھے ایک راہداری سے گزارا گیا جس میں ایکس رے کیمر لگا تھا۔ اگر میں اپنے جسم میں بھی کچھ چھپا کر لے جاتا تو پتا چل جاتا۔ میں جس کمرے میں نکلا، وہاں چھت پر شاہور لگے تھے۔ میرے اندر آتے ہی عقب میں دروازہ بند ہو گیا اور شاہور سے بہت تیزی سے جراثیم کش دواملا پانی برسنے لگا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں پانی سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ شکر ہے پانی گرم تھا ورنہ دس منٹ تک ٹھنڈا پانی برستا تو مجھے باہر جاتے ہی نمونیا ہو جاتا۔ دس منٹ بعد شاہور بند ہو گیا اور کمرے کا اگلا دروازہ کھل گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ یہاں گرم ہوا بھینکنے والا شاہور تھا میں اس کے نیچے کھڑا ہوا تو ایک منٹ سے بھی پہلے میرا جسم بالکل خشک ہو گیا۔ اس دوران میں ایک گارڈ ایک بنڈل اٹھائے اندر آیا۔ اس نے بنڈل میز پر رکھ دیا اور میری طرف دیکھا۔

”یہ تمہارا سامان ہے۔“

سامان میں ایک لباس، ایک تولیا، ٹوتھ پیسٹ و برش

اور اسی طرح استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔ میں نے لباس پہنا اور گارڈ کے ساتھ چل پڑا۔ جب میں راہداری سے گزر رہا تھا تو قیدی اپنی اپنی کوششوں سے جھانک کر مجھے خوش آمدید کہہ رہے تھے اور یہ سب ناقابل بیان الفاظ تھے لیکن جیل کے قیدیوں کی زبان یہی تھی۔ میں سنی ان سنی کر کے چلتا رہا۔ گارڈ مجھے ایک سیل تک لایا۔ اس نے چابی سے تالا کھولا اور جیسے ہی میں اندر گیا اس نے کھینکنے والا فولادی دروازہ بند کر کے اسے دوبارہ تالا لگا دیا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”جیل میں خوش آمدید۔“

جرمن جیلوں میں قیدیوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ عام طور سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی لیکن جو قیدی بد معاشری کرتے ہیں ان سے جیل حکام اچھی طرح نمٹتے ہیں۔ مجھے جس سیل میں رکھا گیا تھا وہ ایک آدمی کے لیے تھی۔ اس کی چوڑائی پانچ فٹ اور لمبائی نو فٹ تھی۔ بیڈ دھات کا تھا جس پر چند انچ موٹا میٹریس بچھا تھا۔ ایک کبل اور ایک ٹکیہ تھا۔ سیل کے آخری حصے میں ایک کھوڑا اور ایک چھوٹا سا واش بیسن لگا تھا۔ اس کے اوپر دیوار میں فکس آئینہ تھا اور ایک چھوٹا سا ریک تھا جس میں ٹوتھ پیسٹ اور کنگھا رکھا جاسکتا تھا۔ سامان رکھنے کے لیے بیڈ کے نیچے خانہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس خانے کا جائزہ لیا اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح ٹٹولا اور بالآخر مجھے ایک جگہ مل گئی۔ میں نے مطمئن ہو کر اپنا سامان اس خانے میں رکھ دیا۔

میں صبح چھ بجے جیل آیا تھا، آٹھ بجے کوشریوں کے دروازے خود کار انداز میں کھل گئے۔ ان کا لاک دو طرح سے کھلتا تھا، ایک مینول یعنی چابی سے اور دوسرا الیکٹرانک طریقے سے کھلتا تھا۔ جب سب قیدیوں کو کھولنا ہوتا تھا تو لاک الیکٹرانک طریقے سے کھول دیے جاتے تھے۔ جیل شیڈول کے مطابق قیدیوں کو صبح آٹھ بجے کھول دیا جاتا تھا۔ وہ میس میں جا کر ناشتا کرتے۔ اس کے بعد انہیں سارا دن آزاد رکھا جاتا تھا۔ وہ باہر جا کر میدان میں کھیلتے یا لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے یا اخبار اور رسالے پڑھتے۔ اس کے علاوہ انڈور کھیلوں کی سہولت بھی تھی۔ جیسے ہی سارے قیدی باہر آئے ان کے سیل دوبارہ بند ہو گئے، اب کوئی اس وقت تک اپنے سیل میں نہیں جاسکتا تھا جب تک یہ دوبارہ نہ کھولے جاتے۔ دوبارہ یہ رات آٹھ بجے کھلتے تھے۔ رات کے کھانے کے فوراً بعد قیدیوں کو دوبارہ صبح آٹھ بجے تک کے لیے بند کر دیا جاتا تھا۔ قیدیوں کے اندر جانے کے بعد گارڈز معائنہ کرتے کہ کوئی قیدی اپنے سیل سے غیر حاضر تو نہیں ہے۔

جرمن جیلوں میں قیدیوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ عام طور سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی لیکن جو قیدی بد معاشری کرتے ہیں ان سے جیل حکام اچھی طرح نمٹتے ہیں۔ مجھے جس سیل میں رکھا گیا تھا وہ ایک آدمی کے لیے تھی۔ اس کی چوڑائی پانچ فٹ اور لمبائی نو فٹ تھی۔ بیڈ دھات کا تھا جس پر چند انچ موٹا میٹریس بچھا تھا۔ ایک کبل اور ایک ٹکیہ تھا۔ سیل کے آخری حصے میں ایک کھوڑا اور ایک چھوٹا سا واش بیسن لگا تھا۔ اس کے اوپر دیوار میں فکس آئینہ تھا اور ایک چھوٹا سا ریک تھا جس میں ٹوتھ پیسٹ اور کنگھا رکھا جاسکتا تھا۔ سامان رکھنے کے لیے بیڈ کے نیچے خانہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس خانے کا جائزہ لیا اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح ٹٹولا اور بالآخر مجھے ایک جگہ مل گئی۔ میں نے مطمئن ہو کر اپنا سامان اس خانے میں رکھ دیا۔

میں صبح چھ بجے جیل آیا تھا، آٹھ بجے کوشریوں کے دروازے خود کار انداز میں کھل گئے۔ ان کا لاک دو طرح سے کھلتا تھا، ایک مینول یعنی چابی سے اور دوسرا الیکٹرانک طریقے سے کھلتا تھا۔ جب سب قیدیوں کو کھولنا ہوتا تھا تو لاک الیکٹرانک طریقے سے کھول دیے جاتے تھے۔ جیل شیڈول کے مطابق قیدیوں کو صبح آٹھ بجے کھول دیا جاتا تھا۔ وہ میس میں جا کر ناشتا کرتے۔ اس کے بعد انہیں سارا دن آزاد رکھا جاتا تھا۔ وہ باہر جا کر میدان میں کھیلتے یا لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے یا اخبار اور رسالے پڑھتے۔ اس کے علاوہ انڈور کھیلوں کی سہولت بھی تھی۔ جیسے ہی سارے قیدی باہر آئے ان کے سیل دوبارہ بند ہو گئے، اب کوئی اس وقت تک اپنے سیل میں نہیں جاسکتا تھا جب تک یہ دوبارہ نہ کھولے جاتے۔ دوبارہ یہ رات آٹھ بجے کھلتے تھے۔ رات کے کھانے کے فوراً بعد قیدیوں کو دوبارہ صبح آٹھ بجے تک کے لیے بند کر دیا جاتا تھا۔ قیدیوں کے اندر جانے کے بعد گارڈز معائنہ کرتے کہ کوئی قیدی اپنے سیل سے غیر حاضر تو نہیں ہے۔

جرمن جیلوں میں قیدیوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ عام طور سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی لیکن جو قیدی بد معاشری کرتے ہیں ان سے جیل حکام اچھی طرح نمٹتے ہیں۔ مجھے جس سیل میں رکھا گیا تھا وہ ایک آدمی کے لیے تھی۔ اس کی چوڑائی پانچ فٹ اور لمبائی نو فٹ تھی۔ بیڈ دھات کا تھا جس پر چند انچ موٹا میٹریس بچھا تھا۔ ایک کبل اور ایک ٹکیہ تھا۔ سیل کے آخری حصے میں ایک کھوڑا اور ایک چھوٹا سا واش بیسن لگا تھا۔ اس کے اوپر دیوار میں فکس آئینہ تھا اور ایک چھوٹا سا ریک تھا جس میں ٹوتھ پیسٹ اور کنگھا رکھا جاسکتا تھا۔ سامان رکھنے کے لیے بیڈ کے نیچے خانہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس خانے کا جائزہ لیا اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح ٹٹولا اور بالآخر مجھے ایک جگہ مل گئی۔ میں نے مطمئن ہو کر اپنا سامان اس خانے میں رکھ دیا۔

میں صبح چھ بجے جیل آیا تھا، آٹھ بجے کوشریوں کے دروازے خود کار انداز میں کھل گئے۔ ان کا لاک دو طرح سے کھلتا تھا، ایک مینول یعنی چابی سے اور دوسرا الیکٹرانک طریقے سے کھلتا تھا۔ جب سب قیدیوں کو کھولنا ہوتا تھا تو لاک الیکٹرانک طریقے سے کھول دیے جاتے تھے۔ جیل شیڈول کے مطابق قیدیوں کو صبح آٹھ بجے کھول دیا جاتا تھا۔ وہ میس میں جا کر ناشتا کرتے۔ اس کے بعد انہیں سارا دن آزاد رکھا جاتا تھا۔ وہ باہر جا کر میدان میں کھیلتے یا لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے یا اخبار اور رسالے پڑھتے۔ اس کے علاوہ انڈور کھیلوں کی سہولت بھی تھی۔ جیسے ہی سارے قیدی باہر آئے ان کے سیل دوبارہ بند ہو گئے، اب کوئی اس وقت تک اپنے سیل میں نہیں جاسکتا تھا جب تک یہ دوبارہ نہ کھولے جاتے۔ دوبارہ یہ رات آٹھ بجے کھلتے تھے۔ رات کے کھانے کے فوراً بعد قیدیوں کو دوبارہ صبح آٹھ بجے تک کے لیے بند کر دیا جاتا تھا۔ قیدیوں کے اندر جانے کے بعد گارڈز معائنہ کرتے کہ کوئی قیدی اپنے سیل سے غیر حاضر تو نہیں ہے۔

جرمن جیلوں میں قیدیوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ عام طور سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی لیکن جو قیدی بد معاشری کرتے ہیں ان سے جیل حکام اچھی طرح نمٹتے ہیں۔ مجھے جس سیل میں رکھا گیا تھا وہ ایک آدمی کے لیے تھی۔ اس کی چوڑائی پانچ فٹ اور لمبائی نو فٹ تھی۔ بیڈ دھات کا تھا جس پر چند انچ موٹا میٹریس بچھا تھا۔ ایک کبل اور ایک ٹکیہ تھا۔ سیل کے آخری حصے میں ایک کھوڑا اور ایک چھوٹا سا واش بیسن لگا تھا۔ اس کے اوپر دیوار میں فکس آئینہ تھا اور ایک چھوٹا سا ریک تھا جس میں ٹوتھ پیسٹ اور کنگھا رکھا جاسکتا تھا۔ سامان رکھنے کے لیے بیڈ کے نیچے خانہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس خانے کا جائزہ لیا اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح ٹٹولا اور بالآخر مجھے ایک جگہ مل گئی۔ میں نے مطمئن ہو کر اپنا سامان اس خانے میں رکھ دیا۔

میں صبح چھ بجے جیل آیا تھا، آٹھ بجے کوشریوں کے دروازے خود کار انداز میں کھل گئے۔ ان کا لاک دو طرح سے کھلتا تھا، ایک مینول یعنی چابی سے اور دوسرا الیکٹرانک طریقے سے کھلتا تھا۔ جب سب قیدیوں کو کھولنا ہوتا تھا تو لاک الیکٹرانک طریقے سے کھول دیے جاتے تھے۔ جیل شیڈول کے مطابق قیدیوں کو صبح آٹھ بجے کھول دیا جاتا تھا۔ وہ میس میں جا کر ناشتا کرتے۔ اس کے بعد انہیں سارا دن آزاد رکھا جاتا تھا۔ وہ باہر جا کر میدان میں کھیلتے یا لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے یا اخبار اور رسالے پڑھتے۔ اس کے علاوہ انڈور کھیلوں کی سہولت بھی تھی۔ جیسے ہی سارے قیدی باہر آئے ان کے سیل دوبارہ بند ہو گئے، اب کوئی اس وقت تک اپنے سیل میں نہیں جاسکتا تھا جب تک یہ دوبارہ نہ کھولے جاتے۔ دوبارہ یہ رات آٹھ بجے کھلتے تھے۔ رات کے کھانے کے فوراً بعد قیدیوں کو دوبارہ صبح آٹھ بجے تک کے لیے بند کر دیا جاتا تھا۔ قیدیوں کے اندر جانے کے بعد گارڈز معائنہ کرتے کہ کوئی قیدی اپنے سیل سے غیر حاضر تو نہیں ہے۔

جرمن جیلوں میں قیدیوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ عام طور سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی لیکن جو قیدی بد معاشری کرتے ہیں ان سے جیل حکام اچھی طرح نمٹتے ہیں۔ مجھے جس سیل میں رکھا گیا تھا وہ ایک آدمی کے لیے تھی۔ اس کی چوڑائی پانچ فٹ اور لمبائی نو فٹ تھی۔ بیڈ دھات کا تھا جس پر چند انچ موٹا میٹریس بچھا تھا۔ ایک کبل اور ایک ٹکیہ تھا۔ سیل کے آخری حصے میں ایک کھوڑا اور ایک چھوٹا سا واش بیسن لگا تھا۔ اس کے اوپر دیوار میں فکس آئینہ تھا اور ایک چھوٹا سا ریک تھا جس میں ٹوتھ پیسٹ اور کنگھا رکھا جاسکتا تھا۔ سامان رکھنے کے لیے بیڈ کے نیچے خانہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس خانے کا جائزہ لیا اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح ٹٹولا اور بالآخر مجھے ایک جگہ مل گئی۔ میں نے مطمئن ہو کر اپنا سامان اس خانے میں رکھ دیا۔

میں صبح چھ بجے جیل آیا تھا، آٹھ بجے کوشریوں کے دروازے خود کار انداز میں کھل گئے۔ ان کا لاک دو طرح سے کھلتا تھا، ایک مینول یعنی چابی سے اور دوسرا الیکٹرانک طریقے سے کھلتا تھا۔ جب سب قیدیوں کو کھولنا ہوتا تھا تو لاک الیکٹرانک طریقے سے کھول دیے جاتے تھے۔ جیل شیڈول کے مطابق قیدیوں کو صبح آٹھ بجے کھول دیا جاتا تھا۔ وہ میس میں جا کر ناشتا کرتے۔ اس کے بعد انہیں سارا دن آزاد رکھا جاتا تھا۔ وہ باہر جا کر میدان میں کھیلتے یا لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے یا اخبار اور رسالے پڑھتے۔ اس کے علاوہ انڈور کھیلوں کی سہولت بھی تھی۔ جیسے ہی سارے قیدی باہر آئے ان کے سیل دوبارہ بند ہو گئے، اب کوئی اس وقت تک اپنے سیل میں نہیں جاسکتا تھا جب تک یہ دوبارہ نہ کھولے جاتے۔ دوبارہ یہ رات آٹھ بجے کھلتے تھے۔ رات کے کھانے کے فوراً بعد قیدیوں کو دوبارہ صبح آٹھ بجے تک کے لیے بند کر دیا جاتا تھا۔ قیدیوں کے اندر جانے کے بعد گارڈز معائنہ کرتے کہ کوئی قیدی اپنے سیل سے غیر حاضر تو نہیں ہے۔

جرمن جیلوں میں قیدیوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ عام طور سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی لیکن جو قیدی بد معاشری کرتے ہیں ان سے جیل حکام اچھی طرح نمٹتے ہیں۔ مجھے جس سیل میں رکھا گیا تھا وہ ایک آدمی کے لیے تھی۔ اس کی چوڑائی پانچ فٹ اور لمبائی نو فٹ تھی۔ بیڈ دھات کا تھا جس پر چند انچ موٹا میٹریس بچھا تھا۔ ایک کبل اور ایک ٹکیہ تھا۔ سیل کے آخری حصے میں ایک کھوڑا اور ایک چھوٹا سا واش بیسن لگا تھا۔ اس کے اوپر دیوار میں فکس آئینہ تھا اور ایک چھوٹا سا ریک تھا جس میں ٹوتھ پیسٹ اور کنگھا رکھا جاسکتا تھا۔ سامان رکھنے کے لیے بیڈ کے نیچے خانہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس خانے کا جائزہ لیا اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح ٹٹولا اور بالآخر مجھے ایک جگہ مل گئی۔ میں نے مطمئن ہو کر اپنا سامان اس خانے میں رکھ دیا۔

میں صبح چھ بجے جیل آیا تھا، آٹھ بجے کوشریوں کے دروازے خود کار انداز میں کھل گئے۔ ان کا لاک دو طرح سے کھلتا تھا، ایک مینول یعنی چابی سے اور دوسرا الیکٹرانک طریقے سے کھلتا تھا۔ جب سب قیدیوں کو کھولنا ہوتا تھا تو لاک الیکٹرانک طریقے سے کھول دیے جاتے تھے۔ جیل شیڈول کے مطابق قیدیوں کو صبح آٹھ بجے کھول دیا جاتا تھا۔ وہ میس میں جا کر ناشتا کرتے۔ اس کے بعد انہیں سارا دن آزاد رکھا جاتا تھا۔ وہ باہر جا کر میدان میں کھیلتے یا لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے یا اخبار اور رسالے پڑھتے۔ اس کے علاوہ انڈور کھیلوں کی سہولت بھی تھی۔ جیسے ہی سارے قیدی باہر آئے ان کے سیل دوبارہ بند ہو گئے، اب کوئی اس وقت تک اپنے سیل میں نہیں جاسکتا تھا جب تک یہ دوبارہ نہ کھولے جاتے۔ دوبارہ یہ رات آٹھ بجے کھلتے تھے۔ رات کے کھانے کے فوراً بعد قیدیوں کو دوبارہ صبح آٹھ بجے تک کے لیے بند کر دیا جاتا تھا۔ قیدیوں کے اندر جانے کے بعد گارڈز معائنہ کرتے کہ کوئی قیدی اپنے سیل سے غیر حاضر تو نہیں ہے۔

جرمن جیلوں میں قیدیوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ عام طور سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی لیکن جو قیدی بد معاشری کرتے ہیں ان سے جیل حکام اچھی طرح نمٹتے ہیں۔ مجھے جس سیل میں رکھا گیا تھا وہ ایک آدمی کے لیے تھی۔ اس کی چوڑائی پانچ فٹ اور لمبائی نو فٹ تھی۔ بیڈ دھات کا تھا جس پر چند انچ موٹا میٹریس بچھا تھا۔ ایک کبل اور ایک ٹکیہ تھا۔ سیل کے آخری حصے میں ایک کھوڑا اور ایک چھوٹا سا واش بیسن لگا تھا۔ اس کے اوپر دیوار میں فکس آئینہ تھا اور ایک چھوٹا سا ریک تھا جس میں ٹوتھ پیسٹ اور کنگھا رکھا جاسکتا تھا۔ سامان رکھنے کے لیے بیڈ کے نیچے خانہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس خانے کا جائزہ لیا اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح ٹٹولا اور بالآخر مجھے ایک جگہ مل گئی۔ میں نے مطمئن ہو کر اپنا سامان اس خانے میں رکھ دیا۔

جرمن جیلوں میں قیدیوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ عام طور سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی لیکن جو قیدی بد معاشری کرتے ہیں ان سے جیل حکام اچھی طرح نمٹتے ہیں۔ مجھے جس سیل میں رکھا گیا تھا وہ ایک آدمی کے لیے تھی۔ اس کی چوڑائی پانچ فٹ اور لمبائی نو فٹ تھی۔ بیڈ دھات کا تھا جس پر چند انچ موٹا میٹریس بچھا تھا۔ ایک کبل اور ایک ٹکیہ تھا۔ سیل کے آخری حصے میں ایک کھوڑا اور ایک چھوٹا سا واش بیسن لگا تھا۔ اس کے اوپر دیوار میں فکس آئینہ تھا اور ایک چھوٹا سا ریک تھا جس میں ٹوتھ پیسٹ اور کنگھا رکھا جاسکتا تھا۔ سامان رکھنے کے لیے بیڈ کے نیچے خانہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس خانے کا جائزہ لیا اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح ٹٹولا اور بالآخر مجھے ایک جگہ مل گئی۔ میں نے مطمئن ہو کر اپنا سامان اس خانے میں رکھ دیا۔

ناشتے کے بعد میں نے لائبریری کا رخ کیا۔ یہ بتانا بھول گیا تھا کہ جیل میں ایک بہترین لائبریری بھی تھی جس میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولت بھی تھی لیکن انٹرنیٹ کی تمام سرگرمیاں جیل حکام کی طرف سے نوٹ کی جاتی تھیں کہ قیدی کہیں باہر کسی سے غلط مقصد کے تحت رابطہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ لائبریری میں تازہ ترین اخبارات آتے رہتے تھے۔ میں نے انٹرنیٹ پر آسٹریا کے اخبارات نکالے اور انہیں دیکھتا رہا۔ مجھے خدشہ تھا کہ میری پراسرار گم شدگی کا ذکر ہوگا لیکن کسی اخبار میں ایسی کوئی خبر نہیں تھی میں نے سکون کا سانس لیا یعنی ابھی تک میری عدم موجودگی کو گم شدگی قرار نہیں دیا گیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے میں بھی اس طرح بغیر اطلاع کے غائب نہیں ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں دوبارہ لائبریری آ گیا۔ یہاں زیادہ تر عمر رسیدہ اور شریف طبع قیدی تھے۔ اس لیے لائبریری میں امن و سکون تھا۔ میں فی الحال ایسی جگہوں پر جانے سے گریز کر رہا تھا جہاں مجھے بد معاشر قیدیوں سے سابقہ پڑے، وہ عام طور سے نئے آنے والے قیدیوں کے ساتھ جارحانہ رویہ اپناتے تھے۔

مجھے کسی کا خوف نہیں تھا لیکن میں نمایاں نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کے لیے لائبریری یا ٹی لاؤنج سب سے بہترین جگہ تھی۔ سب سے خطرناک جگہ کھیل کا میدان تھا جہاں آئے دن جھگڑے ہوتے تھے اور گارڈز بھی صرف اس وقت دخل دیتے تھے جب معاملہ سنگین ہو جاتا ورنہ چھوٹے موٹے جھگڑوں میں دخل اندازی سے گریز کرتے تھے۔ انڈور کھیلوں کی جگہ پر بھی بد معاشر قیدیوں کا قبضہ تھا اور وہاں بھی لڑائی جھگڑے ہوتے تھے۔ لائبریری سے بد معاشر قیدیوں کا کوئی واسطہ نہیں تھا اور ٹی لاؤنج میں بھی گارڈز کی وجہ سے وہ سکون سے رہتے تھے اور جو سکون سے نہیں رہتا چاہتے تھے وہ وہاں آتے ہی نہیں تھے۔ میں لچ کے بعد کچھ دیر ٹی لاؤنج میں گزارتا تھا۔ وہاں موجود قیدیوں کے ساتھ گپ شپ کرتا۔

خطرناک یا تاش کھیلتا اور شام کو ڈنر سے پہلے دوبارہ لائبریری جا کر کوئی کتاب نگوا لیتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ یہاں قیدیوں کی اس حد تک نگرانی نہیں ہوتی ہوگی کہ ان کے پڑھنے پر بھی نظر رکھی جاتی ہو۔ کتاب ایٹوکر کے میں ڈنر کے بعد اپنے ساتھ لے آتا۔ مجھے جلدی نیند نہیں آتی تھی اس لیے اس وقت تک پڑھتا تھا جب تک نیند نہ آجائے۔

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

لیٹرین کے لیے مخصوص تھا۔ یہ خاصا بڑا حصہ تھا اور دن میں قیدی نہیں جاتے تھے۔ اسی جگہ انہیں ہر دوسرے دن نہانے کی سہولت مہیا کی جاتی تھی۔ قیدیوں کے گروپ بنا دیے گئے تھے اور ان کے دن اور اوقات طے کر دیے تھے وہ اسی وقت جا کر نہاتے اور اس کے بعد انہیں دوسرا لباس مہیا کیا جاتا تھا۔ میں نے اپنے مقصد کے لیے چیزیں جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔ یہ چیزیں مجھے مختلف جگہوں سے ملی تھیں اور میں نے انہیں بڑی احتیاط سے چھپا کر بیڈ کے نیچے والے خانے میں رکھا تھا۔ کبھی کبھی جیل حکام اچانک قیدیوں کے سیل کی تلاشی لیتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ قیدی کسی نہ کسی طرح ممنوعہ اشیا حاصل کر لیتے ہیں، ان میں منشیات بھی تھی اور چھوٹے موٹے ہتھیار بھی تھے۔

دوسرے ہفتے میں میں نے لٹچ کر رہا تھا، میرے ساتھی قیدیوں کا ایک گروپ بن گیا تھا جس میں سب ہی معمولی جرائم میں قید ہونے والے افراد تھے۔ اچانک ایک طرف سے ہنگامہ کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ دو افراد آئے سامنے آگئے تھے۔ ان میں کسی بات پر زبانی تنازعہ ہوا لیکن اب بات ہاتھ پاؤں تک آگئی تھی۔ میرے ایک معر ساتھی نے کہا۔ ”وہ پہلے بالوں والا ڈیک ہے اور اس کے سامنے کالے بالوں والا ہمیں ہے۔“

ہمیں تقریباً تین سال کا تو منہ محض تھا، اس کے چہرے سے ایک قسم کی سفاکی اور اذیت پسندی فیک رہی تھی۔ میرے ساتھی نے کہا۔ ”یہ بہت خبیث آدمی ہے۔۔۔ ڈیک نیا آیا ہے اسے ہمیں کے بارے میں علم نہیں ہے۔“

”یہ کس لیے جیل میں آیا ہے؟“

”اس نے نہایت سفاکی سے ایک لڑکی کو آبروریزی کے بعد کلڑے کلڑے کر کے قتل کیا تھا۔ عدالت میں اس کے وکیل نے اسے ذہنی مریض ثابت کیا۔ اس وجہ سے اسے صرف پانچ سال کی سزا ہوئی ہے، اس میں سے بھی دو سال کا بیروں ہے۔ اسے یہاں آئے ہوئے یہ دوسرا سال ہے۔ ایک سال بعد یہ بیروں پر رہا ہو جائے گا۔“

لڑکے نے مجھے روک لیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کارل۔۔۔“

میں چونکنا ہو گیا۔ ”ہاں کہو۔۔۔“

”مجھے فرانز نے بھیجا ہے۔“

”کیا کہا ہے اس نے اور ویسے یہ فرانز کون ہے؟“

میں نے انجان بن کر کہا۔

لڑکا مسکرایا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو میں کس فرانز کی بات کر رہا ہوں۔“

”دیکھو اگر تمہارے پاس کوئی کام کی بات ہے تو کرو ورنہ میرا راستہ چھوڑ دو۔“

”کام کی بات یہ ہے۔“ اس نے اچانک اپنی ہتھیلی میرے چہرے کی طرف کی تو میں بدک کر پیچھے ہٹا۔ میں سمجھا وہ مجھ پر حملہ کر رہا ہے لیکن جب میں نے اس کی ہتھیلی کو دیکھا تو اس پر ایک نمبر لکھا تھا، غور کرنے پر وہ پارسل نمبر ثابت ہوا۔

”ٹھیک ہے میری چیز کہاں ہے؟“

”فرانز نے کہا ہے پہلے کوڈ بتاؤ تب وہ چیز ملے گی۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”طے یہ ہوا تھا جو شخص مجھے وہ چیز دے گا تب میں اسی شخص کو کوڈ بتاؤں گا۔“

لڑکے نے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی اور سمجھ گیا تھا کہ وہ ناکام رہا تھا۔ اس نے جیب سے وہی چھوٹا سا سلینڈر نکال کر مجھے تھما دیا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا، یہ وہی سلینڈر تھا۔ مطمئن ہو کر میں نے لڑکے سے کہا۔ ”غور سے سنو۔ میں دوبارہ نہیں بتاؤں گا یا دکر لو۔“

”تم فکر مت کرو کوڈ بتاؤ۔“

میں نے اسے چھ عدد والا کوڈ بتایا اور وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ یقیناً فرانز کا آدمی تھا۔ میں نے سلینڈر احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا اور رات کو ٹھہری میں جاتے ہی اسے سامان رکھنے والے خانے کے اس خلا میں چھپا دیا جو میں نے کوشش کر کے تلاش کیا تھا اور پھر اسے ایک تار سے کرید کرید کر اتنا بڑا کر لیا تھا کہ اس میں یہ سلینڈر چھپا سکتا تھا۔ اگلے روز میں پہلی بار کھلے میں آیا۔ موسم اب بھی سرد تھا لیکن برف باری نہیں ہوئی تھی اور جیل کا احاطہ صاف تھا۔ قیدی گرم کپڑوں میں مختلف کھیلوں میں مگن تھے یا ایکسرسائز اور دوستانہ جسمانی مقابلوں میں وقت گزار رہے تھے۔ میں نے ہمیں کو تلاش کیا اور وہ مجھے ایک طرف چند افراد کے ساتھ مل گیا وہ آپس میں بات کر رہے تھے۔ صورت، جسامت اور انداز سے وہ ہمیں کی فکر

کے نظر آتے تھے۔ شاید یہ جیل میں اس کا گروپ تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ سگریٹ پی رہے تھے اور باری باری جس طرح سب ایک ہی سگریٹ پی رہے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا وہ نشا آور سگریٹ تھی۔

یہ سارا دن میں باہر رہا لیکن کسی ایک جگہ نہیں بیٹھا تھا بلکہ حرکت کرتا رہا۔ ہمیں سچ سے پہلے واش روم والے حصے میں گیا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس دن وہ جہاں جہاں بھی گیا میں غیر محسوس انداز میں اس کے پیچھے رہا۔ البتہ اس کے بہت پاس جانے سے گریز کیا تھا۔ وہ بہت چونکا اور بے چین آنکھوں والا شخص تھا جو اپنے پاس آنے والے ہر فرد کو بہت مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کے قریب جانے سے گریز کیا تھا۔ اس کے بعد احتیاطاً ایک دن چھوڑ کر ایک دن میں اس کی نگرانی کرتا رہا اور ایک مہینے میں اس کے تمام معمولات سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ مجھے یہ جان کر قطعی حیرت نہیں ہوئی کہ وہ نہ صرف خود چرس اور کوکین کا نشہ کرتا تھا بلکہ جیل میں اس کا کاروبار بھی کرتا تھا۔ وہ نہ جانے کس ذریعے سے یہ منشیات منگواتا تھا اور جیل میں ضرورت مند قیدیوں کو منہ مانگے داموں بیچتا تھا۔ ظاہر ہے اس میں جیل کے عملے کے لوگ بھی ملوث تھے۔ یہ جاننے کے بعد میں مزید محتاط ہو گیا تھا۔ وہ جیل میں رہ کر جرم کر رہا تھا اس لیے وہ اپنے آس پاس سے بہت زیادہ چونکنا تھا، اگر اسے مجھ پر شک ہو جاتا تو پھر میں اپنا کام آسانی سے نہیں کر سکتا تھا۔

میری احتیاط رنگ لائی مجھے وقت تو لگا لیکن بالآخر میں نے اس کے بارے میں سب کچھ جان لیا تھا۔ اس کی وہ عادت جو مجھے کام کی لگی تھی، وہ سچ سے پہلے لازمی لیٹرین جاتا تھا اور وہاں خاصی دیر قیام کرتا تھا۔ وہ وہاں اتنی دیر لگاتا کہ باقی سب قیدی لٹچ کے لیے بیٹھ جاتے تھے اور وہ اس وقت میں میں آتا جب لٹچ کا وقت تقریباً ختم ہونے والا ہوتا تھا اور اکثر وہ اپنی ٹرے باہر لے جا کر کھاتا تھا۔ لٹچ کا وقت ختم ہوتے ہی میں خالی کرنا لازمی تھا، اس کے بعد کوئی قیدی وہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ لیٹرین میں اتنی دیر کرتا کیا تھا؟ لیکن مجھے اس بارے میں زیادہ تجسس نہیں تھا۔ اس کا لیٹرین میں قیام کا یہ وقت مجھے اپنے منصوبے کے لیے موزوں لگ رہا تھا۔

مجھے جیل آئے دو مہینے ہو چکے تھے اور تیسرے مہینے کا آغاز تھا۔ ایک مہینے کے اندر میری بیروں پر رہائی یقینی تھی۔ مجھے اس سے پہلے ہی اپنا کام کرنا تھا۔ ہفتے والے دن قیدی جلدی لٹچ کے لیے بیٹھنے کی طرف یلغار کرتے تھے کیونکہ



ہفتے کو سب سات بجے باہر آتے تھے اور اس لحاظ سے ناشتا بھی ایک گھنٹا پہلے ملتا تھا لیکن لٹچ کا وقت وہی دو سے تین تھا۔ بھوک سے بے تاب قیدی جلدی میں پہنچ جاتے تھے۔ سوائے ہمیں کے وہ، اپنے معمول کے مطابق لیٹرین میں خاصا وقت گزار کر آتا تھا۔ میں نے آنے والے ہفتے کو چن لیا۔ اس صبح میں وہ سارا سامان ساتھ لے کر نکلا تھا جو میں نے ادھر ادھر سے حاصل کیا تھا۔ یہ سامان اپنے لباس میں چھپایا تھا۔ سلینڈر بھی نکال لیا تھا۔ جیسے ہی لٹچ کے لیے گھنٹا سجا تمام قیدی بیٹھنے کی طرف روانہ ہو گئے اور ان میں سے کچھ نے پہلے واش روم کا رخ کیا تھا۔ ان میں، میں بھی شامل تھا اور جبکہ ہمیں تو شامل تھا ہی۔

واش روم ایریا میں تین لیٹرین تھے۔ ان میں سے ہر

ایک میں آئے سامنے دس دس خانے بنے ہوئے تھے اور ہر خانے میں ایک کموڈ لگا تھا۔ پیشاب کے لیے الگ حصہ تھا۔ ہر لیٹرین میں داخل ہونے کا دروازہ ایک ہی تھا جس کے پاس ہی ہاتھ منہ دھونے کی جگہ تھی۔ کموڈ والے خانے اس سے آگے تھے۔ میں ہاتھ دھونے کے بہانے رک گیا اور دیکھا کہ ہینس بائیں طرف کے آخری خانے میں داخل ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی خانے میں جاتا تھا۔ میں ایک کموڈ والے خانے میں داخل ہوا اور اندر بیٹھ کر سامان نکالا۔ اس دوران قیدی جلدی جلدی فارغ ہو کر رخصت ہو رہے تھے۔ آخری قیدی کے جاتے ہی میں نے باہر نکل کر ایک تختی دروازے کے باہر لگا دی جس پر آؤٹ آف آرڈر لکھا تھا۔ اگر کوئی آتا بھی تو وہ دوسرے لیٹرین کا رخ کرتا یہاں نہیں آتا۔ جوتے میں پہلے ہی اتار چکا تھا اور دبے قدموں واپس خانے میں آ گیا۔

ہینس دم سادھے آخری قیدی کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی میں دروازہ بند کر کے آیا، اس کے خانے سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے وہ کموڈ کو اپنی جگہ سے اکھاڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ آوازیں کچھ دیر بعد رک گئیں۔ میں نے اپنی جیب سے سلینڈر نکالا اور اسے دونوں سروں سے پکڑ کر مخالف سمتوں میں گھمایا۔ اس کی نہ نظر آنے والی سیل آسانی سے ٹوٹ گئی اور سلینڈر کے دونوں سروں سے دو عدد کپسول نما چیزیں نکل آئیں۔ ان میں سے ایک نیلے رنگ کا تھا اور دوسرا سرخ رنگ کا۔ میں نے سرخ کپسول احتیاط سے سلینڈر میں ڈال کر جیب میں رکھ لیا اور پھر منہ پر کپڑے سے بنا ایک ماسک چڑھایا، یہ میں نے خود بنایا تھا جیسے آؤٹ آف آرڈر کی تختی خود بنائی تھی۔ میں دبے قدموں خانے سے نکلا اور ہینس والے خانے کی طرف بڑھا۔ اس نے لیٹرین خالی پا کر بے فکری سے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا اور کموڈ کی طرف جھکا ہوا کچھ کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ فلیش ٹینک کو ہٹا کر اس کے پیچھے نظر آنے والے خلا سے کچھ نکال رہا تھا اور اس کی توجہ پوری طرح اس طرف تھی۔

یہ بہترین موقع تھا، میں نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا اور خاموشی سے اس کے پیچھے جا کر نیلا کپسول اس کی گدی پر رکھتے ہوئے کپسول کو دبایا تو گیس نکلنے جیسی آواز آئی اور ہینس فوراً ہی بے سدھ ہو کر منہ کے بل کموڈ پر گر پڑا۔ میں نے اسے کھینچ کر پیچھے کیا، کپسول میں موجود دوا نے کام دکھایا تھا۔ یہ مخصوص قسم کا کپسول تھا جس میں دوا گیس کی صورت میں پریشر سے بھری ہوتی ہے اور کپسول دباتے ہی یہ سامنے کی طرف سے نکلتی ہے، پریشر کی وجہ سے یہ جلد سے ہوتی کسی

انجکشن کی طرح خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ یہ جسم کو سن کر دینے والی دوا تھی۔ آدمی ہوش میں رہتا ہے لیکن نہ تو بول سکتا ہے اور نہ بل سکتا ہے۔ میں نے پھرتی سے ہینس کو پیچھے کھینچا اور کموڈ کا معائنہ کیا۔ تب انکشاف ہوا کہ ہینس اس کموڈ کے فلیش ٹینک کے پیچھے موجود خلا کو منشیات اور رقم رکھنے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اس میں ایک پیکٹ میں کوکین، ایک میں چرس اور ایک میں مختلف کرسی نوٹ تھے۔ میں فکر مند ہو گیا اگر کوئی غیر متوقع طور پر آ جاتا تو ہینس کے ساتھ میں بھی پکڑا جاتا اور جیل میں منشیات کے کاروبار میں ملوث ہونے کا الزام نہایت سنگین کیس بن جاتا۔ میں نے فلیش ٹینک کا جائزہ لیا اور سمجھ گیا کہ اسے کس طرح بند کرتے ہیں۔ اسے بند کر کے میں باہر آیا جہاں ہینس بے بسی سے فرش پر پڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ دو گھنٹے سے پہلے حرکت کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ذرا جھک کر کہا۔

”تم سوچ رہے ہو گے کہ میں تمہارا کوئی کاروباری حریف ہوں اور بزنس کی وجہ سے یہ حرکت کی ہے لیکن تمہارا یہ خیال غلط ہے۔“

میں نے سلینڈر سے دوسرا کپسول نکالا اور زبردستی اس کا منہ کھول کر اس میں ڈال دیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا لیکن وہ مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔ ”اس کپسول میں کیا ہے یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے میں تمہیں کچھ اور بتاؤں گا۔ تمہیں وہ لڑکی یاد ہے جسے تم نے اغوا کیا اور پھر ایک ہفتے تک اسے اپنی قید میں رکھ کر تشدد کا نشانہ بناتے رہے۔ تم نے اسے بار بار درندگی کا نشانہ بنایا اور اس پر بھی تمہارا دل نہیں بھرا تو تم نے اسے زندہ حالت میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے مار دیا۔ اس کے ٹکڑے زمین میں دفن کر دیے لیکن تم پکڑے گئے۔ تمہارے جرم کے لحاظ سے تمہیں سزائے موت ہونی چاہیے تھی لیکن تمہارے وکیل کی چالاکی سے تم نفسیاتی مریض بن کر بچ گئے۔“

اس سے باتوں کے دوران میں نے سلینڈر اور دوسری چیزیں ایک کموڈ میں بہا دیں اور کئی بار فلیش ٹینک چلایا تاکہ یہ چیزیں بہہ کر سیوریج میں دور چلی جائیں۔ اس کے بعد میں واپس ہینس کے پاس آیا۔ وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے اس سے صرف میں بات کر سکتا تھا۔ ”تم نے جو کپسول کھایا ہے بلکہ میں نے کھلایا ہے اس میں ایک تیز اثر کیمیکل ہے جس کی خاصیت کچھ تاب کار مواد جیسی ہے یعنی یہ جسم کو گلا سڑا دیتا ہے لیکن یہ تاب کاری خارج نہیں کرتا۔ ایک بار یہ جسم میں شامل ہو جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں

ہے... سنا تم نے دنیا کا کوئی علاج اور کوئی ڈاکٹر تم کو نہیں بچا سکتا۔ تم زیادہ سے زیادہ دو ہفتے میں لمحہ بہ لمحہ موت کا شکار ہو جاؤ گے اور اس دوران میں ایسے کرب و اذیت سے گزر رہے گے جس کا تم نے بھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ ہاں شاید تمہارے ہاتھوں لوگ ایسے کرب سے گزر رہے ہوں۔ بہر حال اب انصاف ہو گیا ہے۔“ میں اس کے پاس سے کھڑا ہو گیا۔ ”دو گھنٹے بعد تم حرکت کر سکو گے لیکن اس کے بعد تم صرف دو ہفتے اور اپنے اس گندے وجود کے ساتھ دنیا میں گزار سکو گے۔ یہ اس لڑکی کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کا بدلہ ہے۔“

میں نے ان تمام غیر متعلقہ جگہوں سے اپنی انگلیوں کے نشانات مٹائے جہاں یہ جیل حکام کو مشکوک کر سکتے تھے۔ آؤٹ آف آرڈر کی سختی اور نقاب میں نے میں کی طرف جاتے ہوئے ایک ڈسٹ بن میں چھینک دیا۔ میں میں میں آیا تو سب معمول کے مطابق تھا۔ میں اپنا کھانا لے کر اپنے گروپ کے پاس آ بیٹھا۔ میرے ساتھی نے کہا۔ ”ہے کارل، آج تم نے دیر کر دی۔“

”بس ایک ضروری کام نمٹا رہا تھا جس کے لیے میں اس جیل میں آیا ہوں۔“ میں نے سنجیدہ بات کو مزاح کے انداز میں کہا تو سب ہنس پڑے۔ جب تک ہم لچ کر کے فارغ ہوئے کسی نے ہمیں گولیٹرین کے فرش پر بے حس و حرکت پڑا دیکھ لیا تھا۔ اس نے شور مچا کر پہلے انتظامیہ کو بتایا اور جب جیل کا عملہ ہمیں کو جیل کے اسپتال لے گیا تو وہ سنسنی پھیلانے کے لیے سب کو بتانے دوڑا آیا اس نے میں میں اعلان کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمیں کے گروپ کے مخصوص لوگ یہ سن کر فکر مند ہو گئے تھے۔ ان کا دھیان اپنے کاروباری حریفوں کی طرف گیا ہوگا۔ اس کا مطلب تھا آنے والے چند دنوں میں جیل میں فساد متوقع تھا۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ رات تک ہمیں واپس آ گیا تھا۔ پتا نہیں اس نے جیل حکام کو کیا بیان دیا تھا۔ اگر اس نے حقیقت بتا دی تھی تب بھی کسی کا دھیان میری طرف نہیں جاسکتا تھا۔

دوسرے دن اسے جیل سے کہیں لے جایا گیا اس وقت تمام قیدی محن میں جمع تھے اور ہمارے سامنے ایک ایسولینس ہمیں کو لے کر روانہ ہوئی تھی۔ شام کوئی وی پر ہمیں کے بارے میں خبر آ رہی تھی۔ وہ اسپتال میں تھا اور ڈاکٹروں کے مطابق اسے کوئی ایسا زہریلا کیمیکل کھلایا گیا تھا جس کا توڑ ان کے پاس نہیں ہے اس کیمیکل نے ہمیں کے پورے جسم کو متاثر کیا تھا۔ اس کی حالت تیزی سے بگڑ رہی تھی۔ ٹی وی پر اس کی چند لمحوں کی جو ویڈیو دکھائی گئی اس میں اس

کا چہرہ عجیب سا لگ رہا تھا جیسے کسی نے باریک تیز دھماکے سے اس کے چہرے پر مسکرت میں کچھ لکھنے کی کوشش ہو۔ وہ نڈھال سا اسپتال کے بستر پر پڑا تھا۔ قیدیوں کے لیے یہ ایک سنسنی خیز خبر تھی۔ رات سے پہلے جیل کے قیدیوں کو علم ہو گیا تھا کہ کسی قیدی نے نقاب پہن کر ہمیں زبردستی ایک کپسول کھلایا تھا اور اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ لڑکی کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کا جواب ہے جس قتل کے الزام میں ہمیں کو سزا ہوئی تھی۔ جیل حکام کے کسی قیدی کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اگلے دن پوری کی مکمل تلاشی لی گئی بہت سارے قیدیوں کے پاس سے اشیائیں لیکن ان سے ہمیں کے ساتھ ہونے والی واردات پر کوئی روشنی نہیں پڑی تھی۔

دو تین دن اس حوالے سے خاصی سنسنی رہی۔ واقعہ تھا کہ جیل انتظامیہ مل کر رہ گئی تھی۔ مگر چوتھے دن سے معمول پر آ گیا۔ ٹی وی پر ہمیں کو دکھانے کا سلسلہ بند کر گیا تھا۔ اس کی صورت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ حکومت طرف سے پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ عورتیں اور بچے کی طرف سے دیکھ کر ڈر جاتے۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ خلاف توقع اس واقعے کے بارہویں دن وارڈن کے دفتر سے میرا بلاوا آ گیا تھا۔ اس نے مجھے اطلاع دی کہ میرے اچھے چال چلن کی وجہ سے جیل کے مجھے بل از وقت پیرول پر رہا کرنے کی سفارش کر دی اور کل صبح مجھے رہا کیا جا رہا تھا۔ یہ رہائی سرکاری وکیل مرہون منت بھی تھی جس نے بعد میں بھی میرے لیے جیل سے رابطہ رکھا اور بل از وقت ہی مجھے پیرول پر رہا کر کے اس میں کامیاب رہا۔ اگرچہ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ میرا کوئی گھر نہیں تھا اس لیے پیرول کی مدد تک مجھے ایک کیونٹی سینٹر میں رہنا تھا اور لوگوں کے کام کرنا تھے۔ یہ کیونٹی سینٹر لاوارث، بیمار اور غریب لوگوں کے تھا۔ سزا یافتہ قیدی یہاں ان لوگوں کی خدمت کرتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ مجھ پر کوئی پابندی نہیں تھی لیکن رات بچے تک مجھے لازمی کیونٹی سینٹر میں موجود ہونا تھا۔ اس علاوہ جو کام میرے ذمے لگایا جاتا اسے انجام دینا تھا میرا کام بہت آسان تھا، مجھے ان بوڑھے مریضوں کو دوا چیر پر بٹھا کر باہر لان کی سیر کرانی تھی جو از خود چل پھر نہیں پاتے تھے۔ یہ ڈیوٹی صبح دس سے شام چھ بجے تک تھی۔ دوسرے دن میں کیونٹی سینٹر میں ہی رہا۔ تیسرے دن میں ڈیوٹی کے وہاں سے نکلا اور زیر زمین چلنے والی میٹرو وین کی مدد سے

ہسپتال تک پہنچا جہاں ہمیں داخل تھا۔ میں نے نیچے ریسپشن سے ہمیں کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ انتہائی بے ہمتی کے شے میں تھا اور اس کی حالت تشویش ناک تھی۔ میں ادھر آیا تو ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے مجھے ہمیں کی ایک جھلک دکھائی اور اسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگرچہ یہ میں نے ہی کیا تھا لیکن میں نے سوچا نہیں تھا کہ اس کیمیکل کا نتیجہ اتنا خطرناک نکلے گا۔ بائو لو جسٹ کی حیثیت سے میرے لیے یہ کیمیکل حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا اور مجھے اس کی قاتل خصوصیت کا اچھی طرح پتا تھا لیکن یہ انسانی جسم کا کیا حال کرتا ہے اس کا مجھے پہلی بار اندازہ ہوا تھا۔ ہمیں بستر پر گئے سڑے گوشت کا ڈھیر سا بن گیا تھا۔ اس کا منہ اتنا خراب ہو گیا تھا کہ اندر کی ہڈیاں نکل آئی تھیں اور وہ نہ جانے اس حال میں زندہ کیسے تھا۔ بہر حال اسے اس حال میں دیکھ کر مجھے بہت اطمینان ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ اگلے چوبیس گھنٹے گزار لے تو بڑی بات ہوگی۔

میں آنے والے سوا دو مہینے تک کیونٹی سینٹر میں اپنا کام کرتا رہا۔ مجھے معلوم تھا میں مدت پوری کے بغیر غائب ہوا تو مفروضہ قرار دیا جاؤں گا اور پولیس مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس کے پاس میری تصویر اور منکر پرنٹ آگئے تھے۔ اگر وہ کوشش کرتے تو مجھے تلاش بھی کر سکتے تھے اور انہیں یہ معلوم کر کے زیادہ خوشی ہوتی کہ ان کا مطلوبہ مجرم اصل میں ویانا کا ایک یونیورسٹی پروفیسر ہے۔ اس کے بعد یہ تحقیق ہوتی کہ میں نے ایسا کیوں کیا اور جلد یا بدیر پولیس ہمیں کے ساتھ ہونے والی کارروائی کا ذمے دار مجھے ہی قرار دیتی۔ اس لیے جلد بازی سے بہتر تھا کہ میں کچھ صبر سے کام لیتا اور ایک بار مجھے رہائی مل جاتی تو میں یہاں سے غائب ہو جاتا۔ پھر کارل شوٹز کا دنیا میں کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ جرمن حکومت نے اسی نام سے میرے کاغذات بنوا دیے تھے اور اب میں باقاعدہ جرمن شہری تھا۔ جب تک میں جیل میں رہا میں نے سر کے بال چھوٹے رکھے۔ اسی طرح مونچھوں سمیت فرنیچ کا انداز بھی برقرار رکھا۔ اس سے میرا حلیہ بالکل مختلف ہو گیا تھا۔

بالآخر پانچ مہینے کی سزا پوری ہوئی اور مجھے کیونٹی سروس کی قید سے بھی رہائی مل گئی۔ میں نے سب سے پہلے اپنی خاصی بڑھ جانے والی فرنیچ ڈاڑھی اور مونچھیں صاف کیں۔ پھر پارکنگ میں موجود گاڑی تک آیا۔ خدشات کے ساتھ میں نے گاڑی کے سسٹم کو ان لاک ہونے کا حکم دیا اور مجھے خوشی ہوئی جب اس نے حکم کی تعمیل کی یعنی بیٹری چارج

ہوتی رہی تھی۔ میں نے اپنا سامان نکالا اور لباس تبدیل کیا۔ میرے پاس رقم تھی اور مجھے بینک سے رقم نکوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ باہر نکل کر میں نے کار کی نمبر پلیٹس تبدیل کیں اور فوری طور پر روانہ ہو گیا۔ اپنا پرانا لباس اور نمبر پلیٹس میں نے ایک جگہ ڈسٹ بن میں ڈال دی تھیں۔ میونخ میں ایک رات اسی طرح ایک کال گرل کے گھر میں بسر کی اور اگلے دن ایک اور جگہ سے سرحد پار کی۔ اس طرح سرحدی حکام کو پتا نہیں چلا کہ میں کب جرمنی آیا تھا۔ انہوں نے کار اور پاسپورٹ دیکھ کر مجھے جانے کی اجازت دیدی۔ جب تک اس بات کی خاص طور سے جانچ نہ ہوتی کہ میں کب جرمنی آیا اور کیا تو کسی کو بھی پتا نہ چلتا کہ میں پانچ مہینے سے زیادہ عرصے جرمنی کی ایک جیل میں رہا تھا۔

گھر واپس آیا اور تمام چیزوں کو ورکنگ آرڈر میں لے آیا۔ ایک دن بعد میرا گھر ویسا ہی ہو گیا جیسے پانچ مہینے پہلے تھا۔ میں نے یونیورسٹی ای میل کی کہ میں واپس آ گیا ہوں اور کل سے یونیورسٹی جوائن کروں گا۔ ای میل پر ہی مجھے شوکا ز نوٹس بھیج دیا گیا تھا۔ یہ قابل اطمینان بات تھی کہ مجھے ملازمت سے فارغ نہیں کیا گیا تھا۔ میں کل یونیورسٹی جا کر حکام کے سامنے کوئی معقول وضاحت پیش کر سکتا تھا کہ میں کیوں پانچ مہینے یونیورسٹی سے غیر حاضر رہا۔ مجھے اعتماد تھا کہ میں انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد میں اپنی معمول کی زندگی وہیں سے شروع کروں گا جہاں سے پانچ مہینے پہلے رکی تھی۔

پانچ مہینے پہلے فرینکفرٹ سے آنے والے خط میں اس جاسوس فرم نے مجھے اطلاع دی تھی کہ میری اکلوتی بیٹی شرمین آج سے کوئی دو سال پہلے ایک جنسی جنونی کے ہاتھو ماری گئی تھی اور وہ جنونی ان دنوں جیل میں سزا کاٹ رہا ہے۔ خط میں مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ اسے صرف پانچ برس کی سزا ہوئی ہے۔ میں نے کچھ عرصے پہلے اس فرم کو شرمین کی تلاش پر مامور کیا تھا اور میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنی اندوہناک خبر سننے کو ملے گی۔ قاتل کی سزا کا سن کر میں نے محسوس کیا کہ اسے تو سزا ملی ہی نہیں ہے اور تب میں نے اسے خود سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ میں اس کے جیل سے باہر آنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے خدشہ تھا اس دوران میں میرے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ میں نے اپنے فیصلے پر فوری عمل کیا۔ اب میں مطمئن تھا کہ میں نے اپنی بیٹی کے قاتل کو وہ سزا دیدی تھی جس کا وہ مستحق تھا۔



اسرار اور تحیر کے پردے
میں لپٹا ایک منفرد
طویل سلسلہ

کشکول

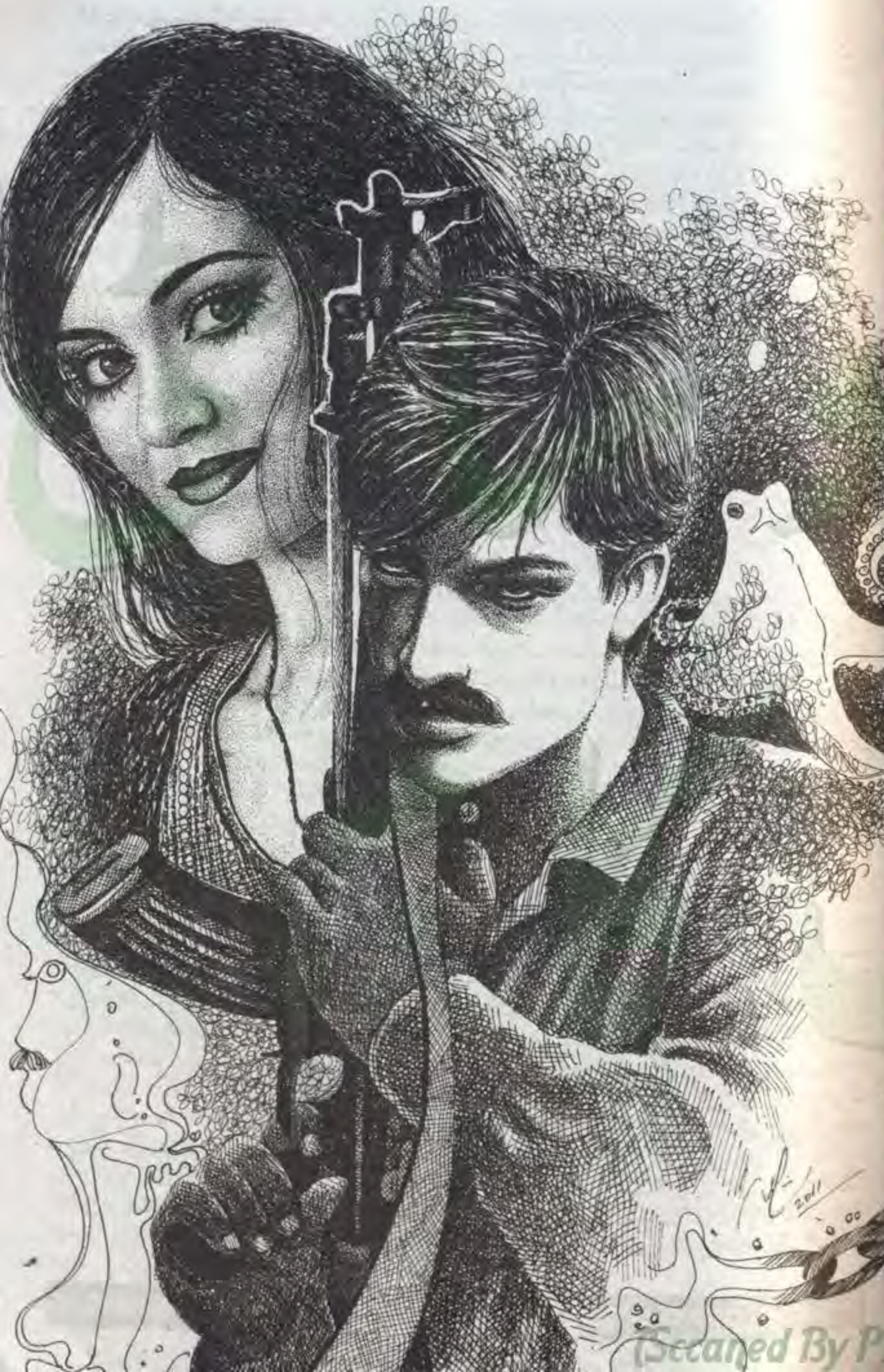
انوار صدیقی

چودھویں قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں پوش ریا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبیہی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلازی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ ساز یوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

***** گذشتہ اقساط کا خلاصہ *****

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیر سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی یک لکھی جگہ نہیں دی شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو فیہی تعلیم کے زیور سے آرا تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی لکھی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک قبرستان میں ایک سیاہ فام دروازہ قد شخص پر تاب بھونچ کر برہنہ حالت میں کوئی پر اسرار گل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشان دہانی قبر سے ایک نیوٹلا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سونیاں بیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیوٹلا سونیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشہ لے لے جاتا ہے تو جب ایک تاڑینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ تاڑینا کے اسرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھو لدا ری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ تاڑینا خود چھو لدا ری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں مچھی۔ بزرگ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلا تا ہے۔ ایک چنگی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں تاڑینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک اس چنگی کا ذکر بھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر تاڑینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چنگی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آوازے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز بھی مایوسی کے عالم سے وہ چار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے فریے لیاقت حسین کی رسائی سینٹ مین تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت رکھ لیا جاتا ہے۔ سینٹ مین اور ان کی اہلیہ راجیلہ بیگم سنبھلے ہوئے ہمدرد لوگ تھے سینٹ مین کا روبرو باری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں فتح حامد بظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ فتح حامد کا خاص آدمی "بلیک ناٹنگر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا لیکن براہ راست وہ بھی فتح حامد کی اہلیت سے ناواقف تھا۔ فتح حامد کے خائن میں سرفہرست میڈم روہنی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روہنی نے بھی انڈورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد و مالوچن اور سیام فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو فتح حامد کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان فتح حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو



کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روپی سے گھبر کر رہی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں ہے۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روپی کو اغوا کر کے اس کی خراب اخلاقی تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ دوسرے شخصین کو بھی زیر کرنے کی سازشوں کے جال بناتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کرتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آ جاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ داروں میں افضل خان بھی زیر عتاب آ جاتا ہے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے جب شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے قلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ کہنے پر ایک اور بڑے تاجر ستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالبیور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ شیخ حامد کے اثر و رسوخ مرکز تک پہنچنے کی وجہ سے پولیس کے کچھ اعلیٰ افسران بھی اپنی روایتی مجبوری کے تحت اس کے راستے میں آنے کی غلطی نہیں کرتے تھے۔ ایماندار آئی جی عظیم احمد کے رہنما ہونے بعد اس کی جگہ آغا منصور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کانٹنے کی حثایت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سر ہے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی عظیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سرانج ایسا اور فرض شناس افسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آ چکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سرانج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سرانج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو سرنے والی کے سوا بال سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے سرنے سے پیشتر آخری کال سرانج کو کی تھی۔ سرانج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کر لیتا ہے۔ شیخ حامد کے غصے الماس کو بے آبرو کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت برحق سرانج ہی کے ذریعے الماس کو روانی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تحقیق شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم قلم تھی وہ سرانج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخیز ذہنی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے معاملے کو دانش سمیت آگ لگا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر رہتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انٹیلی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کر لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پر تاب بمبھٹن جو غلط کامیاب تھا، اپنے نیچو والے ٹائل کی ناکائی کے بعد لیاقت حسین کو ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روپی سین انصار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران اپنی ذاتی سیکرٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک ہنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو بے درپے دو ہنگلے ملتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پاکر لودھی کو معطل کر دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روپی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی ”بلیک ٹائیگر“ کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ”بلیک ٹائیگر“ کی موت شیخ حامد کے لیے ایک جھلکا ثابت ہوتی ہے۔ سرانج جولیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات حق تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سرانج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سرانج اور لیاقت حسین جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے رہنما زہید کا شکیل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی مزا بھگتے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ امداد سے ملاقات کے بعد جب جگا ایک مخصوص ٹھکانے پر واپس آتا ہے تو ایک شخص کو دیکھ کر چپکنا ہے جو اس کمرے تک آ گیا تھا جہاں کسی دوسرے غیر متعلق شخص کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جگا اور اس نووارد کے درمیان معمولی جھڑپ ہوتی ہے پھر چند اہم انکشاف رونما ہوتے ہیں۔ سیاہ فام ہاشم کو سین انصار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران ستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سرانج اسپتال سے ملازمہ گلاب کی خودکشی کی تحقیق کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سرانج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد نے کنول سے شادی کے بعد دونوں گواہوں اور کنول کی ماں کے کل کے احکامات جاری کر دیے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعہ محفوظ کر لی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اسے سر پرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے۔ امداد علی اسے فی الحال مہر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے قلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت ستا تا ہے اور نگزب طربان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سرانج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگ زیب اینڈ مینی شیخ حامد کے خلاف گھیرائیگاہ کرتی ہے۔ شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اور نگزب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دین پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگ زیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بد مزگی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے یہ معاملہ ہوا ہے لہذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرادیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلہ حملہ کیا گیا لیکن وہ اپنی صلاحیتوں کے سبب محفوظ رہا۔

ایس پی اورنگ زیب کے موقع واردات پر پہنچنے کے بعد ملحقہ تھانے کا عملہ اور پولیس فورس کی کچھ اور گاڑیاں بھی پہنچ گئیں۔ اورنگ زیب کی ہدایت پر سڑک پر دونوں سمت پولیس تعینات کر کے راستے بلاک کر دیے گئے۔ علاقے کے لوگوں نے بھی قانون نافذ کرنے والے مختلف اداروں کو فون پر اس خونی ٹکراؤ کی اطلاع دی تھی جس میں سات آٹھ انسانی قتل کی کہانی بھی سنائی گئی تھی۔

پویشن کو کنٹرول کرنے کے بعد اورنگ زیب نے سب سے پیشتر لیاقت حسین کا ہاتھ تھام کر اپنی گاڑی میں بٹھایا پھر علاقہ پولیس کے انسپکٹر کو ایک طرف کھڑے ہو کر کارروائی کے مختلف پہلوؤں پر بریفنگ دینے لگا۔

”جس بندے کو میں نے اپنی گاڑی میں بٹھایا ہے وہ میرا ذاتی واقعہ کار ہے۔ حادثے کی اطلاع اسی نے مجھے دی تھی، میں نہیں چاہتا کہ اس کا نام کسی بھی طرح درمیان میں آئے ورنہ کچھ جانے پہچانے مجرم بھی چوکنہ ہو جائیں گے۔“

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو بھی کسی نامعلوم فرد کی طرف سے فون کر کے اطلاع ملی تھی۔“

”میں سمجھ رہا ہوں سر.....“ انسپکٹر نے کہا۔ ”سب کچھ آپ کی ہدایت کی روشنی میں ہوگا۔“

”جو لاشیں بکھری پڑی ہیں وہ یقیناً پولیس کو مطلوبہ مجرموں کی ہوں گی جن کو ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔“

”سر..... کیا آپ کو اس قسم کے کسی مقابلے کی توقع پہلے سے تھی؟“

”ہیں..... اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس واردات کی پشت پر کس کا ہاتھ ہے۔“ اورنگ زیب نے سرد لہجے میں اعتراف کیا۔ ”جو آدمی میرے ساتھ جائے گا وہ اسی کے جان کے دشمن تھے۔“

”ایسی صورت میں تو میرا خیال ہے کہ آپ اگر اس کا تحریری بیان لے لیں تو.....“

”نہیں..... فی الحال میں اس کا نام کسی صورت درمیان میں نہیں لانا چاہتا۔“

”نہیں آئے گا سر..... لیکن جن لوگوں نے یہ قاتلانہ ڈراما اسٹیج کیا ہے وہ تو جانتے ہوں گے؟“

”ہاں..... اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ان کو آسانی سے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔“ اورنگ زیب نے قدرے کرحش لہجے میں جواب دیا پھر کچھ توقف سے بولا۔

”کوشش کیجیے گا کہ میڈیا کے لوگ بھی مرنے والوں کی

تصاویر نہ بنا سکیں۔“

”اوکے سر..... میں اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔“

”آپ ضروری کارروائی کے بعد لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیں..... مجھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، آپ کی تمام کاغذی کارروائی کی رپورٹ کل تک یقینی طور پر درکار ہوگی..... ممکن ہو تو مرنے والوں کی ہسٹری بھی معلوم کر کے اپنی رپورٹ کے ساتھ مجھے پہنچا دیں، اس کے بعد ہی میں آپ کو کسی جوابی کارروائی کے لیے مزید ضروری گائیڈ لائن دے سکوں گا۔“

”سر.....“ انسپکٹر نے اورنگ زیب کی بات پوری طرح سمجھنے کے بعد دہلی زبان میں کہا۔ ”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس مجرم کو بھی فوری طور پر حراست میں لے لیں جو اس حادثے کا ذمہ دار ہے۔“

”آپ کا مشورہ قانون کے عین مطابق ہے لیکن.....“

اورنگ زیب نے ہونٹ کاٹتے ہوئے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”اس کو حراست میں لینے کا خواب ابھی ہمارے اعلیٰ افسران اور عہدیدار بھی نہیں دیکھ سکتے۔“

”آئی۔سی۔“ انسپکٹر نے حیرت کا اظہار کیا پھر وہ ضروری کارروائی میں مصروف ہو گیا۔

لیاقت حسین نے حملہ کرنے والے جس نقاب پوش کو زندہ چھوڑ دیا تھا وہ مردوں سے بھی بدتر حالت سے دوچار تھا۔ سب سے پہلے اس کی تصاویر لی گئیں پھر اورنگ زیب نے ایک سب انسپکٹر کو قریب بلا کر ہدایت دی۔ ”اسے ایبویلینس میں ڈال کر تھانے پہنچا دیں، میں بھی ادھر آ رہا ہوں۔“

”جو حکم سر.....“

”انسپکٹر سے کہہ دیں کہ اس زخمی کا شمار بھی قبل از وقت قریب المرگ لوگوں میں لکھ لیں۔“ اورنگ زیب نے زخمی کو حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ حضرات کارروائی جاری رکھیے، میں آدھے گھنٹے بعد تھانے پہنچ جاؤں گا۔ کوئی ضروری مشورہ یا گائیڈ لائن درکار ہو تو موبائل پر رابطہ کر لیں۔“

”رائٹ سر.....“

ماتحتوں کو ضروری ہدایتیں دینے کے بعد وہ اپنی گاڑی کی سمت گھوما تو اس کی نظر سیٹھ عثمان کی گاڑی پر پڑی، ایک لمحے کو اس نے رک کر کچھ سوچا پھر سب انسپکٹر کو دوبارہ قریب بلا کر کہا۔ ”آپ کو ایک زحمت اور دے رہا ہوں۔“ اس نے مطلوبہ کار کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کو کسی طرح ڈپٹی

سپرٹنڈنٹ سراج کی قیام گاہ تک پہنچا دیں، اس کا حوالہ بھی درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔“

سب انسپکٹر سے فارغ ہو کر وہ اپنی گاڑی میں آ گیا۔ لیاقت حسین اگلی نشست پر گم صم بیٹھا باہر کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے تاثرات نظر آرہے تھے۔ اورنگ زیب نے گاڑی اسٹارٹ کر کے واپسی کے لیے موڑ دی۔ موقع واردات سے کچھ دور آنے کے بعد اس نے لیاقت حسین کو بڑی سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

”تم کس سوچ میں گم ہو؟“

”میں گھر پر لیٹا ایک ذاتی مسئلے پر غور کر رہا تھا صاحب پھر..... آپ کے ساتھ اس وقت گاڑی میں کس طرح آ گیا؟“

لیاقت حسین کے چہرے سے عیاں الجھن اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ غلط بھی نہیں ہے۔ اورنگ زیب اپنی نشست پر کسمسا کر رہ گیا، عام حالات میں شاید وہ لیاقت حسین کے جواب کو تسلیم نہ کرتا مگر سراج بھی اسے بتا چکا تھا کہ کوئی روحانی قوت ایسی ہے جو لیاقت حسین کی رہنمائی کرتی ہے، وہ اس قوت کے تحت جو عمل کرتا ہے اس کے مکمل ہو جانے کے بعد گزری ہوئی باتیں اس کے ذہن سے محو ہو جاتی ہیں جس کا اثر وہ ذاتی طور پر لے کر اظہار کرتا ہے۔ سراج نے اورنگ زیب سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ لیاقت حسین کو اس مسئلے پر زیادہ نہ کریدے چنانچہ اس وقت بھی اورنگ زیب نے لیاقت حسین کے جواب پر کسی رد عمل کا اظہار کرنے کے بجائے دوستانہ انداز میں کہا۔

”میں تمہیں اپنے ساتھ لے آیا تھا مگر..... تم شاید ابھی تک اپنے ذاتی مسئلے پر غور کرنے میں مصروف ہو؟“

”صاحب..... آپ مجھے تسلی تو نہیں دے رہے ہیں؟“ لیاقت حسین نے دبی زبان میں سوال کیا۔

”تمہیں یہ خیال کیوں آرہا ہے کہ میں غلط بیانی کر رہا ہوں؟“

”وہ..... وہ.....“ لیاقت حسین نے گڑبڑا کر کہا۔

”دراصل میں اکثر کچھ باتیں بھول جاتا ہوں۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے جس کا اندازہ مجھے سراج صاحب کی باتوں سے بھی ہو چکا ہے..... ایسا کیوں ہوتا ہے صاحب؟“

”اس لیے کہ تم ضرورت سے زیادہ وفادار اور مخلص ہو۔“

”آ..... آپ اس وقت مجھے ساتھ کیوں لائے تھے.....؟“ لیاقت نے دوسرے انداز میں خود کو تسلی دینے کی

خاطر سوال کیا۔ ”میرا مطلب ہے کہ میں آپ کی کیا قدر کر سکتا ہوں۔“

”ذہن پر زور نہ دو۔“ اورنگ زیب نے بہ دست لہجے میں کہا۔ ”مجھے ایک حادثے کی رپورٹ ملی تھی، میں اس وقت سراج کے پاس تھا۔ آنے سے پہلے دوسرا ہٹ کی تمہیں بھی ساتھ لے آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ تم اس وقت نیند میں تھے، شاید اسی لیے تمہیں یاد نہیں، کچھ دیر بعد ہے کہ نیند کا خمار اترنے کے بعد تمہیں یاد آ جائے۔“

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس جواب سے اس طرح مطمئن نہیں ہوا تھا، اورنگ زیب نے اس کی کیفیت محسوس کر کے گفتگو کا رخ بدل کر پوچھا۔

”تمہاری بیوی شاید آج کل اپنے گھر گئی ہوئی ہے؟“

”جی ہاں صاحب..... اس کے ایک قریبی رشتے کی موت ہو گئی تھی اس لیے اس کا جانا ضروری تھا۔“

”تم ساتھ کیوں نہیں گئے.....؟“

”مم..... میں سراج صاحب کو تنہا چھوڑ کر نہیں چاہتا تھا صاحب، ان کے بڑے احسان ہیں مجھ پر لیاقت حسین نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”جب وہ میری ضرورت کا ہر طرح خیال رکھتے ہیں تو میں انہیں بیماری حالت میں چھوڑ کر کیسے چلا جاتا۔“

”بیوی کو واپس لینے تو جاؤ گے؟“

”سراج صاحب سے اجازت مل گئی تو جاؤں صاحب۔“

”کیا مطلب؟“ اورنگ زیب نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”انہوں نے آج ہی مجھ کو تاکید کی تھی کہ میں ان اجازت کے بغیر گھر سے باہر بھی نہ نکلوں۔ کوئی سر پھرانا ان کے علاوہ مجھے بھی نقصان پہنچانے کے خواب دیکھے ہیں۔ میں ان کے حکم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔“

”گڈ.....“ اورنگ زیب نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ”میں نے کہا تھا ناں کہ کچھ دیر بعد تمہارے ذہن سے نیند کا خمار اترے گا تو سب باتیں تمہیں یاد آ جائیں گی۔“

لیاقت حسین نے تجسس بھری نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھا لیکن کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اورنگ زیب نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ اس کا ذہن اس زخمی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس کے لیے تھوڑی سی سختی کے بعد کارآمد بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ لیاقت حسین کے آخری جواب کی روشنی

میں یہ بات بھی مزید واضح ہو گئی تھی کہ اسی کو راستے سے ہٹانے کی خاطر دشمنوں نے گھیرنے کی کوشش کی ہوگی لیکن کسی روحانی قوت کے کرشمے نے ان کی بساط پلٹ دی تھی۔ سراج کی سنائی ہوئی کہانیوں کے مطابق پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میڈم روبی اپنے اسٹڈی میں آ کر کچھ فائلوں کو الٹ پلٹ رہی تھی جب دروازے پر دستک سن کر پوچھا۔ ”کون ہے.....؟“ پھر دستک کی آواز سن کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ فائلیں اس وقت بھی اس کے سامنے میز پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ کسی خاص فائل کی تلاش میں ہے۔

”کیا بات ہے میڈم.....؟“ تھریا نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر دریافت کیا۔ ”کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟“

”ہو سکتا ہے کہ وہ فائل میں نے اپنے بیڈروم کے لاکر میں رکھ دی ہو۔“ میڈم نے سرسری طور پر جواب دیا پھر فائلوں کو ایک طرف پٹا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

”کوئی خاص فائل نہیں تھی۔ میرے ایک دو پرسنل لیٹر تھے جو اس وقت مجھے یاد آ گئے تھے۔“

”کیا ان کا تعلق بھی کچھ موجودہ حالات سے ہے؟ میرا مطلب ہے کہ شیخ حامد سے متعلق کوئی اہم خط؟“ تھریا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”براہ راست نہیں تھا لیکن وہ کسی ضرورت کے وقت کام آسکتے تھے۔“ میڈم نے سنبھل کر جواب دیا پھر بات بدل کر بولی۔ ”اس وقت تمہیں شاید مجھ سے کوئی ضروری کام ہے ورنہ عام طور پر تم میری اسٹڈی میں کم ہی آتی ہو۔“

”آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے۔“ تھریا نے محتاط لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ”پرسنل سیکریٹری ہونے کی حیثیت سے میرا فرض بھی ہے کہ آپ کے تمام دکھ سکھ کا خیال رکھوں۔“

”ہاں۔ اور تمہیں یہ اندازہ بھی ہوگا کہ میں تمہیں پرسنل سیکریٹری کے علاوہ اپنا راز دار بھی سمجھتی ہوں۔“ میڈم نے مزید وضاحت کرنے کے بعد بے تکلفی سے پوچھا۔ ”کہو، کیا بات ہے؟“

”بگ باس کے بیٹے پر جگا کے ساتھیوں کا حملہ آپ ہی کے اشارے پر ہوا تھا، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ نے براہ راست جگا سے بات نہیں کی، ہاشم کے بعد میں نے ہی

لوچن کے ذریعے اسے پیغام بھیجا تھا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جگانے اس بار اس حملے کا کوئی معاوضہ نہیں لیا۔“ تھریا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”معاوضہ نہ لینے کی وجہ بھی میرے علم میں ہے۔ بگ باس کے خیال میں بلیک ٹائیگر کی موت میں جگا کے آدمیوں کو دخل رہا ہوگا۔ اس لیے کہ بلیک ٹائیگر نے ہاشم کو وہیں دیکھا تھا۔ رہا ہاشم کی خودکشی کا معاملہ تو اسے بھی میں نے ہی آپ کی ہدایت پر کوڈ سیون اسٹار کے حوالے سے احکامات جاری کئے تھے۔“

”مجھے تمام باتوں کا علم ہے۔ تم اس وقت کیا کہنا چاہتی ہو؟“ میڈم نے وضاحت طلب لہجے میں تھریا کو مخاطب کیا۔

”ڈپٹی سپرٹنڈنٹ سراج کی بات اور ہے میڈم۔“ تھریا نے بڑے خلوص سے سمجھانے والا انداز اختیار کیا۔ ”اس نے آپ کے ساتھ احسان کیا تھا لیکن ہر پولیس آفیسر پر اعتماد کرنا میرے خیال میں دانش مندی نہیں ہے..... ان کی دوستی اور دشمنی دونوں ہی اکثر بہت مہنگی ثابت ہوتی ہے۔“

”تمہارا اشارہ غالباً ایس پی اورنگ زیب کی طرف ہے؟“

”میں انکار نہیں کروں گی۔“ تھریا نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”آج ایس پی اورنگ زیب اپنی ذاتی رنجش کی وجہ سے بگ باس کے خلاف ہے۔ اس نے سراج کے توسط سے آپ کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا کر آپ کو جگا کے ذریعے بگ باس کی رہائش گاہ پر حملے کی خاطر اپنے مفاد میں استعمال کیا لیکن کل اپنا مقصد نکل جانے کے بعد ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناتے وہ آپ سے جگا کے بارے میں کھوج بھی کر سکتا ہے۔“

”میں تمہاری بات سے متفق ہوں۔“ میڈم نے کسمسا کر کہا۔ ”لیکن اگر مسٹر سراج نے ایس پی اورنگ زیب کو میرے حوالے سے کچھ بتایا ہوگا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی بتایا ہوگا۔“

”میں نے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ حالات کے پیش نظر کوئی بھی ذمے دار پولیس آفیسر کسی آڑے وقت میں ہمارے کام آسکتا ہے۔“ تھریا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس ضمن میں کیا میں آپ سے ذاتی سوال کر سکتی ہوں۔“

”میں نے تمہیں ہر قسم کا اختیار دے رکھا ہے۔“ میڈم نے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ ”کیا معلوم کرنا

چاہتی ہو؟“

”وی آئی جی آغا منظور کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟“

”میں سمجھی نہیں.....“

”بگ باس سے انتقام لینے کی خاطر آپ نے افضل خان کو اعتماد میں لینے کی خاطر بہت بڑی پیش کش کی تھی۔“

”کیا افضل خان کے مقابلے میں، جو آپ کے اعتماد کو دھوکا دینے پر تل گیا تھا..... آپ آغا منظور کو اعتماد میں نہیں لے سکتیں، جبکہ یہ بات آپ کے علم میں بھی ہے وہ آپ کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ مسٹر سراج بھی اس ضمن میں آپ کو اشارہ دے چکے ہیں۔“

میڈم نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ تھریا کا مقصد سمجھنے کے بعد اس نے ایک سرد آہ بھری، کچھ دیر خلا میں دیکھتی رہی پھر بڑے اعتماد سے دہی زبان میں کہا۔

”تھریا..... مائی ڈیر، تم اس راز سے واقف ہو کہ میں اپنے مرحوم شوہر کے قاتل سے انتقام لینے کی خاطر ہر قربانی دے سکتی ہوں۔ افضل خان کو بھی کام کا آدمی سمجھ کر میں نے ایک جوا کھیلا تھا لیکن اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے..... اس کے علاوہ ایک عورت کیا ایک بار دھوکا کھانے کے بعد اپنے مستقبل کے بارے میں کسی دوسرے مرد کے سامنے بھی زبان کھول سکتی ہے.....؟ اس کے ساتھ ہی ابھی یہ بات بھی پوری طرح واضح نہیں ہے کہ آغا منظور کس حد تک بگ باس کی دشمنی مول لے سکتا ہے..... مسٹر سراج نے یہ ضرور کہا ہے کہ اب وہ بھی تنگ آمد بہ جنگ آمد کے فارمولے پر عمل کرنے پر آمادہ ہے لیکن کیا میرا براہ راست اس سے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کھل کر بات کرنا مناسب ہوگا؟“

”اگر آپ اجازت دیں تو میں کسی دن کسی بہانے سے اسے یہاں کھانے پر بلانے کی کوشش کروں۔“

”کیا بہانہ کروگی؟“

”پہلی بار جب مسٹر سراج نے آپ کو افضل خان کی بلڈنگ کے باہر والے ناخوشگوار واقعے سے محفوظ کیا تھا۔ اس وقت وہ آغا منظور ہی کی ہدایت پر آپ کی نگرانی پر مامور تھا، لیاقت حسین نجات دہندہ بن کر سامنے آگیا۔ اب مسٹر سراج بھی بم بلاسٹ کے سبب بستر پر ہیں اور لیاقت حسین پر بھی قاتلانہ حملے کی اطلاع آپ کو سراج سے مل چکی ہے۔ ہم ان تمام موضوعات پر بھی بات کر سکتے ہیں۔ مل بیٹھنے کے بعد اور

بھی باتیں ہو سکتی ہیں۔ اس طرح آپ کو بھی آغا منظور قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع میسر آ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے..... تم اگر یہی مناسب سمجھتی ہو تو لو.....“ میڈم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”بہت دنوں سے لوچن اور ڈومایا بیکار بیٹھے ہیں..... انہیں واپس بھیج دیا جائے؟“

”نہیں.....“ میڈم نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”میں انہیں ایک آخری بار اور استعمال کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں کل تک اس پروگرام سے بھی مطلع کر دوں گی۔“

تھریا جانے کے ارادے سے ابھی تو میڈم نے اسے روک کر کہا۔

”پہلی ملاقات میں تم اشاروں کنایوں میں بھی آغا منظور کو گھر بلانے کے بارے میں کچھ نہیں کہو گی۔“

”اتنا میں بھی سمجھتی ہوں کہ ہمیں دوسرا قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔ میز پر ایک ساتھ بیٹھیں گے تو یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ خود آغا منظور بھی اس دعوت کو کس پس منظر میں دیکھتا ہے۔“ تھریا نے بڑے سنجھے ہوئے انداز میں دورانہی کی بات کی پھر قدم اٹھاتی اسٹڈی سے نکل گئی۔

لیاقت حسین کو سراج کے مکان پر چھوڑنے کے بعد اورنگ زیب نے سرسری طور پر سراج کو مختصر واقعات سے آگاہ کیا پھر سیدھا متعلقہ تھانے پہنچا سب انسپکٹر اس کو اس کمرے تک لے گیا جہاں زخمی مجرم ننگے فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اس نے اورنگ زیب کو دیکھا تو تڑپ کر بولا۔

”میرے باؤں بھلے بندھے رکھو لیکن ہاتھ کھول د تاکہ اپنے زخموں کو کھجاسکوں۔“

”میں آگیا ہوں، اب تمہاری کھجلی بھی دور ہو جائے گی۔“ اورنگ زیب کے اشارے پر کمرے کو اندر سے بند کر دیا گیا۔ مارچ کرنے والے دو سنگدل اور تجربے کار سپاہی کمرے میں آکر کھڑے ہو گئے۔ سب انسپکٹر بھی موجود رہا۔

”جس آدمی نے تمہارے آدمیوں کو تنہا بھون ڈالا تھا وہ تمہاری آتی جاتی سانوس کو بھی ختم کر سکتا تھا لیکن تم نے زبان کھولنے کا وعدہ کر کے وقتی طور پر زندگی کی بھیک مانگی تھی جو تمہیں مل گئی۔ اب کیا ارادہ ہے؟“ اورنگ زیب نے کرخت لہجے میں سوال کیا۔ ”زندگی یا موت.....“

”میں تم سے اکیلے میں بات کرنا پسند کروں گا۔“ زخمی نے ہونٹوں کے سامنے جتے خون کے لوتھڑوں کو ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ ”کیوں؟..... اس کی وجہ تم بھی جانتے

ہو گے۔“

اورنگ زیب نے زخمی کو غور سے دیکھا پھر اس نے سب انسپکٹر سمیت سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ کمرہ خالی ہونے کے بعد زخمی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”مجھے زندگی کی کوئی تمنا بھی نہیں ہے لیکن کوئی وجہ تھی جو میں نے زندگی کی بھیک مانگی تھی۔“

”کیچر نہیں..... سیدھی طرح میرے سوالات کے جواب دو۔“ اورنگ زیب نے بگڑے ہوئے تیور سے اسے مخاطب کیا۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”تم ٹیڑھی کھیر ہو۔ یہ بات ہمارے بڑوں کو بھی معلوم ہے۔“ زخمی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”میں بھی جانتا ہوں کہ اگر میں نے زبان کھولی یا بند رکھی۔ دونوں ہی صورتوں میں مجھے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا شاید..... اسی لیے میں نے وقتی طور پر کسی مصلحت سے زندگی کی بھیک مانگی تھی۔ اسے میری بزدلی سے تعبیر نہ دینا۔“

اورنگ زیب نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ کچھ توقف سے بولا۔ ”تم نے تنہائی میں بات کرنے کی شرط کیوں لگائی تھی؟“

”کالی بھیڑیں ہمارے ساتھیوں میں بھی ہیں۔“ زخمی نے پھر منہ صاف کرنے کی خاطر فرش پر تھوک کر کہا۔

”تمہارے لوگ بھی نوٹ کی گڈیوں کی خوشبو سونگھ کر ایمان بیج دیتے ہیں..... ان کی تعداد ہم سے زیادہ ہے۔“

”اب کیا کہنا چاہو گے؟“

”جو سائھی مرچکے ہیں ان میں میرا نام بھی شامل کرا دو..... اس کے بعد جب تک میری سانس چل رہی ہے تم کو مجھے کسی ایسی جگہ رکھنا ہوگا کہ ہمارے کسی بڑوں کو بھی میری زندگی کی بھیک نہ ملے۔“

”تم کس کے لیے کام کرتے ہو.....؟“

”جس کی بولی سب سے زیادہ.....“ زخمی کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر کر تلخیوں میں تبدیل ہو گئی۔ ”جو قانون کی نظروں میں انعام یافتہ مجرم قرار دے دیا جائے پھر ضرورت مندوں میں اس کی بولی بھی چڑھ جاتی ہے۔“

”میں نے کہا تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔“

اورنگ زیب نے ایک بار پھر بگڑے ہوئے تیور سے اسے اپنی حیثیت اور قیمتی وقت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”آرام سے بات کرو آفیسر..... میں بھی تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے کسی مصلحت کی وجہ سے زندگی طلب کی تھی۔“ زخمی کے تیور بھی بدلنے لگے۔ ”اگر تمہارے پاس

میری بات سننے کے لیے وقت نہیں ہے تو پھر اپنے آدم خور کتوں کو دوبارہ اندر بلا لو۔ میں اب تم سے رحم یا زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔“

اورنگ زیب تھملا کر رہ گیا لیکن اس کی تجربے کار نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ زخمی کی باتوں کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کمرے میں کچھ دیر موت کا سناٹا طاری رہا پھر اورنگ زیب نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

”کھل کر بات کرو..... لیکن وقت کا خیال بھی رکھو ورنہ ایک بار پولیس کی فائل رپورٹ تیار ہو جائے تو اس میں رد و بدل کی گنجائش بھی بہت کم رہ جاتی ہے۔“

”جانتا ہوں.....“ زخمی نے کراہ کر کہا پھر اورنگ زیب کی نظروں میں نظریں ڈال کر ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”میں کسی کی موت کی خبر سننے تک زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ جس دن تم مجھے اس کی سانس اکھڑنے کی خوشخبری سنا تا اسی دن مجھے تھوڑا سا زہر فراہم کر دینا۔ میں ثابت کر دوں گا کہ مردوں کی زبان ایک ہوتی ہے۔“

”کس کی موت کی خوشخبری سننا چاہتے ہو؟“

”وہی جس نے لیاقت حسین کے ڈیڑھ وارنٹ جاری کیے تھے..... وہ..... وہ تمہارے ساتھ بھی بہت جلد کوئی آخری مارکہ کرنے کے بارے میں غور کر رہا ہے۔“ زخمی نے مسکرا کر کہا۔ ”تم بھی اس کا نام جانتے ہو آفیسر۔“

”تمہاری زبان اس کا نام لیتے ہوئے کیوں لرز رہی ہے؟“ اورنگ زیب نے جھلا کر دریا یافت کیا۔

”مم..... میں شیخ حامد کی بات کر رہا ہوں آفیسر..... جس نے تمہارے محکمے کی بڑی بڑی کرسیوں کو منہ مانگے داموں خرید رکھا ہے۔ کیا تم انکار کرو گے؟“

”نہیں.....“ اورنگ زیب کے چہرے پر آشوب کا نام سننے کے بعد ایک رنگ آکر گزر گیا۔

”مجھے تمہارا کھرا جواب سن کر خوشی ہوئی۔“ زخمی کی آنکھیں کسی بھید سے چمکنے لگیں۔

”تم نے جس نگر مجھ کا نام لیا ہے وہ خود سامنے نہیں آتا۔“ اورنگ زیب نے زخمی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اپنے خریدے ہوئے مجرموں کو آگ میں جھونکتا رہتا ہے۔ تم..... تم ان لوگوں کے نام سے بھی ضرور واقف ہو گے۔“

”سب کے ناموں سے کوئی واقف نہیں ہوتا لیکن میں دو تین نام ضرور جانتا ہوں۔“ زخمی نے درد کی شدت سے کراہ کر کہا۔ ”جو اس کا سب سے قابل اعتماد ممبر تھا اسے ہمارے حلقوں میں بھی بلیک ٹائیگر کے نام سے پہچانا جاتا ہے لیکن تم

بھی جانتے ہو کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔“

”اسپورٹس کار میں مارا گیا تھا؟“

”ہاں..... لیکن اس کی موت حادثہ نہیں تھی..... کسی نے اس حادثے سے قبل اسے شوٹ کر دیا تھا، مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے، تفصیل تم جانتے ہو گے۔“

”یانی دو تین کون ہیں؟“

”تین نہیں..... میں صرف دو کے نام جانتا ہوں۔“ زخمی نے کھنکار کر تھوکتے ہوئے جواب دیا۔ ”بلیک ٹائیگر کی جگہ کس کو ملی، یہ مجھے نہیں معلوم لیکن اس وقت راجو نامی شخص کی گڈی اونچی اڑ رہی ہے..... وہ تمہارے ہتھے چڑھ گیا تھا لیکن تم..... تم بھی کسی اونچی کرسی سے ملنے والے حکم پر اسے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے..... میں نے غلط تو نہیں کہا۔“ آخری جملہ ادا کرتے وقت زخمی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بھی ابھرا آئی تھی۔

”ہاں..... ایسا ہی ہوا تھا مگر میں نے بھی اس حکم کی پیروی کچھ سوچ سمجھ کر کی تھی۔“ اورنگ زیب نے بھی جواب میں مسکرا کر کہا۔ ”تم راجو کی موت کی خبر بھی بہت جلد سن لو گے۔ میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔“

”ایسی بات نہیں ہے آفیسر.....“ زخمی نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”اوپر تک کنکشن ملا ہوا اور پیچھے کھونا مضبوط ہو تو کچی گولیاں بھی پکی ہو جاتی ہیں۔ تم لوگ بھی ہم پر اسی لیے جال نہیں ڈالتے کہ ہمارے گرو گھنٹال کا کھونا بھی مضبوط ہے لیکن ایک مشورہ میرا بھی سن لو..... راجو کی موت ہمارے کھونٹے کی بیٹھک پر پیاز کترنے سے کم نہیں ہوگی۔ ایک بار چوکنا ہونے کے بعد وہ بھی زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں بھی صورت نظر آتے ہی گولی مار دینے کا حکم صادر کر دیا جائے۔ فی الحال وہ بھی تمہارے کھونٹوں کی وجہ سے رعایت سے کام لے رہا ہے۔“

”دوسرا کون ہے.....؟“ اورنگ زیب نے اس کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑاتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے اسے دیکھا نہیں لیکن بلیک ٹائیگر کے بعد وہ نمبر دو کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔“ زخمی نے رک رک کر اطمینان سے جواب دیا۔ ”کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کسی زمانے میں وہ پولیس ریکارڈ پر اسلم ڈنکا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔“

”تم کس نام سے مشہور تھے؟“ اورنگ زیب نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

”مرنے والے اپنا نام نہیں بتایا کرتے آفیسر۔“ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ تم میرا بھی کاغذی خانہ پری کرنے کی خاطر کسی بھی مجرم کے کھانے میں ڈال دینا۔ کیا فرق پڑے گا؟“

”کتنی دیر تک سانس روک سکتے ہو؟“ ”بکھی اس کی پریکٹس نہیں کی مگر تم اپنے بھنگیوں کو میرا لاش سمیٹنے کے لیے بلا لو۔ دو منٹ یا اس سے کچھ اوپر تک سانس روکنے کی کوشش بھی کر لوں گا۔“

”ایک بات اور.....“ اورنگ زیب نے کچھ سوچ سرسراتے لہجے میں دریافت کیا۔ ”شبنم نامی لڑکی تمہارے گرو گھنٹال کے پاس کام کرتی تھی وہ آج کل کہاں غائب ہے؟“

”اس کو تلاش کرنے کی ذمہ داری بھی نمبر دو کو دی ہے..... یہ بھی سنا ہے کہ گرو گھنٹال نے تمہارے ڈی آئی جی کی یہی کام سونپا ہے۔“

”ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کی گاڑی پر اسپتال کے قریب کس نے بم کا دھماکا کیا تھا؟“

”وہ تم لوگوں کو صرف وارنگ کے لیے تھا۔“ زخمی نے سانس درست کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر مارنا مقصود ہوتا تو تم دونوں اس وقت زندہ بھی نہ ہوتے..... میں غلط بیانی نہیں کر رہا۔ جن لوگوں کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا وہ بھی نمبر دو کے خاص آدمی تھے جو بھی اوچھا وار نہیں کرتے۔“

”ٹھیک ہے، تم مرنے کو تیار ہو جاؤ، میں بھنگیوں کو بلا دوں۔“ اورنگ زیب نے مدھم آواز میں کہا پھر دروازہ کھول کر کچھ فاصلے پر موجود سب انسپکٹر کو بلا کر کہا۔ ”آپ کی پرائیویٹ ایمبولینس کو کال کر لیں۔ زخمی کی لاش میں خوراک لگانے کے لیے لے جاؤں گا۔ اس عرصے میں بھنگیوں کو طلب کر لیں مگر زبان بند ہی رکھیں۔“

”میں سمجھتا ہوں سر..... آپ کے حکم کے خلاف ورزی نہیں ہوگی۔“

سب انسپکٹر کے جانے کے بعد اورنگ زیب نے دوبارہ اندر آ کر کمر بند کیا پھر انسپکٹر کوفون کر کے زخمی کو مردہ ظاہر کرنے کے سلسلے میں ضروری ہدایتیں دینے لگا۔ منٹ بعد ایمبولینس آنے کی اطلاع ملی تو اورنگ زیب نے کمرے کا دروازہ دوبارہ کھول دیا، دروازے پر موجود بھنگی اس کے اشارے پر اندر آ گئے۔ زخمی نے اپنی آنکھیں بند کر کے نہ صرف سارا جسم اکڑا لیا بلکہ سانس بھی روک لی تھیں۔

۳۳۳

پستہ قد کا وہ فریج کٹ ڈاڑھی والا جس فوراً اشار ہوٹل گیسٹ لاونج میں بیٹھائی وی دیکھنے میں مصروف تھا، وہ شخص کے مین آفس سے تین میل کے فاصلے پر تھا، فریج کٹ ڈاڑھی کے علاوہ اس کے چہرے پر ناک سے ذرا نیچے بائیں جانب والا سیاہ تل بھی اس کی گندی رنگت کو اور اجاگر کر رہا تھا۔ اس نے اس وقت اسی قسم کا اسپورٹنگ لباس زیب تن کیا تھا جو عام طور سے گولف کھیلنے والے کھلاڑی پہنتے ہیں۔ کھونٹوں پر مونٹے فریم کی عینک اس کے چہرے پر بے حد شگفتہ نظر آ رہی تھی۔ جس انہماک سے وہ لی وی دیکھ رہا تھا اس سے یہ ظاہر بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس فرصت ہی مت ہے۔ اس کے قریب ہی ایک سنہری بیگ بھی موجود تھا۔ اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے دس کا عمل تھا۔ ٹھیک دس بج کر پینتالیس منٹ پر فریج کٹ ڈاڑھی نے لاکھ موہاٹل وائبرٹ ہو تو اس نے فوراً ہی اسکرین پر ہر دیکھ کر اسے آن کر لیا۔ ”ہیلو..... کیا پروگرام ہے.....؟“

اس نے ادھر ادھر دیکھ کر دبی زبان میں پوچھا۔ ”میں گیسٹ نمبر دو کے باہر سیاہ رنگ کی وین میں موجود ہوں، اس پر ایک کوریئر سروس کا نام لکھا ہوگا۔ تم آکر پچھلے حصے میں بیٹھ جانا پھر پروگرام بھی فائل کر لیں گے۔ وین کے رانیور سے کوئی بات مت کرنا۔“

”اوکے.....“ فریج کٹ ڈاڑھی والے نے جو لوچن کے سوا کوئی اور نہیں تھا، موہاٹل آف کیا۔ سفری بیگ اٹھا کر کاندھوں سے لٹکا یا پھر گیسٹ نمبر دو کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ فریج کٹ ڈاڑھی بعد وہ باہر نکلا تو سیاہ وین سامنے ہی پارک تھی، وہ خاموشی سے وین کی پشت پر گیا۔ شاید اسے آتا دیکھ لیا گیا تھا جو پشت کا دروازہ کھول دیا گیا، لوچن خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ پچھلے حصے میں سر تا پا سیاہ چست لباس میں موجود شخص ڈوبتا تھا جس نے سیاہ وین کے حرکت میں آنے کے بعد لوچن سے سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔

”تمہیں سیون اشار کی جانب سے کوئی نئی ہدایت تو نہیں ملی؟“ ”نہیں.....“ لوچن نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں صرف مین آفس کو تباہ کرنے کا کام سونپا گیا ہے وہ بھی اس طرح کہ پوری عمارت کو، خاص طور سے بگ باس کے خاص آفس کو جلا کر راکھ کر دیا جائے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ ڈومانی سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔ ”کیا اس عمارت اور بگ باس کے آس پاس اس سے سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔“

کی نگرانی کی خاطر گارڈز اور مسلح چوکیدار نہیں ہوں گے؟“ ”یقیناً ہوں گے۔“ لوچن نے کہا۔ ”نہ ہوتے تو یہ کام سب سے داسوں کسی مقامی بد معاش سے بھی لیا جاسکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں اس کے لیے خاص احتیاط اور دور اندیشی سے کام لینا ہوگا۔ باقاعدہ کراؤ کا قوی امکان ہے۔“ ڈومانی فوری کوئی جواب نہیں دیا۔ لوچن بھی کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد سرسراتے لہجے میں بولا۔ ”میرا ذاتی خیال ہے کہ اس مہم کے بعد ہماری چھٹی بھی کر دی جائے گی۔“

”تمہیں کس طرح اندازہ ہوا؟“ ڈومانی اسے چونک کر وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”ایسے چھوٹے مونٹے کاموں میں ہم جیسے بین الاقوامی شہرت یافتہ لوگوں کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ مقامی لوگ زیادہ کارآمد ہوتے ہیں۔ بہر حال اب میں خود بھی اکتا گیا ہوں۔“

”کیا تم نے اس عمارت کے پورے حصوں کو اندر باہر سے دیکھ رکھا ہے؟“ ڈومانی سوال کیا۔

”تم نے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔“ لوچن نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”البتہ ہمیں جو نقشہ فراہم کیا گیا ہے اور جن حصوں کو پانی لائٹ کیا گیا ہے اس کا یہ غور جائزہ لے چکا ہوں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ بگ باس کے مخصوص آفس کو نشانہ بنانے کی خاطر ہم میں سے ایک آدمی کو عمارت کے پچھلے حصے کی جانب جانا ہوگا۔ دوسرے کے لیے صدر دروازے سے اندر داخل ہونے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہمیں اسلحے کے علاوہ ان پلاسٹک بموں کا استعمال بھی کرنا ہوگا جو آگ بھڑکانے کے کام آتے ہیں۔ کیا تم نے پوری تیاری کر لی ہے؟“

”ہاں، میں کیل کانٹے سے پوری طرح لیس ہوں۔“ ڈومانی ایک لمبی توقف کے بعد سوال کیا۔ ”تم کس حصے کی طرف سے ایکشن شروع کرنا پسند کرو گے؟“

”پچھلے حصے سے۔“ لوچن نے بے پروائی سے کہا۔ ”تم مجھے اسی طرف ایک بلاک چھوڑ کر اتار دینا۔ میں پچھلے حصے میں آگ لگانے کے بعد وہاں موجود گارڈز اور نگرانی کرنے والوں کو یہی تاثر دوں گا کہ ہم تعداد میں زیادہ ہیں اور پچھلے حصوں کو خاص طور پر استعمال کیا ہے۔ ایسی صورت میں صدر دروازے کی نفری بھی پچھلی طرف توجہ دے گی۔ تم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عمارت میں داخل ہو سکتے ہو، دو چار آدمیوں کو پھر بھی ختم کرنا ضروری ہوگا اس میں کوئی رعایت نہ کرنا۔“

”رائٹ.....“ ڈومانی گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔
”طے شدہ پروگرام یہ ہوگا کہ ہم ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اپنا کام شروع کریں گے اور ہر حال میں بارہ بجے تک اپنی اس وین تک پہنچیں گے جو قریبی پوسٹ آفس کی عمارت کے عقب میں ہماری منتظر ہوگی۔ اوکے۔“

”اوکے۔“ لوچن نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”ہم طے شدہ وقت کی ہر حال میں پابندی کرنے کے عادی بھی ہیں لیکن..... اگر کوئی ایک فریق کسی وجہ سے نہ پہنچ سکا تو دوسرا کیا کرے گا.....؟“

”وہ آخری فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا۔“ ڈومانی صاف گوئی سے کہا پھر وہ دونوں ہی اپنے سفری بیگ میں موجود پلاسٹک بم اور دیگر ضروری چیزوں کا جائزہ لینے لگے۔ دونوں کے چہروں سے سکون ہی سکون ظاہر ہو رہا تھا۔ ڈومانی گیارہ بج کر دس منٹ پر لوچن کو مطلوبہ عمارت سے ایک بلاک پیچھے اتارا اور خود اگلی نشست پر بیٹھ کر اپنی پوزیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

لوچن نے وین سے اترنے کے بعد اس طرح طویل انگڑائی لے کر جسم کے مختلف حصوں کو گھمایا جیسے وہ طویل سفر کے بعد اپنے اوپر طاری ہونے والی تکان دور کر رہا ہو۔ اس عمل سے فارغ ہوتے وقت اس نے نظریں گھما پھر کر قرب وجوار کا جائزہ بھی لے لیا پھر نہایت سکون سے سیٹی پر ایک مغربی ٹیون الاپتا ہوا اگلے بلاک تک پہنچنے کی خاطر شارٹ کٹ استعمال کرتا قدم بڑھانے لگا۔ گیارہ بج کر بیس منٹ پر وہ مطلوبہ عمارت کے عقبی حصے کی سامنے والی فٹ پاتھ پر موجود تھا۔ اس کے شہسے کے عین مطابق مطلوبہ عمارت کی پشت پر بھی دو گارڈ لیفٹ رائٹ کرنے میں مصروف تھے، لوچن کا سیدھا ہاتھ پتلون کی جیب میں ریگ گیا جہاں اس کا خطرناک آٹومیٹک موجود تھا جس کے ذریعے وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر ایک منٹ میں چھ فائر کر سکتا تھا۔ ایک پل میں اس نے آخری فیصلہ کیا پھر دوسری فٹ پاتھ کی سمت جانے لگا۔ دونوں گارڈز اسے روڈ کراس کرتے دیکھ کر رک گئے۔ ان دونوں کی نظریں لوچن پر مرکوز تھیں جو اس وقت بھی بہ ظاہر سیٹی بجانے میں مگن تھا۔

”ہالٹ.....“ ایک گارڈ نے رائفل سیدھی کر کے لوچن کو دینگ آواز میں مخاطب کیا۔ ”تم کون ہو..... کہاں جانا ہے؟“

لوچن جواب دینے کے لیے سوچ رہا تھا جب کہیں سے ایک فائر ہوا جس نے لوچن سے سوال کیا تھا وہ لڑکھڑا کر

ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے گارڈ نے پوزیشن لینے کی کوشش اتنی دیر لوچن کے لیے کافی تھی، اس نے آٹومیٹک نکال کیا، دوسرا گارڈ بھی موت کی نیند سو گیا۔ لوچن کے بات حیرت انگیز تھی کہ پہلے گارڈ کو مارنے والا کون تھا دوست ہی رہا ہوگا، دشمن ہوتا تو ان دونوں گارڈز کے اس وقت لوچن خود دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہو چکا۔ گارڈ پر کسی رائفل سے چلائی جانے والی گولی کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجی تھی۔ لوچن کے سوچنے کا زیادہ وقت نہیں تھا اس نے سفری بیگ پلاسٹک بم نکالے، دانت سے ان کا سیفی کیچ ہٹا کر اس کیے بعد دیگرے ان کو شیخ حامد کے آفس کی دیوار پر آتش گیر مادہ ایک شعلے کے روپ میں بھڑک اٹھا۔

اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر آفس کی شیشے کی کھڑکی پر اس کا نشانہ خطائیں گیا۔ اندر سے شعلے اٹھے اور شیشوں ٹکڑے ٹوٹ کر نیچے گرنے سے چھناکے کی آواز ابھری۔ لوچن حفظہ ما تقدم کے طور پر سڑک پر اوندھا ہوا تیزی سے کہنیوں کے بل ریگتا ہوا پہلی فٹ پاتھ پر آگیا۔ اس کی وہ احتیاط بروقت ثابت ہوئی، جلتی ہوئی عمارت کی داہنی موڑ سے ایک جیب برق رفتاری سے گھوم کر تیزی سے اس سڑک پر آگئی جس پر ایک طرف خود لوچن اور دوسری جانب دوسرے گارڈز کی لاشیں پڑی تھیں۔ جیب میں تین گارڈ ہی نظر آ رہے تھے۔ لوچن نے برقی رفتاری سے اور پلاسٹک بم نکالا۔ جیب کچھ فاصلے پر تھی، مگر اس کی

میں آگئی تو اس نے بم کو اس طرف اچھالا پھر آٹومیٹک ریپڈ فائرنگ بھی شروع کر دی، آگ کے شعلوں ابھرتے ہی جیب بھی فٹ پاتھ سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ لوچن نے تیزی سے لپک کر بلڈنگ کے کونے پر پہنچ کر اس کی لے لی ورنہ دوسری جانب سے اندھا دھند ہونے کا فائرنگ کی لپیٹ میں بھی آ سکتا تھا۔ جو گارڈ جلتی ہوئی سے زخمی حالت میں زندہ بچے ہوں گے۔ ان کی کھوپڑیاں الٹ جانا بھی یقینی امر تھا، لوچن نے آٹومیٹک کا میگزین پھر آگے بڑھنے والوں کو روکنے کی خاطر لگا تار فائرنگ کی کے بعد پلٹ کر دوڑنے لگا۔ وہ اپنے حصے کا کام کر چکا تھا۔ حامد کا ذاتی آفس اور اس کا فلور پوری طرح آگ کی لپیٹ میں تھا۔ سڑک عبور کرنے کے بعد وہ رک گیا۔ اب لپے لپے قدم اٹھاتا ہوا اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا اس کے ذہن میں یہ سوال بھی رہ رہ کر ابھرتا تھا کہ جس پہلی گولی گارڈ پر چلائی وہ کون تھا؟ وہ ان ہی خیالوں میں

کشتوں

جب احاطہ عقب سے کچھ آہٹ سن کر چونکا لیکن اسے بوجھ بھی، عقب سے سر پر کیا جانے والا حملہ اتنا بھرپور تھا کہ وہ چکر کر رہ گیا پھر اس نے جب خود کو دو تین باوردی اور خچ پولیس والوں کے چنگل میں دیکھا تو اسے دن میں سے نظر آ گئے۔ اس کے سفری بیگ میں آٹومیٹک کے حمل میگزین کے علاوہ ایک دو دستی بم اب بھی موجود تھے۔ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا پولیس کے ہاتھوں لگنا سیون اسٹار کو کسی طور پر پسند نہیں آئے گا۔ خود بھی وہ اس کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ مگر اس نے وقتی طور پر کچھ دیر کے لیے خود کو ان کے دم و کرم پر چھوڑ دیا پھر سانس درست کرنے کے بعد پوچھا۔

”مجھے کس جرم میں گرفتار کر رہے ہو.....؟“
”پریشان مت ہو.....“ ایک بڑی بڑی مونچھ والے پولیس مین نے کہا۔ ”تھانے چل کر ہم اپنی سلی کر لینے کے بعد اس کا نشانہ خطائیں گیا۔ اندر سے شعلے اٹھے اور شیشوں ٹکڑے ٹوٹ کر نیچے گرنے سے چھناکے کی آواز ابھری۔ لوچن حفظہ ما تقدم کے طور پر سڑک پر اوندھا ہوا تیزی سے کہنیوں کے بل ریگتا ہوا پہلی فٹ پاتھ پر آگیا۔ اس کی وہ احتیاط بروقت ثابت ہوئی، جلتی ہوئی عمارت کی داہنی موڑ سے ایک جیب برق رفتاری سے گھوم کر تیزی سے اس سڑک پر آگئی جس پر ایک طرف خود لوچن اور دوسری جانب دوسرے گارڈز کی لاشیں پڑی تھیں۔ جیب میں تین گارڈ ہی نظر آ رہے تھے۔ لوچن نے برقی رفتاری سے اور پلاسٹک بم نکالا۔ جیب کچھ فاصلے پر تھی، مگر اس کی

لوچن پھر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دوسرے پولیس والے اس کا بیگ اتار لیا۔ اس افتاد کے بعد لوچن نے سختی سے اپنی زبان بند رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب اس کے ذہن میں ڈومانی کا خیال ابھرتا تھا۔ پولیس والے اسے دبوچ کر کچھ دور لے گئے پھر ایک پولیس جیب قریب آ کر رکی تو پولیس والوں نے اس کی تفصیلی تلاشی لینے کے بعد دھکے مار کر جیب میں بٹھا دیا۔ ہاتھ پشت پر کر کے ان میں ہتھکڑیاں بھی ڈال دی گئیں۔

”تم اکیلے تھے یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔“
”کلی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک پھول والے نے پلٹ کر اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”تھانہ آجانے دو، پھر اطمینان سے پوری کہانی بھی سنا دوں گا۔“ لوچن نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”کیا حکم ہے صاحب.....؟“ مونچھ والے نے اپنی مخصوص زبان میں ایک پھول والے افسر سے پوچھا۔ ”ابھی سے اس کی چیمبی نہ شروع کر دیں؟ تھانے پہنچنے تک اس کا سارا کھلف بھی اتر جائے گا۔“

”نہیں.....“ اسے ایسی آئی نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ خاص مجرم نظر آتا ہے۔ ہمارے بڑے افسران اس سے مل کر یقیناً خوش ہوں گے۔ میں نے انہیں فوری طور پر حادثے کی اطلاع کر دی تھی۔“

ٹھیک اسی وقت ڈومانی صدر دروازے پر موجود مسلح گارڈز کو موت کے گھاٹ اتار کر عمارت میں داخل ہو چکا تھا،

بلڈنگ کی عقب سے کچھ ہنگامہ خیز۔ آوازیں اس کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں لیکن جو ہم اسے سوچی گئی تھی وہ اسے ادھورا چھوڑ کر جانے کے لیے خود کو آمادہ نہ کر سکا، عمارت میں داخل ہونے کے بعد وہ تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر کی طرف جارہا تھا جب کسی چیز کے چلنے کی بواں کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ لوچن پشت کی جانب آگ لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ڈومانی کے ذہن میں ابھرنے والا یہ احساس ہی اس کے خون کو گرما گیا، اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی، پہلی منزل پر پہنچنے کے بعد اس نے دفتر کے بیرونی دروازے کو آزمایا جو بند نہیں تھا، ممکن ہے اندر کچھ افراد موجود ہوں، اس نے اپنے آٹومیٹک کے دسے پر گرفت مضبوط کی پھر دروازہ کھولتا ہوا اندر داخل ہو کر بغلی دیوار سے چپک گیا، اگلا قدم اٹھانے سے پیشتر وہ وہاں کی سن گن لینا چاہتا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہ ریسیشن ہال تھا، اندھیرے کے سبب اسے ہر چیز واضح طور پر نظر نہیں آ رہی تھی، وہ دو منٹ اسی پوزیشن میں کھڑا رہا پھر سامنے کا ایک دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی آگ کی لپٹ کی روشنی بھی نظر آگئی جو اندرونی حصے میں کہیں لگی تھی، دروازہ کھلتے ہی دو افراد بھی اس کے سامنے آ گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ایک نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے دوسرے آدمی کہاں مر کھ گئے۔ دو گارڈز پشت پر بھی تعینات تھے، مسلح افراد کی جیب جمی راؤنڈ پر تھی۔ پھر یہ آگ.....“

”میں نے فائر بریگیڈ کو فون کر دیا ہے مگر.....“ دوسرے کے لہجے سے بھی وحشت ٹپک رہی تھی۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ بگ باس رات کی ڈیوٹی دینے والوں میں سے کسی ایک کو بھی معاف کر سکے گا۔ ایک دو کی غلطی کی سزا سب کو بھگتنی پڑے گی۔“

”ادھر دفتر کے اندر بھی ہمارے تین چار آدمی تھے، وہ کہاں گئے؟“ پہلے نے مردہ آواز میں سوال کیا۔

”وہ..... وہ شاید کسی تانے سو رہے ہوں گے۔“ دوسرے نے جھلا کر کہا۔ ”میں پولیس کو بھی فون کرتا ہوں۔“ اپنا جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی اس نے جیب سے غالباً اپنا موبائل نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر وہ کراہتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

”لچے،“ کی مدھم آواز ہونے کے باوجود اس کا دوسرا ساتھی جو یقیناً پروفیشنل ہی تھا، خطرے کی بوسوگھ کر تیزی سے زمین پر لیٹ گیا، اس نے حیرت انگیز طور پر رائفل پکڑے

پکڑے دو کروٹیں تبدیل کیں پھر جدھر سے ”ٹچ“ کی آواز ابھری تھی ادھر اندازے ہی سے فائر بھی کر دیے۔ ڈومانیے ایک پل کی دیر کی ہوتی تو دونوں گولیاں اس کے جسم میں ہی پیوست ہوتیں۔ موبائل نکالنے والے کو نشانہ بنانے کے بعد ہی اس نے پھرتی سے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی تھی۔ رائفل بردار کی توجہ منتقل کرنے کی خاطر اس نے دوسرے ہاتھ میں دبا ہوا آتش پلاسٹک بم بھی بچ جانے والی عقبی دیوار پر اچھال دیا، ہلکے دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی کئی بھڑکتے شعلے لپکے تو پورا ماحول جگمگا اٹھا۔ رائفل والے کی نظریں شعلوں کی طرف اٹھی تھیں کہ ڈومانیے کے آٹومینک سے نکلی ہوئی دوسری گولی اس کے وجود کو نگل گئی۔ شعلوں کی روشنی میں میدان بہ ظاہر صاف نظر آیا تو ڈومانیے بیگ سے دو گولے نکال کر دائیں بائیں اچھال دیے۔ شعلوں کے بلند ہوتے ہی وہ اٹھ کر تیزی سے نیچے واپس جانے والے زینوں کی طرف لپکا، اسے یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی اپنا مقصد پورا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اسے مکمل اعتماد تھا کہ آتش گیر مادہ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں پورے فلور کو شعلوں کی لپیٹ میں لے لے گا، اس سے پیشتر ہی وہ عمارت سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن چار چھ زینے طے کرنے کے بعد ہی اس کی پشت پر بائیں شانے کے قریب جیسے کسی نے لوہے کی سلاخ اتار دی ہو۔ درد کی شدت سے کراہتا ہوا وہ زینوں پر گرا تو بیگ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ کسی نے پشت ہی سے اسے سائمنلنسر لگے اسلحہ سے نشانہ بنایا تھا، سیڑھیوں پر قلابازیاں کھاتے ہوئے بھی اس کا ذہن نہ صرف پوری طرح بیدار تھا بلکہ اس نے آٹومینک کو اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیا تھا پھر ایک ذرا سنبھلتے ہی اس سمت فائر کر دیے جدھر سے دشمن نے گولی چلائی تھی، اس کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ ایک انسانی جسم چکراتا ہوا سیڑھیوں پر گرا پھر تیزی سے سیڑھیوں پر رول کرتا ہوا ڈومانیے کے قریب آ کر ڈھیر ہو گیا۔ اسی لمحے زینوں کے تیز پاور کی روشنی بھی آن ہو گئی، ڈومانیے حیرت انگیز پھرتی سے بلب کا نشانہ لیا لیکن روشنی کرنے والا اس پر سبقت لے گیا، ڈومانیے فائر کرنے کی حسرت پوری ہو گئی لیکن اس کا نشانہ چوک گیا تھا، اس کی وجہ دشمن کی جانب سے کیا جانے والا فائر تھا جس نے اس کے سیدھے بازو کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ آٹومینک ڈومانیے کے ہاتھ سے نکل گیا، اس کے باوجود اس نے تن بہ تقدیر خود کو سیڑھیوں پر گرا دیا، اوپر سے فائر ہو رہے تھے لیکن ڈومانیے وقت تک قسمت سے بچتا رہا جب تک وہ درمیانی لینڈنگ پر نہیں پہنچ گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دو گولیاں اس کے جسم کے

آر پار ہو گئیں۔ زینوں سے دو گارڈز رائفلیں تانے اور سر پر پہنچ گئے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے ان کے چہروں سے خوف ہی عیاں تھا۔ شاید آفس سے والے شعلوں کی لپک ان کے مستقبل کو بھی اپنے لپیٹ لے سکتی تھی۔

”تت..... تم جیت کر بھی ہار گئے۔“ ڈومانیے زین سے لہجے میں کہا۔ ”تمہارا باپ تمہیں مجھ سے زیادہ اناک موت سے دو..... دو..... دو چار کرے گا۔ بائیں بائیں۔“

”تم نے یہ کام کس کے اشارے پر کیا ہے؟“ رائفل بردار نے ڈومانیے سے گرج کر سوال کیا۔

”یو آر رائنگ..... سن آف اے..... بچ۔“

اکھڑتی ہوئی سانس سنبھال کر فاتحانہ انداز میں بولا۔

جس کا نمک کھاتے ہیں، جس کو ایک بار..... زرز.....

دے دیتے ہیں اس سے..... دھو..... دھو کا نہیں کرتے۔“

”تمہارے ساتھ اور کون تھا.....؟“ دوسرے

رائفل کے بٹ سے ڈومانیے زخمی کندھے پر شدید ضرب لگا

دیوانوں کی طرح کہا۔ ”حرام کے ختم..... مرتے وقت

ہمارے لیے کچھ آسانیاں پیدا کر دو۔“

”آخ..... تھو.....“ ڈومانیے خون تھوکتے ہوئے حصار

سے کہا۔ ”تت..... تت تم مرد ہو کر..... موت سے ڈرو

ہو..... بلا ڈمی سوائن۔“

جواب میں ان دونوں نے ڈومانیے کو بے تحاشا رائفل

بٹ سے دھنا پھر اس کو پھلانگتے ہوئے نیچے اتر گئے

سے کچھ آدمیوں کی تیز تیز بات کرنے کی آوازیں

آئیں۔ ڈومانیے بڑی مشکلوں سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

موبائل اس کے پاس ہی تھا۔ موبائل نکال کر اس نے

سم نکال کر منہ میں رکھ کر چبانا شروع کر دیا۔ موبائل

میں ڈال کر اسے توڑا پھر خلا میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”گڈ..... گڈ..... بب..... ببائی..... سیون

ون..... اس..... کس..... ٹٹ..... ٹٹ..... ٹٹ..... ٹٹ.....

سیون اشارہ کو پوری طرح گڈ بائی کہنے کی حسرت پوری

کر سکا۔ اس کی سانس اکھڑ چکی تھی لیکن اس کے مردہ

پر اس وقت بھی جوان مردوں کی سی فاتحانہ مسکراہٹ

گئی تھی۔

ۛۛۛ

ریٹائرڈ میجر عاطف اس وقت کلب میں

دوستوں کے ساتھ تفریح میں مصروف تھا جب اس کے

پر دارا رستم علی کی کال ریسیو ہوئی۔ پرائیویسی کی خاطر وہ دوستوں سے ایکسیوز کر کے تھوڑی دور چلا گیا۔ اسے شبہ تھا کہ دارا نے اسے بلا مقصد فون نہیں کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔ رسی دو چار جملوں کے بعد ہی دارا نے میجر عاطف کو باپ کی پریشانی سے آگاہ کر دیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ پولیس ایس پی اورنگ زیب نے بھی رستم علی سے اس کے دفتر آکر ملاقات کی تھی۔

”ایس پی کی آمد کا مقصد کیا تھا؟“ میجر عاطف نے دریافت کیا۔

”ڈیڈ اور ایس پی کی ملاقات بند کمرے میں ہوئی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ملاقات بھی کچھ خاص نوعیت ہی کی تھی۔“

”اب تم کس وجہ سے پریشان ہو؟“

”جو ٹینڈر میں نے بہر حال کسی نہ کسی طرح زیادہ آفر دینے کے باوجود حاصل کیا ہے اس نے شیخ حامد کو ضرور مشتعل کر دیا ہوگا۔ ڈیڈ کو یہی اندیشہ ہے، وہ مجھے اور روشنا کو باہر جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ دوسری صورت میں ممکن ہے وہ ٹینڈر کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔“

”آئی سی، گویا تمہارا یہاں سے چلا جانا شرط قرار دیا گیا ہے۔“

”ہاں..... لیکن فی الحال میں نے انکار کر دیا ہے۔“

”اب کیا چاہتے ہو؟“

”شیخ حامد کی تھوڑی سی گوثالی تاکہ وہ ڈیڈ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔“ دارا نے بے حد سنجیدگی سے درخواست کی۔

”تم یہ کام زیادہ آسانی سے کر سکتے ہو۔“

”ہو جائے گا۔“ میجر عاطف نے کہا۔ ”ڈونٹ وری لیکن ایک شرط پر.....“

”وہ کیا.....؟“

”تمہیں کلب کے لیے بھی تھوڑا وقت نکالنا پڑے گا۔ ہمارے سرکل کے اکثر لوگ تمہاری اور روشنا کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔“ عاطف نے بے تکلفی سے کہا۔ ”کچھ دنوں بعد ہم ایک فینسی ڈریس پروگرام بھی ارنج کر رہے ہیں، تمہیں اور روشنا کو بھی اس میں حصہ لینا پڑے گا۔“

”رات کے کھانے پر آ جاؤ۔ براہ راست روشنا سے بھی بات کر لینا، اگر وہ تیار ہوگئی تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”کیا سمجھوں.....؟ کیا شادی کے بعد سے روشنا نے تمہیں کنٹرول میں لے رکھا ہے۔“ میجر عاطف نے شوخی

سے سوال کیا۔

”ایسی بات نہیں ہے لیکن ڈیڈ پرانے وقت کے بزرگ ہیں، کلب میں آنا جانا پسند نہیں کرتے، روشنا ان ہی کی وجہ سے احتیاط کرتی ہے ورنہ تم بھی جانتے ہو کہ اس نے کس شوق سے کلب جو ان کیا تھا۔ ہم نے اچھا خاصا ایک حلقہ بھی بنالیا تھا۔“

”ڈونٹ وری..... تم روشنا کو راضی کر لو، میں انکل کو منالوں گا۔ اوکے، رات کھانے پر ملاقات ہو رہی ہے۔“

میجر عاطف نے موبائل آف کیا پھر دوستوں کے قریب جا کر اس نے دارا اور روشنا کو واپس کلب لانے کا دعویٰ کیا تو سب ہی نے ”تھری چیئرس فار میجر عاطف“ کا نعرہ بلند کیا۔

اے ایس آئی نے تھانے پہنچ کر لوچن کے متعلق ماتحتوں کو ضروری ہدایت دی پھر وہ ایس ایچ او کے کمرے میں آ گیا جہاں اس وقت ایس پی اورنگ زیب کے علاوہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج بھی موجود تھا۔ اے ایس آئی انہیں جائے وقوعہ سے متعلق بریفنگ دے رہا تھا۔ جب مرنے والے گارڈز اور ڈوما کی تصویروں کا سیٹ بھی آ گیا۔ اورنگ زیب، اے ایس آئی سے معلومات حاصل کر رہا تھا۔ سراج نے تصویریں الٹی پلٹنی شروع کر دیں۔ ڈوما کی تصویر سامنے آئی تو وہ چونکا۔ ہاشم کی موت کی تصدیق کرتے وقت ملکی ایئر لائن نے جو معلومات اور فرسٹ کلاس کے مسافروں کی تفصیل فراہم کی تھیں، ان میں ڈوما کی تصویر بھی شامل تھی، اب ڈوما سامنے آیا تھا تو لاش کی تصویر کی صورت میں جس سے تیسرے مسافر کی معلومات حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ اے ایس آئی بریفنگ دے کر چلا گیا تو سراج نے اورنگ زیب کو بھی ڈوما کے بارے میں آگاہ کر دیا۔

”آئی سی!“ اورنگ زیب نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”گویا تین میں سے دوسرے چکے ہیں۔ اب صرف ایک باقی ہے لیکن..... کیا آپ کو اندازہ ہے کہ یہ تینوں کس پارٹی کے لیے کام کر رہے تھے.....؟“

”یقین سے نہیں کہا جاسکتا لیکن حالات کی روشنی میں میرا ایک اندازہ ہے جو ممکن ہے غلط بھی ہو کہ یہ تینوں شاید میڈم کے لیے کام کر رہے تھے۔“

”کیا اب میڈم اس کا اقرار کر لیں گی؟“

”ہو بھی سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ آپ کے اکسانے پر کم از کم جگہ سے کام بھی لے رہی ہے۔“

”میں بعد میں میڈم کو بھی مٹولنے کی کوشش کروں گا، فی

کشکول

الحال جو حملہ آور گرفتار کر کے لایا گیا ہے اس سے دو دو باتیں بھی ہو جائیں۔“

اے ایس آئی کی رہبری میں وہ اس کمرے تک پہنچے جہاں لوچن کو ایک لوہے کی کرسی پر پوری طرح کس کر باندھ رکھا گیا تھا۔ اس کرسی سے ہائی پاور کی بجلی کا ننگا تار بھی منسلک تھا جو مجرم کی زبان کھولنے کی خاطر بہت کارآمد ثابت ہوتا تھا۔

اورنگ زیب اور سراج کمرے میں داخل ہوئے۔ اے ایس آئی باہر ہی روک دیا گیا۔ سراج اس وقت لوچن کو سامنے زندہ حالت میں دیکھ کر دوبارہ چونکا۔ اورنگ زیب بھی لوچن کو غور سے دیکھنے لگا جو اس وقت بھی اس طرح بے پروا نظر آ رہا تھا جیسے وہ قیدی نہ ہو۔ بس ایک لمحے کو..... لوچن کی نظروں میں بھی اورنگ زیب اور سراج کو سامنے دیکھ کر ایک چمک سی ابھری لیکن اس نے چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ”تم غیر ملکی ہو مسٹر.....“ اورنگ زیب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے لوچن کو سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ ”مجھے اس بات کا تجربہ ہے کہ غیر ملکی مجرم ہونے کے باوجود کھل کر بات کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ مشرق والوں پر اپنی سابقہ برتری کا احساس انہیں اب بھی ہے۔“

”میں اس وقت غیر ملکی نہیں..... صرف مجرم ہوں“

”آفسر۔“ لوچن نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”تم مجھے بانس پر چڑھانے میں اپنا وقت ضائع نہ کرو، مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں..... یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے جس پر دنیا کی کوئی طاقت اپنا عمل دخل مسلط نہیں کر سکتی۔“

”میری اطلاع کے مطابق تم نے شیخ حامد کے آفس کو آتش گیر مادے کے پلاسٹک بموں سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔“ اورنگ زیب نے قدرے خشک لہجے میں سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔ ”اس کے علاوہ تم نے تقریباً پانچ بندے بھی مار دیے۔ تم کیا کہو گے؟“

”میں نے نفری کا شمار نہیں کیا، ممکن ہے پانچ کے ساتھ دو ایک اور بھی لپٹے میں آ گئے ہوں۔“ لوچن نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ”رہا شیخ حامد کا آفس تو اس کام کے لیے مجھے خاص طور پر تعینات کیا گیا تھا جو مجھے ہر قیمت پر کرنا تھا۔“

”کس کے اشارے پر.....؟“

”ہم جس کو زبان دیتے ہیں اس کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتے۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ ہم اس کے نام سے واقف بھی نہیں۔ جو احکامات ملتے تھے اس کے لیے ایک خاص کوڈ ورڈ پہلے سے طے ہو گیا تھا۔“

”احکامات مرد کی آواز میں ہوتے تھے یا کبھی کبھی کوئی عورت بھی.....“ سراج نے گھما پھرا کر کریدنے کی کوشش کی۔

”سوری آفسر..... میں اس معاملے میں بھی زبان بند رکھنے کا عہد کر چکا ہوں۔“ لوچن نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”کیا تمہارے کچھ اور ساتھی بھی تھے..... ہیں۔“ اس بار سراج نے محتاط انداز میں لوچن کو مخاطب کیا۔

”اگین سوری آفسر.....“ لوچن عجیب انداز میں مسکرایا۔ ”ہم بین الاقوامی سطح کے مجرم ہیں۔ مر جاتے ہیں لیکن دوسرے کا نام نہیں لیتے۔“

”کچھ دیر پہلے تمہارا ایک ساتھی اور بھی تھا جو فرار ہوتے وقت کام آ گیا۔ اس کے حساب میں بھی کئی قتل درج کیے گئے ہیں۔“ اورنگ زیب نے ڈوما کی آخری تصویر نکال کر لوچن کو دکھائی۔ لوچن نے زبان سے کچھ نہیں کہا چہرہ آگے کر کے تصویر کو ہونٹوں سے چوم لیا۔ یہ بھی اس کا خاموش اعتراف ہی تھا۔

”تمہارا نام میری معلومات کے مطابق لوچن ہے؟“

سراج نے دوسرا سوال پوچھا۔

”ہاں.....“ لوچن نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

”اس بار میں نے اسی نام کا انتخاب کیا تھا۔ ایک بار جس نام کا انتخاب ہو جائے اسے ہم دوسرے معاہدے میں بھی استعمال نہیں کرتے۔“

”تمہارا ایک ساتھی کچھ دنوں پہلے خودکشی کر چکا ہے۔“ سراج نے بات جاری رکھی۔ ”اس کی لاش ہمیں ایک پرائیویٹ ریٹ ہاؤس سے ملی تھی۔“

”ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو لیکن..... اگر اس نے خودکشی کی ہوگی تو یقیناً اپنی کسی غلطی کے اعتراف کے بعد ہی کی ہوگی۔“ اس بار بھی لوچن نے گول مول جواب دیا۔

”جو خودکشی انسان ہنسی خوشی اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ جس کی پشت پر اس کو احساس ہو کہ اس نے کسی معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ وہ ہماری نظروں میں قابلِ غور ہوتا ہے اس لیے کہ ہم عام حالات میں کسی سے خوف زدہ ہو کر اس قسم کا بزدلانہ قدم نہیں اٹھاتے۔“

”جس جہاز میں تم یہاں آئے تھے اس کی فرسٹ کلاس میں صرف تین ہی مسافر تھے۔“ اورنگ زیب نے سراج کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کہا۔ ”دو کام آ گئے..... تیسرے تم ہو.....“

”جس جہاز میں تم یہاں آئے تھے اس کی فرسٹ کلاس میں صرف تین ہی مسافر تھے۔“ اورنگ زیب نے سراج کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کہا۔ ”دو کام آ گئے..... تیسرے تم ہو.....“

”جس جہاز میں تم یہاں آئے تھے اس کی فرسٹ کلاس میں صرف تین ہی مسافر تھے۔“ اورنگ زیب نے سراج کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کہا۔ ”دو کام آ گئے..... تیسرے تم ہو.....“

”جب تمہیں کسی ذریعے سے اطلاع مل گئی ہے تو پھر اب اپنا اور میرا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟“ لوچن کے لہجے میں یک لخت کڑھکی آگئی۔ ”یہ وہم دل سے نکال دو کہ میں تمہاری سختیوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لوں گا۔ ویسے یہ بھی بتادوں کہ مرنا جینا بھی ہمارے اپنے اختیار کی بات ہے۔ ہم زبان کھولنے کے بجائے مردوں کی طرح مرجانا ہی پسند کرتے ہیں۔“

”اور اگر ہم تمہیں زندہ رکھنا چاہیں تو.....“ سراج نے سوال کیا۔

”یہ تمہاری مرضی کی بات ہے۔“ لوچن نے شانے چکا کر بے پروائی سے جواب دیا۔ ”میں تمہارے سامنے رحم کی درخواست نہیں پیش کروں گا۔“

”زہریلا کپسول.....؟“ اورنگ زیب نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

”اس کے علاوہ اور بھی بے شمار طریقے ہیں جن سے شاید تم لوگ ابھی تک واقف بھی نہ ہو۔“

”جگا کا نام بھی سنا ہے؟“

”کبھی دیکھا نہیں..... صرف سنا ہے کہ اسے تمہارے جیل خانے کے گندے ماحول نے مجرم بنا دیا ہے۔“ لوچن نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ”اب بھی وہ قتل و غارت گری سے پرہیز ہی کرتا ہے۔“

”ایک اہم سوال اور.....“ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ”کیا تمہارے ساتھ کوئی تیسرا آدمی تھا جس نے پہلی گولی چلا کر عمارت کے عقبی حصے پر دو گارڈز میں سے ایک کو ہلاک کیا تھا۔ اس کی موت رائل کی گولی سے ہوئی تھی جبکہ تمہارے پاس سے آٹومیک پستول اور پلاسٹک بم ہی مل سکے ہیں۔“

”میں تمہاری معلومات کو چیلنج نہیں کروں گا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں بھی نہیں جان سکا کہ وہ کون مہربان تھا۔ اس نے بروقت کام نہ دکھایا ہوتا تو شاید اس وقت میں بھی تمہارے ہتھے نہ چڑھ پاتا، موت کی پرسکون نیند سو رہا ہوتا۔ ہو سکتا ہے اسے پوشیدہ طریقے سے ہماری حفاظت پر مامور کیا گیا ہو۔“

”ہم تمہیں تھرڈ ڈگری سے دو چار نہیں کریں گے۔“ اورنگ زیب نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”ایک شرط پر..... تم خودکشی نہیں کرو گے۔“

”تم سوچ لو آفیسر..... ہم کسی قسم کی بارگیننگ کرنے کو بھی اپنے اصول کے خلاف ہی سمجھتے ہیں۔“

”ہم بھی جلدی میں قدم اٹھانے سے گریز ہی کرتے ہیں۔“ اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا پھر سراج کے ساتھ اٹھ کر باہر آ گیا۔

”آپ کا لوچن کے بارے میں کیا اندازہ ہے.....؟“

سراج نے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

”کام کا آدمی ہے..... ہمیں اس کے ساتھ ممکنہ رعایت سے کام لینا ہوگا۔“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے بات جاری رکھی۔ ”ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ اس کا تعلق میڈم روبی ہی سے ہوگا۔ آپ نے بھی دہلی زبان میں شیعے کا اظہار کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میڈم نے لوچن اور اس کے ساتھی کو صرف آکٹوپس کے آفس کو آگ لگانے کا کام سونپا ہو اور جگا کے کسی آدمی کو ان کی حفاظت پر مامور کر دیا ہو جو اپنا کام کر کے نکل گیا ہو۔“

ایس ایچ او کے دفتر میں پہنچ کر اورنگ زیب نے ڈیوٹی انسپکٹر کو ہدایت دی۔

”آپ کو شش کر کے گرفتار ہونے والے مجرم کا کم از کم دس دن کا ریمانڈ حاصل کریں۔ اس کی نگرانی پر ذمے دار عملے کو تعینات کریں اور..... جب تک میں نہ کہوں آپ حضرات مجرم کے ساتھ کوئی سخت رویہ بھول کر بھی اختیار نہ کریں۔ دیگر معاملات میں آپ کو ضابطے کی کارروائی کرنے کا مکمل اختیار ہوگا۔“

”اوکے سر.....“

”ایک خاص بات اور..... مجرم کو ایسے لاک اپ میں رکھا جائے جہاں تک نگرانی کرنے والوں کے سوا کسی اور کی پہنچ ممکن نہ ہو..... کسی کو ملاقات کی اجازت بھی نہ دی جائے..... کوئی اثر و رسوخ استعمال کرے تو آپ فوری طور پر کسی وقت بھی مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔“

”میں آپ کے حکم کی اہمیت کو سمجھ رہا ہوں سر..... آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“

”گڈ.....“ اورنگ زیب کچھ اور ضروری ہدایت دے کر اٹھ رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ ایس ایچ او نے کال اٹینڈ کی پھر ریسپور اورنگ زیب کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ڈی آئی جی صاحب کی کال ہے سر..... آپ کے لیے۔“

”ہیلو سر.....“ اورنگ زیب نے ریسپور لے کر بڑے سکون سے اٹینڈ کیا۔ ”اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”ابھی آپ کے آکٹوپس کا فون آیا تھا۔“ ڈی آئی جی آغا منظور نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ کا موبائل فون مسلسل

کشکول

بند آ رہا ہے۔ شاید سگنل نہیں آرہے ہوں گے۔ میں نے آپ کو گھر پر کال کیا وہاں سے معلوم ہوا کہ آپ متعلقہ تھانے پر ملیں گے۔ آپ کو شاید اطلاع مل گئی ہوگی کہ کسی نے آکٹوپس کے فلوور پر دونوں جانب سے حملہ کر کے وہاں آگ لگا دی ہے، اس کے بیان کے مطابق اس کے گارڈز اور حفاظتی دستے کے دس بارہ آدمیوں کو بھی ہلاک کیا گیا ہے۔“

”ادھر ہی جا رہا ہوں سر..... مرنے والوں کی گنتی بھی کر لوں گا۔ قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتا ان کی تعداد کے بارے میں۔“ اورنگ زیب نے سرد انداز میں جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔ ”میرے لیے کوئی خاص ہدایت.....“

”میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں لیکن..... ذرا ہاتھ ہلکا کر کیجیے گا۔ وہ اس وقت فون پر پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا، ہو سکتا ہے کہ اس نے ہمارے سلسلے میں مرکز میں اپنے واقف کاروں سے بھی الٹی سیدھی شکایتیں کی ہوں۔“

”فکر نہ کریں سر..... اگر کوئی آفت آئے تو آپ بلا تکلف میرا نام لے کر اپنی پوزیشن کلیئر کر سکتے ہیں۔“ اورنگ زیب کے چہرے پر بھی ناگوار تاثرات ہی ابھرے تھے۔ ”اوپر والوں کو میں سنبھال لوں گا۔“

”پھر بھی..... اگر مصلحت سے کام لیا جائے اس میں زیادہ دانش مندی ہوگی۔“

”اس کی ذمے داری بھی آکٹوپس کے طرز عمل پر ہوگی۔ اگر اس نے میری پوزیشن کا خیال نہیں کیا تو شاید مجھے کھلے الفاظ میں اسے بتانا ہوگا کہ ایک ذمے دار ایس پی کے کیا فرائض ہوتے ہیں اور وہ کس حد تک قانون کی طاقت کا استعمال کر سکتا ہے۔“ اورنگ زیب نے جملہ مکمل کرتے ہی دوسری جانب سے کسی بات کا انتظار کیے بغیر ریسپور رکھ دیا پھر سراج کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا لمبے لمبے قدم اٹھاتا ایس ایچ او کے آفس سے نکل کر باہر کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس وقت وہ کوئی بھی قانونی قدم اٹھانے سے قطعی دریغ نہیں کرے گا۔ راستے میں اس نے سراج سے بھی زیادہ بات نہیں کی۔ چائے وقفہ پر پہنچ کر اس نے تمام زاویوں سے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا۔

فائر بریگیڈ نے پورے دفتر کو مکمل تباہ ہونے سے کسی حد تک بچالیا تھا لیکن جو کچھ تباہ ہو چکا تھا وہ بھی شیخ حامد کے زخموں پر کئی ہوئی مریج سے کم نہیں تھا۔ یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت شیخ حامد اپنے گھر پر ہی بیٹھا فون کھڑکا رہا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی تفتیشی ٹیم کے ساتھ ایک ایک حصے کا

فائر بریگیڈ نے پورے دفتر کو مکمل تباہ ہونے سے کسی حد تک بچالیا تھا لیکن جو کچھ تباہ ہو چکا تھا وہ بھی شیخ حامد کے زخموں پر کئی ہوئی مریج سے کم نہیں تھا۔ یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت شیخ حامد اپنے گھر پر ہی بیٹھا فون کھڑکا رہا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی تفتیشی ٹیم کے ساتھ ایک ایک حصے کا

زندگی میں بھر آؤ آگیا تھا جب اسے سیٹھ عثمان اور اپنے باپ کے درمیان کسی بد مزگی کی بھٹک ملی تھی۔ اس شجے کی تصدیق ہو جانے کے بعد اس نے ہر پہلو پر غور کیا پھر اس نے براہ راست سیٹھ عثمان سے مل کر پہلی بار یہ بتا دیا کہ وہ سردار سرفراز خان کا لخت جگر ہے۔ اس کی صاف گوئی پر سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم دونوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور اب قدرت نے اسے پھر نوازنے کی ٹھان لی تھی۔

اس شام حسب معمول سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم سراج کی رہائش گاہ پر آئے تو لیاقت حسین نے ہی ان کا استقبال کیا تھا۔ الماس بیگم راحیلہ کا ہاتھ تھام کر اندر لے گئیں، سیٹھ عثمان لیاقت حسین سے بات کرنے لگے۔

”لیاقت حسین..... تم نے وعدہ کیا تھا اور زبان دی تھی کہ سردار سرفراز خان کا نام ظاہر ہونے کے بعد بھی تم ہم سے علیحدگی نہیں اختیار کرو گے، ہم جو کہیں گے تم اس پر آنکھ بند کر کے پہلے کی طرح عمل کرو گے۔“

”آپ حکم دیں صاحب۔ لیاقت حسین آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کرے گا۔“ لیاقت حسین نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”ایک مشکل کام درپیش ہے، تم چاہو تو وہ مشکل دور ہو سکتی ہے۔“

”میں نے آپ کا نمک کھایا ہے صاحب۔“ لیاقت حسین جذباتی ہو گیا۔ ”آپ کی خاطر اگر مجھے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی دینا پڑے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“

سیٹھ عثمان خاموشی سے اندر چلے گئے۔ آدھے گھنٹے بعد لیاقت حسین کو بھی طلب کر لیا گیا۔ لاؤنج میں سراج اور الماس بیگم کے علاوہ راحیلہ بیگم اور سیٹھ عثمان بھی موجود تھے۔ لیاقت حسین ان کے سامنے ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

”لیاقت حسین۔“ سراج نے اسے مخاطب کیا۔ ”مجھے آج پہلی بار یہ معلوم ہوا ہے کہ تم غلط بیانی بھی کرتے ہو۔“

لیاقت حسین نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر دبی زبان میں کہا۔ ”میں انکار نہیں کروں گا صاحب لیکن مجھے بھی غیرت بھی انسان کو مصیبت غلط بیانی پر مجبور کر دیتی ہے۔“

”غلطی بہر حال غلطی ہوتی ہے جس کی سزا بھی ضرور ملتی ہے۔“ سراج کے لب و لہجے سے اپنا نیت عیاں تھی۔

”آپ جو سزا دیں گے مجھے منظور ہوگی صاحب۔“

لیاقت حسین نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔

”تمہیں سراج صاحب نہیں بلکہ راحیلہ سزا دینے کا

ارادہ کر چکی ہیں۔“ الماس نے کہا۔ ”فوری طور پر تمہیں موجودہ ملازمت سے برطرف کیا جا رہا ہے۔“

لیاقت حسین نے چونک کر سیٹھ عثمان کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر کئی سوالات گڈمڈ ہو رہے تھے جب سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم جانتے ہو لیاقت حسین کہ میں بیگم صاحبہ کے کسی حکم سے انکار نہیں کرتا۔ جو فیصلہ ہو چکا ہے اسے واپس لینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ البتہ میں اپنے ذاتی اختیار سے تمہیں اپنے نئے دفتر کا سپروائزر مقرر کر رہا ہوں اور فوری طور پر تمہاری تنخواہ تیس ہزار روپے کر رہا ہوں۔“

لیاقت حسین گنگ رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہو پھر جب الماس نے اسے مبارکباد دی اور سراج نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا تو اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

”صاحب۔“ اس نے بھرائی آواز میں سیٹھ عثمان سے کہا۔ ”آپ نے جو حکم دیا ہے میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن ایک درخواست میری بھی قبول کر لیجیے۔“

”کھل کر بتاؤ لیاقت حسین..... ہم تمہاری کسی فرمائش سے انکار نہیں کریں گے۔“

”میں آپ کی گاڑی کی چابی کسی اور کو نہیں دوں گا..... آپ جہاں بھی جائیں گے، میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔“

”گڈ.....“ سراج نے کہا۔ ”میں تمہاری اس بات سے بالکل متفق ہوں۔ جب تک کچھ معاملات پوری طرح ہمارے کنٹرول میں نہ آجائیں۔ عثمان کا تمہارے سوا کسی اور کے ساتھ آنا جانا میں بھی پسند نہیں کروں گا۔“

کچھ دیر بعد لیاقت حسین واپس اپنے کمرے میں آیا تو اسے اپنی ماں بڑی شدت سے آئی۔ یہ سب اسی کی دعاؤں کا نتیجہ تھا، اس نے خدا کا شکر ادا کرنے کی خاطر دو رکعت شکرانے کے ادا کیے پھر دو رکعت استغفار کے پڑھے، خدا سے گڑگڑا کر دعا کرتا رہا کہ وہ اسے ہر معاملے میں سرخرو کرے، قدم قدم پر اپنے رحم و کرم سے نوازتا رہے۔ وہ ہر معاملے میں ہمیشہ ثابت قدم رہے، اس سے کبھی کوئی ایسی لغزش نہ ہو جو خدا اور اس کے محبوب کے لیے ناپسندیدہ ہو۔ مرتے وقت تک اس سے بھول کر بھی کوئی ایسا گناہ سرزد نہ ہو جو آخرت میں اس کی پکڑ کا سبب بن جائے۔

اس رات لیاقت حسین کو فرحین کی کئی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی، وہ پاس ہوتی تو دونوں مل کر اس کا میاں کا

ککشکول

جشن مناتے جو لیاقت حسین کو اچانک نصیب ہوئی تھی۔ خود فرحین کا سر بھی بلند ہو جاتا کہ اس نے لیاقت حسین کے مستقبل کے لیے جو خواب دیکھے تھے وہ پورے ہو گئے۔ فرحین کو یاد کرتے وقت لیاقت حسین نے طے کر لیا تھا کہ وہ دو ایک روز میں سیٹھ عثمان سے اجازت لے کر فرحین کو لینے چلا جائے گا۔ اسی بہانے ماں سے بھی مل لے گا جو اسے یاد آتی رہتی تھی۔ ممکن ہے طویل جدائی کے بعد وہ حویلی جائے تو سردار سرفراز خان بھی اسے گلے لگا کر معاف کر دے۔ ان ہی خیالوں میں ہم لیاقت حسین نیند کی وادیوں میں بچکولے کھانے لگا۔ اس کی پلکوں پر آنے والے کل کے خواب پھل رہے تھے جب فرحین کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”سچ سچ سو گیا یا مجھے آتا دیکھ کر آنکھیں موند لیں۔“ لیاقت حسین نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ فرحین اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے قریب کھڑی تھی، خلاف توقع اس نے پہلے رنگ کی ساڑی باندھ رکھی جس کا تنگ بلاؤز اسے پریشان کر رہا تھا، اس کی نگاہوں میں مستی ہی مستی نظر آرہی تھی۔ اس کے جوڑے میں بائیں جانب گیندے کا ایک تازہ پھول بھی لگا تھا۔

”تو..... تو کب آئی؟“ لیاقت حسین نے حیرت سے دریافت کیا۔ ”یہاں کیسے پہنچ گئی؟“

”دو پہر کو آ گئی تھی لیکن بیگم صاحب نے روک لیا تھا، اب وہی مجھے یہاں چھوڑ گئی ہیں۔ تیری خوشی میں اضافہ کرنے کی خاطر۔“ فرحین نے ایک خاص ادا سے اٹھلا کر کہا۔ ”یہ تو اس طرح فکر کر کیا دیکھ رہا ہے؟ کیا تمہیں میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی؟“ پھر اس نے لیاقت حسین کے اور قریب آ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”سچ بتا کیسی لگ رہی ہوں؟“

”یہ ساڑی تجھے.....“

”تیری شاہ پری نے دی ہے۔“ فرحین نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اسی نے باندھنا بھی سکھا دیا۔ جانتا ہے وہ کیا کہہ رہی تھی؟“

”کیا کہہ رہی تھی.....؟“

”کہہ رہی تھی کہ ایسے لباس میں مرد کی رال بہت جلدی بننے لگتی ہے۔“

”وہ سچ کہہ رہی تھی.....“ لیاقت حسین نے اسے بے اختیار اپنے قریب گھسیٹ کر بازوؤں میں جکڑ لیا۔ فرحین کسمسا کر بولی۔

”اٹھ کر کواڑ کو کنڈی تو لگا لے۔ کوئی آگیا تو کہے گا؟“

فرحین کے قرب نے لیاقت حسین کو دیوانہ بنا دیا تھا لیکن وہ اس کے کہنے پر دروازہ بند کرنے کی خاطر اٹھ گیا۔ فرحین اسے شوخ نظروں سے دیکھتی رہی، لیاقت حسین کو آج اس کا ہر انداز بڑا حسین نظر آ رہا تھا۔ شاید دس گیارہ دنوں کی دوری نے اس کو بھی بے چین کر دیا تھا۔ خود لیاقت حسین بھی اسے نئے لباس اور نئے ڈھنگ میں دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ کمرے میں زیر و پا ور کی روشنی بھی گل کرنے کے بعد وہ دوبارہ فرحین کے قریب آیا تو فرحین نے پہلی مرتبہ اسے اپنے کھلے بازوؤں میں سمیٹ لیا، اس کے سینے کی دھڑکن بتا رہی تھی کہ لیاقت حسین سے دور رہ کر وہ بھی اس کے قرب کے لیے مضطرب ہو گئی تھی۔ لیاقت حسین کو فرحین کا وہ نیا انداز اور بے قابو کر گیا۔ بڑی دیر تک وہ اس کے بالوں سے کھیلتا رہا، اس گالوں پر اپنی محبت کی مہریں لگا رہا۔ فرحین کی بے خودی اور خود سپردگی کا نیا انداز اسے طوفانی پھیڑوں کی مانند اپنے ساتھ بہا لے جانے کی کشش کر رہا تھا جب کسی نے اسے بڑے کرخت لہجے میں مخاطب کیا۔

”آنکھیں ہوتے ہوئے بھی اندھا ہو رہا ہے عقل کے دشمن..... سنبھل جا ورنہ سب کچھ ستیا ناس ہو جائے گا۔“

لیاقت حسین نے گھبرا کر آواز کی سمت دیکھا، جس ناپتا بزرگ نے اسے منگھوپہر کے ٹینٹ میں بیٹھے ہوئے دیوانے تک پہنچنے میں مدد کی تھی، اس وقت اسی کا ہیولا اس کے سامنے فضا میں بل کھاتا نظر آ رہا تھا۔ لیاقت حسین ہڑبڑا کر اٹھا۔ اس نے کمرے میں دوبارہ روشنی کی تو خود بھی ششدر رہ گیا۔ فرحین کا کوئی وجود کمرے میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر ناپتا کے ہیولے پر نظر ڈالی جو آہستہ آہستہ لرزتا ہوا فضا میں تحلیل ہو گیا۔ لیاقت حسین نے بوکھلا کر پٹنگ کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا، جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا شاید وہ سب کچھ ایک خواب تھا لیکن فرحین کے جوڑے میں لگا ہوا گیندے کا پھول اس وقت بھی اس کے بستر پر مسلا ہوا پڑا صاف نظر آ رہا تھا۔

شیخ حامد کے لیے وہ سانحہ ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے فراموش کر دیتا۔

یہ پہلا موقع تھا جب کسی نے اس کی شہ رگ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کی تھی۔ اس کے کارندے اسے ایک ایک بل کی رپورٹ دے رہے تھے۔ دو گھنٹے سے وہ متواتر بھی فون اور بھی اپنے مختلف موبائل پر کالیں کر رہا تھا۔ ہر کال کے ساتھ ملنے والی نئی اطلاع اس کے لیے جلتی پرتیل کا کام کر

رہی تھی۔ دفتر جل جانے کا معاملہ ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے حلق کے نیچے اتار لیتا۔ یہ اس کی شہرت اور ساکھ پر ایسی کاری ضرب تھی جس نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔ اسے عمارت اور ساز و سامان کے جلنے یا تباہی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ انشورنس کمپنی سے وہ ایک کی جگہ دس وصول کر سکتا تھا۔ سارے ریکارڈ کی کاپی مختلف کمپیوٹرز پر محفوظ کراتے رہتا اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ خود دوسروں کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتا تھا اس لیے یہ بھی بخوشی جانتا تھا کہ اس کے مخالفوں کی تعداد بھی کم نہیں ہوگی۔ کوئی بھی کسی وقت چھوٹے موٹے وار پلٹ کر کر سکتا تھا اسی مقصد سے وہ ہر نئی فائل کو کسی الماری یا دراز میں محفوظ کرنے سے پیشتر اس کا مکمل ڈیٹا کمپیوٹرز پر محفوظ کرنے کا عادی تھا۔ اس کام میں ایک منٹ کی تاخیر بھی اسے منظور نہیں تھی۔ جو عمارت جل کر خاکستر ہو چکی تھی وہ پندرہ بیس روز میں دوبارہ مرمت کرائی جاسکتی تھی لیکن وہ کسی دشمن کو سزا اٹھانے سے پیشتر ہی پگل دینے کی عادی تھا اس لیے پہلی بار جب کسی نے بھرپور وار کیا تو غصے سے پاگل ہی ہو گیا تھا۔

اس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں ایک بدلیسی دوشیزہ کے ساتھ کنول سے مجبوراً دور رہنے کا غم غلط کر رہا تھا جب نمبر دو نے اسے آگ کی اطلاع دی تھی۔

”باس۔ کسی نے ہمارے آفس کو دونوں طرف سے آتشیں بم پھینک کر آگ لگا دی ہے۔“

”کیا بک رہے ہو.....؟“ وہ آغوش میں سٹی ہوئی بے لباس دوشیزہ کو غصے سے ایک طرف دھکیلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کون لوگ تھے؟“

”ابھی اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوا۔ صرف اتنی اطلاع ملی ہے کہ وہ تعداد میں غالباً دو ہی تھے۔ دونوں غیر ملکی تھے۔ ایک موقع پر مارا گیا دوسرے کو پولیس ساتھ لے گئی ہے۔“

”جو حرام کے ختم ہم نے پال رکھے تھے وہ کہاں مر گئے تھے.....؟“

”ان میں سے بھی آدھے کام آگئے۔ جو زندہ ہیں، ان کے بیانات لیے جا رہے ہیں۔“

”جس حرام زادے کی لاش ملی ہے وہ کون تھا؟.....“

”کس پارٹی سے تعلق تھا اس کا.....؟“

”ابھی تصدیق نہیں ہو سکی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان دونوں کا تعلق بھی اسی سیاہ فام جمہیتی سے تھا جس کی لاش کچھ دنوں پیشتر ایک مقامی گیسٹ ہاؤس سے ملی تھی۔“

”خیال نہیں.....“ وہ کسی زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتے ہوئے بولا۔ ”مجھے درست اطلاع ملنی چاہیے۔“

”کسی حد تک اس خبر کو مصدقہ بھی کہا جاسکتا ہے۔“

”کھل کر بات کرو..... میں معے حل کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”ہمارے ایک پولیس کے انفارمر نے بتایا ہے کہ کچھ عرصہ قبل تین غیر ملکی ایک ہی جہاز میں ایک ساتھ یہاں آئے تھے، ایک سیاہ فام تھا جو پوسٹ مارٹم کی کہانی کے مطابق خودکشی کر چکا ہے۔ دوسرا ہمارے آدمیوں کے ہاتھوں کام آگیا۔ تیسرے کو پولیس ساتھ لے گئی ہے۔“

”آئی۔ سی.....“ شیخ حامد نے خلا میں گھورتے ہوئے بڑے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”جگا کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟“

”وہ ابھی تک انڈر رگر اوٹنڈ ہی ہے۔“

”اسے فوری تلاش کرنا ضروری ہے۔“ شیخ حامد نے چیخ کر حکم دیا۔ ”جو سیاہ فام مر چکا، اس حرامی کو جگا کے ٹھکانے پر ہی دیکھا گیا تھا۔ بلیک ٹائیگر نے اسی دن سے اس کا تعاقب شروع کیا تھا لیکن.....“ شیخ حامد جملہ مکمل کیے بغیر دھاڑا۔ ”وہ میرا سب سے کاہل آدمی تھا جسے گولی مار دی گئی پھر اس کے بعد سے جگا بھی منظر عام سے ہٹ گیا۔ اس ساری کہانی کے پیچھے مجھے جگا ہی نظر آ رہا ہے۔ اسے کسی طرح بھی تلاش کرو، اب میں تم لوگوں کی غفلت برداشت نہیں کر سکتا۔“

”رائٹ سر.....“ دوسری جانب سے مختصر جواب دیا گیا۔

”جس غیر ملکی کو پولیس لے گئی ہے وہ اس وقت کہاں ہے؟“

”علاقے کے تھانے میں۔ میری معلومات کے مطابق وہاں ایس پی اورنگ زیب پہلے سے موجود تھا پھر.....“

پھر اسی نے پولیس پارٹی کے ساتھ جائے حادثہ کی تفصیلی رپورٹ بھی جائزہ لینے کے بعد اپنی موجودگی میں موقع پر ہی تیار کرائی ہے۔“

اورنگ زیب کا نام شیخ حامد کے زخموں پر نمک سے کم نہیں تھا۔ اس نے ایک اچھی ہوئی نظر بدلیسی دوشیزہ پر ڈالی جو بہ دستور بستر کی شکلوں پر بکھری پڑی بڑی بے پروائی سے سگریٹ پینے میں مصروف تھی۔ وہ ایک لمحے تک اسے خالی خالی نظروں سے گھورتا رہا پھر بڑے سرو لہجے میں سوال کیا۔

”جو لوگ عمارت کی چوکیداری پر تعینات تھے ان میں سے کتنے مارے گئے؟“

کشکول

”صحیح تعداد ابھی نہیں معلوم ہوئی لیکن ایک اطلاع کے مطابق آٹھ دس کام آگئے ہیں۔“

”باقی جو بچے ہیں ان نمک حراموں کو بھی گولی مار دو۔“

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ شیخ حامد نے انتظار بھی نہیں کیا پھر فوری طور پر فون پر ڈی آئی جی کرائمز سے رابطہ کیا۔

”مجھے حادثے کی اطلاع مل چکی ہے جناب، میں.....“

”میری اطلاع کے مطابق حملہ آوروں کا ایک غیر ملکی ساتھی پولیس کی حراست میں ہے؟“

”میں ابھی متعلقہ تھانے کو فون کر کے.....“

”اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے آغا منظور۔“ شیخ حامد نے اس کی بات کاٹ کر تلملاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے گرفتار ہونے والے کی تمام تفصیل صبح تک درکار ہوگی، تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ اب میں مرکز کے ان ہڈ حراموں کو بھی ہلا کر رکھ دوں گا جو ہر ماہ پابندی سے دم ہلاتے ہوئے مجھے سلام کرتے ہیں، تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو گے؟“

”آپ پریشان نہ ہوں جناب..... میں براہ راست اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔“ ڈی آئی جی نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”تم پھر مجھے دلاسہ دینے کی باتیں کر رہے ہو۔“ اس نے بہ دستور جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ”نئے ایس پی کے آنے کے بعد سے تم بھی مجبور نظر آ رہے ہو۔“

”ایسی بات نہیں ہے لیکن.....“

”میری بات کا خیال رکھنا.....“ مجھے صبح تک پوری تفصیل درکار ہوگی۔“ اس نے ایک بار پھر ڈی آئی جی کی پوری بات سنے بغیر کہا پھر جھلا کر ریسپور کر پڈل پر رکھ دیا۔ اٹھ کر چند لمحے تک ادھر ادھر کی زخمی درندے کی طرح ٹہلتا رہا پھر بستر پر پڑے شکار کے قریب آگیا، غیر ملکی دوشیزہ نے اٹھ کر اس کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں۔ شیخ حامد اس کے ساتھ بھوکے شیر کی طرح لپٹ گیا۔ چند لمحے اس کے جوان جسم کے نشیب و فراز کو بھونچوڑا تار ہا پھر اسے دوبارہ بستر پر چھوڑ کر اس نے موبائل اٹینڈ کیا۔ دوسری طرف سے نمبر دو کی کال آئی۔

”سر.....“ جو پولیس کی حراست میں ہے اسے سخت پھر سے میں رکھا گیا ہے، کسی کو بھی اس کے قریب.....“

”نان سنس.....“ شیخ حامد حلق کے بل چیخا۔ ”کال کا مقصد بیان کرو؟“

”جس حرام زادے کی لاش ملی ہے وہ کون تھا؟.....“

”کس پارٹی سے تعلق تھا اس کا.....؟“

”ابھی تصدیق نہیں ہو سکی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان دونوں کا تعلق بھی اسی سیاہ فام جمہیتی سے تھا جس کی لاش کچھ دنوں پیشتر ایک مقامی گیسٹ ہاؤس سے ملی تھی۔“

”وہ..... وہ..... اس کا نام لو چین ہے سر، چینی باشندہ ہے۔ اس کا تعلق ایک بین الاقوامی تنظیم سے ہے جو ضرورت مندوں کو منہ مانگی رقم کے عوض بندے فراہم کرتی ہے۔“

ایک ہی سانس میں بات جاری رکھی گئی۔ ”جو ہمارے گارڈ کا نشانہ بنا اس کا نام ڈوما ہے اس کا تعلق بیروت سے تھا، وہ بھی اس تنظیم کا سرگرم کارکن تھا۔“

”جس نے خودکشی کی وہ ہاشم تھا، کیوں؟“

”لیس سر.....“

”یہ بات تھوڑی سے دوڑ دھوپ کے بعد میرا گھریلو ملازم بھی معلوم کر سکتا تھا۔“ اس نے بڑی نفرت کا اظہار کیا۔

”اصل سوال یہ ہے کہ ان حرامزوروں کو کس پارٹی نے یہاں آنے کی دعوت دی تھی؟“

”میں کوشش میں لگا ہوں سر لیکن.....“

”اب کوشش سے کام نہیں چلے گا۔“ وہ جھلا کر بولا۔

”مجھے رزلٹ چاہیے۔“

”او۔ کے سر.....!“

”ون منٹ.....“ شیخ حامد نے اچانک ذہن میں ابھرنے والے کسی خیال کے تحت سرسراتے لہجے میں کہا۔

”لیاقت حسین بھی ہاتھ آتے آتے نکل گیا۔ تم اس کے بارے میں اب کیا کہو گے؟“

”وہ..... وہ..... سب کچھ حیرت انگیز ہی تھا سر ورنہ.....“

”ایک بات پر غور کرو.....“ اس نے نمبر نو کی بات کاٹ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”لیاقت حسین کے بچ کر نکل جانے کے بعد ہی یہ آگ لگانے والی کارروائی کی گئی ہے۔“

”اوہ.....“ نمبر نو چونکا۔ ”ہو سکتا ہے سر کہ پھر اس میں ایجنسی کے کچھ لوگ بھی شامل ہوں۔“

”نہیں.....“ شیخ حامد نے اس کے خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ ”ایجنسی کے لوگ بین الاقوامی تنظیم سے بھی دہشت گرد نہیں امپورٹ کرتے لیکن ایک بات طے ہے..... جو کچھ ہو اس میں کسی نہ کسی زاویے سے لیاقت حسین کا نام ضرور درمیان میں آتا ہے۔“

”آپ کا یہ اندازہ غلط نہیں ہے سر لیکن لیاقت حسین کچھ دنوں سے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کے بنگلے پر ہے۔ اگر روز بھی وہ اتفاق سے ہمیں نظر آ گیا تھا، ہم نے ایکشن لینے میں دیر بھی نہیں کی لیکن اس کی قسمت اچھی تھی جو وہ.....“

”گولی کے بدلے گولی.....“ شیخ حامد کی آنکھوں میں شعلے ناچنے لگے۔ ”جب تم ڈنکا کے نام سے مشہور تھے.....“

وقت تمہارا بھی یہی اصول تھا.....

”آپ صرف اشارہ کر دیں سر..... عمل کرنا میرا کام ہے۔“

”صرف ایک دن اور انتظار کر لو اس کے بعد لیاقت حسین جس چھت کے بھی نیچے ہوا سے بھی آگ لگا دو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔“

”سمجھ گیا سر.....“

شیخ حامد نے موبائل آف کیا تو بدلیسی عورت نے اٹھ کر پھر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں، بڑی نشیلی آواز میں بولی۔ ”کم آن ڈارلنگ! لٹ اس فنش ون راؤنڈ، پلیز۔“ اس کی آنکھیں شدت جذبات سے سرخ ہو رہی تھیں۔ خود سپردگی کا بے باک انداز بھی قیامت ہی تھا، شیخ حامد نے اسے پھر اپنی آغوش میں گھسیٹ لیا۔ یہ صرف اس کی وحشت کا مظاہرہ تھا ورنہ اس کے ذہن میں اس وقت بھی انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ شعلے جنس مخالف کی آتش شوق کو سرد کرنے کے لیے ناکافی تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اسے پھر چھوڑ کر اٹھ گیا۔ اس کے اندر انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی اس سے مجبور ہو کر اس نے براہ راست ایس پی اورنگ زیب کے نمبر شیخ کے پھر موبائل کان سے لگایا۔

”ہیلو..... ایس پی اورنگ زیب بول رہا ہوں.....“

”میں شیخ حامد بول رہا ہوں۔“

”اوہ.....“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”جو سانحہ رونما ہو چکا اس پر مجھے بھی دکھ ہے۔“

”میں نے تمہیں تعزیت کا اظہار کرنے کی خاطر فون نہیں کیا تھا۔“ شیخ حامد بری طرح بھنا گیا۔

”میرے لائق کوئی حکم.....؟“

”جو سورتی اولاد مر گیا اسے جہنم میں ڈالو۔ میں اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں جو تمہاری حراست میں ہے۔“

”وہ بھی غیر ملکی ہی ہے لیکن اس نے ابھی تک خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔“ اورنگ زیب نے سپاٹ انداز میں کہا۔

”ہم مختلف طریقوں سے اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ زیادہ ڈرائنگ روم ٹریٹمنٹ اس لیے نہیں دے رہے کہ اگر وہ بھی مر گیا تو اصل مجرم اور ذمے دار افراد تک پہنچنے میں مشکل بھی پیش آسکتی ہے۔“

”تمہارا کچھ ذاتی خیال تو ہوگا کہ مجھے نقصان پہنچانے میں کس باسٹر ڈکا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“

”مجھے آپ کے نقصان اور اس وقت آپ کی ذہنی کیفیت..... دونوں کا اندازہ ہے مسٹر حامد لیکن میں فی الحال

یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”کیا یقینی بات اگلوآنے کی خاطر مجھے کہیں اوپر فون کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑے گی؟“ شیخ حامد نے رخ انداز میں اورنگ زیب کو اپنے اثر و رسوخ سے مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

”یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے شیخ صاحب، میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔“

شیخ حامد مشورہ والی بات سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ قدرے تیز لہجے میں بولا۔ ”میں تم کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ تم سے مشورہ کر کے کوئی قدم اٹھاؤں۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔“

”اوہ..... کیا آپ نے اس وقت یہی کہنے کے لیے زحمت گوارا کی ہے۔“ اورنگ زیب کے جواب میں بھی کوئی لچک نہیں تھی۔

”تمہاری فائل رپورٹ کب تک تیار ہو جائے گی؟“

”پولیس صرف سنجیدگی سے تفتیش کر سکتی ہے محترم..... کوئی ٹائم فریم دینا ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا۔“

”اوہ.....“ شیخ حامد نے دانت پیٹتے ہوئے لائن منقطع کر دی پھر غصے میں کھولتا ہوا ٹیلی فون کے قریب گیا۔

اس بارہ وہ براہ راست مرکزی وزیر داخلہ کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ اس کا رہا سہا سکون بھی اورنگ زیب سے گفتگو کرنے کے بعد غارت ہو گیا تھا۔

”ہیلو شیخ صاحب.....“ دوسری جانب سے وزیر داخلہ کی آواز ابھری۔ ”اس وقت کیسے یاد کر لیا؟“

”آپ کو زحمت تو نہیں ہوئی.....؟“

”قطعاً نہیں، ابھی پندرہ منٹ پیشتر ہی ایک میننگ سے آیا ہوں اور آپ کا فون ملنے سے تو ہمیں خوشی ہوئی ہے۔“ دوسری جانب سے خاصی بے تکلفی سے کہا گیا۔ ”اور سنائیں، کاروبار کیسا چل رہا ہے؟“

”کاروبار کو تو آگ لگ گئی جناب۔“ شیخ حامد نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ سب خیریت تو ہے؟“

”خیریت ہوئی تو اس وقت آپ کو زحمت نہ دیتا..... ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے دشمنوں نے میرے آفس اور پورے فلور کو جلا کر سب کچھ راکھ کا ڈھیر کر دیا ہے۔“

”کوئی گرفتاری بھی ہوئی یا نہیں.....؟“

”ایک غیر ملکی کی لاش ملی ہے، دوسرا ایس پی اورنگ زیب کے قبضے میں ہے۔“

”ہم پوری کوشش کر رہے ہیں جناب۔“

”کوشش سے کام نہیں چلے گا۔“ شیخ حامد کا لہجہ تھکاتہ ہو گیا۔ ”اس کے حلق میں ڈنڈا ڈال کر سب کچھ اگلوآنے کی

”ایس پی سے بات کی آپ نے؟“

”آپ بھول رہے ہیں کہ میں آپ سے پہلے اس کے تباہ لے کی بات کر چکا ہوں۔“ شیخ حامد نے یاد دہانی کراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اسے فون کیا بھی میں نے، لیکن اس نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی کہ وہ مجھے نہ تو معلومات فراہم کرنے کا پابند ہے نہ ہی کوئی ٹائم فریم دے سکتا ہے۔“

”آغا منظور سے شکایت کی آپ نے؟“

”وہ بھی آپ کی طرح ایس پی کے خلاف کوئی ایکشن لینے سے کتراتا ہے۔“ شیخ حامد نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

”اب تو ایسا راستہ اختیار کرنا پڑے گا کہ براہ راست صدر مملکت یا وزیراعظم تک رسائی حاصل کروں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں شیخ صاحب..... میں براہ راست ایس پی سے بات کرتا ہوں، وہ آپ کو ہر معلومات فراہم کرنے کا پابند ہے۔“

شیخ حامد نے شکر یہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ وزیر داخلہ بھی کوئی چھوٹی موٹی شے نہیں تھا، ریسپورڈر کھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تو غیر ملکی دوشیزہ نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ مصروف ہو تو پھر مجھے جانے کی اجازت دو۔“ اس کے لہجے سے بیزاری ہی مترشح تھی۔

”اوہ..... گٹ لاسٹ۔“

شیخ حامد کا غیر مہذب جواب دوشیزہ کے لیے غیر متوقع تھا، اس نے برا سامنہ بنایا۔ واش روم میں جا کر لباس پہنا اور خاموشی سے رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے دس منٹ بعد ہی شیخ حامد کے موبائل کی اسکرین روشن ہو گئی جس پر اورنگ زیب کا نام بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ تین گھنٹے کے بعد ہی اس نے اپنا موبائل آن کر کے خشک لہجے میں پوچھا۔

”اب کیسے یاد کیا.....؟“

”وزیر داخلہ کے فون کے بعد میرے لیے ضروری تھا کہ آپ سے رابطہ کروں، مجھے اس کا حکم بھی دیا گیا ہے۔“

اورنگ زیب نے سلجھے ہوئے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”آپ مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتے ہیں؟“

”جو ملزم تمہاری حراست میں ہے اس نے کچھ اگلا یا نہیں؟“

”ہم پوری کوشش کر رہے ہیں جناب۔“

”کوشش سے کام نہیں چلے گا۔“ شیخ حامد کا لہجہ تھکاتہ ہو گیا۔ ”اس کے حلق میں ڈنڈا ڈال کر سب کچھ اگلوآنے کی

کوشش کرو۔ مجھے ہر قیمت پر معلوم ہونا چاہیے کہ کس سورتی اولاد نے مجھے نقصان پہنچانے کی غلطی کی ہے۔“

”سر.....“ اورنگ زیب نے پہلی بار مرعوب ہونے والا انداز اختیار کیا۔ ”کچھ وقت تو درکار ہوگا۔“

”ٹھیک ہے..... میں تمہیں چوبیس گھنٹے کا وقت دے سکتا ہوں۔“

”شکر یہ شیخ صاحب۔ چوبیس گھنٹے کا وقت میرے لیے بہت کافی ہوگا۔ میری کوشش ہوگی کہ اس کے بعد آپ کو شکایت نہ ملے۔“ اورنگ زیب نے بہ دستور شستہ انداز میں کہا۔ ”جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔“

شیخ حامد نے ”گڈ!“ کہہ کر لائن کاٹ دی۔ اس وقت پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہر حال ایس پی اورنگ زیب کو شکست دینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لے کر ایک دوسرواری کالیں اور کیں پھر سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔

پر تاب بھوشن اس وقت کالی کے مندر کی ایک کنیا میں کھڑا پجارن مدھو کو تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ دیوی کے لیے اپنا چاپ پورا کرنے کے بعد اب اس نے اپنی جون بھی بدل دی تھی، عام پنڈت پجاریوں کا روپ اختیار کر لیا تھا، اس وقت بھی خاصا صاف تھرا دکھائی دے رہا تھا، گہرے زرد رنگ کی اجلی دھوتی اس کے لمبے تڑنگے جسم پر خاصی سج رہی تھی، بازو اور سینہ کھلا ہوا تھا۔ سیدھے ہاتھ کی کلائی میں لوہے کے دو کنگن تھے، ننگے سینے اور کشادہ پیشانی پر صندل کی دھاریاں پڑی تھیں۔ گلے میں کئی چھوٹی بڑی مالا میں جھول رہی تھیں۔ ایک گہرے گہرے رنگ کی اکیس موٹے دانوں کی مالا بھی تھی جس پر اس وقت اس کی موٹی موٹی انگلیاں تیزی سے گردش کر رہی تھیں لیکن وہ جن تیز نظروں سے مدھو کو گھور رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس وقت اچھے موڈ میں نہیں ہے۔

مدھو پوری طرح بن سنور کر، رنگ روپ نکال کر اس کی کنیا میں آئی تھی، اس کی جھیل کنول جیسی مدھر بھری آنکھوں میں مستی ہی مستی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، کاجل کی ڈوری نے ان آنکھوں کو اور بھی قاتل بنا دیا تھا۔ کنیا میں داخل ہونے سے پہلے اسے پوراوشواں تھا کہ مہان پجاری اس کے روپ نکھار کو دیکھ کر دیوانہ ہو جائے گا۔ اپنے شریر کی سندرتا بڑھانے کی خاطر اس نے بڑے گہیر کا پنڈلیوں تک اونچا گھاگھرا پن رکھا تھا۔ سینے پر رنگ چولی تھی۔ خوب صورت

کلائیوں میں اس نے گھاگرے سے ملتے جلتے رنگ کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں، بالوں کا جوڑا باندھ کر اس نے داہنی جانب گیندے کا پھول بھی لگا رکھا تھا۔ مندر کے کھلے صحن سے گزرتے وقت اس نے جس لہراتی چال کا مظاہرہ کیا تھا اس نے وہاں موجود تمام پجاریوں کے من میں ہلچل مچا دی تھی۔ وہ سب اس نئی پجاری کو پہلی بار دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے لیکن پرتاب بھوشن اسے کنیا میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر کئی سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔ انگلیوں کی گردش بھی ہاتھ میں دبی مالا پر کچھ شدت اختیار کر گئی تھی۔

”کیا بات ہے مہاراج.....“ مدھو نے اٹھلا کر اسے لہانے کی کوشش کی۔ ”تم اس طرح اپنی داسی کو کیوں دیکھ رہے ہو؟“

”تو.....“ پرتاب نے اس کے گیندے کے پھول کو حقارت سے دیکھا۔ ”اسے زمین پر ڈال کر چرنوں تلے روند دے۔“

”مہاراج.....“

”میری آگیا کا پالن کر.....“ پرتاب نے مدھو کو تحکمانہ لہجے میں مخاطب کیا۔ ”اسی کے کارن سارا بنا بنایا کھیل چوہٹ ہو گیا۔“

مدھو نے جوڑے سے پھول نکال کر قدموں تلے مسل دیا پھر ہاتھ باندھ کر بولی۔ ”مہاراج، کیا داسی سے کوئی بھول ہوئی؟“

”مورکھ..... تو اس مسئلے کے پاس پھول لگا کر کیوں گئی تھی؟“

”اس کو پوری طرح شیشے میں اتارنے کے کارن۔ تم کہنا تو کہا تھا.....“

”ہاں..... یاد ہے مجھے۔“ پرتاب جل کر بولا۔ ”پرنتو اسی پھول کے کارن اس کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔“

”میں سمجھی نہیں مہاراج۔“ مدھو نے معصومیت سے کہا۔ ”وہ دشت تو پوری طرح مجھے اپنی استری جان کر میرے شریر میں سامنے کو بیا کل تھا۔ پھر اچانک نہ جانے کیسے اسے اپنی بھول کا دھیان آ گیا۔ وہ ایک دم چونکا تھا مہاراج پھر..... میں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”تو نہیں جانتی لیکن دیوی کی کرپا سے میں پاتال میں بھی جھانک کر دیکھ سکتا ہوں۔“ پرتاب نے ہونٹ چباتے ہوئے خلا میں گھور کر کہا۔ ”وہ کوئی چھایا تھی جس نے اس مسئلے کو میرے جال میں پھنسنے پھنسنے بچا لیا اور اب..... اب وہ دور چلا گیا ہے۔“

”کہاں چلا گیا مہاراج؟“

”اپنی استری کو لینے گیا ہے۔ دو ایک دن میں واپس بھی لوٹ آئے گا۔ پھر میں اسے اس طرح گھیر دوں گا کہ اگلا پچھلا سارا حساب برابر ہو جائے گا۔“

”تم نے..... گیندے کی پھول کی بات کیوں کی تھی مہاراج؟“

”اسی پھول نے اسے الجھن میں ڈال دیا ہے۔“

پرتاب ساٹ لہجے میں بولا۔ ”وہ تیرے شریر سے الگ نہ ہوتا تو وہ اتنی جلدی دم دبا کر بھاگنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔ مگر میں نے دیوی کی دیا سے جو مہان شکتی پراپت کی ہے وہ اسے نشٹ کرنے میں میری سہائتا اوش کرے گی۔ پھول نے کھیل خراب کر دیا، میں نے تیرے چاروں اور

(طرف) جو منڈل باندھا تھا وہ اس سے باہر نہ نکلتا تو اس حرامی کی نظر میں بھی نہ آتا..... تو نے بھی جلدی میں واپس آتے ہوئے اس پر دھیان نہیں دیا۔“ پرتاب نے مدھو کو پھر چبھتی نظروں سے دیکھا۔ ”اس مسئلے کے شریر کی آگ نے تجھے بھی پگھلا دیا تھا شاید.....“

”ایسا نہیں ہے مہاراج۔“ مدھو نے دوبارہ ہاتھ باندھ لیے۔ ”دیوی جانتی ہے میں اس کے چرنوں کی دھول ہوں۔ میرے من میں کھوٹ ہوتا تو دیوی کی نظریں بھی میرے من کا چور پکڑ لیتیں۔ پھر شاید مجھے تمہاری سیوا کرنے کا سے بھی نہ ملتا۔“

”دیوی نے تیرے اوپر جو کرپا کی ہے اسے بھولنا مت ورنہ نیکٹ ہو کر رہ جائے گی۔“

”تم بھی شاکر مہاراج۔“ مدھو نے اس بار آگے بڑھ کر پرتاب کے پیر تمام لیے، اس کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔

پرتاب کی آنکھیں گھمنڈ سے چمک اٹھیں کچھ دیر وہ مدھو کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے دیکھ کر بتا کہ اس سے وہ مسلا کہاں ہے؟“

”مہاراج..... میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں کیول ایک داسی ہوں، میرے پاس وہ شکتی.....“

”آنکھیں موند لے۔“ پرتاب نے اس کی بات کاٹ کر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”من میں دیوی کا دھیان کر لے۔ راستے کے اندھیارے بھی دور ہو جائیں گے۔“

مدھو نے دو تین بار آنکھیں جھپکائیں پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دو تین منٹ تک اس کے چہرے پر الجھن طاری رہی پھر ہونٹوں پر ایک مسکان کھیلنے لگی۔ چمک

کر آنکھیں بند کیے بولی۔

”ہاں مہاراج..... وہ..... وہی ہے، کسی گاڑی میں ڈھیر سارے لوگوں کے بیچ بیٹھا ہے۔ میں اسے دیکھ رہی ہوں۔ سب تمہاری کرپا اور دیوی کی دیا ہے۔“

پرتاب نے آگے بڑھ کر اس کے گداز گالوں کو ہتھیلیوں کے بیچ تھاما تو مدھو نے آنکھیں کھول دیں، ان آنکھوں میں چمک ہی چمک تھی اس نے پرتاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”پہلے ایسا بھی نہیں ہوا تھا مہاراج۔“

”جانتا ہوں۔“ پرتاب عجیب انداز میں مسکرایا۔

”اب بھی نہ ہوتا مورکھ لیکن یہ سب بھی اسی مہان شکتی کا چمکار ہے جو میں نے دیوی کے لیے صحن جاپ پورا کرنے کے بعد پراپت کیا ہے۔“

”یہ..... یہ بھی میرے لیے اچنبھا ہے۔“ مدھو نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔ ”آج وہ چمکار ہو گیا جو میں نے بھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا۔“

”یہ نہیں پوچھے گی کہ یہ کیسے ہوا؟“ پرتاب اسے گھورتا ہوا بولا پھر مسکرا کر پوچھا۔ ”پارس پتھر کا نام بھی سنا ہے؟“

”سنا ہے مہاراج..... گیانی کہتے ہیں کہ وہ جسے مل جائے وہ قسمت کا دھنی کہلاتا ہے۔“ مدھو نے جواب دیا۔

”جس دھات پر اسے رکھ دیا جائے وہ بھی کھرا سونا بن جاتی ہے۔“

”جو مہان شکتی کے مالک ہوتے ہیں، جن کو دیوی کا خاص آشیر باد حاصل ہوتا ہے وہ بھی پارس پتھر سے کم نہیں ہوتے۔“

”میں سمجھی نہیں مہاراج.....؟ پتھر تو پتھر ہوتا ہے۔“

”اوش ہوتا ہے۔ پر اسے یہ شکتی اوپر والا دان کرتا ہے۔“ پرتاب نے چھاتی ٹھونک کر جواب دیا۔ ”دیوی نے اپنی کرپا سے مجھے بھی جاپ منڈل سے نکلنے کے بعد یہی شکتی دان کر دی تھی۔ تو بڑی بھاگیہ شالی ہے جو تو نے گچھا سے نکلتے ہی میرے چرن چھو لیے اور..... جب میں نے تیرے شریر سے اپنے شریر کو رگڑا تو..... تو بھی کندن بن گئی۔ پرنتو ایک بات دھیان میں رکھنا۔ جب تک تیرا من اجلا ہے۔ تیرے بھیر کوئی کھوٹ نہیں آئی تو دیوی کی کرپا سے مزے لیتی رہے گی لیکن..... جس دن میں نے تجھ سے نظریں پھیر لیں تو پھر تو کوڑے کے ڈھیر میں پڑا پکڑا بن جائے گی پھر..... دیوی بھی تجھے نشانہ نہیں کرے گی۔“

”میں سارا جیون تمہارے چرنوں کی دھول میں رہوں گی مہاراج..... تم جو آگیا دو گے۔ اس کا پالن کرنا اپنا

کشکول

دھرم سمجھوں گی۔“ مدھو نے بڑی عقیدت سے ہاتھ باندھ کر پرتھوی کے سامنے ڈنڈوت کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھ سے ایک بار جو بھول ہو گئی ہے اسے شاکر دو۔“

”ایک بات اور گانٹھ سے باندھ لے.....“ پرتاب نے اسے پھر تیز نظروں سے گھورا۔ ”دیوی نے تجھے کیول میری سیوا کرنے کو کہا ہے۔ کبھی بھول کر بھی اگر کسی نے کٹے پجاری کو دیکھ کر تیرا من لپٹا یا تو پھر نہ تو گھر کی رہے گی نہ گھاٹ کی۔“

”ایسا میرے جیون میں کبھی نہیں ہوگا مہاراج، میں وچن دیتی ہوں۔“ مدھو نے جواب دینے میں دیر نہیں کی لیکن پھر فوراً چونک کر بولی۔ ”مہاراج کیا تم نے جس دشمن کے پاس بھیجا تھا اس کا دھرم نشٹ کرنے کے کارن بھی مجھے اپنے شریر کی رکشا کرنی پڑے گی؟“

”مورکھ.....“ پرتاب کے غلیظ ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی، سینہ تان کر بولا۔ ”تو کالی کی داسی ہے اور میری سیوا کر رہی ہے تو پھر یہ بات بھی کبھی نہ بھولنا کہ اپنے دیوی دیوتاؤں اور دھرم کے لیے شریر تو کیا، جیون کا بلیدان دینا بھی کوئی پاپ نہیں۔ دیوی کی بھی یہی سیکشا ہے جس پر جینا ہمارا دھرم ہے۔“

”مہاراج..... اب میرے لیے کیا آگیا ہے؟“

”تو نے اچھا روپ نکالا ہے مدھو.....“ پرتاب نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”پرا بھی نہیں..... جب میرا من چاہے گا تجھے بلا لوں گا۔“

مدھو اس سے کتنی کھڑی رہی۔ اسے آنکھ بند کر کے کسی کو دیکھنے کی شکتی ملی تو وہ تن من دھن سے خوش تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پرتاب سے علیحدہ نہیں کیا پھر جب پرتاب نے چھوڑ دیا تو اس نے مدھو سے یہ بھی بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”اس مسئلے پر نظر رکھنا۔ کوئی نئی بات معلوم ہو تو ترنت مجھے خبر کر دینا۔“

”مہاراج..... تم نے کہا تھا کہ کوئی چھایا تھی جس نے تمہارا راستہ کھوٹا کر دیا تھا۔ وہ کس کی چھایا تھی؟“

”اسی کی کھوج میں ہوں.....“ پرتاب نے بل کھا کر کہا۔ ”ایک بار وہ مجھے جل (دھوکا) دے کر نکل گئی پرنتو پرتاب نے ہارنا نہیں سیکھا۔ میں اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا..... تو..... تو اب جا۔“

مدھو ہاتھ باندھ کر اٹھنے قدموں کنیا سے نکل گئی تو پرتاب کچھ دیر بعد پھر فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، آنکھیں بند کر کے پھر کچھ بد بدانے لگا۔

اگر منظر عام پر آگئیں تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“

”رہش.....“ شیخ حامد جھلا کر اٹھ بیٹھا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”میں نہیں جانتی لیکن وہ بڑے اعتماد سے بات کر رہا تھا اور.....“

”ناممکن.....“ اس نے کنول کی بات کاٹ کر کہا۔

”میرے خاص آفس اور تمہارے بیڈ روم تک کوئی چڑیا کا بچہ بھی پر نہیں مار سکتا۔“

”آپ ایک بات کیوں نظر انداز کر رہے ہیں۔“ کنول نے جواب دیا۔ ”جو نو وارڈ میرا موبائل نمبر معلوم کر سکتا ہے وہ.....“

”تم نے کسی سہیلی وغیرہ کو تو یہ نمبر نہیں دیا۔“ شیخ حامد کے ذہن میں ایک امکانی خیال ابھرا۔

”آپ نے مجھے دو موبائل دیے ہیں۔ ایک صرف آپ کے لیے مخصوص ہے اور دوسرا..... دوسرا نمبر کسی کو نہیں دیا بلکہ اس سے ابھی تک کوئی کال بھی نہیں کی گئی۔“

شیخ حامد نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ذہن میں پھر شبہات سرا بھارنے لگے۔ دو تین منٹ خاموشی کے بعد ایک ممکنہ خیال کے تحت اس نے کنول کے علاوہ خود کو بھی تسلی دینے کی کوشش کی۔

”ہو سکتا ہے کسی نے اپنے مطلوبہ نمبر غلط ملائے ہوں اور تمہارا نمبر مل گیا ہو؟“

”لیکن اس نے وہ دھمکی.....“

”ریلیکس۔“ اس نے کنول کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہو سکتا ہے اس کی آواز سن کر تم گھبرائی ہو اور اس نے تمہاری خواہدہ آواز سن کر محض تم سے فلرٹ کرنے کی خاطر ایک امکانی بات کہہ دی ہو اور تم..... ون منٹ.....!“ وہ بات کرتے کرتے چونکا۔ ”اس کا جو نمبر تمہارے موبائل پر ریکارڈ ہوا ہے۔ وہ کیا ہے.....؟“

دوسری طرف سے بتائے جانے والے نمبروں کو نوٹ بک پر لکھنے کے بعد اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”اب تم سو جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں کہ کس کی موت آئی ہے۔“ بعد میں شیخ حامد نے اسی وقت ان نمبروں کو چیک کرایا تو یہ جان کر اس کی

نیند اور اچاٹ ہو گئی کہ وہ نمبر ایک ایسے شخص کا تھا جو ایک سال پیشتر کسی ایکسیڈنٹ میں کام آ گیا تھا۔ اس کی اکلوتی بیوی شوہر کی موت کے بعد پنجاب کے کسی گاؤں میں واپس لوٹ گئی تھی۔ گویا وہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں رہا تھا پھر وہ کس

شیخ حامد رات بہت دیر سے سویا تھا۔ دفتر میں لگنے والی آگ اس کے دل و دماغ تک پہنچ گئی تھی۔ اسے نقصان کی فکر نہیں تھی، اس کے انشورنس ایجنٹ نے کل رات ہی اسے فون کر کے کہا تھا کہ تمام ضروری کارروائی زیادہ سے زیادہ پندرہ دن میں مکمل ہونے کے بعد رقم اس کے بینک میں جمع کرا دی جائے گی۔ وزیر داخلہ نے بھی پہلی بار ایس پی اورنگ زیب کے مقابلے میں مردانگی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے نتائج حسب مشاہیر آمد ہوئے تھے۔ خود اورنگ زیب نے اسے کال کر کے اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا جو شیخ حامد کے لیے ایک فتح تھی۔

صبح تقریباً دو بجے وہ بستر پر دراز ہوا تھا۔ اس کے ذہن کے اندر جو کھلبلی مچی تھی اس کو پرسکون کرنے کی خاطر اسے کم از کم دس گھنٹے پرسکون نیند کی ضرورت تھی، اس نے ملازموں کو ہدایت کر دی تھی کہ اسے بلا کسی بہت اہم وجہ کے ڈسٹرب نہ کیا جائے لیکن..... ابھی اسے آدھے گھنٹے کا ذہنی سکون بھی نہیں ملا تھا جب اس کے موبائل کی مدھم گھنٹی بجی۔ شیخ حامد نے جھلا کر اسکرین پر نظر ڈالی، وہ کنول کی کال تھی۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ وہ موبائل کو اٹھا کر دیوار پر اتنی شدت سے مارے کہ پھر وہ ڈسٹرب نہ ہو سکے لیکن پھر کسی خیال کے تحت اس نے موبائل آن کر لیا۔

”اس وقت کیسے کال کیا.....؟“ اس کے لہجے میں بیزاری بھی شامل تھی۔

”سنا ہے کہ آپ کے دفتر کو.....“

”گولی مارو دفتر کو۔“ وہ تلملا کر بولا۔ ”تمہیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی تک کس فکر میں جاگ رہی ہو؟“

”آپ سے ایک بہت اہم بات اور کرنی تھی۔ اسی نے میری نیند بھی اڑا دی ہے۔“ کنول نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”کیا اہم بات ہے؟“

”ابھی پندرہ منٹ پہلے ایک ان نون کال آئی تھی میرے نمبر پر.....“

”تمہارے نمبر پر.....؟“ شیخ حامد چونکا۔ ”تمہارا نمبر میرے علاوہ اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ کون تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟“

”مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا لیکن..... وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس میری اور آپ کی کچھ ایسی تصویریں ہیں جو

کے ہاتھ لگ گیا؟ جس کے ہاتھ لگا اسے کنول کے وہ نمبر کیسے معلوم ہوئے جو شیخ حامد کے سوا کسی اور کے پاس نہیں تھے.....؟ وہ ان ہی خیالوں سے الجھ رہا تھا جب اس کے دوسرے موبائل نے واٹس ایپ پر آکر شروع کیا۔ اسکرین پر آنے والا نمبر اس کے خاص آدمی نمبر نو کا تھا۔ تیسری گھنٹی پر اس نے موبائل آن کر کے کانوں سے لگا لیا۔

”اس وقت کیا ضروری کام پیش آگیا۔“

”باس..... ہمارے ستارے شاید گردش میں آتے جا رہے ہیں۔“

”اب کیا پہاڑ ٹوٹ پڑا.....؟“ شیخ حامد نے دانت پیستے ہوئے سوال کیا۔

”تین لاشوں کا پٹی پیک پارسل باہر سروس روڈ پر پڑا ہے۔“

”کس کی لاشیں ہیں..... تفصیل بیان کرو۔“ شیخ حامد کی آنکھوں کی نیند تین لاشوں کا حوالہ سنتے ہی اچاٹ ہو گئی۔

”راجو اور ان دو ساتھیوں کی لاشیں ہیں باس، جنہیں آپ کی سفارش پر کوٹھی پر ہونے والے حملے کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا۔“ نمبر نو نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پندرہ بیس منٹ پہلے ایک لوڈنگ ٹرک سروس روڈ سے گزرا تھا جس پر سے کوٹھی کے گارڈز کی توجہ ہٹانے کی خاطر فائرنگ بھی کی گئی۔ ٹرک تیزی سے نکل جانے کے بعد ہمارے آدمیوں نے دیکھا کہ لکڑی کی تین قد آدم تاہوت نما پیٹیاں سروس روڈ پر پڑی تھیں۔ ان کا چہرہ باہر سے بھی دیکھا جاسکے اس لیے چہرے کے سامنے والی لکڑی کو بڑی مہارت سے دائرے کی صورت میں کاٹ دیا گیا تھا۔“

شیخ حامد نے پوری تفصیل سننے کے بعد حلق کے بل چیختے ہوئے دریافت کیا۔

”پیٹیاں اب کہاں ہیں.....؟ انہیں کھولا تو نہیں گیا؟“

”آپ کو اطلاع دینا ہمارا پہلا فرض تھا۔ اب آپ جو حکم دیں۔“

”لوڈنگ ٹرک کا نمبر نوٹ ہوا؟“

”اس کا موقع ڈیوٹی گارڈ کو نہیں مل سکا۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”اس کی داہنی ران میں گولی لگی ہے۔ جان بچانے اور پوزیشن لینے کی خاطر گارڈز ایک لمحے کو پیچھے ہٹے تھے، اتنی دیر میں مظلوم ٹرک غائب ہو گیا۔“

”باہر والے کہاں مر گئے تھے؟“

”کسی کو اس کی توقع نہیں تھی باس، اس لیے آپ

کی اطلاع کے لیے بتا دوں کہ لوڈنگ ٹرک سے بے آواز لولیاں چاروں طرف چلائی جا رہی تھیں۔ جو کچھ ہوا وہ سوچے سمجھے اور منظم طریقے سے ہوا ہے۔“

”تمہارا خیال کس طرف جارہا ہے.....؟“

”پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا باس لیکن..... ایسی پی اورنگ زیب ان کو چھوڑنے پر ڈی آئی جی کے اصرار کے بعد بھی یہ مشکل آمادہ ہوا تھا۔ راجو اور اس کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ہی اس چوتھے آدمی کی پتھر کو بھی آزاد کر دیا تھا۔“

”وکی کس کا آدمی تھا.....؟“ شیخ حامد نے ہاتھ ملے ہوئے سوال کیا۔

”وہ..... وہ جگا کے لیے کام کر رہا تھا۔“

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ جگا کو قبر سے کھود کر بھی برآمد کرنے کی کوشش کرو۔“ اس بار شیخ حامد غصے سے لرزتا ہوا چلا یا۔ ”یہ بھی معلوم کرو کہ وہ ولد الحرام ہی کس کے لیے کام کر رہا ہے؟.....“

”ہم ہر طرف کھنگال چکے ہیں باس۔“ نمبر دو نے کہا۔

”وہ ہمارے خوف ہی سے کہیں انڈر گراؤنڈ ہو گیا ہے۔ جس دن کسی کو نظر آگیا اس دن آپ سے پوچھتے بغیر ہی اسے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔“

”گارڈ سے کہو کہ وہ علاقے کے تھانے کو نئی صورت حال کی رپورٹ کرے۔ ذاتی حیثیت میں..... میں ڈی آئی جی سے بات کرتا ہوں۔“ شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے موبائل آف کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ فون سے بڑے طیش کے عالم میں آغا منظور کے گھر کے نمبر ملارہا تھا۔

”ہیلو.....“ تیسری چوٹھی گھنٹی کے بعد دوسری جانب سے آغا منظور کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

”شیخ حامد بول رہا ہوں۔“

”ابھی وقت کیسے یاد کیا.....؟“

”جن حرامیوں نے دفتر کو آگ لگائی تھی وہ ابھی تک دندنا تے پھر رہے ہیں۔“

”خیریت..... اب کیا ہوا؟“

”میں نے کوٹھی کے حملے کے بعد اپنے جن آدمیوں کو تمہاری سفارش پر رہا کر دیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پیشتر ان کی لاش کی پیٹیاں کوٹھی کے سامنے سروس روڈ پر پھینک دی گئی ہیں، جس لوڈنگ ٹرک کے ذریعے انہیں یہاں ڈمپ کیا گیا ہے اس سے باقاعدہ گولیوں کی بارش بھی کی گئی۔ میری کوٹھی کا ایک ڈیوٹی گارڈ بھی زخمی ہو گیا۔“ شیخ حامد نے بھنا کر پوچھا۔

کشکول

توقع جس مہذب انداز میں شیخ حامد کو سیلیوٹ کیا تھا اس سے شیخ حامد کا سینہ کچھ اور چوڑا ہو گیا۔

”کوئی کلیو ملا.....؟“ آغا منظور نے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

”جس ٹرک سے لاشوں کی پیٹیاں گرائی گئی تھیں وہ ہماری ایک ٹائٹ پیٹرولنگ پارٹی کی نظروں میں آگیا ہے۔“

”کوئی گرفتار بھی ہوئی.....؟“ شیخ حامد نے براہ راست اورنگ زیب سے سوال کیا۔

”مذکورہ ٹرک فیکٹری ایریا کے قریب سڑک کے کنارے پارک ملا ہے اور.....“ اورنگ زیب نے ذرا تامل سے کہا۔ ”اس کی ڈرائیونگ سیٹ سے جس ڈرائیور کی لاش ملی ہے اس کے جیب سے برآمد ہونے والے شناختی کارڈ سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کون تھا، کہاں ملازمت کرتا تھا۔“

”کون تھا وہ سورما.....؟“ شیخ حامد بھڑک کر کھڑا ہو گیا۔

”وہ کوئی سورما نہیں بلکہ ایک مظلوم تھا شیخ صاحب۔“

اورنگ زیب نے دبی زبان میں کہا۔ ”اسے اس واردات میں اسلحہ کے زور پر استعمال کیا گیا پھر اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی گئی۔“

”کچھ بتا تو چلے کہ کون تھا وہ مجرم یا مظلوم؟“

”وہ ٹرک اور وہ ڈرائیور..... دونوں آپ کی کمپنی کے تھے۔“ اورنگ زیب نے بہ دستور مدھم لہجے میں انکشاف کیا تو شیخ حامد کے علاوہ آغا منظور بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

”اب تم مجھے کیا حکم دو گے آغا منظور؟“ شیخ حامد نے دانت پیستے ہوئے بڑے سرد لہجے میں سوال کیا۔ ”کس سے رابطہ کروں؟ کس کے گلے میں گھنٹی باندھوں؟ یہ سب میرے ہی ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟ تم سب کس مرض کی دوا ہو.....؟“

”میں صرف دو روز کی مہلت چاہوں گا شیخ صاحب۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے قوی امید ہے کہ ان دو دنوں میں میرے آدمی کوئی نہ کوئی سراغ تلاش کر لیں گے، ویسے آپ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس پر میں بھی ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے شرمندگی کا اظہار ہی کر سکتا ہوں۔“

”جو لاشیں میرے آدمیوں کی گفٹ پیک کی صورت میں ملی ہیں، ان کا کیا کروں؟“

”صرف آپ کے اشارے کی ضرورت ہے۔“ اس بار بھی اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ”ضروری تفتیش کے بعد میں انہیں احترام کے ساتھ دفنانے کا بھی بندوبست کر دوں

جس میں تمہاری جو پیٹرولنگ پارٹیاں گشت کر رہی ہیں۔ وہ جھک مار رہی ہیں؟“

”جو پیٹیاں پھینکی گئی ہیں انہیں وہیں پڑا رہنے دیں۔ پندرہ منٹ کے اندر دوسرے عملے کے ساتھ آتا ہوں۔“ دوسری جانب سے ہدایت کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

شیخ حامد نے اپنے خاص آدمیوں کو کچھ ضروری کالیں میں پھر وہ خواب گاہ سے نکل کر نچلے فلور کے ڈرائنگ روم آگیا۔ اس کے نیچے اترنے کے کچھ دیر بعد آغا منظور بھی اس کے سامنے موجود تھا۔

”ایک ہی رات میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے دو انگلیں وارداتیں۔“ شیخ حامد نے پیشانی پر ہل ڈال کر بگڑے ہوئے تیور سے کہا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اگر جواب میں میرے آدمیوں نے بھی کاروباری..... دفاتر میں شعلے بھڑکانے شروع کر دیے اور اندھا دھند لوگوں کو موت کے منہ میں جھونک دیا تو تم..... تمہاری فورس اور دوسری تمام ایجنسیوں کی نیندیں بھی حرام ہو جائیں گی۔“

”میں آپ کی پوزیشن سمجھ رہا ہوں شیخ صاحب لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ یقیناً کسی سوچی سمجھی اسکیم کے پیش نظر ہو رہا ہے۔ آپ بھی کھل کر کسی پر شبہ نہیں کرتے..... آپ جس کی طرف انگلی اٹھا دیں، ہم اس کو آنکھ بند کر کے حوالات میں ڈال کر اس کی زبان کھلوانے کی پوری کوشش کریں گے لیکن.....“

”تم نے ابھی تک شبہم کے اغوا کے بارے میں کیا کامیابی حاصل کر لی؟“ جواب میں شیخ حامد کی پیشانی پر بھی سلونیس ابھر آئیں۔ ”جگا جیسا غنڈا اور اس کے پالتو کتے بھی کہیں اپنی کسی عزیزہ کی رومالی میں منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔ کوئی سورما مرد نہیں جو سامنے آئے پھر؟..... کیا اس کے نتائج صرف مجھے بھگتنے پڑیں گے؟ تم بھی مجبور ہو، میں بھی صبر کرتا رہوں تو پھر دنیا کا کاروبار کون چلائے گا.....؟ جگا..... شبہم کو اغوا کرنے والے یا دوسرے اچکے اور اٹھائی گیرے؟“

”میں نے آپ کی کسی بات سے نہ پہلے انکار کیا ہے، نہ اب کروں گا..... آپ اشارہ کریں تو میں ملازمت چھوڑنے کو بھی تیار ہوں۔“ آغا منظور نے قدرے جزبہ ہو کر کہا۔ ”اس کے سوا جو آپ حکم دیں میں وہ بھی کرنے کو آمادہ ہوں۔“

شیخ حامد نے کوئی فوری جواب نہیں دیا پھر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ایس پی اورنگ زیب اندر آگیا۔ اس نے خلاف

چاہتا تھا کہ ایس پی اورنگ زیب اندر آگیا۔ اس نے خلاف

چاہتا تھا کہ ایس پی اورنگ زیب اندر آگیا۔ اس نے خلاف

چاہتا تھا کہ ایس پی اورنگ زیب اندر آگیا۔ اس نے خلاف



بھائی سریم کے حنان نہانی

تعلق کوئی بھی ہو بغیر احساسات کے مردہ جسم کے مانند ہوتا ہے ان کا تعلق بھی انتہائی پراسرار تھا... ایک خود فریبی میں مبتلا ایک کو مفاد پرستی کا مرض لاحق... بہ ظاہر ایک جان دو قالب... مگر دو مختلف روپ... ان کی محبت انہیں ایک دوسرے سے قریب رہنے پر مجبور کرتی تھی مگر کوئی تیسرا وجود ایسا بھی تھا جس نے ان کی سمتوں کا رخ مخالف کر ڈالا۔ اس کے باوجود لہو کی پکار ہلچل مچاتی رہی... بالآخر ان میں سے ایک نے پلٹ کر دیکھا اور پھر اس کا بھر م ریت کے مانند بکھر کر رہ گیا۔

دو بھائیوں کی بے مثال محبتوں اور مخالفتوں کا عجیب تماشا

سیاہ سوٹ میں ملبوس وہ جوان اور خوب صورت آدمی فیری ٹاؤن کے قبرستان میں ایک قبر کے سامنے ساکت کھڑا تھا۔ اس کے سنہری مائل سرخ بال بکھرے ہوئے تھے۔ قبر پر جیمز ایڈم کے نام کا کتبہ لگا تھا۔ چوکور سنگ مرمر کی بڑی سی سل پر پیچھے جیمز ایڈم کا نام اور مختصر تعارف تھا۔ اس کے چہرے پر غم و الم کے تاثرات تھے کیونکہ اس کا بھائی ہمیشہ کے لیے اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اسے اپنے بھائی سے بہت زیادہ محبت تھی۔ جیمز ایڈم کی موت آج سے ٹھیک ایک سال پہلے

قدم رکھتے ہی اس نے میڈم کو ایک خاص انداز میں جیسے میڈم روٹی نے بھی محسوس کیا۔
”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اپنی تمام تر مصروفیت باوجود ہمارے غریب خانے پر آنا منظور کر لیا۔“
”وہ بھی شاید نام کی مناسبت سے۔“ میڈم کے اعتبار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برجستہ کہا تو آنا صرف لاجواب ہی نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک بار پھر ایسی والہانہ نظروں سے دیکھا جیسے یہ کہنا چاہ رہا ہو ”اگر آپ اس غریب خانے پر مجھ خاکسار کو بھی سر چھپا خاطر تھوڑی سی جگہ مستقل بنیادوں پر فراہم کر دیں تو بڑی پروری ہوگی۔“
کچھ دیر تک رسی باتیں ہوتی رہیں پھر تھری سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”اب ہمارے سراج صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟“
”خدا کا شکر ہے کہ طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔“
منظور نے مختصر تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے آپ نے میرے علاوہ سراج کو بھی دعوت دی ہوگی۔“
”ان کی دعوت بھی ضرور ہوگی اور آپ کو بھی دو بلا لایا جائے گا۔“ تھریا نے مسکرا کر کہا۔ ”اس طرح آپ آنا جانا بھی لگا رہے گا۔“

”آپ حکم دیں تو میں بستر لے کر ادھر ہی بیٹھ جاؤں۔“ اس بار آغا منظور نے تھریا کے جملے سے لگا اٹھا کر معصوم صورت بنا کر کہا تو میڈم بھی اپنی بے ساختہ ضبط نہ کر سکی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ ڈرائنگ روم میں رکھنے کے بعد سے مہمان کی نظریں کسی نہ کسی بہانے کے تحت بار بار بہک رہی تھیں۔

”آج کل تو خیمہ بستیوں میں بھی بکے الاٹمنٹ بغیر قدم نکالنے کی جگہ نہیں ملتی۔ آپ اس خوب صورت گھر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔“

”انسان اگر دن میں بھی خواب دیکھ لے تو میرا خیال ہے کوئی پابندی نہیں ہے، اس وقت تو پھر رات ہے۔“ آپ کی باتوں پر مجھے حیرت ہی ہو رہی ہے۔ میڈم نے اس کے جواب سے متاثر ہو کر قدرے بے بسی سے کہا۔ ”جس محکمے سے آپ کا تعلق ہے وہاں بذراحت بہت کم پائے جاتے ہیں۔“

اس پراسرار اور تحریرو آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

گا۔ متعلقہ تھانے میں آپ کے گارڈ نے جو رپورٹ درج کرائی ہے وہی بہت ہے۔“
”سوچ لو ایس پی.....“ شیخ حامد نے اورنگ زیب کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”اگر دو روز میں تم بھی کوئی تیر نہ مار سکے تو.....؟“

”ناکامی کی صورت میں اس کا اختیار بھی آپ کو ہوگا۔“
آپ جو فیصلہ صادر کریں گے، وہ مجھے منظور ہوگا۔“
کچھ دیر بعد شیخ حامد کی کوٹھی سے نکل کر باہر آنے کے بعد آغا منظور نے اورنگ زیب کو ایک طرف لے جا کر سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو کوئی یقینی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ خاص طور پر میری موجودگی میں..... فرض کیجیے اگر آپ مجرموں تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو۔“

”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں سر.....“ اورنگ زیب نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”مجرم تک تو ہم بہت پہلے پہنچ چکے ہیں، صرف اس کے ہاتھوں میں لوہے کے ٹنگن ڈالنے باقی رہ گئے ہیں۔“

”میں سمجھ رہا ہوں آپ کا مقصد لیکن شاید آپ اس آکٹوپس کی خطرناک چالوں سے ابھی پوری طرح واقف نہیں ہیں۔“

”واقف ہو گیا ہوں سر..... اسی لیے تو اب اس کے سامنے جھک رہا ہوں۔“

”دھاٹ.....“ آغا منظور نے حیرت سے اورنگ زیب کو دیکھا۔ ”کیا آپ واقعی اس کے سامنے سر نہڑ کر کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟“

”نی الحال.....“ اورنگ زیب نے شانے اچکا کر بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ”دو روز بعد کون کس کے شکنجوں میں ہوگا۔ قبل از وقت کون یقین سے کہہ سکتا ہے۔“

آغا منظور کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ ایس پی کے جملے کی گہرائی تک پہنچنے سے ہی قاصر تھا پھر..... قبل اس کے کہ وہ اورنگ زیب سے مزید وضاحت چاہتا۔ ملحقہ تھانے کا انسپکٹر ان کے قریب آ گیا۔ ان کے درمیان پیش آنے والی واردات کی قانونی باتیں شروع ہو گئیں تو آغا منظور کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد واپس گھر چلا گیا۔

تھریا نے بڑے والہانہ انداز میں آغا منظور کا استقبال کیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں میڈم روٹی پہلے سے موجود تھی جہاں اس نے آغا منظور کو سادگی سے خوش آمدید کہا۔ خود آغا منظور اس وقت خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں

آج ہی کے دن اور تقریباً اسی وقت واقع ہوئی تھی۔ یعنی آج جیمز ایڈم کی برسی تھی۔ اس وقت قبرستان میں اور کوئی نہیں تھا بس وہی ایک جیمز ایڈم کی قبر کے سامنے افسردہ کھڑا تھا۔

☆☆☆

امریکی ریاست ساؤتھ ڈکونا میں ایڈم خاندان غیر معروف نہیں تھا۔ وہ اس علاقے میں آنے والے اولین لوگ تھے اور گزشتہ ڈھائی سو برس سے زیادہ عرصے سے یہاں آباد تھے۔ اس عرصے میں خاندان بہت بڑھ گیا تھا اور اس کے بہت سارے لوگ دوسرے علاقوں کی طرف چلے گئے تھے۔ مگر اب بھی بیشتر ایڈمز ساؤتھ ڈکونا میں ہی آباد تھے۔ ریاست کے وسطی حصے میں اس چھوٹے سے قصبے میں ایڈم خاندان کے کئی گھرانے آباد تھے اور انہیں یہاں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ وہ دولت مند تھے اور قصبے کی معیشت ایک طرح سے ان ہی کے گرد گھومتی تھی۔ اسی وجہ سے ان کی سیاسی اہمیت بھی تھی۔ قصبے کا میئر اور مقامی کانگریس مین یا سینیٹر ان کی رضا مندی سے بننا تھا۔ اس سے ایڈم خاندان کے اثر و رسوخ کا یہ خوبی پتا چلتا تھا۔

مارش ایڈم ایک بزنس مین تھا۔ قصبے کے پاس ایک انڈسٹریل اسٹیٹ میں اس کا شیشے کی اشیا بنانے کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ یہ کارخانہ اس کے باپ نے قائم کیا تھا لیکن اسے اس مقام تک مارش لے کر آیا تھا۔ آغاز میں یہاں صرف سادہ شیشے اور شیشے کی سادہ مصنوعات بنی تھیں پھر مارش یہاں جدید ٹیکنالوجی لایا، اس نے شیشے کی اعلیٰ اور معیاری اشیا بنانا شروع کیں اور اب ایڈمز گلاس کی مصنوعات پورے امریکا بلکہ یورپ تک جاتی تھیں۔ مارش ارب پتی تھا اور اس کے پاس دنیا کی ہر آسائش اور سہولت تھی۔ فیری ٹاؤن میں مارش کا خوب صورت دلا نما گھر تھا۔

☆☆☆

نوجوان نے گہری سانس لی اور قبر کے پاس سے ہٹ کر قبرستان سے باہر جانے لگا۔ دن کی روشنی اپنے آخری دموں پر تھی۔ سرما کا آغاز تھا اور درختوں سے زرد ہو کر جھڑنے والے پتے راستوں اور سڑک پر تھے۔ ہوا انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ اڑاتی پھر رہی تھی۔ قبرستان قصبے سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس کے آغاز میں فیری ٹاؤن کا خوب صورت سفید عمارت والا چرچ تھا۔ عین اس وقت جب وہ سڑک پر آیا اور قصبے کی طرف جانے لگا تو چرچ سے فادر جارج نکلے اور انہوں نے نوجوان کو جاتے دیکھا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ اس خوب صورت ولا کے سامنے کھڑا تھا جس کے گیٹ پر

ایڈم ہاؤس کی تختی لگی تھی۔

☆☆☆

مارش ایڈم کے دو بیٹے جیمز اور مائیکل تھے۔ بڑا تھا، اسے شروع سے تعلیم سے دلچسپی تھی اس لیے اس عمری میں بزنس ڈگری حاصل کر لی اور باپ کے کاروبار میں شامل ہو گیا۔ جیمز اس سے پانچ برس چھوٹا اسے تعلیم سے زیادہ کھیل کود اور مہم جوئی سے دلچسپی تھی دلچسپی اس کی موت کی وجہ بنی۔ صرف بائیس برس کی عمر میں موٹر سائیکل کے حادثے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زیادہ تیز بائیک چلا رہا تھا۔ اس کی بائیک سڑک پر پڑے آئل سے سلب ہوئی اور جیمز سمیت قلابازیاں کھاتی ایک کھائی میں جا گری۔ جیمز موت سے ہمکنار ہو گیا تھا۔ جب ایسپولینس اور ڈاکٹر حادثہ پر پہنچے تو وہ مر چکا تھا۔

یہ بڑا افسوس ناک سانحہ تھا جس نے سنا وہ اٹک ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ جیمز ہنس کھ، زندہ دل اور نوجوان تھا اس کے بے شمار دوست تھے اور دشمن کوئی نہ تھا۔ اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن ان میں سے کوئی کی گرل فرینڈ نہیں بن سکی تھی۔ جو اسے پسند نہیں وہ انہیں نہیں تھا اور جو اسے پسند کرتی تھیں جیمز کو ان میں دلچسپی تھی۔ اس نے ان کے پاس جانے کی کوشش بھی نہیں کیونکہ وہ کسی کو دھوکا دینے کا قائل نہیں تھا۔ اس نے لڑکیوں سے صاف کہہ دیا کہ وہ ان سے دوستی کر سکتا ہے اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ وہ لڑکیاں اس صاف گوئی پر مسوس کر رہ گئی تھیں لیکن ان میں سے کسی نے جیمز کے دل میں کینہ نہیں رکھا تھا۔ وہ سب بعد میں بھی اس کی دوست رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ کچھ دیر کھڑا ایڈم ولا کو دیکھتا رہا۔ سامنے وسیع عریض لان تھا جس میں وہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔ اس عالی شان مکان میں دونوں بھائی اپنے اپنے کمرے کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ گیٹ سے اندر آیا اور سرخ چٹائی والے ڈرائیوے سے ہوتا عمارت کے سامنے والے دروازے میں آیا۔ داخلی دروازہ بلند چھت والے برآمدے میں چھت کو گول رومن طرز کے ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ داخلی دروازے سے اندر آیا۔ سامنے ایک طویل سرخ کارپٹ سے آراستہ گیلری تھی۔ گیلری میں دونوں طرف دروازے تھے۔ دیواروں کے ساتھ چھوٹی میز

اور اسٹولز پر آرٹسٹک چیزیں رکھی تھیں۔ دیواروں پر خوب صورت تصاویر آویزاں تھیں۔ وہ گیلری سے ہوتا ہوا عمارت کے مرکزی ہال میں آیا جہاں آتش دان کے اوپر اس کے خاندان کی تصاویر لگی تھیں۔ ان میں مارش ایڈم، اس کی بیوی ایما اور دونوں بچے مائیکل اور جیمز نمایاں تھے۔

☆☆☆

جیمز بہت سے افراد کو پسند کرتا تھا اور ان سے محبت بھی کرتا تھا۔ اسے اپنے باپ سے محبت تھی، اپنی ماں سے محبت تھی جو اس کے باپ سے الگ ہو گئی تھی اور اب کسی اور کی بیوی تھی۔ مارش نے بیوی کو اس شرط پر طلاق دی کہ بچے وہ رکھے گا۔ ایما کی بھی یہی خواہش تھی کیونکہ وہ جس شخص سے شادی کرنا چاہتی تھی اس نے ایما کے بچوں کو قبول کرنے سے پہلے ہی انکار کر دیا تھا۔ علیحدگی کے بعد ایما سال میں دو بار بچوں سے ملتی تھی۔ ایک بار وہ ان سے ملنے آتی تھی اور دوسری بار جیمز اور مائیکل اس کے پاس جاتے تھے۔ ایسا عام طور سے اس وقت ہوتا تھا جب ایما کا دوسرا شوہر مارش کاروباری دورے پر کہیں گیا ہوتا تھا۔ جب تک وہ اٹھارہ سال کے نہیں ہوئے یہ معمول جاری رہا۔ مائیکل نے اٹھارہ سال کا ہوتے ہی ماں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ ماں باپ کی علیحدگی میں وہ ماں کو قصور وار سمجھتا تھا اور اس کا رویہ ایما سے سرد ہوتا تھا۔ البتہ جیمز ماں سے محبت کرتا تھا۔ وہ اپنی وفات تک ماں سے ملتا رہا۔ اٹھارہ سال کے بعد وہ آزاد ہو گیا تھا کہ اپنی مرضی سے ماں سے ملے۔ وہ سال میں کئی بار جا کر ایما سے مل کر آتا تھا۔

ماں سے محبت اپنی جگہ، اسی طرح جیمز باپ سے بھی محبت کرتا تھا لیکن اگر اسے صحیح معنوں میں کسی سے محبت تھی تو وہ اس کا بھائی مائیکل تھا۔ وہ اسے جنون کی حد تک چاہتا تھا۔ بچپن سے وہ مائیکل کا دیوانہ تھا اور جب وہ بالکل چھوٹا سا تھا تو زیادہ تر مائیکل کے پاس ہی رہتا تھا، وہ اسکول سے آتے ہی جیمز میں لگ جاتا اور اسے اٹھائے گھومتا تھا۔ اگر کبھی مائیکل اسے گود سے اتار دیتا تو وہ رونے لگتا تھا پھر ایما کے پاس جا کر بھی نہیں بھلتا تھا۔ اسے صرف مائیکل کے پاس قرار آتا تھا۔ ایما کو بچوں سے خاص دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ جیمز کو مائیکل کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتی تھی۔ بھائیوں میں ویسے ہی محبت ہوتی ہے لیکن جیمز کی مائیکل سے وابستگی اس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ جب اس نے ذرا ہوش سنبھالا تو اس کا بیشتر وقت مائیکل کے ساتھ گزرتا تھا۔ ڈھائی سال کی عمر میں وہ اس کے ساتھ سونے لگا تھا اور صبح جب مائیکل اسکول چلا جاتا تو جیمز سارے گھر میں بولا یا ہوا پھرتا تھا۔ جب مائیکل اسکول سے واپس آتا تو اس کی

خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

صرف جیمز ہی نہیں، مائیکل بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا تھا۔ بھائی کی خاطر اس نے کسی کو دوست نہیں بنایا۔ وہ اسکول سے آتا تو اس کا سارا وقت جیمز کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ وہ اس کا اس طرح خیال رکھتا جیسے کوئی ماں اپنے پہلے بچے کا خیال رکھتی ہے بلکہ مارش کا کہنا تھا مائیکل، جیمز کا اتنا خیال رکھتا تھا جتنا ایما نے مائیکل کا بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ اسے کھلاتا، نہلاتا دھلاتا اور اس کے کپڑے بدلتا تھا۔ پھر وہ اس کے ساتھ کھیلتا تھا۔ جیمز کے لیے مائیکل کے ساتھ زندگی کا ہر لمحہ خوشیوں سے بھر پور تھا۔ جب وہ دس سال کا تھا تو ایما اور مارش میں علیحدگی ہو گئی۔ جیمز ماں کے جانے سے دکھی ہوا تھا لیکن اسے خاص فرق نہیں پڑا کیونکہ مائیکل موجود تھا جو ہر طرح سے اس کا سہمی اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا تھا۔ جیمز اسی اسکول میں داخل ہوا جہاں مائیکل اب بڑے گریڈ میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن وہ جیمز کو ساتھ اسکول لے کر جاتا اور اسے اسکول کی عمارت تک پہنچا کر پھر اپنے اسکول کی طرف جاتا تھا۔ بڑے گریڈ والوں کی عمارت الگ تھی۔ البتہ اسکول ایک ہی جگہ تھا۔ جیمز کی چھٹی پہلے ہوتی تھی اور اس وقت مارش اسے لینے آتا تھا کیونکہ مائیکل کلاس میں ہوتا تھا۔ گھر میں جیمز کو ایک گھنٹا بھائی کے بغیر گزارنا پڑتا تھا اور یہ گھنٹا اس کے لیے کتنا مشکل تھا یہ بات وہی جانتا تھا۔ وہ مائیکل کے انتظار میں نہ تو کپڑے بدلتا اور نہ کچھ اور کرتا تھا۔ جیسے ہی مائیکل گھر میں داخل ہوتا وہ دوڑ کر اس سے لپٹ جاتا تھا۔ مائیکل اس کے کپڑے تبدیل کراتا اور پھر اسے منہ ہاتھ دھلا کر کھانا کھلاتا۔ جیمز دس برس تک بھائی کے ہاتھ سے کھانا کھاتا رہا تھا پھر مارش نے ذرا سختی کی تو جیمز نے خود سے کھانا شروع کیا تھا۔ مائیکل پندرہ سال کا ہو چکا تھا لیکن اس کی نہ تو کسی سے خاص دوستی تھی اور نہ ہی اس کی کوئی بیرونی سرگرمی تھی۔ اس کی عمر کے لڑکے مختلف کھیل کھیلتے تھے۔ وہ گرل فرینڈ رکھتے تھے اور زندگی کے تمام تجربے کر چکے تھے لیکن مائیکل ان چیزوں سے دور تھا۔ اس کی وجہ جیمز تھا جو اسے کچھ اور کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد اس کا سارا وقت جیمز کے لیے مخصوص تھا۔ جیمز نے کسی اور سے دوستی نہیں کی۔ اگر کسی بچے نے اس سے دوستی کی کوشش کی تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ایسا لگتا تھا اسے سوائے اپنے بھائی کے دنیا میں اور کوئی پسند ہی نہیں ہے۔ اسکول سے آ کر کھانے کے بعد وہ دونوں کچھ دیر پڑھتے اور آرام کرتے تھے، پھر کھیلنے کے لیے باہر لان پر نکل آتے۔ مارش کا وسیع و عریض مکان تقریباً ایک ہیکٹر رقبے پر

پھیلا ہوا تھا۔ اس کا لان کسی فٹ بال گراؤنڈ سے کم نہیں تھا۔ جیمز اور مائیکل روز شام کو یہاں فٹ بال کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی وہ منی گولف کھیلتے یا پھر رگبی سے شوق پورا کرتے تھے۔

☆☆☆

وہ کچھ دیر آتش دان کے پاس کھڑا خاندان کی تصاویر دیکھتا رہا۔ اس میں مارش کا باپ اور اس کا دادا آئزک ایڈمز بھی موجود تھا۔ خاندان کے کچھ دوسرے افراد بھی کسی کسی تصویر میں تھے لیکن تقریباً تمام ہی تصاویر مارش اور اس کی فیملی کی تھیں۔ پھر وہ ہال سے ہوتا ہوا لاونچ میں آیا۔ لاونچ میں ایک دیوار مکمل طور پر شیشے کی تھی اور اس کے پار ولا کے سوئمنگ پول کا نیلا پانی کسی آنیے کی طرح ساکت تھا۔ وہ باہر نکل آیا۔

☆☆☆

مارش کو تیراکی کا شوق تھا اس نے ولا میں خاصا بڑا سا سوئمنگ پول بنوایا تھا۔ یہ اگرچہ اولمپک سائز تو نہیں تھا لیکن اس سے کچھ ہی چھوٹا تھا۔ ایک طرف اس میں ڈائیو کرنے کا انتظام بھی تھا۔ مختلف جگہوں پر اس کی گہرائی مختلف تھی جہاں بچے تیرتے تھے وہاں پانی صرف پانچ فٹ گہرا تھا اور ڈائیو والے حصے میں پندرہ فٹ گہرا تھا۔ اس میں ڈائیو پرچاس فٹ کی بلندی سے بھی چھلانگ لگا سکتا تھا۔ مائیکل شروع سے بہت اچھا تیراک تھا۔ اس نے صرف چار برس کی عمر میں تیرنا سیکھ لیا تھا۔ اسے خود مارش نے تیرنا سکھایا تھا۔ البتہ جیمز کو پانی سے ڈر لگتا تھا۔ وہ پانچ برس کا ہو گیا تھا اور اس نے ایک بار بھی پول میں قدم نہیں رکھا تھا۔ مائیکل نے کئی بار اسے آمادہ کرنا چاہا مگر وہ نہیں مانا۔ ایک بار تو مائیکل نے اسے اٹھا کر پول میں پھینک دیا اور پھر اس کے پیچھے خود بھی کود گیا۔ بدحواس جیمز نے اسے اس بری طرح جکڑا کہ وہ خود بھی ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ یہ مشکل اس نے خود کو جیمز کی گرفت سے آزاد کیا اور پھر اسے پانی سے نکال کر باہر لے آیا۔ اس روز مارش نے پہلی بار مائیکل کو بری طرح ڈانٹا تھا۔

اس واقعے کے بعد جیمز پانی سے مزید ڈرنے لگا تھا۔ عجیب بات ہے کہ بعد میں اس نے ہم جوئی کا ہر کام کیا۔ وہ پہاڑوں اور چٹانوں پر چڑھا۔ اس نے اسکاٹی ڈائیونگ بھی کی۔ بانیک کا اسے جنون تھا اور وہ بہت خطرناک رفتار سے بانیک چلاتا تھا۔ بعض اوقات اسے دیکھنے والے ڈر جاتے تھے لیکن جیمز کو کبھی خوف محسوس نہیں ہوا۔ البتہ وہ جب کبھی پانی کے پاس جاتا تو خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس نے مرتے دم تک کبھی پانی میں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ پول پارٹیوں میں شریک نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کبھی کسی

دریا یا ندی پر گیا تھا۔ اپنی بائیس برس کی عمر میں اس نے بار بھی سمندر نہیں دیکھا تھا۔ اگر ہم جوئی کے دوران اسے پانی سے واسطہ پڑ جاتا تو وہ اسے پار کرنے کے لیے کوئی پل تلاش کرتا تھا چاہے پانی چند فٹ گہرا کیوں نہ ہو۔ پل تلاش کرنے کے لیے اسے میلوں دور کیوں نہ پڑے۔ عجیب بات تھی۔ ساری عمر پانی سے ڈرنے والا ایڈمز موت کے وقت پانی سے بھرے ایک گڑھے میں تھا۔ اگرچہ وہ گڑھے میں گرنے سے پہلے مر چکا تھا مگر اسے لاش پانی میں تیرتی ہوئی پانی گئی تھی۔

☆☆☆

پانی دیکھ کر اسے عجیب سا احساس ہو رہا تھا اس لیے جلد ہی پول کی طرف سے آگے نکل آیا۔ ولا کے عقبی حصے میں مارش نے لان کی جگہ ایک گرین ہاؤس بنوایا تھا۔ یہاں مارش نے ٹراپیکل علاقے کے پودے اور درخت منگوا کر لگائے تھے۔ برنس سے فارغ ہو کر وہ کئی گھنٹے اس گرین ہاؤس دیکھ بھال میں گزارتا تھا۔ ایما سے اس کے بہت سارے اختلافات میں سے ایک یہ گرین ہاؤس بھی تھا۔ ایما کو شک تھا کہ مارش کو جو وقت اسے دینا چاہیے وہ گرین ہاؤس کو دیتا تھا۔ بعد میں مارش کا یہ شوق مائیکل نے بھی اپنایا تھا اور وہ باپ کے ساتھ مل کر گرین ہاؤس کی دیکھ بھال کرنے لگا تھا۔ جیمز کو گرین ہاؤس سے کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ساری عمر میں شاید تین بار یہاں قدم رکھا ہوگا اور وہ بھی مائیکل کی وجہ سے، وہاں موجود ہوتا تھا۔ اسے برداشت نہیں تھا کہ مائیکل اس سے زیادہ کسی چیز یا انسان پر توجہ دے۔

☆☆☆

ہائی اسکول کے آخری سال میں مائیکل کو ہاکی کا شوق ہوا تھا۔ اس نے اسکول کی ٹیم میں شمولیت کی کوششیں شروع کر دیں مگر اسکول کی ٹیم میں پہلے ہی بہت اچھے کھلاڑی موجود تھے اور ان میں اپنی جگہ بنانے کے لیے مائیکل کو بہت زیادہ محنت کی ضرورت تھی۔ اسکول میں کلاسز ہوتی تھیں پھر وہ گھر آ جاتا اور شام کو دوبارہ اسکول کے اسٹیڈیم پر ٹیکس میں حصہ لینے جاتا تھا۔ جب اس نے ٹیکس میں حصہ لینے کا آغاز کیا تو جیمز بے قرار ہو گیا۔ وہ مائیکل کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ اب اس سے دوری جیمز کو کھلتی تھی۔ دوسری طرف اسے احساس تھا کہ ہاکی کھیلنا مائیکل کا شوق ہے۔ جیمز نے اس کا حل یہ نکالا کہ جب مائیکل ٹیکس کے لیے جاتا تو وہ بھی اس کے ساتھ جاتا۔ اسے ہاکی کھیلنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اسے سرے سے یہ کھیل پسند ہی نہیں تھا۔ وہ صرف مائیکل کی خاطر دو تھیں

کھتے میدان کے سامنے بچوں پر گزارتا تھا۔ اس دوران میں وہ نہ کسی سے بات کرتا اور نہ کچھ اور کرتا تھا۔ بس غلطی باندھے مائیکل کو دیکھتا رہتا اور جیسے ہی مائیکل میدان سے باہر آتا وہ لپک کر اس کے پاس پہنچ جاتا۔ مائیکل نے کئی بار اسے سمجھایا کہ وہ کیوں اس طرح بول رہا ہے، اس سے بہتر ہے وہ گھر میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھا کرے یا کوئی گیم کھیلا کرے لیکن جیمز بھائی سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ بارہ سال کی عمر میں جب لڑکے اپنی روٹین خود بنانے لگتے ہیں ان کے الگ دوست ہوتے ہیں اور الگ سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ وہ کھیلتے ہیں اور ٹیموں کا حصہ بنتے ہیں۔ وہ مل کر پڑھتے ہیں اور مل کر پکنک پر جاتے ہیں تو جیمز کو سوائے مائیکل کے اور کسی سے سروکار نہیں تھا۔ وہی اس کا دوست اور ہم دم تھا۔ وہ اسی کے ساتھ کھیلتا اور اسی کے ساتھ تفریح کرتا تھا۔ لیکن جب مائیکل نے ہاکی کھیلنا شروع کی تو پریکٹس کے بعد اس میں اتنی ہمت اور وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ جیمز کے ساتھ فٹ بال کھیلتا۔

لڑکیاں کھلاڑیوں کو پسند کرتی ہیں۔ وہ جسمانی طور پر مضبوط، جارح اور ہیرو ہوتے ہیں، یہ تینوں خصوصیات لڑکیوں کو پسند ہیں۔ فطری بات تھی کہ میدان کے باہر موجود تماشاویں میں زیادہ تعداد لڑکیوں کی ہوتی تھی۔ وہ اپنی پسند کے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے وہاں آتی تھیں۔ ان میں ایک مشل بین بھی تھی۔ جب جیمز، مائیکل کے ساتھ جانے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ مشل مائیکل میں دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ بڑی دل کش اور نازک اندام لڑکی تھی۔ جب کھیل کے دوران مائیکل کوئی اچھی موو بناتا تو وہ بڑے پُر جوش انداز میں اسے داد دیتی تھی۔ جب مائیکل باہر آتا تو وہ بلند آواز سے اسے سراہتی تھی۔ جیمز نے یہ بات پہلے ہی محسوس کر لی تھی۔ پھر مائیکل بھی مشل کو نظر انداز نہیں کر سکا تھا۔ اب وہ اس کی تعریف کرتی تو مائیکل اس کا شکر یہ ادا کرتا تھا۔ وہ جب مشل سے بات کرتا تو وہ کھل اٹھتی تھی۔

ایک دن مائیکل بہت اچھا کھیلتا تو مشل جیسے دیوانی ہو گئی تھی جیسے ہی مائیکل باہر آیا وہ اس سے لپٹ گئی اور اسے چوم لیا۔ جیمز کے ساتھ مائیکل بھی ہکا بکا رہ گیا۔ پھر مائیکل مسکراتے لگا تھا۔ ظاہر ہے اس عمر کے کسی نوجوان کو کسی لڑکی کی طرف سے ایسی حرکت بری لگ ہی نہیں سکتی۔ اس نے مشل کا شکر یہ ادا کیا تھا۔ مشل نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس سے کہیں اور ملنے کو کہا۔ مائیکل ہچکچایا پھر اس نے ایک اینڈ پر باہر ملنے کا وعدہ کر لیا۔ اس نے مشل کو اپنا نمبر دیا

اور اس کا نمبر لے لیا۔ جب وہ جیمز کے ساتھ واپس جا رہا تھا تو بہت خوش تھا۔ جیمز کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا اور اس نے اپنے تاثرات سے واضح بھی کیا تھا لیکن زندگی میں پہلا موقع تھا جب مائیکل نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ مائیکل ویک اینڈ پر مشل سے ملنے گیا تھا۔ اس کے بعد ان دونوں کی دوستی تیزی سے پروان چڑھی تھی۔ جیمز کو لگا مائیکل اس سے دور جا رہا ہے اس سے چھین رہا ہے اور چھیننے والی مشل ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ معاملہ ایک حد سے آگے جاتا، اچانک مشل مائیکل سے کھنچنے لگی۔ اس نے کھیل کے میدان میں آنا چھوڑ دیا اور جب مائیکل نے اس سے باہر ملاقات کی کوشش کی تو اس نے بہانوں سے انکار کر دیا۔ جلد مائیکل کو پتا چل گیا کہ اس انکار کے پس پشت ایک اور لڑکا ٹام تھا، وہ اسکول کی سوئمنگ ٹیم میں شامل تھا اور لڑکیوں میں بڑا مقبول تھا۔ شکل صورت کا اچھا تھا، بس ایک خرابی تھی کہ وہ ایک معمولی باریمن کا لڑکا تھا۔ مائیکل نے مشل سے جب سختی سے پوچھا تو دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ مشل نے اس پر اور اس نے مشل پر بے وفائی کے الزامات لگائے تھے۔ نتیجہ دوستی کے خاتمے کی صورت میں نکلا تھا۔ مائیکل مشتعل اور غم زدہ تھا۔ بہت دن تک وہ دکھ کی کیفیت میں رہا اور جیمز نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ اسے خوشی تھی کہ اس کا بھائی اسے واپس مل گیا ہے۔

☆☆☆

وہ گرین ہاؤس سے آگے آیا تو ولا کے آخری حصے میں ایک چھوٹا سا بڑا ہاؤس تھا۔ یہ شوق بھی مارش کا تھا، اسے نایاب اور نادر پرندے پالنے کا شوق تھا۔ اس نے بہت مہنگے داموں یہ پرندے جمع کیے تھے اور بڑا ہاؤس میں ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کا مکمل انتظام تھا۔ ان میں سے بعض پرندے ایک لاکھ ڈالرز سے زیادہ مالیت کے تھے اس لیے مارش نے بڑا ہاؤس اس طرح بنوایا تھا کہ کوئی غیر متعلقہ شخص کسی صورت اندر داخل نہ ہو سکے۔ پرندوں کی دیکھ بھال وہ خود کرتا تھا۔ اس نے ان کی دیکھ بھال، خوراک اور علاج کے لیے باقاعدہ کورس کر رکھا تھا۔ جب مائیکل نے گرین ہاؤس اپنے ذمے لے لیا تو مارش کو خیال آیا کہ بڑا ہاؤس جیمز کی ذمہ داری بنادے۔ جیمز کو پرندے اچھے لگتے تھے لیکن اس نے انہیں پالنے میں کبھی دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ یہ ذمے داری والا کام تھا اور جیمز کو ایسا کوئی کام یا مشغلہ اچھا نہیں لگتا تھا جو اس کی ذمہ داری بن جائے۔ اس لیے جب مارش نے اس سے بڑا ہاؤس سنبھالنے کو کہا تو جیمز نے صاف انکار

کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”سوری ڈیڈی مجھے پرندے پالنے کا شوق نہیں ہے۔“

”اگر نہیں ہے تو پیدا کرو۔“ مارش کو اس کے جواب سے مایوسی ہوئی تھی۔ ”تم نہ کوئی کھیل کھیلتے ہو اور نہ کوئی اور ہابی ہے۔ اگر پرندے پالنے کا شوق نہیں ہے تو کچھ اور کرو۔ آدمی کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔“

☆☆☆

وہ ولا کی عقبی سمت سے عمارت میں داخل ہوا اور سڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا جہاں بیڈرومز تھے۔ وہ جیمز کے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ وہ دیکھا ہی تھا جیسے جیمز کی زندگی میں تھا۔ جیمز کی ہر چیز اپنی جگہ رکھی تھی اور کمرے کی حالت بتاتی تھی کہ اس کی باقاعدگی سے دیکھ بھال ہوتی ہے۔ دیواروں پر جیمز کی تصویریں لگی تھیں جن میں وہ فٹ بال کھیلتے اور مہم جوئی کرتے دکھائی دے رہا تھا ایک تصویر میں وہ اپنی ہارے ڈیوسن بایک کے ہمراہ تھا۔ اسی بایک کو چلاتے ہوئے اسے حادثہ پیش آیا تھا۔

☆☆☆

مارش کی بات نے جیمز کو بھی قائل کر لیا کہ آدمی کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے لیکن یہ کچھ اسے اپنی مرضی سے کرنا چاہیے۔ وہ چودہ سال کا ہو چکا تھا اور اسکول میں اپرگریڈ میں آگیا تھا۔ ان دنوں مائیکل بزنس انسٹی ٹیوٹ چلا گیا تھا اور جیمز اکیلا تھا اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا، اس لیے مارش کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔ اس نے اسکول کی فٹ بال ٹیم کے لیے ٹرائل دیے اور منتخب ہو گیا۔ حیرت انگیز طور پر اس کا کھیل بہت اچھا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے اس نے بھی باقاعدہ فٹ بال نہیں کھیلی تھی۔ یہ شاید ایڈم ولا کے لان پر فٹ بال سے ٹھنوں پر ٹیکس کا نتیجہ تھا جو وہ مائیکل کے ساتھ کرتا تھا۔ چند مہینے میں وہ ٹیم کا مقبول ترین کھلاڑی بن گیا تھا۔ اس کا کھیل تو بہترین تھا ہی، اس کی شخصیت بھی کم سحر انگیز نہیں تھی۔ ابھی وہ پندرہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا اور اس کا قد پونے چھ فٹ سے تجاوز کر گیا تھا۔ اسمارٹ ورزشی جسم اور دلکش نقوش کی وجہ سے لڑکیوں کا فیورٹ بن گیا تھا۔ اس کے ارد گرد پروانہ وار منڈلانے والی لڑکیاں عمر میں اس سے تین چار سال بڑی تھیں۔ کم عمری اور نا تجربے کاری کے باوجود جیمز کو یہ سب اچھا لگتا تھا۔ البتہ اس نے کسی لڑکی کو گرل فرینڈ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی توجہ لڑکیوں سے زیادہ اپنے کھیل کی طرف تھی۔ اسی کی وجہ سے اسکول کی ٹیم نے کاؤنٹی چیمپین شپ جیتی تھی۔ اس کے بعد جیمز فیری ٹاؤن کا مقبول

ترین لڑکا بن گیا تھا۔

☆☆☆

وہ جیمز کے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے آیا، یہ مائیکل کا بیڈروم تھا۔ کمرامائیکل کے ذوق اور پسند مطابق سجا ہوا تھا۔ خوب صورت ڈبل بیڈ کے ساتھ رائٹنگ ٹیبل اور اس پر لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ ایک طرف گیسٹیف میں کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ مائیکل کو مطالعہ کا شوق تھا۔ اسی شیف میں اس کی بزنس کی ڈگری سرٹیفیکیشن سبجے ہوئے تھے۔

☆☆☆

مائیکل ایک بزنس انسٹی ٹیوٹ میں بزنس مینجمنٹ کورس کر رہا تھا۔ وہ دو سال بعد آیا تو جیمز کی کایا پلٹ پرچہ رہ گیا تھا۔ چھٹیوں میں وہ گھر آنے کے بجائے تفریح کرے۔ فلوریڈا چلا گیا تھا اور دونوں سال اس کی گرمیوں کی چھٹیوں میں گزری تھیں اسے صرف سربامیں چند دن آنے کا موقع تھا تب سردی کی وجہ سے بیرونی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں۔ جیمز زیادہ تر گھر میں پایا جاتا تھا۔ اس لیے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ جیمز میں کیا تبدیلی آچکی ہے۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو جیمز سوائے اسکول جانے کے اور گھر سے نکلتا ہی نہیں تھا لیکن اب وہ گھر میں کم پایا جاتا تھا۔

جیمز کی تبدیلی کا صحیح معنوں میں اندازہ اس وقت ہوا جب مائیکل نے کورس مکمل کر کے مارش کے ساتھ بزنس دیکھ شروع کیا۔ وہ واپس ولا آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ جیمز پہلے کی طرح اس سے چٹ جائے گا۔ مگر اسے حیرت ہوئی جب جیمز نے اسے زیادہ لفٹ نہیں کرائی تھی۔ اسے مائیکل کے آنے کی خوشی تھی لیکن اس نے اس کے لیے اپنی سرگرمیاں ترک نہیں کی تھیں۔ ان دنوں وہ اسکول میں فاسٹل کے امتحان کی تیاری کے ساتھ انٹر اسٹیٹ ٹورنامنٹ میں اسکول کی نمائندگی کی تیاری بھی کر رہا تھا۔ ان کے کوچ کو امید تھی کہ اگر جیمز ٹھیک کھیلا تو وہ پہلی تین پوزیشنز میں سے ایک لازمی حاصل کر لے گا۔ جیمز اسے یہ سب بڑے جوش و خروش سے بتا رہا تھا۔ مائیکل مسکرا دیا۔

”شکر ہے اب تم بڑے ہو گئے ہو، ننھے ننھے بچے نہیں رہے۔“ اس کا اشارہ سمجھ کر جیمز جھینپ گیا تھا۔ ”وہ وقت اور تھا جب تک میں تمہارے ساتھ رہا مجھے دنیا کا پتا ہی نہیں چلا لیکن جب تم چلے گئے تو مجھے دنیا کو دیکھنے کا موقع ملا۔“

”تم نے ٹھیک کہا لیکن اس میں میرا قصور نہیں ہے میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی پر تم اس وقت کچھ سمجھ

کے لیے تیار نہیں تھے۔“ وہ میری غلطی تھی۔“ جیمز نے اعتراف کیا۔ ”دراصل میں نے بچپن سے تمہارے سوا کسی کو دیکھا ہی نہیں... میرے لیے تم ہی سب کچھ تھے۔ ممی ڈیڈی کی حیثیت بھی تمہارے مقابلے میں ثانوی تھی۔“

مائیکل نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”بہر حال اب تم سمجھ گئے ہو کہ زندگی کس طرح گزارتے ہیں۔ مگر کھیلوں کے ساتھ ضروری ہے تم تعلیم اور اپنے مستقبل کی پروا بھی کرو۔“ جیمز بے پروائی سے مسکرایا۔ ”بزنس سنبھالنے کے لیے تم ہونا... پھر مجھے کیا ضرورت ہے اس بارے میں پریشان ہونے کی۔“

مائیکل کے ساتھ مارش کا بھی خیال تھا کہ جیمز کو اپنے مستقبل کی فکر کرنی چاہیے۔ جیسے مائیکل نے اسکول سے نکلتے ہی بزنس مینجمنٹ کے کورس میں داخلہ لے لیا تھا اور وہ صرف بائیس برس کی عمر میں کاروبار سنبھالنے کے قابل ہو گیا تھا۔ جب وہ جیمز کی عمر کا تھا تب بھی کہیں زیادہ میچور تھا۔ جیمز میں یہ میچورٹی نظر نہیں آ رہی تھی، اس کے خیال میں زندگی کھیل کود اور انجوائے منٹ کے لیے ہے۔ اسے کھیلوں کے ساتھ مہم جوئی کا شوق بھی تھا لیکن مارش کی طرف سے اس پر پابندی تھی اور وہ انتظار کر رہا تھا کہ کب اٹھارہ سال کا ہو تو اسے اس معاملے میں باپ کی اجازت کی ضرورت نہ رہے۔ اسے پُر خطر مہم جوئی کا شوق تھا۔

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد بھی اسے تین مہینے انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس نے مارش کی خواہش کے برعکس بزنس انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لینے کے بجائے ایک مقامی کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں کا ماحول بہت رنگین تھا کیونکہ کالج میں بے شمار لڑکیاں تھیں۔ بزنس انسٹی ٹیوٹ کا ماحول سنجیدہ اور سادہ تھا، وہاں آنے والی لڑکیاں بھی اتنی شوخ و شنگ نہیں تھیں۔ مائیکل سے وہاں کے ماحول کے بارے میں سن کر ہی جیمز نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بزنس انسٹی ٹیوٹ نہیں جائے گا۔ اٹھارہ سال کا ہونے کے بعد اسے کوئی پُر خطر کام کرنے کے لیے اپنے باپ کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ایک مہم جو کلب جوائن کر لیا۔ اسے ہائیکنگ اور رائٹنگ اچھی لگتی تھی۔ پھر بایک کا شوق تھا۔ اس نے ہائی اسکول پاس کرنے پر مارش سے ہار لے ڈیوسن بایک مانگ لی۔ مارش کو بائگرز اچھے نہیں لگتے تھے لیکن جیمز کی فرمائش پوری کرتی تھی۔ اس نے بادل ناخواستہ اسے ہار لے ڈیوسن کا نیا ماڈل لے کر دیا جس کی قیمت پینتیس ہزار ڈالر تھی۔

کھلاڑی

شاعری سے ہماری دلچسپی اس عمر میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ جب دادی ماں کی نثری کہانیوں کا سلسلہ ختم کیا تھا اور جب سے ہم نے ٹرکوں کے پیچھے دوڑنا شروع کیا تھا۔ شومنی قسمت کہ اس وقت خدوخال ایسے نہ تھے کہ کوئی ہمارے ہاتھ میں شاعری کی کتاب تھما تا اور کہتا۔ ”خوش فہم اور حرف آشنا، نادر خان کے ذوق مطالعہ کی نذر۔“ ان دنوں ہمیں اس بات کا بھی علم نہ تھا کہ شاعری میں کون غالب ہے اور کس کا اقبال بلند ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا۔ ”شعر اور شاعر چھپائے نہیں چھپتے۔“ الغرض اشعار کہیں نہ کہیں سے ہمارے کانوں میں اور سر پر پڑتے رہے۔ سب سے پہلا جو شعر ہم نے سنا، وہ تھا۔

بڑھو گے لکھو گے، بنو گے نواب
جو کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب
یہ شعر ہم جب بھی سنتے تھے، کان کھول کر سنتے تھے اور جس کان سے سنتے اسی سے نکال دیتے تھے۔ ہم یہ سوچتے تھے کہ اگر یہ شعر معنوی اعتبار سے صحیح ہے تو جتنے نواب گزرے ہیں، اگر پڑھ لکھ کر نواب بنے تھے تو پھر وہ شاعروں کو اشرفیوں کی پوٹلیاں دے دے کر کیوں پڑھواتے تھے؟ اور جب کھلاڑی کھیل کود کر خراب ہوتے ہیں تو ان کو کھلا کھلا کر نوٹوں کی گڈیاں ان کے ہاتھ پر کس لیے رکھی جاتی ہیں؟ وہ گڈیاں ان کے منہ پر کیوں نہیں ماری جاتیں؟

نادر خان سرگروہ کی کتاب
”باادب یا محاورہ ہو شیار“ سے اقتباس

اس سے پہلے مارش اسے مہم جو کلب کی رکنیت کے لیے بھی پچاس ہزار ڈالر کی بھاری رقم دے چکا تھا۔ جیمز کے ذاتی خرچے بھی بہت تھے اور اکثر اسے مہینے کا دس ہزار ڈالر جیب خرچ بھی کم پڑ جاتا تھا۔ مائیکل جو بزنس میں مارش کے برابر ذمے داریاں نبھا رہا تھا، اس کے اخراجات بھی اتنے نہیں تھے۔ نت نئی چیزوں اور کاموں کے لیے جیمز باپ سے وقتاً فوقتاً بھاری رقومات لیتا رہتا تھا لیکن اپنی غیر نصابی سرگرمیوں کے باوجود جیمز تعلیم پر توجہ دیتا تھا۔ کالج کے ہر سمسٹر میں اس کا اے گریڈ ضرور آتا تھا۔ تین سال بعد اس نے گریجویشن مکمل کر لیا تھا۔ اس نے سائنس لی تھی اس لیے مارش کی خواہش تھی کہ وہ شیشے کی ٹیکنالوجی کی تعلیم دینے والے کسی ادارے میں داخلہ لے تاکہ وہ کاروبار میں براہ راست حصہ لے سکے۔ لیکن ایک بار پھر جیمز نے اسے مایوس کیا تھا۔ اس نے بے پروائی سے شانے اچکا کر کہا۔

”سوری ڈیڈی... یہ بزنس میرے بس کا روگ نہیں ہے۔“

”تمہارے بس کا روگ نہیں تو میرے بعد تم کیا کرو گے؟“ مارش نے تلخی سے پوچھا۔

جیمز نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔ ”ڈیڈی آپ کی بلین ڈالر کی دولت ہے، اس کے ہوتے ہوئے مجھے کیا کچھ کرنے کی ضرورت ہے؟“

”بالکل ضرورت ہے کیونکہ ہر انسان کو کام کرنا چاہیے۔“ مارش نے برہمی سے کہا۔ ”جو شخص کام کر کے دولت نہیں کماتا، وہ معاشرے پر بوجھ ہوتا ہے۔“

”تب میں بوجھ ہی ٹھیک ہوں۔“ جیمز مسکرایا۔ اسے باپ کے غصے اور پریشانی کی ذرا بھی فکر نہیں تھی۔ ”ویسے مائیک ہے نا...“

”ہاں لیکن ہر چیز اس کی ذمے داری نہیں ہے۔“ مارش غصے سے بولا۔ ”تم پہلے ہی اس کے ساتھ بہت زیادتی کر چکے ہو۔“

جیمز چونکا۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“

”تمہیں کچھ بتانا بیکار ہے کیونکہ تم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔“ مارش نے افسوس سے کہا۔

اس کے کچھ عرصے بعد جیمز مائیک کے حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مارش باپ تھا مگر اسے خود سے زیادہ مائیکل کی فکر تھی کہ وہ جیمز کی جدائی کیسے برداشت کرے گا۔ وہ جیمز سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ لیکن مائیکل نے حیرت انگیز طور پر ہمت کا ثبوت دیا، اس نے خود کو بھی سنبھالا

اور باپ کو بھی دلاسا دیتا رہا تھا۔ مارش صدمے کی بہت عرصے تک دفتر بھی نہیں گیا تھا مائیکل ہی سب کچھ رہا تھا۔ خاصے عرصے بعد مارش اس قابل ہوا تھا کہ سکے۔ اس وقت اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ مائیکل تھا ورنہ اگر جیمز کی جگہ مائیکل مر جاتا تو مارش کا کارخانہ جاتا۔ جیمز میں سرے سے بزنس دیکھنے کی صلاحیت تھی۔ جبکہ مائیکل نے اس کی عدم موجودگی کا احسا ہونے نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

وہ کتابوں کے شلف کے پاس کھڑا تھا کراچیا کی نظر بیڈ کے سرہانے رکھی ایک تصویر کی طرف گئی دیکھتا رہ گیا۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر کمرے سے نکل آیا رخ عمارت کے مرکزی ہال کی طرف تھا۔ مارش ابھی تک سے نہیں آیا تھا۔ وہ عام طور سے دفتر سے سب سے آخر اٹھتا تھا جب اس کا پورا اسٹاف چھٹی کر کے جا چکا ہوتا تھا باہر جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ داخلی دروازہ کھلا اور کوئی آیا۔ قالین پر جوتوں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دے رہی تھی نوجوان جلدی سے ہال کے ایک تاریک کونے میں چلا اور ساکت کھڑا ہو گیا۔ آنے والا ہال میں داخل ہوا اور ایک کونے میں بنے چھوٹے سے بار کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ٹاکی ڈھیلی کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے لیے ایک جام بنایا اور اسے لے کر صوفے کی طرف آیا۔ وہ مائیکل تھا، اس نے نوجوان پر دھیان نہیں دیا صوفے پر بیٹھ کر مائیکل نے سیل فون نکالا اور کسی کو کال کر لگا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔ ”ڈیڈی یہ میں بات کر رہا ہوں... باہر ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟... جان اب میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا... ایک ہی دفعہ کھو کر رہا ہوں... اب تو میں نے تمہاری تصویر اپنے بیڈ کے سرہانے رکھی ہے تاکہ تمہارا خیال سوتے میں بھی میرے ساتھ رہے... جان جو ہوا اس میں میرا اتنا تصور تھا... تم جانتی ہو یہ سب جیمز کا حرامی پن تھا... اس نے رقم دے کر تمہارے پیچھے لگایا تھا اور تمہیں کال کر کے میرے بارے میں مس گانڈ کرتا تھا... ہاں وہ نفسیاتی مرہم... میرے پاس کسی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا... میں سالوں تک اس کے ہاتھوں بے وقوف بنتا رہا... جب انجوائے کرنے کی لائف تھی تو میں جیمز کی آیا بنا رہا... میں بزنس انسٹی ٹیوٹ سے واپس آیا تو وہ مجھے نظر انداز کر کے خود زندگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔“ مائیکل کا لہجہ نہ ہر

نقاب

سلیم انور

بعض مناظر اس قدر پُر فریب ثابت ہوتے ہیں کہ فریب کھانے والا انسان خود کو انتہائی بے وقوف سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسے بھی خود پر یہی گمان گزرا جب چلتے چلتے اسے ٹھوکر لگی اور اس کی تمام حسیات بے دار ہو گئیں۔ اسے اپنے تعاقب میں آنے والے تمام سائے مشکوک دکھائی دے رہے تھے لیکن اچانک ایک منظر نے اس کے تمام شک دور کر دیے۔

رگوں میں لہو کی گردش تیز کرتی ایک سنسناتی تحریر



ڈالتے ہیں اور یہ یقین آ جاتا ہے کہ کوئی آپ کا پیچھا کر رہا ہے۔
چاہے آپ کتنی ہی بغلی گلیوں میں گھوم جائیں اور
چاہے اپنی رفتار جتنی بھی کم یا زیادہ کر دیں آپ اس مشتبه

مجھے یقین ہے کہ آپ اس احساس سے بہ خوبی واقف
ہوں گے..... خوف و دہشت اور سنسنی کی وہ لہر جو آپ کو اپنی
ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی ہوئی اس وقت محسوس ہوتی
ہے جب آپ ایک اچھٹی نگاہ اپنے شانوں پر سے عقب میں



ساکت کھڑا یہ سب سن رہا تھا اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔
کے دل کش چہرے پر دکھ کی پرچھائیں لرزنے لگی تھیں۔
نے مائیکل کے جانے کے بعد خود سے کہا۔ ”یہ کس طرح
ہے... نہیں یہ کوئی دھوکا ہے۔“

مگر وہ جانتا تھا یہ دھوکا نہیں تھا، مائیکل نے جو کہا
اس نے اپنے کانوں سے سنا تھا اور اس میں شک کی
گنجائش نہیں تھی۔ وہ تھکے قدموں سے بیرونی دروازے
طرف چل پڑا تھا۔ ولا سے نکل کر وہ دوبارہ سڑک پر آیا
قبرستان کی طرف چل پڑا۔ شام ہو گئی تھی اور تاریکی
سے چھا رہی تھی۔ جب وہ قبرستان کے دروازے سے
داخل ہوا تو ماحول تقریباً تاریک ہو گیا تھا۔ وہ پختہ روش
چلتا ہوا چرچ کے پاس سے ہوتا جیمز ایڈم کی قبر کی طرف
جانے لگا۔ اچانک چرچ کے فادر جارج نمودار ہوئے۔ فادر
جارج گزشتہ تیس سال سے اس چرچ میں فادر تھے اور مقامی
طور پر ہر شخص کو جانتے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ جیسے اسی
منتظر تھے۔ اسے دیکھ کر وہ چونک گئے پھر خوف زدہ نظر آئے
لگے۔ وہ بھی انہیں دیکھ کر رک گیا تھا۔

”نو جوان تم کون ہو؟“ فادر جارج نے ہمت کر کے
پوچھا۔ نو جوان نے ان کی طرف دیکھا۔

”میں۔“ اس نے دکھ سے لبریز لہجے میں کہا۔ ”میں
سمجھتا تھا مائیکل مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں دیکھنے آیا تھا کہ
مجھ سے اب بھی محبت کرتا ہے لیکن...“

یہ سنتے ہی فادر جارج لڑکھڑا کر پیچھے ہو گئے تھے۔
اب خوف ان کے چہرے پر واضح دکھائی دے رہا تھا۔
نو جوان جملہ ادھورا چھوڑ کر ان کی طرف توجہ دے بغیر تیزی
سے ان کے برابر سے ہوتے ہوئے قبرستان کی طرف جا
لگا۔ فادر جارج اسی جگہ کھڑے ناقابل یقین نظروں سے اسے
دیکھ رہے تھے۔ وہ قبرستان میں مڑا اور جیمز ایڈم کی قبر کی
طرف جانے لگا۔ فادر جارج نے جب آخری بار اسے دیکھا
تو وہ جیمز ایڈم کی قبر کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ وہ ایک تاریک
ہولے کی صورت میں دکھائی دے رہا تھا، اس کے بعد وہ
ایک دم غائب ہو گیا، ابھی تھا اور اگلے ہی لمحے وہاں کوئی نہیں
تھا۔ فادر جارج نے گہری سانس لی اور خاصے سرد موسم میں
ماتھے پر آ جانے والا پسینا صاف کیا۔ انہوں نے خود سے
کہا۔ ”یقیناً مجھے غلط فہمی ہوئی ہے... ہاں یہ غلط فہمی ہی ہے۔“
فادر جارج مڑے اور چرچ میں چلے گئے۔ قبرستان
میں سرد اور تیز ہوا سوکھے پتے اڑا رہی تھی۔

گیا۔ ”اس کا خیال تھا میں ساری عمر گدھا بننا اس کے لیے کام
کرتا رہوں گا اور وہ مزے کرے گا... ہاں اس حادثے
نے میری اس سے جان چھڑا دی... ان ہی دنوں مجھے پتا چلا
تھا کہ اس نے تمہیں مجھ سے دور کرنے کے لیے کیا چکر چلایا
تھا... ہاں نام نے خود قبول کیا تھا... تم نہیں جانتیں یہ سن کر
مجھ پر کیا گزری تھی اور میں نے تمہیں کس طرح دیوانہ وار
تلاش کیا تھا... خدا کا شکر ہے تم مجھے مل گئیں اور اب میں
تمہیں کسی قیمت پر نہیں کھونا چاہتا... جیسے ہی ڈیڈ بزنس ٹرپ
سے واپس آئیں گے میں بات کر لوں گا اور میرا خیال ہے
آنے والے مارچ میں ہم شادی کے بعد ہی مون پر جا سکیں
گے... کہاں؟... جہاں تم کہو... آج کی ملاقات میں ہم
تفصیلات طے کر لیں گے۔“

بات کر کے مائیکل نے سیل فون کو بوسہ دے کر کال
کاٹ دی۔ پھر اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا
اور آتش دان کے اوپر لگی اپنی اور جیمز کی تصویر کو گھورتے
ہوئے بولا۔ ”شکر ہے میری تم سے جان چھوٹ گئی ورنہ تم
ساری عمر مجھے استعمال کرتے رہتے... ڈیڈی اور مثل یہی
سمجھتے ہیں کہ تمہیں حادثہ پیش آیا تھا اور مجھے تمہارے مرنے کا
بہت دکھ تھا... لیکن حقیقت صرف مجھے معلوم ہے... تمہاری
بانیک کو حادثہ نہیں پیش آیا تھا... اس کا بندوبست میں نے کیا
تھا... سناتم نے مسٹر جیمز ایڈم... جب مجھے پتا چلا کہ تم نے
مثل کو مجھ سے دور کرنے کے لیے کیا سازش کی ہے تو میں نے
اسی وقت فیصلہ کر لیا۔ اگر میں نے تمہارا بوجھ اپنی گردن سے
نہیں اتارا تو یہ بوجھ ساری عمر میری گردن پر ہی رہے گا۔ اس
بوجھ کو اتارنے کے لیے مجھے کچھ زیادہ نہیں کرنا پڑا تھا۔ بس
سڑک پر تھوڑا سا آئل گرانا پڑا تھا مجھے معلوم تھا تم کتنی تیز
رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہو اور سڑک کے اس تنگ موڑ سے
گزرتے ہوئے بانیک کو کس جگہ سے گھماتے ہو، بس میں نے
وہیں کچھ گندا آئل ڈال دیا۔ سیاہ رنگ کا ہونے کی وجہ سے
تمہیں پتا بھی نہیں چلا اور بانیک سلب ہو گئی۔ پھر وہی ہوا جو
میں چاہتا تھا۔ مجھے تم سے نجات مل گئی اور پولیس بھی یہ سمجھتی رہی
کہ گندا آئل کسی گاڑی سے گرا تھا۔ آج اس واقعے کو پورا ایک
سال ہو گیا ہے۔ سناتم نے جیمز ایڈم... لیکن تم نہیں سن سکتے۔“
مائیکل ہنسا اور اسی لمحے اس کی نظر اس کو نے کی طرف گئی
جہاں نو جوان کھڑا تھا۔ مائیکل کی ہنسی رک گئی اور وہ کچھ خوف
زدہ نظر آنے لگا پھر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ مائیکل سمجھ
رہا تھا کہ وہاں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ شاید مائیکل نے اسے
دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ آتش دان سے ڈرا دور تاریک کونے میں

ہو لے کو اپنے عقب میں چالیس فٹ کے فاصلے پر بہ دستور موجود پاتے ہیں۔۔۔۔۔ تب آپ کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے؟
 بس یہی کیفیت اس وقت مجھ پر طاری تھی۔
 میں IOS یا یونان کے کسی بھی حصے سے واقف نہیں تھی اور نہ ہی مجھے یقینی طور پر اس بات کا معمولی سا گمان تھا کہ طیش میں آ کر رات میں IOS نامی اس چھوٹے سے یونانی شہر میں تنہا نکل پڑنا محفوظ ہوگا۔۔۔۔۔ نہ جانے مجھے جشن سے معمولی لڑائی پر بے مقصد اتنا طیش کیوں آ گیا تھا جو میں ہوٹل سے نکل پڑی۔

میرا خیال ہے کہ میں اپنے ذہن پر سے ہر قسم کے خیالات کا بوجھ اتار پھینکا چاہتی تھی اور بحیرہ روم کی گرمیوں کی یہ رات بڑی مسکون تھی۔ اس رات کے سحر کو اور مزید بہتر انداز سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔۔۔۔۔ نیلے دروازوں والے سفید مکانات، دیواروں پر انگوڑی چڑھتی ہوئی بیلین، پس منظر میں ساحلی چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی سمندری لہروں کا شور اور فضا میں پھولوں اور جڑی بوٹیوں کی ٹھہری ہوئی مہک۔
 یہ ایک پرفیکٹ، مسکون، دل موہ لینے والی رات تھی! میں اس رات کا بھرپور لطف لے رہی تھی کہ وہ میری نظر میں آ گیا۔

پہلے تو میں یہی سمجھی کہ یہ میرا واہمہ ہے۔ اس نے ہڈی والا سیاہ رنگ کا سوٹر پہنا ہوا تھا۔ سائے میں ہونے کی بنا پر اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
 اپنے انداز سے وہ روایتی قسم کا دبے پاؤں پیچھا کرنے والا لگ رہا تھا۔ اسی قسم کا جو آپ صرف پرانی اسکول کی ڈرائونی فلموں میں دیکھا کرتے ہیں۔ اس بات کی تصدیق کے لیے کہ وہ واقعی ایک حقیقت ہے، مجھے چھ بار غیر منطقی ٹرن لینے کے علاوہ دو درجن بار شانوں پر سے عقب میں اچھتی نگاہ ڈالنے کے بعد اس کی موجودگی کا یقین آ گیا۔
 مجھ پر خفقتانی کیفیت طاری ہو گئی۔ میرا ذہن کورا ہو گیا۔ مجھے اس کے علاوہ اور کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں بہ دستور چلتی رہوں اور اپنے عقب میں اچھتی نگاہ ڈالتی رہوں۔

جوگی میں نے منتخب کی وہ تنگ اور مختصر تھی۔ لگ بھگ دو سو فٹ کے بعد وہ کسی قسم کے اسکوائر سے جا ملتی تھی جہاں لوگوں کی ریل پیل دکھائی دے رہی تھی۔ اگر وہ شخص مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس بات کا چانس تھا کہ میں دوڑ کر اس کی دسترس سے نکل کر اسکوائر کے جھوم میں گم ہو جاؤں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں اس پر بھرپور

توجہ مرکوز رکھوں اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنے شانوں سے عقب میں اچھتی نگاہ ڈالنے کا سلسلہ موقوف نہ کروں۔
 کارنر سے گھومتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس تنگ مختصر گلی میں صرف چند دروازے گلی کے رخ پر تھے۔ گلی میں نہ تو کوئی دکان دکھائی دے رہی تھی اور نہ ہی کوئی سے کدہ۔۔۔۔۔ اور یہ بات اس چھوٹے سے جزیرے میں قطعی غیر روایتی محسوس ہوئی۔
 اگر وہ تعاقب کرنے والا اس گلی میں داخل ہوتا ہے مجھے پتا چل جائے گا لیکن تب میں کیا کروں گی؟

میں نے اپنا چہرہ تاروں بھرے آسمان کی طرف اٹھالیا اور التجا کرنے لگی۔ ”خدا یا، پلیز اسے میرے پیچھے مت آنے دینا۔ کاش یہ سب میرا واہمہ ہو!“
 یہ میری زندگی کے ممکنہ بدترین اوقات تھے۔ زندگی بالکل اس طرح لگ رہی تھی جیسے فلموں میں کوئی منظر سنسنی خیز دکھایا جاتا ہے۔
 گلی میں تیس فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد احتیاط کے ساتھ گھوم گئی تاکہ اسے احساس نہ ہونے پائے کہ میں اس کی موجودگی سے باخبر ہوں۔

وہ اب بھی وہاں موجود تھا۔
 بہ دستور میرے عقب میں۔ اس اندھیری گلی میں۔ میں نے اپنا سانس روک لیا حتیٰ کہ میرا سر چکرانے لگا۔ میری نگاہیں بار بار بے قراری میں میرے شانوں کے عقب میں اور اس راستے پر جس پر میں آگے بڑھ رہی تھی، اٹھ رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں گھوٹکے کی سی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہوں۔ صرف میری نبض کی رفتار اس حقیقت کی مظہر تھی کہ میں کم و بیش دوڑ رہی تھی۔
 شانگ اسکوائر میں پہنچنے کے بعد میں مجمع میں گم ہو گئی۔ پھر ایک جگہ رک کر میں جھگی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ چاہے عارضی طور پر سہی لیکن میں فی الوقت محفوظ تھی۔

اسکوائر کے مین ریسٹورنٹ کے کھلے آنگن کا احاطہ سرخ یا قوتی گلاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ فضا گلاب کی خوشبو سے معطر تھی۔ عام حالات میں، میں اس مسکون ماحول کو کسی طور مجھے تروتازہ کر دیتا۔
 لیکن اس وقت معاملہ دوسرا تھا۔ میری زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔
 میں ایک کے بعد ایک گلاب کی ٹہنیاں توڑ رہی تھی۔

میں اس زرد سے بے خبر تھی جو میری ہتھیلیوں میں ہو رہا تھا۔ گلاب کے کانٹوں نے میری ہتھیلیوں کو لہو لہان کر دیا تھا اور ہتھیلیوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

لیکن مجھے صرف ایک ہی بات کی فکر لاحق تھی۔ اپنے دفاع کی۔ کم از کم ان کانٹے دار ٹہنیوں سے میں اپنا کچھ نہ کچھ بچاؤ تو کر ہی سکتی تھی۔

اب میں منظم طور پر اپنا کام کر رہی تھی۔۔۔۔۔ ایک اچھتی نگاہ شانوں پر سے اپنے عقب میں ڈالتی، پھر ایک ٹہنی توڑتی، پھر اچھتی نگاہ عقب میں ڈالتی، پھر ایک ٹہنی توڑتی۔۔۔۔۔ اور ہر بار مجھے وہ دیکھنے کو مل رہا تھا جو میں کسی طور بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

میرا پیچھا کرنے والا!
 اب تو میرا جی چاہ رہا تھا کہ کسی بھی طرح بس جشن کے پاس پہنچ جاؤں لیکن میں اس اسکوائر سے، اس جھوم سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک وہ شخص میرا تعاقب ختم نہیں کر دیتا۔

پھر ایک ناقابلِ پیمائش حوصلے کے ساتھ گلاب کی کانٹے دار ٹہنیوں کو ایک ہتھیار کے مانند ہاتھ میں دوپچے میں اس شخص کی جانب بڑھنے لگی جو میرا تعاقب کر رہا تھا۔
 لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب اس شخص نے یہ بھانپ لیا کہ میں کس مقصد سے اس کی جانب بڑھ رہی ہوں تو وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ میرے بڑھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ رہا تھا اور پھر چند ہی لمحوں میں یہ معاملہ بالکل الٹ ہو گیا۔ اب میں اس کا تعاقب کر رہی تھی اور وہ مجھ سے دور بھاگ رہا تھا۔

پھر یہ سلسلہ ایک وحشیانہ تعاقب میں بدل گیا۔
 لوگ تیزی سے چھٹ رہے تھے اور ہم ان کے درمیان سے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ گلاب کی کانٹے دار ٹہنیاں بہ طور ہتھیار میرے ہاتھ میں دبلی ہوئی تھیں۔
 پھر میں چیخ پڑی۔ ”رک جاؤ!“

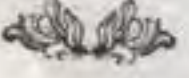
اور پھر میں مزید حیرت زدہ رہ گئی جب میرے تھکمانہ انداز پر وہ یک دم رک گیا۔
 میں بھی رک گئی اور ہانپنے لگی۔ پھر وہ گھوما اور اس نے اونٹنڈاؤ پر اٹھادیا۔ میں محتاط انداز میں اس کے قریب پہنچی تو وہ کسی طور پر ایسا نظر نہیں۔۔۔۔۔ آ رہا تھا جسے دیکھ کر جھرجھری آجائے یا ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑنے لگے۔

”تم کون ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میں اس ہوٹل کا سکیورٹی گارڈ ہوں جہاں تم قیام



پذیر ہو۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔
 ”تو میرا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟“
 ”تمہارے بوائے فرینڈ نے مجھ سے کہا تھا کہ تم پر نظر رکھوں تاکہ تم اس اجنبی جگہ پر کھونہ جاؤ یا کوئی تم پر دست درازی کی کوشش نہ کرے۔“ یہ کہہ کر اس نے قدرے توقف کیا۔
 پھر بولا۔ ”IOS رات کے وقت کسی بھی تنہا خاتون کے لیے خطرناک جگہ ثابت ہو سکتی ہے۔“
 یہ سن کر میری بیجانی کیفیت ختم ہو گئی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے جشن سے میری لڑائی لاکھوں برس پہلے ہوئی تھی۔ اب تو مجھے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ لڑائی کس بات پر ہوئی تھی۔
 میں جلد از جلد واپس جشن کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔

”میں واپس چلنے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے سکیورٹی گارڈ سے کہا۔ ساتھ ہی اپنا ہتھیار یعنی گلاب کی کانٹے دار ٹہنیوں کو اپنے خون آلودہ ہاتھوں سے علیحدہ کرتے ہوئے نیچے رکھ دیا اور گلاب توڑ کر اپنے ہاتھوں میں بھر لیے۔
 پھر ہوٹل واپس پہنچ کر میں نے اپنے خون میں تر گلاب اپنے جشن کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔



پس منظر

سرزا محب بیگ

انسان اگر نہ ملے تو اتنا دکھ نہیں ہوتا مگر کسی کامل کر بچھڑ جانا کتنی داستانوں کو جنم دینے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے اور بد قسمتی سے اسے بھی اپنا ہمسفر کھونا پڑا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی جدائی کی رسوائی نے اس کے دامن کو بھی داغدار کر ڈالا۔ ایسے میں بیگ صاحب قانون کے ہتھیاروں سے آراستہ دلائل کا انبار لے کر اس کے دامن کو دھونے چلے آئے... اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ غم اسے موت کی نیند سلا دیتا۔

”وکالت کا خزانچہ“ گانے کی خواہش کرنے والے ایک موکل کا پر حزن انداز

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ پیش منظر کہلاتا ہے۔ اس منظر نامے کے عقب میں بھی بہت کچھ پوشیدہ ہوتا ہے جہاں تک انسانی آنکھ کی رسائی ممکن نہیں۔ اس چھپے ہوئے راز کو منظر عام پر لانے کے لیے بینائی کے ساتھ دانائی کو بھی استعمال کرنا پڑتا ہے پھر بصارت اور بصیرت کا یہ باہمی ملاپ تحقیق و تفتیش کی گاڑی کو کسی حتمی منزل تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے۔ اس تمہید کے بعد اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ ایک روز میں عدالت سے نکل کر پارکنگ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ کسی نے عقب سے مجھے پکارا۔ اپنے نام کی پکار سن کر مجھے رکنا پڑا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک بینڈم نو جوان کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے پایا۔ میں رک کر سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اگلے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں عدالت کے کمرے سے نکل کر راہ داری سے گزر رہا تھا یہی نو جوان ایک وکیل کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا بعد میں پتا چلا کہ وہ مذکورہ وکیل سے میرے ہی بارے میں پوچھ رہا تھا۔ مذکورہ نو جوان نے میرے قریب پہنچ کر اپنا ایک

ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”السلام علیکم بیگ صاحب.....!“

”وعلیکم السلام۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کے مصافحے کے لیے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔

”آپ مجھے نہیں جانتے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن شیرازی صاحب کے توسط سے میں آپ سے غائبانہ متعارف ہوں اور آج ملاقات بھی ہو گئی ہے۔“

”میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ”آپ کن شیرازی صاحب کا ذکر کر رہے ہیں؟“

میرے جاننے والوں میں شیرازی نام کے تین افراد شامل تھے۔ فیصل شیرازی کا تعلق شو بزنس سے تھا۔ نجم شیرازی مشیر اکم ٹیکس تھے اور فرید شیرازی ایک فلاحتی تنظیم کے روح رواں تھے۔ اس اسرارٹ نو جوان نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”میں نجم شیرازی کی بات کر رہا ہوں جناب۔ وہ نجم ٹیکس وغیرہ کے وکیل ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور استفسار کیا۔ ”آپ کی تعریف؟“

”اوہ..... آئی ایم ریلی ویری سوری بیگ صاحب۔“

وہ ندامت آمیز لہجے میں جلدی سے بولا۔ ”میں پریشانی میں اپنا تعارف تو کرانا بھول ہی گیا..... میرا نام ہاشم ہے۔“

”ہاشم انور۔“

”آپ نے اپنے پریشان ہونے کا ذکر کیا ہے؟“ میں نے تنقیدی نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا اسی سلسلے میں آپ میرے پاس آئے ہیں؟“

”جی ہاں، بالکل یہی معاملہ ہے۔“ وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔

”میں نے اپنی رسٹ وائچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے آپ ٹھیک ایک گھنٹے بعد میرے آفس آ جائیں بھر وہیں پر آپ سے تفصیلی بات ہو جائے گی۔“

اس وقت دن کا ڈیڑھ بج رہا تھا اور اس وقت میں لٹچ پر جاتا تھا۔ لٹچ کرنے میں آدھا پونا گھنٹا لگ جاتا، تاہم میں نے ہاشم انور کو احتیاطاً ایک گھنٹے کا ٹائم دیا تھا۔ ڈھائی بجے تک تو میں یقیناً اپنے آفس میں پہنچ ہی جاتا۔ میں ایک مخصوص ریسٹورنٹ میں دن کا کھانا کھایا کرتا تھا جو سٹی کورٹ کی عمارت اور میرے آفس کے تقریباً وسط میں واقع تھا۔

”ہاشم نے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ کا آفس کہاں پر ہے؟“

”یہاں سے واکنگ ڈسٹنس پر ہے۔“ میں نے کہا پھر اس کثیر المنزلہ عمارت کا نام بھی بتا دیا جس کے اندر میرا دفتر تھا۔



مذکورہ عمارت میں زیادہ تر دکلا ہی کے دفاتر واقع تھے۔ ہاشم نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ”ٹھیک ہے بیگ صاحب! میں اتنی دیر میں لچ کر لیتا ہوں۔“

”لچ.....“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ”آپ کہاں لچ کریں گے؟“

”کہیں بھی۔“ وہ سرسری انداز میں بولا۔ ”ایکچو نیلی مجھے تو ایک گھنٹا گزارنا ہے۔ اسی دوران میں پیٹ پوجا بھی ہو جائے گی۔“

”اگر کوئی پر اہم نہ ہو تو آج لچ میرے ساتھ ہی کر لیں۔“ میں نے ایک اندرونی جذبے کے تحت اسے پیشکش کر دی۔ ”میں اس وقت لچ کے لیے ہی ایک قریبی ریسٹورنٹ میں جا رہا تھا۔“ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے میری پیشکش قبول کر لی۔

ہاشم کی عمر میرے اندازے کے مطابق پچیس اور چھپیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک دراز قامت اور صحت مند نوجوان تھا۔ رنگ گورا اور چہرے کے نقوش سے وجاہت جھلکتی تھی۔ اس نے جینز کے اوپر ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ یہ لباس اس پر بہت سج رہا تھا۔ بازوؤں کی پچھلیوں اور کاتھی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے کسرت کرتا ہوگا۔ اس کا بدن اسپورٹس مین والا تھا اور حرکات و سکنات میں بڑی منظم استعداد پائی جاتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ایک خوب صورت فریم والا نظریہ لگا رکھا تھا۔ وہ خاصا سلیجھا ہوا نوجوان تھا، بات چیت کا انداز انتہائی مہذب اور شائستہ تھا۔

مجھے صحت مند، خوش مزاج اور چاق و چوبند نوجوان بہت اچھے لگتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے بے ساختہ ہاشم کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے دی تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں مجھے اچھا لگا تھا اور اس پیشکش میں بھی میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔

ہم ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھے تو ہمارے درمیان بات چیت بھی ہونے لگی۔ ہاشم میرے ساتھ بیٹھ کر ذرا سا بھی نروس محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک پُر اعتماد نوجوان تھا تاہم جو پریشانی اسے کھینچ کر میرے پاس لائی تھی اس کے آثار ہاشم کی آنکھوں اور چہرے پر دیکھے جاسکتے تھے۔ وہ کسی ذہنی الجھن کا شکار دکھائی دیتا تھا۔

اس نے آرڈر وغیرہ کا معاملہ مجھی پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے تھوڑے غور و خوض کے بعد دو ایسی ڈشز آرڈر کر دیں جو ہم دونوں بہ آسانی کھا سکتے تھے۔ آرڈر پلیس ہونے میں

تھوڑی دیر باقی تھی لہذا میں نے اس مہلت سے اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہاشم سے پوچھا۔ ”ہاشم! آپ جانتے ہیں دنیا میں سب سے قیمتی کیا ہے؟“

”آئی تھنک..... انسانی زندگی۔“

”اور انسانی زندگی میں سب سے قیمتی شے؟“

”اوں.....“ اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”ٹائم۔“

”ویری گڈ۔“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کے دونوں جواب مجھے پسند آئے ہیں۔“

”تھینک یو بیگ صاحب۔“ وہ ممنونیت بھر انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہے تو ہم بھی وقت کا پورا پورا استعمال کریں گے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کھانا بھی چلے گا اس دوران میں ہماری گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“ اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

”بس تو پھر سب سے پہلے آپ مجھے اپنے بارے میں تفصیلاً بتائیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

وہ بتانے لگا۔ ”جناب! میرا نام تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔ میں گارڈن ویسٹ کے علاقے میں رہتا ہوں۔ ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں میری رہائش ہے۔ ایک سال پہلے شادی بھی کر چکا ہوں۔ مین سو لجر بازار میں میری چشموں کی دکان ہے جہاں میں دن بھر موجود ہوتا ہوں۔ میری دکان پر ہر کوئی اور ہر دام کے چشمے موجود ہیں۔ میں اپنے پاس آنے والوں کی نظر بھی ٹیسٹ کرتا ہوں اور ان کی پسند اور ضرورت کے مطابق چشمے بھی بنا کر دیتا ہوں۔“

”اوہ..... لگتا ہے، آپ اپنے کام میں بڑے مہارت سے کام لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”جناب! یہ تو آپ کو تجربے کے بعد ہی صحیح طور پر اندازہ ہوگا کہ میں اپنے پیشے میں کتنا ماہر ہوں۔“ وہ ہنسنے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اگر موقع ملے تو آپ ایک مرتبہ میری شاپ پر تشریف لائیں۔“

”آپ کی سلیز مین شپ کا تو اس دعوت ہی سے مجھے بہ خوبی اندازہ ہو گیا ہے۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور جہاں تک آپ کی دکان پر تشریف لے جانے کا تعلق ہے تو جناب، میرے ساتھ قریب یا دور، کسی بھی

نوعیت کی ضعف نظری والا معاملہ تو ہے نہیں البتہ سن گلاسز کا مجھے ضرور شوق رہا ہے بلکہ شوق ہے۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی شاپ پر اچھے سن گلاسز بھی ہوں گے؟“

”بالکل ہیں جناب۔“ وہ بڑے وثوقی انداز میں سر کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس لوکل سن گلاسز بھی ہیں اور آپ جیسے باذوق لوگوں کے لیے میں نے برانڈڈ گلاسز بھی رکھے ہوئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، پھر تو آپ کی دکان کا ایک آدھ چکر لگانا ہی پڑے گا۔“ میں نے کہا۔

وہ تشکرانہ انداز میں پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے بہت خوشی ہوگی بیگ صاحب۔“

میں نے فوراً اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”ہاشم صاحب! میں پچھلے پندرہ منٹ سے آپ کے ساتھ ہوں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ آپ خاصے اطمینان کے ساتھ مجھے کہنی دے رہے ہیں جس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی سنگین نوعیت کا معاملہ نہیں ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

واضح رہے کہ اس دوران میں ہمارا آرڈر پلیس کر دیا گیا تھا اور ہم نے کھانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے میرے استفسار کے جواب میں کہا۔ ”آپ کسی حد تک درست فرما رہے ہیں۔“

”کسی حد تک..... کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ.....“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو ٹھیک ہے کہ میں مطمئن نظر آتا ہوں۔ میرے چہرے سے وہ پریشانی اور گھبراہٹ ظاہر نہیں ہو رہی جتنا کہ معاملہ سنگین ہے اور اس تضاد کا بھی ایک سبب ہے بیگ صاحب۔“ وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوا، ایک نوالہ منہ میں رکھا اور پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”بیگ صاحب! دراصل میرے ساتھ ایجنسی کوئی پر اہم نہیں ہے۔“

”پھر.....؟“ میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اپنے ایک دوست کی پر اہم لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”میرا دوست عاطف ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔“

”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ ہاشم اپنے کسی مسئلے کے

لیے مجھ سے ملنے آیا تھا۔ یہ تو کوئی دوسرا ہی معاملہ نکل آیا تھا۔ اصل میں ہمارے درمیان گفتگو کی نوعیت کچھ ایسی رہی تھی کہ میں اندازہ نہیں کر پایا تھا، مسئلہ اس کا ہے یا کسی اور کا۔

”آپ کا دوست عاطف کس قسم کی مصیبت کا شکار ہو گیا ہے؟“ میں نے تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔

”پولیس نے عاطف کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”عاطف نے کس کو قتل کر دیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے..... اس پر کس کے قتل کا الزام ہے؟“

”اس کی بیوی ہمارے قتل کا الزام۔“

”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”میں جانتا ہوں، عاطف ایسا انسان نہیں ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”ہمارے قتل میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔ اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس مصیبت میں پھنسا دیا گیا ہے۔“

”تو آپ کے خیال میں، آپ کا عاطف بے گناہ



SOLE DISTRIBUTOR
of U. A. E

WELCOME BOOK SHOP

JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT

P.O.Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae

Best Export From, Pakistan

WELCOME BOOK PORT

Publisher, Exporter, Distributor

All kinds of Magazines, General Books and Educational Books

Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan

Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086

Email: welbooks@hotmail.com

Website: www.welbooks.com

”نہیں جناب! اس کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ لوگ تو اس کیس میں مخالف پارٹی ہیں۔ ہمارے ہاں کل جھکاؤ استغاثہ کی جانب ہے اور وہ بھی عاطف ہی کو ہمارا قاتل سمجھتی ہیں۔“

”جناب بیگ صاحب! آپ اپنی فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کی بالکل فکر نہ کریں۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”منصور صاحب نے اس سلسلے میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے بلکہ اس واقعے کے بارے میں بھی مجھے انہوں نے ہی بتایا تھا۔“

”یہ منصور کون صاحب ہیں؟“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”منصور صاحب دراصل عاطف کے باس ہیں بیگ صاحب۔“ ہاشم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”منصور ٹریولرز کے مالک۔“

”اچھا تو آپ کا دوست کسی ٹریول کمپنی میں کام کرتا ہے؟“

”جی بیگ صاحب۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”وہ ٹکننگ کے شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ منصور ٹریولرز کا آفس میکلوڈ روڈ پر واقع ہے۔“

”چلیں ایک مسئلہ تو حل ہوا۔“ میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اب ایک اور بڑا مسئلہ باقی ہے۔“

”کون سا مسئلہ بیگ صاحب؟“ وہ ابھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”میں نے کہا۔“ ضمانت کا مسئلہ۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں جناب؟“ اس کے لہجے میں ابھن تھی۔

”ہاشم صاحب! میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔“ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس عدالت میں چالان پیش کر دے گی۔ اس موقع پر مجھے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی عدالت میں دائر کرنا ہوگی۔“ میں نے لمحائی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا اس سلسلے میں آپ نے کوئی بندوبست کر رکھا ہے؟“

”بندوبست؟“ اس کی آنکھوں میں تذبذب کی پرچھائیں لہرائی۔ ”ذرا وضاحت فرمائیں گے۔“

”ضرور۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے

مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لہذا کھانے کا بل بھی میں ہی دوں گا۔“ اس وضاحت کے بعد ہاشم نے کوئی مزاحمت نہ کی اور ہم مذکورہ ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ملزم کے ہم در دوست ہاشم کے ساتھ اپنے چیمبر میں بیٹھا ہوا تھا۔

”وہاں ریسٹورنٹ میں، میں نے آپ سے ملزم کے ورثہ کے حوالے سے ایک سوال کیا تھا۔“ میں نے گفتگو کے منقطع سلسلے کو بحال کرتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ مجھے کوئی خاص وجہ بتانے والے تھے؟“

”جی بیگ صاحب۔“ وہ بڑی رसान سے بولا۔ ”عاطف کا کوئی عزیز رشتہ دار آپ کو اس لیے میرے ساتھ نظر نہیں آ رہا کہ وہ اس دنیا میں بالکل اکیلا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونک اٹھا۔

”عاطف چار پانچ سال کا تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کی والدہ نے ماں اور باپ بن کر اسے پالا ہے۔ جب وہ جوان ہوا تو اس کی والدہ بھی چل بسیں۔ وہ کسی دماغی مرض میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ ایک ڈیڑھ سال زیر علاج رہنے کے بعد اسپتال ہی میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب اس بات کو بھی کم و بیش پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”دور کا کوئی عزیز رشتہ دار اس دنیا میں موجود ہوتا تو کہہ نہیں سکتا۔ عاطف کی زبانی کبھی میں نے ایسا کوئی ذکر نہیں سنا۔“

میں نے ایک سفاک حقیقت کی جانب توجہ دلاتے ہوئے ہاشم سے کہا۔ ”آپ کا دوست قتل کے ایک مقدمے میں بطور ملزم نامزد ہو چکا ہے۔ آپ کو کچھ اندازہ بھی ہے کہ اس کیس کی عدالتی کارروائی کے دوران میں کتنے اخراجات ہو سکتے ہیں؟“

”میں کسی اماؤنٹ کا درست اندازہ تو قائم نہیں کر سکتا بیگ صاحب۔“ ہاشم نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن مجھے یہ ضرور پتا ہے کہ آپ کی فیس کے علاوہ دیگر عدالتی اخراجات بھی ہوں گے۔“

”اور یہ تمام تر اخراجات کون برداشت کرے گا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”بہ قول آپ کے، ملزم کے آگے پیچھے تو کوئی ہے ہی نہیں۔ کہیں آپ کے ذہن میں یہ تو نہیں ہے کہ اس سلسلے میں ملزم کی سسرال والے اس کی مالی اور اخلاقی مدد کریں گے؟“

Scanned By PAF

”اور اس کا ایک مطلب یہ بھی کہ.....“ میں نے سر میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کہ اس وقت آپ دوست عاطف عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہوگا۔“

”جی ہاں۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی اور بتانے لگا۔ ”سترہ اگست کی دوپہر میں واقعہ پیش آیا تھا اور اسی روز پولیس نے اسے گرفتار بھی کر لیا تھا۔ اگلے روز یعنی گزشتہ کل پولیس نے عاطف کو میں نے کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا تھا اور اب وہ تھانے میں بند ہے۔“

”کون سے تھانے میں؟“ میرے سوال کے جواب میں اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

”پولیس نے کتنے دن کا ریمانڈ حاصل کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے جواب دیا۔“ سات دن کا۔“

”ملزم عاطف کے کوئی بچے وغیرہ.....؟“

”نہیں بیگ صاحب۔“ اس نے بتایا۔ ”ابھی تک ان کی اولاد نہیں ہوئی تھی۔“

”ایک بات میرے سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں نے اپنی ابھن کو بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”عاطف کے ورثہ میں سے کوئی آپ کے ساتھ نظر نہیں آ رہا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”جی، اس کی خاص وجہ ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں جب ویٹر کومیل کی رقم مع اس کی ٹپ کے کرنے لگا تو ہاشم نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور جلدی سے والٹ نکالتے ہوئے بولا۔ ”آپ نہیں بیگ صاحب، کھانے کے پیسے میں دوں گا۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہاشم صاحب۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

”پلیز بیگ صاحب۔“ وہ والٹ کھول کر اس میں سے رقم نکالنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”ہاشم، اس ریسٹورنٹ میں آپ میرے ساتھ آئے ہو یا میں آپ کے ساتھ آیا ہوں؟“

”ظاہر ہے، آپ مجھے اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔“ کھانے کی پیشکش میں نے آپ کو کی تھی یا آپ نے مجھے؟“

”یہ آفر آپ ہی نے دی تھی۔“

”بس تو پھر ثابت ہو گیا کہ اس لہجے پر میں آپ میزبان اور آپ میرے مہمان تھے۔“ میں نے ذرا

”جی ہاں، مجھے اس کی بے گناہی کا سو فی صد یقین ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”اس یقین کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہے آپ کے پاس؟“

”نہیں جناب! یہ میرے دل کی گواہی ہے۔“

”عدالت دل کی گواہی اور اس قسم کے جذباتی معاملات کو کوئی اہمیت نہیں دیتی ہاشم صاحب۔“ میں نے اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ”وہاں پر ہمیں اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے واقعاتی شہادتیں اور گواہوں کو پیش کرنا پڑتا ہے جب جا کر کہیں بات بنتی ہے۔“

”جناب! عدالتی معاملات کا تو آپ ہی کو زیادہ پتا ہوگا۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ”میں عاطف کو پچھلے پندرہ سال سے جانتا ہوں، جب وہ ہماری اپارٹمنٹس بلڈنگ کے قریب ہی ایک بستی میں رہتا تھا۔ میرا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ ایسا نہیں ہے جیسا اسے اس کیس میں ظاہر کیا جا رہا ہے۔ وہ ہمارا کوئی معمولی سی تکلیف بھی پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا چہ جائے کہ قتل.....“

”آپ نے بتایا ہے کہ ملزم عاطف پہلے آپ کے گھر کے نزدیک ہی کسی بستی میں رہتا تھا۔“ میں نے کھانے کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ”کیا اب وہ کہیں اور شفٹ ہو چکا ہے؟“

”جی ہاں، وہ شادی کے بعد سو لجر بازار کے علاقے میں منتقل ہو گیا تھا۔“

”آپ کے دوست کی شادی کتنا عرصہ پہلے ہوئی تھی؟“

”لگ بھگ ایک سال پہلے۔“

”ہمارے قتل والا واقعہ کہاں پیش آیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کے فلیٹ پر۔“ ہاشم نے جواب دیا۔ ”سو لجر بازار والے فلیٹ پر۔“

”اوہ.....!“ میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا پھر پوچھا۔ ”یہ کب کا واقعہ ہے؟“

”دو دن پہلے کا۔“

”دو دن.....“ میں نے زبانی حساب لگاتے ہوئے کہا۔ ”آج انیس اگست ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا سترہ اگست کو قتل کیا گیا ہے؟“

”جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

Scanned By PAF

Scanned By PAF

Scanned By PAF

Scanned By PAF

کہا۔ ”جب ملزم کو جالان کے ساتھ پولیس حوالہ عدالت کر دیتی ہے تو ڈیفنس کی جانب سے ملزم کے لیے ضمانت یا ضمانتی کا انتظام کرنا پڑتا ہے تاکہ اسے جیل کسٹڈی سے بچایا جاسکے۔ یہ بات بھی طے ہے کہ قتل کے ملزم کی ضمانت تقریباً ناممکن ہوتی ہے تاہم اس سلسلے میں کوشش ضرور کی جاتی ہے۔“ میں سانس لینے کے لیے توقف ہوا پھر اپنی وضاحت مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”مختص ضمانت کو ضمانتی یا ضامن بھی کہتے ہیں جو یقیناً کسی نہایت ہی معزز اور معاشی طور پر خوش حال شہری کی صورت میں عدالت کے لیے قابل قبول ہوتی ہے اور اگر ملزم کی ضمانت کے لیے ایسی کوئی معتبر سماجی شخصیت میسر نہ ہو تو پھر سکے رائج الوقت کام آتا ہے۔ ضمانت کے ضمن میں عدالت ایک بھاری مالیت کا بانڈ بھرداتی ہے۔ آپ اسے ذاتی چیلکے بھی کہہ سکتے ہیں۔“

”مجھے اس بارے میں آج سے پہلے کوئی آئیڈیا نہیں تھا بیگ صاحب۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا منصور ٹریولرز والے منصور صاحب آپ کے دوست کے لیے شخصی ضمانت دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے؟“

”میں سمجھتا ہوں انہیں انکار تو نہیں کرنا چاہیے۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن پھر بھی میں ان سے بات کرنے کے بعد ہی کنفرم کر سکتا ہوں۔“

”آپ ایسا کریں کل اسی وقت منصور صاحب کو اپنے ساتھ میرے آفس لے آئیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں خود ہی براہ راست ان سے بات کر لیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے جناب۔ میں لے آؤں گا انہیں۔“ اس واقعے کے بارے میں آپ کو اگر مزید کچھ پتا ہو تو مجھے تفصیل سے بتائیں۔“ میں نے ہاشم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیگ صاحب، مجھے تو کل رات ہی اس واقعے کی اطلاع ملی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”اور وہ بھی منصور صاحب کے فون کے ذریعے۔ میں رات کو اپنی شاپ بند کرنے ہی والا تھا کہ ان کا فون آگیا اور انہوں نے مجھے بتایا کہ عاطف ایک ناگہانی میں پھنس گیا ہے۔ میری عاطف سے ملاقات ہوئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ عاطف نے منصور صاحب کو میرے بارے میں بتایا تھا کہ مشکل کی اس گھڑی میں ایک میں ہی ہوں جو اس کے لیے بھاگ دوڑ کر سکتا ہوں۔ منصور صاحب نے مجھے یقین دلایا ہے کہ مالی

محاذ پر وہ بھرپور تعاون کریں گے اور عملی میدان میں مجھے پاؤں اور زبان کو زحمت دینا ہوگی لہذا آج صبح میں پہلے ان کے دفتر گیا۔ انہوں نے مجھے ابتدائی اخراجات کے لیے کچھ رقم بھی دی ہے۔ شیرازی صاحب سے میں نے رات ہی بات کر لی تھی اور اب آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔“ وہ رکا ایک طویل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا بیگ صاحب۔“

”کیا آپ عاطف کو دیکھنے تھانے گئے تھے؟“ ”ابھی تک تو نہیں گیا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ کے پاس سے فارغ ہونے کے بعد اس طرف جاؤں گا۔ آج کے دن کے لیے میں نے اپنی شاپ بند رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ ”اچھی بات ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”رات کو میں بھی تھانے جا کر اس سے ایک بھرپور ملاقات کروں گا۔ چند ضروری کاغذات پر اس کے دستخط بھی کروانا ہوں گے۔“

”بیگ صاحب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”شیرازی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ آپ اپنی فیس ایڈوانس میں لیتے ہیں۔ یہ کام بھی ہو ہی جائے تو اچھا ہے تاکہ میں آپ کے آفس سے اس اطمینان کے ساتھ رخصت ہوں کہ آپ نے میرے دوست کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔“

بات ختم کر کے وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اپنا پرس بات شروع کرنے سے پہلے ہی نکال چکا تھا۔ اس کی سوالیہ نظر کا ایک ہی مطلب تھا کہ میں اسے اپنی فیس کے اماؤنٹ کے بارے میں بتاؤں۔ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی خواہش پوری کر دی۔

”شیرازی صاحب نے آپ کو بالکل ٹھیک بتایا ہے۔ میں اپنی فیس ایڈوانس ہی میں وصول کرتا ہوں۔“ اس نے میری فیس کے برابر مالیت کے نوٹ گن کر رقم میری جانب بڑھادی۔ میں نے رقم گن کر اپنی میز کی دراز میں ڈالی اور بدلے میں اسے فیس کی وصولی کی رسید بنا کر دے دی۔

جب وہ میرے دفتر سے رخصت ہونے لگا تو میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ”ایک بات آپ پر واضح کر دوں ہاشم صاحب!“

وہ رک کر ٹھکی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”میں نے اپنی فیس کھری کر کے یہ کیس تو ہاتھ میں لے لیا ہے لیکن ملزم سے ملاقات کے بعد یا کیس کی اسٹڈی کے دوران میں اگر کسی مرحلے پر مجھے یہ احساس ہوا کہ آپ

پیس منظور

کا دوست کسی بھی زاویے سے اپنی بیوی کے قتل میں ملوث ہے تو اسی لمحے میں یہ کیس چھوڑ دوں گا پھر آپ مجھ سے کوئی شکایت نہیں کیجیے گا۔“

”آپ اس عمل میں حق پہ جانب ہوں گے بیگ صاحب۔“ اس نے بھی بڑے واضح انداز میں کہا۔ ”لیکن مجھے یقین ہے، ایسی کوئی بھی صورت حال پیش نہیں آئے گی۔“ ”اللہ کرے، ایسا ہی ہو، میں نے مثبت طرز فکر کا اظہار کیا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا، بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا پھر آئندہ روز آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ میں نے اسی رات دفتری مصروفیات سے نمٹنے کے بعد اپنی گاڑی کو متعلقہ تھانے پہنچا کر ملزم عاطف سے ایک بھرپور ملاقات کر لی اور مجھے جن قانونی کاغذات پر اس کے دستخط کی ضرورت تھی وہ بھی کروا لیے۔ ان کاغذات میں سرفہرست تو میرا وکالت نامہ اور ملزم کی درخواست ضمانت تھی۔

اس بات کا پہلے بھی درجنوں بار کبھی مختصر اور کبھی تفصیلاً احوال بیان کیا جا چکا ہے کہ عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں ملزم سے ملاقات ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ثابت ہوتی ہے۔ بہر حال کبھی قائد عوام، بانی پاکستان اور کبھی دھونس دھمکی کی جھلک دکھا کر یہ کام بھی کر ہی لیا جاتا ہے سو اس رات بھی میں نے کسی نہ کسی طرح ملزم عاطف سے ایک تسلی بخش ملاقات کر لی تھی۔

کہانی کے واقعات کو آگے بڑھانے اور اس کیس کو عدالت میں لے جانے سے پہلے میں آپ کو وقوعہ کے پس منظر سے آگاہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں کسی مرحلے پر آپ کا ذہن الجھن کا شکار نہ ہو۔ ان میں سے بیشتر باتیں تو مجھے ملزم جو کہ اب میرے موکل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، کی زبانی پتا چلی تھیں اور کچھ اہم باتیں میں نے اپنی ریسرچ اور ہاشم انور کے تعاون سے بعد میں معلوم کر لی تھیں۔ میں کسی تفصیل میں جائے بغیر سوائے چند اہم باتوں کے اس کا تمام خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆

ملزم عاطف اس دنیا میں اکیلا تھا جیسا کہ پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد عاطف کی والدہ نے اسے بڑی محبت اور توجہ سے پالا تھا۔ اس کی والدہ ایک معروف فارماسیوٹیکل کمپنی میں کسی چھٹی پوسٹ پر کام کرتی تھیں۔ عمر کے آخری حصے میں وہ کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہو گئی تھیں اور پھر اسپتال ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ہاشم نے اپنی اپارٹمنٹس بلڈنگ کے نزدیک جس بستی کے بارے میں بتایا تھا وہاں عاطف کا ذاتی ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس کا والد بس یہی ایک مکان ترکے میں چھوڑ کر گیا تھا پھر جب اس کی والدہ بھی چل بسیں تو وہ اس دنیا میں تنہا رہ گیا۔ والدہ کی محنت سے اس نے انٹر میڈیٹ تک تعلیم بھی حاصل کر لی تھی۔ جب گھر کا واحد ذریعہ آمدنی بھی زمین اوڑھ کر سو گیا تو عاطف روزگار کے سلسلے میں سرگرم عمل ہو گیا۔ اس کی والدہ بڑی دانش مند خاتون تھی۔ گاہے یہ گاہے جو بھی بچت ہو جاتی وہ اس کے سرٹیفکیٹ خرید لیا کرتی تھی چنانچہ جب وہ اس دنیا سے اٹھی تو کم وبیش دو لاکھ روپے کے سیونگ سرٹیفکیٹس اس کے گھر میں رکھے تھے جن کے حوالے سے اس نے اپنی موت کے بعد عاطف ہی کو ان کا مالک نامزد کر رکھا تھا۔ عاطف نے وہ سرٹیفکیٹس اپنے نام پر تو ٹرانسفر کروا لیے تھے تاہم انہیں کیش کرانے کی حماقت نہیں کی۔ رقم ہاتھ میں آجائے تو خرچ کرنے کی ہزاروں جگہیں نکل آتی ہیں۔ وہ مذکورہ رقم کو سیونگ سرٹیفکیٹس کی صورت محفوظ رکھ کر ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

انسان اگر خلوص نیت سے کسی کام کی کوشش کرے تو جلد یا بدیر اسے اپنے مقصد میں کامیابی ضرور حاصل ہوتی ہے۔ عاطف کی بھی یہ سعی رائگاں نہیں گئی اور مختلف دفتروں کے دھکے کھانے کے بعد بالآخر ایک ماہ کے خاتمے پر اسے منصور ٹریولرز میں جاب مل گئی تھی۔ یہ اس کی پہلی نوکری تھی اور اپنی گرفتاری تک وہ بڑی ثابت قدمی سے اسی ملازمت پر جما ہوا تھا۔

کسی بھی ادارے میں کام کرنے کے لیے باہمی موافقت بہت ضروری ہوتی ہے۔ عاطف اور منصور کے درمیان ابتدا ہی میں میوچل انڈراسٹینڈنگ پیدا ہو گئی تھی۔ عاطف ایک محنتی اور ایمان دار شخص تھا اور منصور ایک مہربان اور قدردان انسان لہذا آج تک کسی نے کسی کو چھوڑنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ جب عاطف کی شادی کا معاملہ سامنے آیا تو اس مرحلے پر بھی منصور صاحب نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

ہما (مقتولہ) کا باپ خاور حمید (مرحوم) عاطف کا گھر دیکھ کر فوراً بدک گیا تھا، اس نے دو ٹوک اور واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں ہما کی ضد کی وجہ سے اس شادی کے لیے تیار تو ہو گیا ہوں لیکن میری بیٹی بیاہ کر اس جگہ میں نہیں آئے گی۔“

چند ماہ پہلے تک خاور حمید زندہ تھا لیکن اب پیوند خاک ہو چکا تھا۔ وہ ایک آسودہ حال بزنس مین تھا لہذا عاطف کے گھر کے حوالے سے اس کا اعتراض بڑا جائز نظر آتا تھا۔ ہمارے ایک بچے میں آنکھ کھولی تھی اور ساری زندگی بڑے آرام و آسائش میں گزری تھی۔ ان کی رہائش گرومنڈر کے نزدیک ایک پوش علاقے میں تھی۔ خاور حمید کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ کا کام کرتا تھا۔ اس کا آفس ٹاور کے نزدیک آئی آئی چندر نگر روڈ پر واقع تھا۔ خاور حمید اور منصور چونکہ ایک ہی علاقے میں بزنس کرتے تھے اور کبھی کبھار ایک دوسرے سے واسطہ بھی پڑ جاتا تھا لہذا وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔

ہما اور عاطف کے سوشل اسٹیش میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن محبت کی کشش انہیں اتنا قریب لے آئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا اور ان کے بیچ محبت کا یہ رشتہ کس طرح استوار ہوا تھا۔ آپ صرف یہ جان لیں کہ ہما اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور خصوصاً خاور حمید کی بے حد لاڈلی بھی۔ ہما کی تمام تر ضدوں اور من مانیوں کے لیے اس کی ماں رئیسہ بیگم، خاور حمید ہی کو ذمے دار ٹھہراتی تھی۔ اس کے خیال میں خاور حمید کے حد سے بڑھے ہوئے لاڈ پیار اور آزادی نے ہما کو خود سر اور سرکش بنا دیا تھا۔ جب عاطف کے حوالے سے گھر میں ہما کی شادی کی بات چلی تو سب سے زیادہ مخالفت رئیسہ بیگم ہی نے کی تھی۔

”میں کسی قیمت پر یہ شادی نہیں ہونے دوں گی۔“ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ خاور حمید کو ہما نے اس شادی کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے باپ کی پدرانہ کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھی لہذا کسی بھی معاملے میں خاور کی رائے کو ہموار کرنے میں اسے دقت پیش نہیں آتی تھی پھر یہ بھی تھا کہ خاور حمید ایک زندہ دل انسان تھا۔ اپنی اکلوتی بیٹی سے بے پناہ محبت کرنے والا۔ وہ جیو اور جینے دو کا حامی تھا لہذا جب ہما نے بڑے واشگاف الفاظ میں اسے اپنی محبت سے نہ صرف یہ کہ آگاہ کیا بلکہ یہاں تک بھی کہہ دیا کہ اگر عاطف اسے نہ ملا تو وہ اپنی جان دیدے گی تو باپ کا دل پگھل گیا۔ وہ دل جس میں بیٹی کی محبت بہ درجہ موجود تھی بلکہ وہ ہما کی محبت کی آنچ ہی سے زندہ تھا۔

خاور حمید نے بیوی کا اعلان سماعت کیا تو پوچھا۔ ”کیوں بھی، آپ اس شادی کو کروانے کا بیڑا کیوں اٹھا رہی ہیں؟“

”میں ماں ہوں۔“ وہ شوہر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہما کا اچھا بڑا جانتی ہوں۔ کچھ سوچ کر فیصلے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔“

”وہی تو پوچھ رہا ہوں۔“ خاور حمید نے کہا۔ ”آخر نے سوچ کیا رکھا ہے؟“

”یہ لڑکا مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا۔“ وہ گول مول انداز میں بولی۔

”اچھا۔“ خاور نے اسے سوالیہ نظر سے گھورا۔ ”آخر کیا خرابی ہے لڑکے میں؟“

”کوئی ایک خرابی ہو تو بتاؤں بھی۔“ اس کا انداز اس بار بھی ٹالنے والا تھا۔

”اگر ایک سے زیادہ خرابیاں ہیں اس نوجوان میں تو.....“ خاور نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔ ”تو پھر کوئی سی بھی دس خرابیاں بیان کر دو۔“

”تمہیں تو مذاق کی سوجھ رہی ہے اور میں پریشان ہوں ہما کے لیے۔“

”ہما کو کیا ہو رہا ہے بھی؟“

”اس نے نادانی میں جو فیصلہ کیا ہے اور تم بھی اس معاملے میں اس کی مدد کر رہے ہو یاد رکھو خاور.....“ اس کا انداز تنبیہی ہو گیا۔ ”یہ نا سمجھ بہت نقصان اٹھائے گی اور تم بھی بیٹھ کر رو گے اس کے کیے کو۔“

”یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں رئیسہ۔“ خاور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اب تو جو فیصلہ ہو گیا سو ہو گیا۔ کچھ بھی ہے ہما کی خوشی کی خاطر یہ قدم تو اٹھانا ہی پڑے گا۔“

”میں نے سنا ہے اس لڑکے کا تو کوئی آگے پیچھے بھی نہیں ہے۔“

”تم نے ٹھیک ہی سنا ہے..... پھر؟“

”میں رشتے داروں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔“ وہ ہاتھ پیر کر بولی۔ ”کوئی پوچھے گا کہ لڑکا کون ہے، اس کے ماں باپ کون ہیں، خاندان کون سا ہے تو..... میں کیا جواب دوں گی انہیں؟“

”وہی جواب جو برسوں پہلے تمہارے والدین نے اپنے خاندان والوں کو دیا تھا۔“ خاور نے معنی خیز نظر سے رئیسہ کی جانب دیکھا۔

خاور کی بات اس کی سمجھ میں ٹھیک طرح سے پہنچ نہ سکی تو وہ الجھن زدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“

”بھئی برسوں پہلے میں پاکستان کے ایک دور دراز علاقے سے کراچی آیا تھا۔ روزگار کے سلسلے میں۔“ خاور مڑ سوچ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا بھی کوئی قریبی عزیز رشتے دار نہیں تھا۔ دور کے رشتے داروں کو میں بہت دور چھوڑ آیا تھا گویا اس وقت میرے بھی کوئی آگے پیچھے نہیں تھا جیسا کہ آج عاطف کے ساتھ ہے۔ ہماری بھی تو شادی ہو ہی گئی تھی نا۔“ وہ لمحے بھر کے لیے تھا ایک ہموار سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”نہ صرف ہماری شادی ہو گئی تھی بلکہ میں نے دن رات سر توڑ محنت کی اور اپنا نام بنالیا۔ آج میرے پاس سب کچھ ہے عزت، دولت، شہرت، بزنس۔ جب میری شادی ہوئی اس وقت تو میں عاطف سے بھی گیا گزرا تھا۔ مجھے امید ہے آگے چل کر عاطف بھی بہت ترقی کرے گا۔ تمہاری قسمت سے میں بن گیا تھا اور ہما کی قسمت سے عاطف بھی ان شاء اللہ ضرور کچھ بن کر دکھائے گا۔“

”یہ کوئی فارمولا تو نہیں ہے۔“ رئیسہ بیگم برا سامنے بناتے ہوئے بولی۔ ”میں تو یہ جانتی ہوں کہ ہماری ہما کے لیے خاندان ہی میں ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ موجود ہے پھر اپنوں کو چھوڑ کر باہر جھانکنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”یہ باہر جھانکنے والا معاملہ نہ تو تم نے کیا ہے اور نہ ہی اس میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔“ خاور نے بڑے واضح انداز میں کہا۔ ”یہ ہما کا ذاتی فیصلہ ہے۔ اس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی عاطف کا انتخاب کیا ہے۔“

پسند کرتا ہے۔“ وہ نوید صدیقی کی وکالت کرتے ہوئے بولی۔ ”نفیسہ آپ نے اشاروں کنایوں میں دو تین مرتبہ مجھ سے بات بھی کی ہے۔“

”نوید یقیناً ہما کو پسند کرتا ہوگا لیکن ہما اس گینڈے کو سخت ناپسند کرتی ہے۔“ خاور نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ”اب ان باتوں کو چھیڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے ہما کی پسند کی تائید کا فیصلہ کر لیا ہے..... بس!“

جب خاور حمید بس کہہ دیا کرتا تو پھر بحث و تکرار کے سارے دروازے بند ہو جایا کرتے تھے۔ رئیسہ کو اس بات کا برسوں سے تجربہ تھا لہذا ان کے بیچ میں گفتگو کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

رئیسہ بیگم نے جس نوید صدیقی کا ذکر کیا تھا وہ رئیسہ کی بڑی بہن نفیسہ کا بیٹا تھا۔ نوید صدیقی ایک ست الوجود گینڈا نما انسان تھا۔ وہ زبان کا بہت خراب اور غصے کا بھی خاصا تیز تھا۔ ہما اس کی بد مزاجی کے باعث ہی اسے سخت ناپسند کرتی تھی۔ نفیسہ کا شوہر فواد صدیقی گارمنٹس کا ایکسپورٹر تھا اور اس کی خاور حمید سے نہیں بنتی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ خاور حمید کی اس سے کبھی نہیں بنی تھی حالانکہ فواد تو خاور کے قریب ہونے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا لیکن

چائنا کلینک اینڈ برن سنٹر
تیزاب۔ گرم پانی۔ تارکول۔ آگ اور الیکٹرک شاک سے جلنے والوں کے لیے

خوشخبری

ڈاکٹر فیاض احمد

یقین سے کہتے ہیں کہ ہمارے کلینک اینڈ برن سنٹر میں اور اپنا علاج کروائیں اور شرطیہ نئی کھال پائیں بغیر پلاسٹک سرجری کے۔ دیگر امراض کا بھی علاج کیا جاتا ہے

نوٹ مرہم بذریعہ vp پارسل بھی منگوا سکتے ہیں

برن اسپیشلسٹ و ڈاکٹر فیاض احمد
(R.H.M.P.D.H.M.S) 0302-2060775

مئی 10 سے 3 بجے تک
رضویہ میڈیٹیشن سوسائٹی گولی مار کراچی شام 4 سے 9 بجے تک

خاور اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ ابتدا میں فواد نے خاور کے توسط سے ایکسپورٹ کے ایک دو کام کروائے تھے اور خاور نے اس کی بے ایمانی پکڑ لی تھی۔ خاور کی نظر میں فواد ایک دھوکے باز اور چرب زبان شخص تھا اور اس قماش کے لوگوں سے خاور سو گز دور ہی رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

خاور نے ہما کی شادی سے پہلے عاطف نے چھوٹے سے مکان کو دیکھ کر جو نقطہ اعتراض اٹھایا تھا اس پر عاطف بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ اگلے روز اس نے اپنے پاس منصور کو صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”تم فکر نہ کرو میں کرتا ہوں کچھ۔“

”آپ کیا کریں گے سر؟“ عاطف نے سوالیہ نظر سے اپنے پاس کی طرف دیکھا۔

”میں خاور حمید سے اس سلسلے میں خود بات کروں گا۔“ منصور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے امید ہے تمہارے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔“ عاطف نے اپنے پاس کی تسلی سے مطمئن ہو گیا۔

دو روز بعد منصور نے خاور کے دفتر جا کر اس مسئلے پر بات کی۔ خاور نے کہا۔ ”میں کچھ غلط تو نہیں سوچ رہا ہوں۔ آپ خود بتائیں منصور صاحب، میری بیٹی اس بستی کے جھونپڑا نما مکان میں کیسے رہے گی؟“

”میں آپ کے موقف سے اتفاق کرتا ہوں خاور صاحب۔“ منصور نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ شادی کے بعد ہما عاطف کے بستی والے مکان میں نہ جائے۔“

”تو پھر.....؟“ خاور نے سوالیہ نظر سے منصور کو دیکھا۔

”پھر یہ کہ اس شادی سے پہلے ہی عاطف کی رہائش تبدیل ہو جانی چاہیے۔“ منصور نے معنی خیز انداز میں کہا۔ خاور نے استعجابیہ نظر سے منصور کو دیکھا اور بولا۔ ”وہ کیسے؟“

”میرے پاس اس کام کو ممکن بنانے کے لیے دو آئیڈیاز ہیں۔“ منصور نے بہ دستور سنجیدہ انداز میں کہا۔ ”ایک آئیڈیاز کا تعلق آپ سے اور دوسرے کا مجھ سے ہے۔“

”پلیز وضاحت کریں۔“ یہ کہہ کر خاور ہمد تن گوش ہو گیا۔

منصور نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر بتانے لگا۔ ”دیکھیں خاور صاحب! آپ اپنی اکلوتی بیٹی کو عاطف کے نکاح میں دینے جارہے ہیں یعنی آپ اسے اپنی عزیز ندی میں

لینے والے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں۔“ خاور نے اثبات میں گردن ہلاتی۔

”اصولی طور پر تو یہ آپ کا فرض بنتا ہے کہ اپنی اکلوتی بیٹی کے آرام و آسائش کے لیے تھوڑی بہت انویسٹ منٹ کر ڈالیں۔“ منصور نے بڑے ڈھنگ سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے پاس کسی شے کی کمی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر نعمت اور ہر دولت سے نوازا رکھا ہے۔ اگر آپ کسی مناسب سے علاقے میں ہما کے نام سے ہی کوئی فلیٹ خرید لیں تو آپ کو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ اس طرح ان لوگوں کی رہائش کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ تو ہے آپ کے لیے آئیڈیاز۔“

منصور اتنا بتانے کے بعد خاموش ہوا تو خاور نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”اور آپ کے حصے کا آئیڈیاز کون سا ہے؟“

”میرے آئیڈیاز کی باری اس وقت آئے گی جب آپ اپنے حصے کے آئیڈیاز پر عمل کرنے سے انکار کر دیں گے۔“ منصور نے کہا۔ ”بہر حال میں وہ بھی بتا ہی دیتا ہوں۔“

”ارشاد۔“ خاور نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ کی جانب سے انکار آتا ہے تو پھر میں

عاطف کے لیے شادی سے پہلے ہی کسی معقول علاقے میں رہائش کا بندوبست کر دوں گا۔“ منصور ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرنے لگا۔ ”سچی بات تو یہ ہے کہ میں اسے کوئی فلیٹ خرید کر نہیں دے سکتا البتہ کرایے پر ضرور دلواسکتا ہوں اور وہ اس طرح کہ.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے

متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”فلیٹ کرایے پر لینے کے لیے ایڈوانس کی جو رقم فلیٹ کے مالک کو دینا ہوگی وہ میں اپنی جیب سے ادا کر دوں گا اور یہ رقم عاطف ہی کی ملکیت ہو جائے گی اب جہاں تک فلیٹ کے ماہانہ کرایے کی ادائیگی کا سوال ہے تو میں اس سلسلے میں عاطف سے دو ٹوک

بات کر لوں گا۔ وہ بستی والے اپنے مکان کو کرایے پر اٹھا دے گا اور وہاں سے ملنے والے کرایے میں مزید رقم ملا کر وہ ہر ماہ فلیٹ کا کرایہ بھرتا رہے گا اور یہ مزید رقم اس کے لیے کوئی اضافی بوجھ ثابت نہیں ہوگی کیونکہ میں اس کی تنخواہ میں کم و بیش اتنا ہی اضافہ کر دوں گا۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر لمحائی توقف کیا پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل

کر دی۔

”خاور صاحب میں جو کر سکتا ہوں وہ آپ کو بتا دیا ہے۔“

”میں آپ کے پُر خلوص جذبات کی قدر کرتا ہوں۔“ آپ عاطف کے سچے خیر خواہ ہیں۔“ خاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کو کسی امتحان میں نہیں ڈالوں گا بلکہ آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ اصولی طور مجھے اپنی بیٹی کے سکھ اور آرام کے لیے تھوڑی بہت انویسٹ منٹ کر لینا چاہیے تو مجھے آپ کی اصولی بات سے پوری طرح اتفاق ہے اور میں اس نیک کام کے لیے تیار بھی ہوں لیکن.....“

”لیکن کیا خاور صاحب؟“ خاور کے نامکمل جملے پر منصور نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

”لیکن یہ کہ.....“ خاور نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ اس کار خیر میں آپ کی طرف سے بھی حصہ شامل ہو جائے۔“

”آپ حکم کریں۔“ منصور نے جلدی سے کہا۔ ”میں اپنی بساط کے مطابق ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔“

”آپ صرف عاطف کی سیلری میں خاطر خواہ اضافہ کر دیں۔“ خاور حمید نے بڑی رसान سے کہا۔ ”باقی کے تمام معاملات میں دیکھ لوں گا۔“

”ڈن!“ منصور نے فیصلہ کن انداز میں اعلان کر دیا۔ وہ دونوں مزید آدھے گھنٹے تک عاطف اور ہما کی شادی کے حوالے سے بات چیت کرتے رہے پھر یہ محفل

برخواست ہو گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ عاطف کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا لیکن اس کا پاس اس کے لیے ایک سرپرست کا کردار ادا کر رہا تھا۔ یہ منصور کا بڑا پین اور عاطف کی خوش قسمتی تھی۔

اس اہم میٹنگ کے دو ماہ کے بعد عاطف اور ہما کی شادی ہو گئی اور اس شادی سے ایک ماہ پہلے خاور حمید نے سو لچر بازار کے علاقے میں ہما کے نام سے ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں مناسب سا فلیٹ بھی خرید لیا تھا۔ ہما کو بیاہ کر اسی فلیٹ میں جانا تھا جہاں عاطف کی معیت میں اس کی نئی زندگی کا آغاز ہو جاتا۔

سب کچھ پروگرام کے مطابق عمل میں آ گیا۔ ہما اور عاطف راضی خوشی سو لچر بازار کے علاقے میں رہنے لگے۔ ان کے فلیٹ کا ایک رخ نشتر پارک کی جانب تھا۔ یہ فلیٹ ہما کے میکے سے بھی بہت قریب تھا۔ یوں سمجھیں کہ واکنگ ڈسٹنس پر۔

انسان عقل اور سوچہ بوجھ کو بروئے کار لا کر اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرتا ہے لیکن اوپر بھی کوئی مہیا منصوبہ ساز بیٹھا ہوا ہے جس کے سامنے بڑے بڑوں کی منصوبہ

بندی دھری کی دھری کی رہ جاتی ہے۔ قدرت نے ان لوگوں کے لیے اپنے طور پر کوئی اور ہی پلاننگ کر رکھی تھی لہذا شادی کے بعد ایک سال کے عرصے کے اندر ہی حالات میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔

خاور حمید کا انتقال ہو گیا۔ رئیس بیگم جامدادہ، کاروبار کی بلا شرکت غیرے مالک بن گئیں۔ ان کی نا تجربہ کاری کا تمام فائدہ بہنوئی نے اٹھایا۔ خاور حمید کی زندگی میں تو فواد صدیقی کا کوئی داؤد کارگر نہیں ہوتا تھا لہذا اس کی موت کے بعد اپنی بیوی نفیسہ بیگم کی مدد سے فواد نے بڑی کاری گری کے ساتھ رئیس بیگم کے گھر اور کاروبار میں راستہ بنا لیا۔ عاطف یہ تمام تر سیاسی بازی گری دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔ اسے چونکہ اپنی سسرال سے ہمدردی تھی اس لیے وہ ہما کے توسط سے رئیس بیگم کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے مخلصانہ جذبات کی ناقدری ہو رہی ہے تو اس نے خاموشی سے کنارہ کش ہو جانا بہتر سمجھا۔ رئیس بیگم چونکہ عاطف سے ہما کی شادی کی مخالفت رہی تھی اس لیے وہ عاطف کو اپنے سامنے کچھ بھی نہیں سمجھتی تھی، اس کی باتوں کو کیا اہمیت دیتی۔ اس اثنا میں یہ قول کے رئیس بیگم کے گھر اور کاروبار پر فواد صدیقی اپنے بچے گاڑ چکا تھا۔

حالات اپنے مزاج اور ڈگر پر گامزن تھے کہ ایک روز ہما کو اس کے فلیٹ کے اندر قتل کر دیا گیا اور کاشف کو اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے پہنچا دیا گیا اور اب اسی عاطف کا کیس میرے ہاتھ میں تھا میں تھا جو اس کے دوست ہاشم کے ذریعے مجھ تک پہنچا تھا۔

حسب وعدہ اگلے روز ہاشم انور مجھ سے ملنے آفس پہنچ گیا لیکن اسے اکیلے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی جب کہ آج تو اسے منصور صاحب کو اپنے ساتھ لے کر آنا تھا۔ میں نے جب اسی حوالے سے سوال کیا تو اس نے بتایا۔

”منصور صاحب کی آج کی مصروفیات پہلے سے طے تھیں اس لیے وہ نہیں آ سکے لیکن انہوں نے پیشی پر عدالت پہنچنے کا وعدہ کیا ہے۔“

”پیشی پر!“ میں نے سوالیہ نظر سے ہاشم کی طرف دیکھا۔ ”آپ کا مطلب ہے جب پولیس اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کرے گی؟“

”جی ہاں، میری یہی مراد تھی۔“ ہاشم نے جواب دیا۔

”ضمانت وغیرہ کے سلسلے میں منصور صاحب سے بات ہوگی؟“

”جی، وہ عاطف کا ضمانتی بننے کے لیے تیار ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”کہہ رہے تھے وکیل صاحب یعنی آپ ضمانت وغیرہ کے کاغذات تیار کروالیں۔ جہاں جہاں ضروری ہوگا وہ آکر دستخط کر دیں گے۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے مطمئن انداز میں کہا۔ ”ہاشم، اس کیس کے سلسلے میں بعض جگہوں پر آپ کی مدد اور تعاون کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ اس کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہیں نا؟“

”آپ مجھے ان دونوں میدانوں میں مستعد پائیں گے۔“ وہ خیر یہ لہجے میں بولا۔

”مجھے آپ سے یہی امید تھی۔“ میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور اسے چند ابتدائی نوعیت کی ہدایات دے دیں۔

”یہ کام تو چالان پیش ہونے سے پہلے ہی میں کر دوں گا بیگ صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”اور کوئی حکم؟“

”جب ضرورت ہوگی تو حکم نہیں بلکہ آپ کو زحمت دوں گا۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ذرا کیس کی باقاعدہ سماعت تو شروع ہونے دیں۔“

بہ وقت رخصت اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور سرسری انداز میں پوچھ لیا۔ ”بیگ صاحب، آپ میری شاپ پر کب تشریف لارہے ہیں؟“

”شاپ پر۔“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ”ہاں۔“ اس نے پلکیں جھپکائیں اور بولا۔ ”آپ کو سن گلاسز دیکھنا تھے نا۔“

”اوہ ہاں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بس، ذرا فرصت مل جائے پھر ان شاء اللہ ضرور چکر ماروں گا۔ ویسے ایک بات ہے ہاشم صاحب.....“ میں نے اپنی بات کے اختتام پر جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔

”کون سی بات بیگ صاحب؟“ ”یہ بات کہ.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تو آپ کی شاپ پر جب جاؤں گا تب جاؤں گا ہی لیکن آپ اتنے بیٹھے مجھے خوب مار کیٹنگ سکھا رہے ہیں۔ اگر کبھی وکالت کا پیشہ چھوڑ کر مجھے دکان داری کرنا پڑی تو سیزمین شپ میں مار نہیں کھاؤں گا۔“

میں نے تو مذاق کے انداز میں بات کی تھی۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”چلیں کوئی بات نہیں بیگ صاحب، ہم اسے ایڈجسٹ کر لیں گے۔“

”ایڈجسٹ؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”ہاشم صاحب، میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”ویری سیمپل بیگ صاحب۔“ وہ لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر میں واقعی آپ کو مار کیٹنگ سکھا رہا ہوں تو اس کیس کے دوران میں آپ سے بھی میں گا ہے بہ گاہے وکالت سیکھتا رہوں گا، حساب برابر ہو جائے گا۔ کیا پتا.....“ اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں توقف کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”کیا پتا، مستقبل بعید میں مجھے دکان داری چھوڑ کر وکالت کا خوانچہ لگانا پڑ جائے۔“

”وکالت کا خوانچہ۔“ بے ساختہ میری ہنسی نکل گئی۔ ”یہ کیا ہوتا ہے ہاشم صاحب؟“

”بھئی بیگ صاحب۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کی طرح کا کوئی ماہر اور تجربہ کار وکیل تو ہوں گا نہیں جو میرے کریڈٹ پر درجنوں بلکہ سیکڑوں کامیاب کیسز درج ہوں اور لوگ مزید کیس میرے ریکارڈ پر چڑھانے کے لیے بھی بے چین ہوں۔ مجھے تو روز کنواں کھود کر اپنے لیے پانی نکالنا ہوگا۔“

”لیکن اس کنوئیں اور پانی کا خوانچہ وکالت سے کیا کام؟“

”جناب، جب میری کوئی پیشہ ورانہ ساکھ نہیں ہوگی تو پھر عمدہ قسم کا دفتر سجا کر بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا مجھے بہ نفس نفیس مارکیٹ میں رزق کی تلاش کے لیے نکلنا پڑے گا اور وہ بھی اس طرح.....“

اس نے دونوں بازو پھیلا کر کچھ اس انداز کا اشارہ دیا جیسے اس نے کوئی تھال وغیرہ اٹھا رکھا ہو، پھر اپنی بات کی تکمیل کرتے ہوئے بولا۔

”میں اس طرح اپنی وکالت کا خوانچہ اٹھا کر سٹی کورٹ کے باہر اور بھی اندر یہ صدائیں لگایا کروں گا..... اے بھائی صاحب، اللہ کے نام پر مجھ سے کوئی کیس کرا لو۔ بڑی دعائیں دوں گا۔ اے بہن، اگر شوہر سے کوئی تنازع چل رہا ہے تو لعنت بھیجو اس کی منحوس شکل پر۔ میں آخر کس مرض کی دوا ہوں۔ مجھ سے اور میری خوانچہ بہ دست وکالت سے رجوع کرو، کورٹ سے ایسا خلع دلوؤں گا کہ عمر بھر دعائیں دوگی..... وغیرہ وغیرہ.....! میں اپنی ہنسی کا قبونہ رکھ سکا، بے ساختہ کہا۔

”ہاشم صاحب! آپ بہت زندہ دل اور دلچسپ انسان ہیں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو کبھی اداکاری وغیرہ کا بھی شوق رہا ہے؟“ ”بھئی کبھی نہیں بیگ صاحب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں جو کچھ بھی بولتا ہوں اس میں کوئی تصنع، بناوٹ یا اداکاری کا دخل نہیں ہے۔ یہ سب کچھ نیچرل ہوتا ہے۔“

”ویری گڈ!“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”اداکاری نہیں تو پھر لکھنے لکھانے کا شوق ضرور رہا ہوگا؟“

”پڑھنے کا بہت شوق ہے۔“ اس نے جواب دیا ”جو بھی ناول یا کتاب ہاتھ لگے، میں راتوں رات چاٹ ڈالتا ہوں۔“

”آپ کی پڑھنے کی یہ عادت بڑی سودمند ثابت ہو سکتی ہے۔“ میں نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ”اگر آپ ساتھ ساتھ لکھنا بھی شروع کر دیں تو مجھے یقین ہے، آپ ایک کامیاب رائٹر کے روپ میں خود کو منوا سکتے ہیں۔“ میں نے مزید کہا۔ ”آپ ڈائجسٹ کیوں نہیں پڑھتے؟“

”بس، ایسے ہی.....“ وہ سرسری انداز میں بولا۔ ”اس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔“

”پڑھا کریں۔“ میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ”خصوصاً سسپنس ڈائجسٹ تو بہت ہی معیاری اور پُر مغز میگزین ہے۔ یہ بات میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ اس میں میری کہانی سمجھتی ہے بلکہ واقعی یہ میگزین معتبر اور قابلِ تعریف ہے۔“

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

ریمائنڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد، پولیس نے اس مقدمے کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ اسی روز میں نے اپنا وکالت نامہ اور ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی۔ اب اس کیس کی سماعت کا آغاز ہو گیا تھا۔ جج نے ملزم کو فردِ جرم پڑھ کر سنائی اور ملزم نے صحتِ جرم سے صاف انکار کر دیا۔

ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ جب پولیس کسی کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے اس کیس کے حوالے سے اپنی تفتیش مکمل کر لی ہے اور چالان کی اسی رپورٹ میں ملزم کا اقراری بیان بھی شامل ہوتا ہے جو کہ ظاہر ہے، ایک جبر کے نتیجے میں

وجود پاتا ہے۔ پولیس والے جب تشدد کی فضا میں ملزم کو ایک ناگرددہ جرم قبول کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو وہ جان کی امان چاہتے ہوئے اقراری بیان پر انگوٹھا یا یا دستخط ثبت کر دیتا ہے۔ بعد ازاں وہ عدالت کے روبرو اس بیان سے منحرف ہو جاتا ہے اسی لیے پولیس کی کسٹڈی میں کیے گئے ملزم کے اقبالِ جرم کو عدالت کوئی اہمیت نہیں دیتی۔

صحتِ جرم سے انکار کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا جا چکا تو میں اپنے موکل کی ضمانت کے لیے دلائل دینے کی غرض سے آگے بڑھا اور جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد بولنا شروع کیا۔

”جناب عالی! میرا موکل سراسر بے قصور ہے۔ اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں الجھانے کی کوشش کی گئی ہے لہذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اسے ضمانت پر رہا کیا جائے۔“

”یور آنر.....“ وکیل استغاثہ نے ضمانت رکوانے کی کوششوں کا آغاز کرتے ہوئے کہا ”ملزم نے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے لہذا اس کی ضمانت قبول کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔“

”جناب عالی! میرا موکل اس معاشرے کا ایک شریف رکن ہے۔ اس کیس کی وجہ سے اس کی نیک نامی اور شرافت پر بڑے منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اسی معاشرے کا ایک معتبر شخص اس کی ضمانت دینے کو تیار ہے لہذا میں نہیں سمجھتا، میرے موکل کی ضمانت پر رہائی عدالت کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کر سکتی ہے۔“

”ضامن کے معتبر، خوش حال اور مضبوط ہونے سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ وہ جس کی ضمانت دے رہا ہے وہ بے گناہ و بے قصور ہے۔“ وکیل استغاثہ نے سلسلہ اعتراضات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ملزم نے ایک خاص پلاننگ کے تحت اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔ یہ خطرناک مجرم ہے یور آنر.....!“

”آ بجیکٹن یور آنر!“ میں نے جج سے مشابہ احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”وکیل استغاثہ نے میرے موکل کے لیے انتہائی نامناسب الفاظ کا استعمال کیا ہے..... آئی آ بجیکٹ، آئی آ بجیکٹ.....!“

”وکیل صاحب!“ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔ ”آپ کو وکیل استغاثہ کے کون سے

الفاظ پر اعتراض ہے؟“

”جناب عالی! آج اس کیس کی پہلی پیشی ہے۔“ میں نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”لہذا جب تک میرے موکل پر عائد کردہ جرم عدالت کے روبرو ثابت نہیں ہو جاتا، اس کے لیے ”خطرناک مجرم“ کے الفاظ استعمال کرنا کسی بھی طور جائز نہیں ہے۔“

جج نے وکیل استغاثہ کو ہدایت کی کہ وہ آئندہ ملزم کے لیے ان الفاظ کا استعمال نہ کرے جن پر ڈیفنس کو اعتراض ہے۔

”ٹھیک ہے جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے بادل ناخواستہ اثبات میں گردن ہلائی اور اپنی مخالفت کو ایک نئے زاویے سے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”جناب عالی! ملزم کو جائے وقوعہ سے گرفتار کیا گیا ہے۔ واقعات و شواہد اسے پوری طرح قاتل قرار دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں استغاثہ کے پاس ایسے گواہ موجود ہیں جن کی شہادت ملزم کا کچا چٹھا سب کھول کر رکھ دے گی لہذا معزز عدالت سے میری پُر زور اپیل ہے کہ وہ ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اس کیس کی سماعت کو آگے بڑھانے کے لیے نئی پیشی کی تاریخ دیدے۔“

”مثلاً استغاثہ کے پاس ایسے کون سے گواہ ہیں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ”جو میرے موکل کا کچا چٹھا کھول کر رکھ سکتے ہیں۔“

”استغاثہ سردست ان کو ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔“ وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔ ”جب استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوگا تو آپ خود ہی تماشا دیکھ لیں گے۔“

”تماشا.....!“ میں نے حیرت بھرے انداز میں دہرایا پھر اپنے موکل کی ضمانت کے سلسلے کو آگے بڑھا دیا۔

ہمارے بیچ مزید پندرہ منٹ تک ترش اور تلخ کلمات کا تبادلہ ہوتا رہا لیکن میں اپنے موکل کی ضمانت کروانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ عدالت نے ملزم عاطف کو جیوڈ نیشنل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کے احکامات صادر کرنے کے بعد آئندہ پیشی کے لیے تاریخ دیدی۔

اگلی پیشی پندرہ روز بعد تھی۔

ہم عدالت سے نکلے تو ہاشم نے قدرے مایوسی سے کہا۔ ”بیگ صاحب! عاطف کی ضمانت تو منظور ہی نہیں ہوئی۔ منصور صاحب کے بھی آج عدالت آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

اس وقت ”منصور ٹریولز“ کا مالک اور ملزم کا پاس

منصور بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ہاشم مایوسی پر الفاظ کا مرہم رکھتا، منصور نے یہ فریضہ سنبھال لیا۔ ہاشم کو سمجھانا شروع کر دیا کہ قتل کے ملزم کی ضمانت میں کس نوعیت کی دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔ اپنی بات اختتام پر اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیگ صاحب! میں آپ کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔“

”تھینک یو منصور صاحب!“ میں نے ایک گہرے سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ ماشا اللہ! قابل معاملات کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔“

”ہاشم بھی سمجھنے لگے گا۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”سنا ہے، اس نے آپ سے وکالت سیکھنے کا پروگرام ترتیب دیا ہے؟“

”پتا نہیں جناب، یہ مذاق میں کیا، کیا کچھ کہتا رہا ہے۔“ میں نے ہاشم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں سنجیدہ ہوں بیگ صاحب!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ میری باتوں کو مذاق نہ سمجھیں۔“

”ٹھیک ہے، ہاشم صاحب!“ میں نے ذرا بے تکلفی سے کہا۔ ”آپ اس کیس کے دوران میں صرف اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں۔ استاد شاگردی کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔“

منصور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”بیگ صاحب! ملزم کی جب ضمانت منظور نہیں ہوئی تو ظاہر ہے اس کے ساتھ ہی ضمانتی کا کردار بھی ختم ہو جائے گا۔“

”جناب! اس کیس میں آپ کا کردار محض ضمانتی تک محدود نہیں تھا۔“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”آپ تو ایک طرح سے اس کیس میں عاطف کے سرپرست اعلیٰ ہیں۔ آپ کا کردار اس کی زندگی میں یہ کیمرہ کھلنے سے پہلے بھی رہا ہے اور اس کیس کے خاتمے کے بعد بھی جاری و ساری رہے گا۔“

منصور نہایت ہی ٹھنڈے اور دھیمے مزاج کا مالک تھا۔ میری بات کو اس نے توجہ سے سنا اور میرے خاموش ہونے پر اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے کب اس کردار کی ادائیگی سے انکار کیا ہے جناب! میں تو کچھ اور ہی کہنے والا تھا۔“

”کچھ اور کیا؟“ میں نے چونکے ہوئے انداز سے اسے دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بات دراصل یہ

”کیوں نہیں.....!“ میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا ”آپ کو پتا ہے، پوسٹ مارٹم رپورٹ میں مقتولہ کی موت کا جو وقت درج کیا گیا ہے، اس کا مطلب کیا ہے.....؟“

”آپ ہی بتادیں۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”لیکچر بازی کا آپ ہی کو زیادہ شوق ہے۔“ ”مجھے تو اور بھی بہت سی بازیوں کا شوق ہے بھی صاحب!“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”جن میں شرطج بازی، نیزہ بازی اور جیت بازی کو باقی ہر بازی پر فوقیت حاصل ہے۔“

”یہ جیت بازی کیا ہوتی ہے؟“ وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ ”یہ وہ بازی ہے جس کے اختتام پر جیت انسان کا مقدر بنتی ہے۔“

وہ برا سامنے بنا کر رہ گیا۔

میں نے کہا۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ میں، مقتولہ کی موت کا وقت دو بجے بتایا گیا ہے اور نہ ہی تین بجے بلکہ دو اور تین بجے سہ پہر کے الفاظ درج ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مقتولہ کی موت دو اور تین بجے کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی تھی اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اس کا درست وقت سہ پہر ڈھائی بجے کا ہو..... میں غلط تو نہیں کہہ رہا بھی صاحب!“

”آپ کا بیان بالکل درست ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”پوسٹ مارٹم میں اسی طریقے سے وقت کا مارجن سیٹ کیا جاتا ہے لیکن آپ اس بحث سے آخر ثابت کیا کرتا چاہتے ہیں؟“

”یہی کہ.....“ میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ”میرے موکل نے آپ کی تیوری اور فلاسفی بلکہ الزام کے مطابق، ڈھائی بجے سہ پہر اپنی بیوی کے سینے میں دو گولیاں اتار کر اسے موت کی نیند سلا دیا پھر اپنے فلیٹ میں بیٹھا آدھا گھنٹا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے پولیس اسٹیشن فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی اور پھر ایک مرتبہ اپنی بیوی کی لاش کے پاس بیٹھ کر پولیس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس دوران میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی جائے وقوعہ سے فرار ہونے کا خیال نہیں آیا..... آپ اس کو کیا کہیں گے بھی صاحب!“

”ملزم کا شاطر پن.....“ وہ نفرت آمیز نظر سے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہی تو اس کی ہوشیاری

صاحب!“ میں نے کب کہا ہے کہ.....“ اس کی حیرت دو چند ہوئی۔ ”ملزم نے قلم سے کاغذ پر لکھ کر ٹیلی فون کے ذریعے اس واقعے کی اطلاع دی تھی.....؟“

”اب آپ اپنے الفاظ ہی سے پھر رہے ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے طنزیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”یا پھر..... شاید آپ کو ”پہ قلم خود“ کا مفہوم اور معنی ہی نہیں معلوم۔“

وہ یہ تو سمجھ گیا کہ اس سے گرامر کی کوئی غلطی ہو گئی ہے تاہم اس کے دماغ میں اتنا کرٹنٹ موجود نہیں تھا کہ وہ قواعد کی غلطی کو بھی پکڑ پاتا لہذا وہ کھسیانہ سا ہو کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”گویا ملزم نے ہی آپ کو اس سانحے کی اطلاع دی تھی؟“

”جی ہاں۔“ اس نے مختصر سے جواب پر اکتفا کیا۔

”اور آپ کی نظر میں ملزم ہی اپنی بیوی کا قاتل ہے؟“

”جی ہاں، بالکل.....“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”واہ واہ..... کیا کمال کی نظر پائی ہے۔“ میں نے حسمخراہہ لہجے میں کہا۔ ”اس نظر کے طفیل جس پر بھی آپ کا کرم ہوتا ہوگا وہ خیر سے..... اس نظر کرم کی تاب نہ لاتے ہوئے پتا نہیں، بغیر ویزا پاسپورٹ کون کون سے جہان کی سیر کو نکل جاتا ہوگا۔“

”پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب!“

”میں اس قسم کی باتیں کر رہا ہوں.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ ہما کی موت سہ پہر دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آپ یہ فرما رہے ہیں کہ ٹھیک تین بجے ملزم نے اپنے فون سے تھانے میں اس افسوسناک واقعے کی اطلاع دی تھی۔“

”تو اس میں آپ کو کیا خرابی نظر آتی ہے وکیل صاحب!“ وہ قدرے برہمی کے ساتھ مجھ سے مستفسر ہوا۔ ”خرابی نہیں..... خرابیاں کہیں بھی صاحب!“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”آپ اپنی بات کی وضاحت فرمائیں گے؟“ وہ جھکے لہجے میں بولا۔

تو اس سے پہلے کہ استغاثہ کی جانب سے کسی گواہ کا بیان شروع ہوتا، میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے آئی او سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔

جج نے میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے آئی او کی طرف ایک خاص انداز سے دیکھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اسے وٹنس باکس میں جا کر کھڑے ہو جانا چاہیے۔ آئی او نے فوراً جج کے نگاہی احکامات کی تعمیل کی۔

اس کیس کا آئی او (تفتیشی افسر) بشارت بھی تھی ایک سب انسپکٹر تھا۔ آئی او کی حیثیت بھی استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں ہر نفس نفیس حاضر رہنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں، میری معلومات کے مطابق استغاثہ کی طرف سے چھ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن واضح رہے کہ میں وٹنس کے ان صفحات میں صرف اہم اور قابل ذکر گواہوں ہی کا تذکرہ کروں گا۔

میں وٹنس باکس کے قریب پہنچا اور انکو آری آفیر بشارت بھی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آئی او صاحب! کیا میں آپ کو بھی صاحب کہہ کر بھی مخاطب کر سکتا ہوں؟“

”بڑے شوق سے.....“ وہ کسل مندی سے بولا۔

بشارت بھی کی عمر پینتیس سے متجاوز تھی۔ وہ بھاری تن و توش کا مالک ایک پست قامت شخص تھا۔ اس کے چہرے سے بیزاری اور کاپلی ٹپکتی تھی اور ظاہری حالت سے بھی وہ مستندست الوجود نظر آتا تھا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں کیا جاسکتا تھا جو ہل کر پانی پینا بھی پسند نہیں کرتے۔ پتا نہیں، وہ محکمہ پولیس میں کیسے سروایو کر رہا تھا..... شاید عاطف جیسے بے گناہوں کو ملزم نامزد کر کے!“

”بھئی صاحب!“ میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اس واقعے کی اطلاع کتنے بجے اور کس نے دی تھی؟“

”کم و بیش تین بجے سہ پہر!“ اس نے جواب دیا۔ ”اور یہ اطلاع اپنے ہی گھر سے تھانے فون کر کے ملزم نے پہ قلم خود دی تھی۔“

”پہ قلم خود.....“ میں نے گہری چوٹ کی۔ ”یعنی آپ کا مطلب ہے، ٹیلی فون کے ذریعے اپنے قلم سے لکھ کر.....؟“ ”جناب! فون پر تو منہ سے بولا جاتا ہے۔“ ”ابھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”قلم سے تو کاغذ پر لکھا جاتا ہے۔“

”میں نے تو آپ ہی کے فرمان کو دہرایا ہے بھی

ہے کہ آئندہ پیشی پر میں ملک میں نہیں ہوں گا۔ مجھے دو تین دن کے لیے کسی ضروری کام سے تھائی لینڈ جانا ہے لہذا آپ ہی اس کیس کو دیکھ لیجیے گا۔ میری ضمانت والا معاملہ تو ختم ہو چکا البتہ.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”البتہ اگر آپ کو اس کیس کے سلسلے میں میرے کسی مالی تعاون کی ضرورت پیش آجائے تو آپ میرے صاحب زادے شہزاد سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ میری غیر موجودی میں شہزاد ہی بزنس کو سنبھالتا ہے اور میں نے اسے شہزاد کے حوالے سے تمام تر صورت حال سے آگاہ کر رکھا ہے۔“

”تھینک یو منصور صاحب!“ ہاشم نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

منصور مجھ سے ہاتھ ملا کر اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ میرے اور ہاشم کے بیچ دس منٹ تک مزید بات چیت ہوتی رہی پھر میں نے اسے کچھ نئی ہدایات کے ساتھ رخصت کر دیا۔

آگے بڑھتے سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا کچھ ذکر ہو جائے۔ اس رپورٹ کے مطابق، مقتولہ ہما کی موت سترہ اگست کی دوپہر دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسے بتیس بور کے سائلنسر لگے ریوالور سے فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مذکورہ آلاء قتل سے دو گولیاں فائر کی گئی تھیں جو براہ راست مقتولہ کے سینے پر لگی تھیں اور انہی میں سے ایک گولی نے اس کے دل میں گھس کر اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔

واقعات کے مطابق مقتولہ کی لاش فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں ایک صوفے کے اوپر پڑی ملی تھی۔ اسے بیٹھنے کی پوزیشن میں مل کیا گیا تھا اور اس کی موت بھی چند سیکنڈ میں واقع ہو گئی تھی تاہم دل پر گولی کھانے اور موت کے منہ میں جانے کے درمیان جو قلیل مدت حائل تھی اسی وقفے میں گردن کے علاوہ اس کا بدن بھی ذرا سا ایک جانب جھک گیا تھا یعنی وہ نیم دراز والی حالت میں آگئی تھی۔

میرے لیے اس قتل کی واردات کا جو پہلو سب سے زیادہ دلچسپی اور توجہ کا حامل تھا وہ یہی تھا کہ اسے اپنے ہی گھر کے ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھے بیٹھے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور اس کی موت کا الزام اسی کے شوہر یعنی میرے موکل عاطف پر عائد کیا گیا تھا۔

☆☆☆ آئندہ پیشی پر جب عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا

اور چالاکی کا کمال ہے کہ نہ صرف یہ جائے وقوعہ پر جانا بیٹھا رہا..... اس نے آلہ قتل کو بھی کہیں چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ سائنسنگر لگا ریو اور ادھر اپنی بیوی کی لاش کے قریب ہی پھینک دیا تھا۔

”میرے موکل کی ہوشیاری، چالاکی اور شاطرانہ پن کا تو آپ نے قصہ بیان کر دیا۔“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ کی اجازت ہو تو ذرا آپ کی مستعدی اور پھرتیوں کا بھی جائزہ لے لیا جائے..... ہوں؟“

اس نے میرے ”ہوں“ کے جواب میں ایک لفظ ادا نہیں کیا بلکہ ناپسندیدہ نظر سے مجھے ٹکنے لگا۔ میں اس کی محاصمانہ نظری پر واکے بغیر مستفسر ہوا۔

”بھٹی صاحب! آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”اس وقت تین بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔“

”صرف پچیس منٹ میں۔“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔ ”یہ ہوئی نا پھرتی والی بات۔ ورنہ واردات کی اطلاع کے بعد حرکت کے معاملے میں پولیس کی ہڈحرامی خاصی مشہور ہے۔“

”آئی جیکشن یور آئر.....!“ وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض جزدیا۔

”جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے اعتراض کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”میرے فاضل دوست نے ابھی محکمہ پولیس کی کارکردگی کے لیے جو نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں وہ کسی بھی طور مناسب اور جائز نہیں ہیں۔ وکیل صفائی کو اس قسم کے طرز عمل سے روکنے کے لیے سرزنش کی جائے۔“

وکیل استغاثہ کا واضح اشارہ الفاظ ”ہڈحرامی“ کی جانب تھا۔ جج نے استغاثہ کے اعتراض کو درست مانتے ہوئے مجھے اپنے بیان میں سے ”ہڈحرامی“ الے الفاظ کو خارج کرنے کا حکم دیا۔ میں نے فوراً جج کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وہاں ”انتہائی غیر ذمہ دار“ کے الفاظ ٹانک دیے اور جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو مقتولہ اپنی زندگی کی بازی ہار چکی تھی؟“

”جی ہاں..... سو فی صد۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور آلہ قتل یعنی اعشاریہ تین دو کیلبر کا سائنسنگر لگا ریو اور مقتولہ کی لاش کے قریب ہی پڑا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ بالکل سچا فرما رہے ہیں۔“

”آپ کو یقین ہے کہ مقتولہ کو اسی ریو اور سے قتل کیا گیا تھا؟“

”جی ہاں..... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس امر کی تصدیق کرتی ہے۔“

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو بعد کی پیداوار ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ ”میں اس وقت کی بات کر رہا ہوں جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔“

”مقتولہ کی لاش صوفے پر پڑی تھی۔“ وہ بڑے سادہ لہجے میں بولا۔ ”قریب ہی سائنسنگر لگا ریو اور بھی پڑا نظر آ رہا تھا جس کا صرف ایک ہی مطلب تھا کہ مقتولہ کو اسی ریو اور سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔“

”یہ مطلب آپ نے اپنی تن آسانی کے لیے افہ کر لیا تھا۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ورنہ اس سلسلے میں چھان بین بھی کی جاسکتی تھی۔“

”کیسی چھان بین.....؟“

”کیا آپ نے آلہ قتل پر سے ایف پی لینے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی؟“

”ہم نے فنگر پرنٹس اٹھانے کی کوشش کی تھی۔“

”پھر کیا نتیجہ برآمد ہوا؟“

”آلہ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے تھے۔“

”آپ کے خیال میں میرے موکل نے دستانے وغیرہ پہن کر فائرنگ کی ہوگی؟“

”ہاں..... یہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہو سکتا ہے۔“

”جی ہاں، کیوں نہیں.....؟“

”مثلاً کیا؟“

”مثلاً یہ کہ..... ملزم نے ریو اور پھینکنے سے پہلے اسے کسی کپڑے سے اچھی طرح صاف کر دیا ہو۔“ آئی او نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”یہ ناممکن تو نہیں ہے۔“

”واقعی یہ ناممکنات میں شمار نہیں ہوتا۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی ”اور آپ میرے موکل کو تو پہلے ہی چالاک، عیار اور شاطر قرار دے چکے ہیں۔“

”وہ ٹھہری ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”جب کسی ملزم کے ایف پی اس کی شناخت یا اس کے جرم کی وقوع پذیری میں معاون ثابت نہ ہو رہے ہوں تو پھر ایک اور بھی ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔“ میں نے خاص لہجے میں کہا پھر بھولنے کی اداکاری کے ساتھ اس میں اضافہ کر دیا۔

پیس منظر

”اس ٹیسٹ کا کوئی بھلا سا نام ہے۔ اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا، ذہن سے اتر گیا ہے۔“

”پیرافن ٹیسٹ.....!“ اس نے تروت بتایا۔

”اللہ آپ کا بھلا کرے۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”یاد آ گیا، اس ٹیسٹ کا یہی نام ہے۔ کیا آپ نے ملزم کے ہاتھوں کا پیرافن ٹیسٹ کرایا تھا؟“

”پیرافن ٹیسٹ (Paraffin Test) ایک مخصوص قسم کا کیمیکیل ٹیسٹ ہے جس کی مدد سے فائرنگ کرنے والے شخص کے ہاتھوں پر بارود کے ذرات کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ انکوائری آفیسر نے میرے سوال کے جواب میں اپنی گردن کوٹھی میں جنبش دی اور بولا۔ ”جی نہیں.....!“

”کیوں نہیں؟“

”جب ملزم آلہ قتل پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر سکتا ہے تو پھر وہ پولیس کی آمد سے قبل اپنے ہاتھوں کو بھی اچھی طرح دھو سکتا ہے.....“

اس کا جواب نامتقولیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

”بھٹی صاحب، ایک بات سچ بتائیں گے؟“

”جی پوچھیں۔“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے ٹکنے لگا۔ ”میں نے ابھی تک آپ سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی۔“

”یہ تو مہربانی ہے جناب کی۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا مقتولہ کی لاش سے آپ کی بات ہوئی تھی؟“

”یہ کس قسم کا سوال ہے وکیل صاحب؟“ وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آپ سوال نہیں کریں، صرف جواب دیں۔“

”وہ معاندانہ انداز میں مجھے گھورنے لگا۔

میں نے کہا ”ہاں یا نہ.....؟“

”بھلا کوئی لاش سے بھی گفتگو کر سکتا ہے؟“

”وضاحت نہیں..... صرف جواب!“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”ہاں یا نہیں؟“

”نہیں۔“ وہ ٹپٹا گیا۔

”اس کا مطلب ہے، مقتولہ کی زبانی آپ کو نہیں پتا چلا تھا کہ ملزم نے اس کے سینے میں دو گولیاں اتار کر اسے ٹھنڈا شمار کر دیا تھا.....؟“

”جی، اس کا یہی مطلب ہے۔“ وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔

”پھر ملزم نے آپ کو خود ہی بتا دیا ہوگا کہ اپنی بیوی کا

قاتل بہ قلم خود وہی ہے؟“ میں نے آئی او کو مزید چڑانے کے لیے بہ قلم خود کے الفاظ کا استعمال کیا تھا۔

”یہ اتنا بھی سیدھا نہیں جتنا شکل سے نظر آتا ہے۔“

”وہ ناپسندیدہ انداز میں ملزم کو گھورتے ہوئے بولا۔“ اس نے تو آخری وقت تک اس جرم سے انکار ہی کیا تھا۔“

”تو پھر آپ نے.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بھٹی صاحب! آپ نے کس بنا پر میرے موکل کو اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا؟“

”ہمیں ایک ایسا عینی شاہد مل گیا تھا کہ جس کی گواہی کے بعد ملزم کے مجرم ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی.....“ آئی او نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

”یعنی شاہد!“ میں نے اچھا خاصا زور دے کر اس کے الفاظ دہرائے۔ ”آپ نے ابھی یہی کہا ہے نا؟“

”جی ہاں، آپ نے جو سنا، میں نے وہی کہا ہے۔“

”یعنی شاہد..... یعنی آئی وٹنس کا مطلب تو آپ کو بہ خوبی معلوم ہوگا؟“

”بالکل معلوم ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”یعنی آپ معزز عدالت کے سامنے اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ آپ کے پاس ایک ایسا گواہ بھی موجود ہے جس نے میرے موکل کو اپنی بیوی کا مردار کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟“

”جی ہاں.....!“

”کیا آپ معزز عدالت کو اس شخص کا نام بتانا پسند کریں گے؟“

”اس کا نام گواہوں کی فہرست میں شامل ہے۔“

”پھر تو ابھی اس کا نام ظاہر کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہوگی؟“

میں نے ٹٹولتی ہوئی اور کھوجتی ہوئی نظر سے اس کی طرف دیکھا تو اسے جواب دیتے ہی بنی۔

”اس شخص کا نام نور علی ہے۔“

”یہ نور علی وہی تو نہیں.....“ میں نے آنکھیں سکیڑ کر آئی او کو دیکھا۔ ”جو ملزم اور مقتول کے سامنے والے فلیٹ میں رہتا ہے؟“

”جی ہاں، وہی ہے۔“ اس نے تصدیق کر دی۔

میں نے اپنی جرح کو موقوف کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

جج نے دس دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت

برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جرنل!“

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے امتیاز نامی ایک گواہ کو پیش کیا گیا۔

امتیاز بھی ”منصور ٹریولز“ ہی میں ملازم تھا اور اس کی حیثیت ایک چہرہ اسی ایسی تھی۔ منصور کی ٹریول ایجنسی میں لگ بھگ بارہ افراد کام کرتے تھے۔ امتیاز نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے قریب پہنچ گیا۔

امتیاز کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے تاہم بالوں کی اس سفید پوشی کو اس نے خضاب کی مدد سے کور کر رکھا تھا۔ وکیل استغاثہ نے کچھ اس انداز میں جرح کا آغاز کیا۔

”امتیاز صاحب! آپ کو منصور ٹریولز میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”لگ بھگ پانچ سال!“ گواہ نے جواب دیا۔

”اور ملزم کب سے وہاں کام کر رہا تھا؟“

”مجھے صحیح اندازہ تو نہیں جناب لیکن کہہ سکتا ہوں کہ یہ

مجھ سے بھی کافی عرصہ پہلے سے اس فرم میں کام کر رہا تھا۔“

”آپ وثوق کے ساتھ اتنا تو بتا سکتے ہیں تاکہ پچھلے

پانچ سال میں ملزم کے معمولات آپ کی نظروں کے سامنے تھے؟“

گواہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”جی ہاں، یہ تو

ایک ٹھوس حقیقت ہے۔“

”آپ کی فرم میں لٹچ کا وقفہ کب سے کب تک کیا

جاتا ہے؟“

وکیل استغاثہ کے اس سوال نے مجھ پر واضح کر دیا

کہ وہ جرح کے رخ کو کس طرف لے کر جانا چاہتا ہے اور

اسی لمحے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ اس نے ملزم کے

ہمدردوں کی کچھار میں ہاتھ ڈال کر استغاثہ کا گواہ کیوں نکال

لیا تھا۔ بہر حال، مجھے اس سے کوئی تشویش یا پریشانی نہیں

تھی۔ میرا ہوم ورک اور ہاشم کا فیلڈ ورک مکمل تھا لہذا میں

بڑے اطمینان سے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔

استغاثہ کے گواہ نے اپنے وکیل کے سوال کے جواب

میں بتایا۔ ”ہمارے ہاں روزانہ دو بجے سے ڈھائی بجے تک

”یہ نام مقررہ ہے یا آگے پیچھے بھی ہوتا رہتا ہے؟“

”نام تو مقرر ہی ہے وکیل صاحب!“ گواہ نے بتایا۔

”تاہم کبھی کبھار پانچ دس منٹ آگے پیچھے بھی ہو جاتا ہے۔“

”اتنا تو چلتا ہے۔“ وکیل استغاثہ نے بے پردہ

سے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا ملزم لٹچ آفس ہی میں کرتا تھا یا

مقصد کے لیے باہر جایا کرتا تھا؟“

”آفس ہی میں کرتا تھا۔“

”کھانا یہ گھر سے لایا کرتا تھا یا بازار سے منگواتا تھا؟“

”بازار سے منگواتا تھا۔“

”کھانا لینے کون جاتا تھا؟“

”میں ہی سب کے لیے کھانا لایا کرتا تھا۔“

”کیا وقوعہ کے روز بھی ملزم نے آپ سے لٹچ منگوا یا تھا؟“

گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے، اس کا کھانا کھانے کا موڈ تھا؟“

”جی ہاں، جیسی تو اس نے منگوا یا تھا۔“

”منگوا یا تھا تو پھر کھایا کیوں نہیں.....؟“

”اس بارے میں تو آپ اسی سے سوال کریں۔“

گواہ بڑی سادگی سے بولا۔

”جب تک آپ کھانا لے کر واپس دفتر پہنچے تو کیا ملزم

اپنی سیٹ پر موجود تھا؟“

”جی نہیں.....“

”تم کتنے بجے واپس آئے تھے؟“

”اس روز مجھے تھوڑی دیر ہو گئی تھی۔“ گواہ نے

جواب دیا۔ ”میں عموماً پونے دو بجے کھانا لینے کے لیے دفتر

سے نکل جاتا ہوں اور دو بجے واپس بھی آ جاتا ہوں لیکن

وقعہ کے روز میری واپسی دو، دس پر ہوئی تھی۔“

”دونج کر دس منٹ پر جب تم واپس آئے تو ملزم

دفتر میں موجود نہیں تھا؟“ وکیل استغاثہ نے ایک ایک لفظ

پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے خیال میں یہ کہاں

غائب تھا.....؟“

”میں جب دفتر واپس آیا تو ملزم کو موجود نہ پا کر میں

نے دوسرے لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا تو مجھے پتا

چلا کہ وہ تھوڑی دیر میں آنے کا کہہ کر باہر نکلا ہے۔“ گواہ

اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹس

اپس کے قریب چلا گیا۔ استغاثہ کے گواہ امتیاز نے ابھی

تھوڑی دیر پہلے جو بیان دیا تھا اور اس کے بیان پر وکیل

استغاثہ نے جس قسم کی جرح کی تھی اس کا ایک خاص زاویہ تھا

اور میں اس زاویے کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وکیل استغاثہ

محض عدالت کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ ملزم نے وقوعہ کے

روز نہایت ہی عمدہ پلاننگ کر رکھی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو کچھ اس

انداز میں قتل کرنا چاہتا تھا کہ سب کچھ انتہائی فطری نظر آئے

اور کسی کو بھی اس کی ذات پر شک نہ ہو۔

میں نے گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی

جرح کا آغاز کیا۔ ”امتیاز صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ

نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ

آپ کو ”منصور ٹریولز“ میں کام کرتے ہوئے لگ بھگ پانچ

سال ہو گئے ہیں؟“

”جی ہاں.....“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے

بولا۔ ”میں نے یہی کہا ہے۔“

”پانچ سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔“ میں نے اپنی

جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس دوران میں کسی

انسان کو سمجھنے اور پرکھنے کے ہزاروں مواقع ملتے ہیں اور پھر

چونکہ ملزم آپ سے پہلے سے اس فرم میں کام کر رہا تھا لہذا

اس کو سمجھنے کے لیے تو آپ کے پاس اسٹاف کا تجربہ بھی موجود

تھا یعنی فرم میں کام کرنے والے لوگ بھی آپ کو ملزم کے

بارے میں بہت کچھ بتا سکتے تھے اور انہوں نے بتایا بھی

ہوگا..... اور آپ نے پوچھا ہوگا۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ

آپ ملزم کی ذات، شخصیت، رویے اور کردار سے اچھی

طرح واقف ہوں گے..... ہوں گے یا نہیں؟“

”جی ہاں، بالکل..... کیوں نہیں!“ وہ جلدی سے

بولا۔

”آپ کو ذاتی طور پر ملزم سے کسی قسم کی کوئی شکایت

تو نہیں؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”جی بالکل نہیں۔“

”اسٹاف کے دیگر افراد کے بارے میں آپ کیا

کہتے ہیں؟“

”ٹھیک ٹھاک تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”سابق ریکارڈ کو آپ ایک طرف رکھ دیں۔“ میں

نے جرح میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔ ”پچھلے پانچ سال پر

آپ نگاہ دوڑائیں اور مجھے بتائیں کہ کیا اس دوران میں

ملزم کا اسٹاف کے کسی شخص سے کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا؟“

”نہیں.....“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”ایسا بالکل نہیں ہوا۔“

”گویا..... آپ یہ بات مانتے ہیں کہ ملزم ایک صلح

جو، امن پسند اور باکردار شخص ہے۔“ میں نے اس کے

چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

”جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات

میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”ماننے والی بات تو ماننا

پڑے گی نا۔“

”امتیاز صاحب! آپ روزانہ کتنے بجے اسٹاف کے

لوگوں کا لٹچ لینے جاتے ہیں اور کتنے بجے واپس آتے ہیں یہ

ایضاً نہیں ہے۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو سیٹھتے ہوئے کہا۔

”اور یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ وقوعہ کے روز آپ کی واپسی

میں دس منٹ کی تاخیر ہو گئی تھی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب

آپ لٹچ لے کر واپس آئے تو ملزم اپنی سیٹ پر موجود نہیں

تھا۔ آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال

کے جواب میں یہی بتایا ہے نا؟“

”جی..... جی یہی بتایا ہے اور میں نے کچھ غلط بھی

نہیں کہا۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”اگر اس وقت ملزم آفس

میں موجود ہوتا تو میں ایسی بات کیوں کرتا.....!“

”تم نے کچھ غلط نہیں کہا امتیاز.....!“ میں نے

ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس کے بعد گڑبڑ شروع

ہوئی ہے۔“

”کیسی گڑبڑ.....؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تنکٹے

لگا۔

”ایسی گڑبڑ کہ.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں

کہا۔ ”ملزم کو آفس میں موجود نہ پا کر آپ نے سب سے

اس کے بارے میں پوچھا مگر ایک شخص کو نظر انداز کر

دیا..... آخر کیوں؟“

”میں کچھ سمجھا نہیں۔“ وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے

ہوئے بولا۔ ”میں نے کس شخص کو نظر انداز کیا ہے؟“

”باری صاحب کو۔“ میں نے کہا۔ ”میں حامد باری

کی بات کر رہا ہوں۔“

”اوہ وہ.....!“ وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے باری صاحب سے نہیں پوچھا تھا۔“

”کیوں نہیں پوچھا تھا؟“ میں نے تیز آواز میں سوال کیا۔ ”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”باری صاحب وہاں موجود نہیں تھے۔“

”موجود نہیں تھے کیا مطلب.....!“ میں نے اسے گھورا۔ ”کیا وہ اس روز آفس نہیں آئے تھے؟“

”جی..... وہ آفس تو آئے تھے مگر لچ پر موجود نہیں تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”باری صاحب لچ نہیں کرتے۔“

”باری صاحب لچ نہیں کرتے.....“ میں نے اسی کے الفاظ دہرائے اور پوچھا۔ ”وہ اگر لچ پر موجود نہیں تھے تو پھر کہاں تھے؟“

”وہ نماز پڑھنے آفس سے باہر گئے ہوئے تھے۔“ گواہ نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ ”ہمارے ساتھ والی بلڈنگ کے میزائٹن فلور پر باقاعدہ باجماعت نماز کا اہتمام موجود ہے۔ باری صاحب لچ نہیں کرتے لہذا وہ لچ کے ٹائم والا ایک گھنٹا اسی ”مسجد“ میں گزارتے ہیں۔ اس دوران میں وہ ظہر کی نماز بھی ادا کر لیتے ہیں.....“

اس نے اپنے جواب میں لفظ ”مسجد“ کا استعمال کیا تھا۔ اس سے گواہ کی مراد کوئی باقاعدہ مسجد نہیں تھی۔ وہ پڑوسی بلڈنگ کے اسی میزائٹن فلور کا ذکر کر رہا تھا جہاں نماز کی ادائیگی کے لیے کوئی جگہ مختص کر دی گئی تھی۔ کمرشل علاقوں میں ایسا ہوتا ہے۔ آفس میں کام کرنے والے درجنوں، سیکڑوں بلکہ ہزاروں افراد کی سہولت کے لیے کسی بلڈنگ میں کوئی خاص جگہ نماز کے لیے چھوڑ دی جاتی ہے جہاں باقاعدہ جماعت کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ یہ ایک مستحسن عمل ہے۔

”اس کا مطلب ہے، حامد باری صاحب ایک نمازی اور پرہیزگار شخص ہیں۔“ میں نے استغاثہ کے گواہ امتیاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹ جیسے انتہائی خطرناک گناہ سے بھی بچنے کی کوشش کرتے ہوں گے اور آفس کے اسٹاف کو ان سے کم ہی شکایت رہتی ہوگی.....؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”باری صاحب اپنے آپ میں مگن رہنے والے ایک نیک انسان ہیں۔ میں نے بھی کسی کو ان کی برائی کرتے نہیں دیکھا۔“

”اور آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میں سمجھا نہیں وکیل صاحب!“ وہ تعجب خیز نظر مجھے تنکے لگا۔

”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کو بھی حامد باری سے کوئی شکایت نہیں ہے؟“ میں نے اپنی بات کو جاری کرتے ہوئے کہا۔

”جی بالکل..... مجھے باری صاحب سے کبھی شکایت نہیں رہی۔“

میں نے پچھلے چند منٹ میں استغاثہ کے گواہ کے ساتھ سوال جواب کرتے ہوئے حامد باری کے کردار اور شخصیت کو عدالت کی نظر میں اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور مجھے اپنے اس مقصد میں صد فیصد کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”آپ کو تو باری صاحب سے کوئی شکایت نہیں خیر انداز میں کہا۔“

”باری صاحب کو آپ سے سخت شکایت ہے۔“ میں نے گواہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب.....!“ وہ بھونچا گیا۔ ”باری صاحب کو بھلا مجھ سے کیا شکایت ہے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے تو ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔“

”آپ سے نہیں کیا مگر مجھ سے ایسا ذکر کیا ہے۔“ میں نے اپنے لہجے کی معنی خیزی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

”کک..... کیا کہا ہے انہوں نے.....؟“

جبر جھراتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔

میں نے اپنے ڈرامے کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ”باری صاحب کو آپ سے یہ شکوہ ہے کہ آپ انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔“

”پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔“ سخت الجھن میں نظر آ رہا تھا۔ ”میں بھلا انہیں کیوں نظر انداز کروں گا..... انہوں نے مجھ سے تو کبھی ایسی کوئی شکایت نہیں کی..... اگر وہ اس وقت یہاں ہوتے تو میں ان سے ضرور پوچھتا کہ انہوں نے میرے بارے میں ایسی شکایت کیوں کی.....!“

”وہ اس وقت یہاں موجود ہیں امتیاز صاحب!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ”لیکن عدالت کے کمرے کے اندر نہیں بلکہ باہر کوریڈور میں۔ میں نے انہیں اس کیس میں ایک اہم گواہ کے لیے یہاں بلا یا ہے لیکن افسوس کہ آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔“

”جب وہ یہاں موجود ہیں تو پھر میری ان سے

”اس لیے کہ آپ کی گواہی مکمل ہونے کے بعد آپ عدالت کے کمرے سے باہر چلے جائیں گے اور اگلے ہی لمحے باری صاحب گواہی دینے اندر آئیں گے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ عدالت کے اندر ان سے کوئی سوال و جواب نہیں کر سکیں گے..... اور باہر جب آپ لوگوں کو آپس میں بات کرنے کا موقع ملے گا تو اس وقت تک بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں رہے گا کیونکہ جب عدالت میں اپنا مقصد حاصل کر چکا ہوں گا۔“

”میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا وکیل صاحب۔“ وہ ترجیح ہوتے ہوئے بولا۔ ”ابھی تک تو آپ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ میں نے کب اور کہاں باری صاحب کو نظر انداز کیا ہے.....؟“

”کمال ہے، یہ چھوٹی سی بات بھی آپ کو میں ہی بتاؤں گا۔“ میں نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ لچ لے کر لوٹے، ملزم آفس میں موجود نہیں تھا۔ آپ نے سب سے ملزم کی غیر حاضری کے بارے میں پوچھا لیکن نہیں پوچھا تو صرف حامد باری سے..... آپ نے انہیں نظر انداز کیا کہ نہیں؟“

”جناب! میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ جب میں لچ لے کر واپس آیا تو باری صاحب آفس میں موجود نہیں تھے۔“ وہ صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ لچ کے وقفے کے دوران میں ظہر کی نماز ادا کرنے جاتے ہیں۔“

میں نے اس کی وضاحت پر توجہ نہیں دی۔ اس لیے توجہ نہیں دی کہ میں جانتا تھا، وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے تو یہ سارا ڈراما ایک خاص مقصد کے تحت رچایا تھا لہذا میں اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔

”حالانکہ.....“ میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ”حالانکہ اگر آپ باری صاحب سے بھی ملزم کے غیاب کے بارے میں پوچھ لیتے تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا۔“

”تو کیا باری صاحب کو پتا تھا کہ ملزم اپنے گھر گیا ہے؟“ وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔ ”آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ملزم باری صاحب کو سب کچھ بتا کر گیا تھا؟“

”جی..... میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”جناب عالی! حامد باری اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہیں۔ میں معزز عدالت کی اجازت

سے انہیں صفائی کے گواہ کی حیثیت سے اندر بلانا چاہتا ہوں لیکن.....“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ میں حامد باری کو اندر بلانے سے پہلے ملزم سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں تاکہ صفائی کے گواہ حامد باری کو یہاں بلانے کا جواز واضح ہو سکے اور.....“ میں نے استغاثہ کے گواہ امتیاز کی طرف دیکھا اور اضافہ کیا۔ ”اور امتیاز صاحب کی نشانی بھی باقی نہ رہے.....“

اگلے ہی لمحے جج نے مجھے ملزم سے جرح کی اجازت دے دی۔

میں اکیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹھنرے) کے پاس آیا اور ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز آپ دوپہر دو اور تین کے درمیان اپنے آفس میں موجود نہیں تھے؟“

”جی ہاں..... یہ درست ہے۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”اور کیا یہ بھی درست ہے کہ آپ ٹھیک تین بجے اپنے گھر میں موجود تھے؟“

”جی، یہ بھی درست ہے۔“

”کیا وقوعہ کے روز تین بجے آپ کا اپنے گھر میں موجود ہونا کسی خاص پروگرام کا حصہ تھا؟“ میں نے اپنے مقصد کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں..... وہ محض ایک اتفاق تھا۔“

”کیسا اتفاق؟“

”دراصل، مجھے پلازا کے علاقے میں ایک شخص سے ملنا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس شخص سے ملاقات نہیں ہو سکی اور اس وقت مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی لہذا میں کھانا کھانے اپنے گھر چلا گیا۔“

”اور گھر پہنچ کر آپ نے کیا دیکھا؟“

”اپنی بیوی ہما کو مردہ حالت میں دیکھا.....“ اس کی آواز رندہ گئی۔

”بہت خوب.....“ وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”ملزم کو کسی شخص سے ملاقات کرنے پلازا کے علاقے میں جانا تھا اور وہ اپنے بیان کے مطابق پلازا گیا بھی مگر اس کی مذکورہ شخص سے ملاقات نہ ہو سکی لہذا وہ کھانا کھانے اپنے گھر چلا گیا.....“

”تو اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے

نئے موسم کی بدلتی قسم اگست 2012ء کے شمارے کی لطافتیں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



جال درجال

جنگل بیابان سے جدید نخلستان کا رخ کر لینے
والی سنسنی خیز کہانی کے اختتامی واقعات
سلیم فاروقی کے مخصوص آہنگ و رنگ

سرواق کی کہانیاں

محبت کی نرم گفتاریاں... نفرت کی چنگاریاں...
دوستی کی دل فریبیاں... اور دشمنوں
کی عیاریاں... دل پسند سرورق کہانیاں

مشرق و مغرب کے رنگ ڈھنگ

مغربی دنیا کے رسم و اطوار... معاشرت و تغیرات
کے گرد گھومتی مختلف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

سحر

انگریز سلسلے

لکار... بدلتے ماحول اور گرجے و منوں کی لاکڑیاں
طاہر جاوید مغل کا معرکہ... ایک نئی ڈگر
پگازن اسما قادری کا سلسلہ گرداب

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... آپ کے قلم سے

وہ سب جو جاسوسی کا خاصہ ہے

جب ان کی واپسی کی کوئی امید نظر نہ آئی تو میں ایجنسی
سوچ کر واپس آ گیا کہ یہاں بیٹھ کر وقت ضائع کر
کوئی فائدہ نہیں۔ میں بعد میں کسی وقت امجد حسین
ملاقات کر لوں گا۔

”اور جب آپ ایجنسی سے باہر نکلے تو آپ کو
نے ستایا۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو لپیٹتے ہوئے کہا۔
آپ نے گھر کا رخ کیا۔

”جی ہاں... میں کھانا کھانے اپنے گھر آ گیا
وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے استغاثہ کی تکلیف دور کرنے کی غرض
نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنے موکل سے پوچھا۔
”ایک بات کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دیں...!۔“

میں نے ٹھہر ٹھہر کر... انتہائی سنجیدہ لہجے میں استغاثہ
کیا۔ ”جب آپ کی، وقوعہ کے روز... امجد حسین پر اپنی
ایجنٹ سے ملاقات طے تھی اور... یہ ملاقات آپ نے
کے وقفے ہی میں کرنا تھی... تو پھر آپ نے امتیاز سے اسے
لیے... لہجے کیوں منگوا یا تھا...؟“

”بات یہ ہے جناب کہ... لہجے تو میں روزانہ
منگوا کرتا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”انسان
نہایت ہی پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ جو کام کرتا چلا آ رہا
ہو وہ اس کی پختہ عادت یا ”فطرت ثانی“ بن جاتی ہے۔
ٹھیک ہے کہ امجد حسین سے میری ملاقات طے تھی اور مجھے
آفس سے باہر ہی کہیں لہجے کرنا تھا لیکن معمول کے مطابق
جب میرا چہرہ اسی امتیاز لہجے کا پوچھنے آیا تو میں نے روزمرہ کی
عادت کے مطابق اس سے لہجے لانے کے لیے کہہ دیا لیکن چہرہ
منٹ کے بعد مجھے یاد آیا تو میں حامد باری کو اپنے جانے کا
کر آفس سے نکل آیا تھا۔“

”حامد باری کو آپ نے کیا بتایا تھا؟“

”میں نے باری صاحب سے کہا تھا کہ مجھے ایک شخص
سے ضروری میٹنگ کے لیے پلازا تک جانا ہے۔ میرا
آجائے تو وہ کوئی بھی کھا سکتا ہے۔“

”پھر اس پر باری صاحب نے کیا جواب دیا تھا؟“

میں نے پوچھا۔

”انہوں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
بھائی! اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ اگر لہجے آ رہا ہے تو آئے
دیں۔ جس کی قسمت میں وہ رزق لکھا ہو گا وہ کھالے گا۔ آپ
جانیں جہاں جانا ہے۔“ ملزم نے بتایا۔ ”پھر ہم دونوں
ایک ساتھ ہی آفس سے نکلے تھے۔ باری صاحب نماز

میرے فاضل دوست؟“ میں نے ترکی بہ ترکی پوچھ لیا۔

”حیرانی اور پریشانی والی بات یہ ہے کہ ملزم کا کسی
شخص سے ملاقات کے لیے جانا طے تھا لیکن اس کے باوجود
بھی اس نے آفس کے چہرے سے لہجے منگوا یا اور خود غائب
ہو گیا۔“

”ہاں... تو...؟“ میں نے وکیل استغاثہ کو گھور کر
دیکھا۔ ”میں سمجھا نہیں، آپ کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہیں؟“

”سیدھی سی بات ہے میرے فاضل دوست! وکیل
استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”جب کسی شخص کو لہجے کے
اوقات میں آفس سے باہر جانا ہوتا ہے تو وہ اپنے لیے لہجے
نہیں منگوا کرتا اور اپنے موکل کی تو پلازا کے علاقے میں
کسی شخص سے ملاقات طے تھی اور وہ ملاقات ہو بھی نہیں سکتی تو
پھر اسے سیدھا آفس واپس آ جانا چاہیے تھا۔ گھر جانے کی کیا
ضرورت تھی۔“

”گھر جانے کی ضرورت کی ملزم نے وضاحت کر دی
ہے۔“ میں نے محمل انداز میں کہا۔ ”اگر آپ کی سمجھ میں
نہیں آئی تو اس میں ملزم کا کوئی قصور نہیں۔ بہر حال...“

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور دوبارہ
ملزم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”وقوعہ کے روز دوپہر میں آپ کی کسی شخص سے
ملاقات طے تھی؟“

”امجد حسین سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”امجد
حسین ایک پراپرٹی ڈیلر ہے اور پلازا کے علاقے میں اس
کی اسٹیٹ ایجنسی ہے۔“

”آپ کس سلسلے میں امجد حسین پر اپنی ایجنٹ سے
ملاقات کرنے والے تھے؟“

”دراصل، ہم جس بلڈنگ میں رہ رہے ہیں وہاں
بھانت بھانت کے لوگ آکر آباد ہو گئے ہیں۔“ وہ معتدل
انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بلڈنگ کا ماحول فیملی
والوں کے لیے مناسب نہیں رہا۔ ہم گھر تبدیل کرنے کے
بارے میں سوچ رہے تھے اسی سلسلے میں امجد حسین سے میری
بات چل رہی تھی۔ وہ مجھے ایک اچھا فلیٹ دکھانے والا تھا۔“

”لیکن وقوعہ کے روز امجد حسین سے آپ کی ملاقات
نہیں ہو سکی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”جی ہاں...“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے
بولا۔ ”جب میں امجد حسین کی ایجنسی پر پہنچا تو پتا چلا کہ وہ
کسی پارٹی کو کوئی فلیٹ دکھانے گئے ہوئے ہیں۔ میں نے
وہیں ایجنسی میں بیٹھ کر پانچ دس منٹ ان کا انتظار کیا لیکن

میں نے ترکی بہ ترکی پوچھ لیا۔

”حیرانی اور پریشانی والی بات یہ ہے کہ ملزم کا کسی
شخص سے ملاقات کے لیے جانا طے تھا لیکن اس کے باوجود
بھی اس نے آفس کے چہرے سے لہجے منگوا یا اور خود غائب
ہو گیا۔“

”ہاں... تو...؟“ میں نے وکیل استغاثہ کو گھور کر
دیکھا۔ ”میں سمجھا نہیں، آپ کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہیں؟“

”سیدھی سی بات ہے میرے فاضل دوست! وکیل
استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”جب کسی شخص کو لہجے کے
اوقات میں آفس سے باہر جانا ہوتا ہے تو وہ اپنے لیے لہجے
نہیں منگوا کرتا اور اپنے موکل کی تو پلازا کے علاقے میں
کسی شخص سے ملاقات طے تھی اور وہ ملاقات ہو بھی نہیں سکتی تو
پھر اسے سیدھا آفس واپس آ جانا چاہیے تھا۔ گھر جانے کی کیا
ضرورت تھی۔“

”گھر جانے کی ضرورت کی ملزم نے وضاحت کر دی
ہے۔“ میں نے محمل انداز میں کہا۔ ”اگر آپ کی سمجھ میں
نہیں آئی تو اس میں ملزم کا کوئی قصور نہیں۔ بہر حال...“

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور دوبارہ
ملزم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”وقوعہ کے روز دوپہر میں آپ کی کسی شخص سے
ملاقات طے تھی؟“

”امجد حسین سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”امجد
حسین ایک پراپرٹی ڈیلر ہے اور پلازا کے علاقے میں اس
کی اسٹیٹ ایجنسی ہے۔“

”آپ کس سلسلے میں امجد حسین پر اپنی ایجنٹ سے
ملاقات کرنے والے تھے؟“

”دراصل، ہم جس بلڈنگ میں رہ رہے ہیں وہاں
بھانت بھانت کے لوگ آکر آباد ہو گئے ہیں۔“ وہ معتدل
انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بلڈنگ کا ماحول فیملی
والوں کے لیے مناسب نہیں رہا۔ ہم گھر تبدیل کرنے کے
بارے میں سوچ رہے تھے اسی سلسلے میں امجد حسین سے میری
بات چل رہی تھی۔ وہ مجھے ایک اچھا فلیٹ دکھانے والا تھا۔“

”لیکن وقوعہ کے روز امجد حسین سے آپ کی ملاقات
نہیں ہو سکی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”جی ہاں...“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے
بولا۔ ”جب میں امجد حسین کی ایجنسی پر پہنچا تو پتا چلا کہ وہ
کسی پارٹی کو کوئی فلیٹ دکھانے گئے ہوئے ہیں۔ میں نے
وہیں ایجنسی میں بیٹھ کر پانچ دس منٹ ان کا انتظار کیا لیکن

میں نے ترکی بہ ترکی پوچھ لیا۔

”حیرانی اور پریشانی والی بات یہ ہے کہ ملزم کا کسی
شخص سے ملاقات کے لیے جانا طے تھا لیکن اس کے باوجود
بھی اس نے آفس کے چہرے سے لہجے منگوا یا اور خود غائب
ہو گیا۔“

”نور علی صاحب! میری ریسرچ کے مطابق آپ کے بیوی بچے وقوع سے دو تین دن پہلے ہی گاؤں گئے ہیں یعنی اس وقت جب چھٹیوں کے بعد اسکول کھل چکے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”اور میں یہ بات ایسے ہی زبانی کلائی نہیں کہہ رہا بلکہ اسے ثابت بھی کر سکتا ہوں۔ آپ جھوٹ بول کر اپنی جان نہیں بچا سکتے.....؟“

”میں اپنی جان کیوں بچاؤں گا۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے۔“ وہ ایک دم ہتسے سے اکھڑ گیا۔ ”آپ کے پاس جو بھی ثبوت ہیں انہیں عدالت میں لے آئیں۔“ ”وہ ثبوت تو میں بعد میں لے آؤں گا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”جو کچھ اس وقت میرے پاس ہے پہلے آپ اس سے ٹونٹ لیں.....“ اس کی گھبراہٹ، پریشانی اور غصہ اس امر کا ثبوت تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میں نے اسے کند چھری سے ڈنچ کرتے ہوئے پوچھا۔

”نور علی! آپ نے ڈھائی بجے اپنے سامنے والے فلیٹ میں قتل کی ایک واردات ہوتے دیکھی اور دروازہ بند کر کے گھر میں بیٹھ گئے۔ کیا پڑوسی ہونے کے ناتے آپ کا فرض نہیں بنتا تھا کہ فوراً پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دیں؟“

”میں نے بتایا تو ہے کہ میں ڈر گیا تھا، خوف زدہ ہو گیا تھا۔“ وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ ”اس روز صبح ہی سے میری طبیعت بھی بہت خراب تھی۔“

”اس وقت آپ کیا ڈرے ہوں گے جو میں اب آپ کو ڈرانے والا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جارحانہ لہجے میں کہا۔ میرے انداز میں ادب و احترام بھی اٹھ گیا تھا۔ ”آپ جس فلیٹ میں رہ رہے ہو، اس کا کرایہ کتنا ہے؟“

”کک..... کرا..... یہ.....!“ وہ شکستہ آواز میں بولا۔ ”ہاں میں نے کرایہ ہی پوچھا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”سو لجر بازار کی ایک صاف ستھری عمارت میں شفٹ ہوئے ابھی آپ کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ وقوع سے ایک آدھ ماہ پہلے ہی آپ نے وہاں رہائش اختیار کی ہے۔ اس سے پہلے آپ کھارادر کے ایک تنگ و تاریک گھر میں زندگی بسر کر رہے تھے۔“

میری معلومات کے مطابق، آپ کے موجودہ فلیٹ کا کرایہ دو ہزار روپے ماہوار ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا

محبت کی قوس قزح اور دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کا حساب

زندگی میں ایک وقت ایسا گزرتا ہے جب انسان باہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے مگر... کچھ وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اندر کا منظر باہر دیکھنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ یہ دل کی لگی ہوئی ہی اتنی بری ہے۔ بقول شاعر... اے عشق ترا تو نام برا... آغاز برا، انجام برا... سنائوں کے حصار میں قید اس نے بھی ایک روزن تلاش کر لیا تھا جہاں سے عہد گزشتہ کی کچھ یادیں خوشگوار جھونکے کے مانند اس کی تنہائی میں چلی آتی تھیں۔

روزن دل

زاہد نقوی



جاوید نڈھال اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ فٹ پاتھ پر جا رہا تھا کہ اچانک قریب آتی ہوئی بے ہنگم آوازیں سن کر وہ چونک پڑا، اس نے دیکھا بغیر سائلنسر کی موٹر سائیکلوں پر کئی نوجوان لڑکے قہقہے لگاتے ہوئے ریس لگا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں ایک

موٹر سائیکل فٹ پاتھ پر آگئی، جاوید کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ وہ اس سے بچنے کے لیے کیا کرے۔ وہ گھبراہٹ میں فٹ پاتھ کے دائیں طرف مکان کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تیز رفتاری سے آتی ہوئی موٹر سائیکل پر سوار لڑکے نے بھی کوشش کی کہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے لیکن اس کا ہینڈل جاوید

کے پیٹ کے ساتھ کھرا گیا۔ لڑکا موٹر سائیکل کے ساتھ سڑک پر پھسلتا ہوا دور تک چلا گیا۔ جاوید کی آنکھوں میں اندھیرا سا آگیا اور چند لمحوں بعد وہ اپنا پیٹ پکڑے ہوئے فٹ پاتھ پر بے سدھ ہو کر گر گیا۔

﴿﴾

جاوید کی جب آنکھ کھلی تو وہ اپنے پورے حواس میں تھا، اسے احساس ہوا کہ وہ ایک اسپتال میں ہے۔ چہرے پر آکسیجن ماسک لگا ہوا ہے۔ ہاتھوں میں ڈریس کلی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھا اور آلے سے دل اور سینے کی کیفیت معلوم کرنے لگا اس نے پاس کھڑی ہوئی نرس سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے یہ جو میں گھنٹے کے اندر اندر خطرے سے باہر آجائے۔“

جاوید نے کچھ بولنا چاہا تو ڈاکٹر نے منع کر دیا۔ ”آپ خاموشی سے لیٹے رہیں بولنے یا ہاتھ ہڈی ہلانے کی کوشش نہ کریں، چھ سات گھنٹے پہلے جب آپ کو یہاں لایا گیا تھا تو پیٹ پر ایک زخم تھا لیکن جب اس کی ڈریسنگ ہو رہی تھی تو آپ کو شدید ہارٹ ایک ہوا۔ اس چھوٹے سے شہر میں خوش قسمتی آپ کی یہ ہے کہ وہ انجکشن مل گیا جس نے آپ کی جان بچالی لیکن ابھی آپ مزید دو روز تک آئی سی یو میں اور رہیں گے پھر کوئی حتمی رائے دی جاسکتی ہے۔“ اسے ڈاکٹر کی آواز بہت دور ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے ایک اور انجکشن لگایا گیا اور وہ چند لمحوں بعد گہری نیند سو گیا۔

جاوید کو اسپتال میں آئے ہوئے چھ دن ہو گئے تھے، اب اس کی صحت نسلی بخش تھی۔ وہ کسی سہارے کے بغیر اپنے ہی کمرے میں چلنے پھرنے لگا تھا لیکن ڈاکٹروں نے اس کی خواہش کے باوجود فریڈ کوٹ جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس لیے کہ دو ڈھائی کلومیٹر کا راستہ یا تو پیدل کا تھا یا پھر وہاں گھوڑا گاڑی یا بیل گاڑی کے ذریعے جایا جاسکتا تھا۔ جاوید کی صحت کے پیش نظر فی الحال یہ سفر اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ شام ہو رہی تھی اس نے کھڑکی بند کی اور اپنے بستر پر آکر بیٹھ گیا اور اسی وقت نرس، ڈاکٹر اور کئی لوگوں کے ساتھ ایک بیڈ پر ایک مریض کمرے میں لایا گیا اور خالی بیڈ کو ہٹا کر اس کا بیڈ کمرے کے کونے میں لگا دیا گیا۔ جاوید نے دیکھا کہ اس کے ایک پیر ایک ہاتھ پر پلاسٹر چڑھایا گیا تھا۔ ہاتھ اور چہرے پر بھی زخم نظر آرہے تھے اس کی آنکھیں بند تھیں یقیناً اسے آپریشن اور پلاسٹر چڑھانے کے دوران بے ہوشی کی دوا دی گئی ہوگی۔ تھوڑی دیر میں کمرے میں موجود دو عورتیں اور

ایک مرد باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر اور نرس بھی تھوڑی دیر بعد مریض کی حالت سے مطمئن ہونے کے بعد چلے گئے تھے۔ ایک سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا بیچ پر بیٹھ گیا جس سے پتا چلا کہ آنے والے مریض کا نام ثار تھا اور وہ گھڑکی سب سے اونچائی سے سڑھی سے گر کر بری طرح زخمی ہوا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچ گیا تھا۔

﴿﴾

دو تین دن ہی میں جاوید اور ثار ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کافی عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ جاوید اکثر آنکھیں بند کر کے خدا جانے کیا کیا سوچتا رہتا یا جب دل گھبراتا تو ثار سے پکڑ باتیں کر لیتا تھا۔ آج صبح بھی گفتگو کی ابتدا جاوید نے کی۔

”آپ کی دیکھ بھال کرنے والا لڑکا شاید بازار گیا ہے!“

”نہیں جاوید صاحب میں نے اسے گاؤں روانہ کر دیا ہے گھر اور کھیتوں کو دیکھنے والا وہاں کوئی تو ہو۔ یوں بھی آپ کے سامنے ہی ڈاکٹر نے کل رات کہا تھا کہ پلاسٹر کٹنے میں چھ سے آٹھ ہفتے لگ سکتے ہیں۔ ہر دس روز بعد ایک کمرے بھی ہوگا، گاؤں سے آنا جانا آسان نہیں ہے اور نہ سردار کو اتنے دن یہاں روک سکتا تھا۔“

”ہاں ٹھیک ہی کہتے ہیں آپ۔“ جاوید کا مختصر سا جواب تھا۔

”ویسے جاوید صاحب آپ باتیں کم کرتے ہیں لیکن جو بھی کہتے ہیں بڑے کام کی ہوتی ہیں، بس جو شعر وغیرہ آپ سناتے ہیں وہ اپنے پلے نہیں پڑتا، چھ جماعت پاس ہونے والا یہ سب کیسے سمجھ گئے۔“

”کیا کروں ثار صاحب، لڑکوں کو پڑھاتے پڑھاتے کچھ مشکل الفاظ ادھر ادھر کی بے سرو پا باتیں کرنے لگتا ہوں، آپ بور ہوئے ہوں گے۔“

”ارے کیا کہہ رہے ہیں آپ جاوید صاحب۔ آپ نہ ہوتے تو اس اندھیرے کونے میں پڑے پڑے میرا دم گھٹ جاتا۔ آپ کی باتوں سے دل بہلا رہتا ہے۔ اچھا یہ بتائیں آپ کھڑکی کھول کر بہت خاموشی کے ساتھ نظریں جمائے کیا دیکھا کرتے ہیں؟“

”میں..... ہاں بس یار کچھ الٹی سیدھی باتیں ہیں۔“

”نثار بے تابی سے بولا۔ مجھے بھی تو بتائیے کہ کھڑکی کی دوسری طرف کیا ہے۔ کیا ہوتا رہتا ہے..... آج آپ نے کھڑکی نہیں کھولی۔“

جاوید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”کھڑکی نہیں روزن دل.....“

”پھر آپ انگریزی بولنے لگے.....“

جاوید نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”روزن دل، یہ انگریزی نہیں فارسی ہے۔ دل کا دروازہ سمجھ لیجیے۔“

”دل کا سوراخ تو سنا ہے۔ یہ دروازہ کیسا؟“ ثار یہ کہہ کر اس طرح ہنسا جیسے اس نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوا تو اس نے پھر رٹ لگائی۔

”جاوید صاحب بتائیے نا..... باہر کیا کچھ ہے۔ کیا ہوتا رہتا ہے؟“

جاوید نے کھڑکی کھول دی اور سر ہانے کھسک کر باہر دیکھنے لگا۔ پھر ایک لمبے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”کھڑکی کے دائیں طرف آدھے حصے میں ایک کمرہ نظر آتا ہے، کمرے کی کھڑکی بالکل میرے سامنے ہے، جب وہ کھلتی ہے تو عموماً ایک جوان سا لڑکا کرسی پر بیٹھا کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہے۔ اسی کمرے میں میز سے تھوڑی دور ایک تخت سا ہے جس پر ایک بزرگ یا تو بیٹھے رہتے ہیں یا لیٹے رہتے ہیں، وہ لڑکے کے باپ ہیں۔“

”آپ کو پتا ہے یہ بات؟“ ثار نے سوال کیا۔

”ہاں یہ کمرہ اتنا واضح ہے کہ کمرے کے اندر ہونے والی ساری باتیں میں سن سکتا ہوں اور کمرے کے اندر ہر ایک چیز ہر ایک فرد کو دیکھ سکتا ہوں۔ لڑکے کو بزرگ بڑی کہہ کر پکارتے ہیں اور وہ انہیں ابی کہتا ہے۔ اکثر دونوں میں کسی نہ کسی موضوع پر بات ہوتی رہتی ہے۔“

”اچھا..... کیا باتیں کرتے ہیں دونوں؟“ ثار کی بے تابی بڑھ رہی تھی۔

”سب تو یاد نہیں لیکن کل ہی بڑی سے وہ کہہ رہے تھے یہ جو تم کو افسانے لکھنے کا خط ہوا ہے اس کا کیا فائدہ..... اور بڑی نے جواب دیا ابی آپ صرف مالی فائدے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنے پڑھنے والوں کو جو بتانا چاہتا ہوں وہ ان تک پہنچ رہا ہے یہی میری نسل کے لیے بہت ہے۔“

اس کے باپ نے ایک اور سوال کیا تھا۔ ”اور یہ جو تم ڈال لکھ رہے ہو، یہ چھپے گا کیسے؟“

اور بڑی نے صرف اتنا کہا تھا۔ ”کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے.....“ پھر اس نے اٹھ کر اپنے باپ کا کھانا لاکر تخت پر رکھ دیا اور پانی کا گلاس بھی۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس کمرے میں یا اس گھر میں بس یہی افراد رہتے ہیں۔“ ثار نے تجزیہ پیش کیا۔

”لگتا تو یہی ہے۔“ جاوید کا جواب تھا۔

”اب یہ دونوں کیا کر رہے ہیں؟“

”ابھی کمرے کی کھڑکی بند ہے۔“

ثار نے پھر اپنا خیال ظاہر کیا۔ ”ایسا لگتا ہے بڑی کے والد صاحب چل پھر نہیں سکتے۔“

”ہو سکتا ہے آپ کا خیال درست ہو یا شاید کوئی اور معاملہ ہو۔“

”اچھا جاوید صاحب اور کیا دیکھ رہے ہیں آپ باہر۔“

جاوید نے جیسے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”باہر..... ہاں۔ میں نے کہا تھا کہ آدھی کھڑکی کے سامنے تو بڑی کا کمرہ ہے۔ لیجئے سامنے کی کھڑکی بڑی کے والد نے آکر ابھی کھولی ہے۔ وہ لنگڑا تے ہوئے بڑی کے پاس گئے ہیں۔ انہوں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ کہہ رہے ہیں۔“

”تمہارا بخار کچھ اور تیز ہو گیا ہے۔“

”سعید صاحب نے ہمیشہ ہماری مدد کی ہے، انہوں نے اگر دوائیں نہ بھیجی ہوتیں تو کیا ہوتا۔ میں گھٹیا کامریض، بھلا کیا کرتا..... دونوں وقت کا کھانا بھی وہ بھیج رہے ہیں.....“ یہ ساری باتیں جاوید نے رک رک کر کہیں۔ وہ ہر بات سننے کے بعد ہر ادا دیتا تھا۔ ”بڑی اب اٹھ کر بیٹھ گیا ہے اور اس کے والد اسے شاید دو اپلا رہے ہیں۔“

”بہت سخت بیمار ہو گیا ایک دم بڑی۔“ ثار نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

جاوید نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے بتایا۔ ”گھر کا سامنے والا دروازہ ابھی ابھی کھلا ہے اور ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی سیڑھیوں سے اتر کر کار کی طرف آرہی ہے۔ کالج کی طالبہ لگتی ہے۔“

”یہ کیسے معلوم ہوا آپ کو؟“

”ارے بھائی اس طرح کہ اس کے ہاتھ میں صرف دو کاپیاں ہیں کوئی بھاری بھر کم بیگ نہیں ہے۔ ہائیں یہ کار میں نہیں بیٹھی بلکہ دائیں طرف چلی گئی ہے اور نظر نہیں آ رہی۔“

”نظر نہیں آ رہی، یہ تو برا ہوا۔“ ثار نے بے تابی سے کہا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اسے لڑکی کے بارے میں اور بھی کچھ معلوم ہو.....

چند ہی لمحے بعد جاوید بولا۔ ”یہ کیا..... وہ لڑکی تو سامنے والے کمرے میں آگئی ہے۔ بڑی کے پاس آکر

اسی کے بستر پر بیٹھ گئی ہے۔" جاوید اب ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ نہ تار بھی بے چینی سے خنجر تھا کہ اسے معلوم ہو کہ دونوں میں کیا باتیں ہوئیں۔ تھوڑی دیر بعد جاوید نے بتایا۔

"لو کی چلی گئی ہے، بڑی نے اسے وانا کہا کہ مخاطب کیا تھا اور پوچھا تھا۔" آج کون سا پیر ہے؟" وانا نے کہا۔ "ارو کا۔"

"اور کل.....؟"

"کل انگریزی کا پرچہ ہے۔ آپ کو تیز بخار ہے خدا کرے آپ ٹھیک ہو جائیں جلدی سے۔" وانا بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہو جاؤں گا، گھبراؤ نہیں۔ میں ٹھیک ہوتا تو گھر میں آکر کل کے پرچے کے بارے میں کچھ نوٹس بنوا دیتا۔"

"نہیں نہیں..... آپ نہ آئیے گا میں خود آ جاؤں گی شام کو۔"

"ارے نہیں تم نہ آنا سعید انکل کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ میرا مطلب تمہارا یہاں آنا۔"

"میں انہیں سمجھا لوں گی۔" وانا نے جاتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ چلی گئی اب؟" ثار نے تصدیق کرنی چاہی۔

"ہاں وہ روانہ ہو گئی ہے۔"

"اور بڑی کیا کر رہا ہے؟" ثار نے جاننا چاہا۔

"وہ اب بھی بستر پر بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ اس کے والد اسے سمجھا رہے ہیں۔" جاوید نے رک رک کر ان کی باتیں بتائیں۔ "وہ کہہ رہے ہیں۔"

"بڑی، بیٹے میں جو کچھ سوچ رہا ہوں اگر وہ سچ ہوا تو بڑے مسائل پیدا ہوں گے۔" سعید صاحب کو وانا کا یہاں آنا پسند نہیں لیکن وہ مانتی نہیں۔ بیٹے ایک بات ذہن نشین کرلو۔ برابر والوں کے درمیان تو رابطے بڑھنے کے امکانات ہوتے ہیں لیکن اگر زمین آسمان کا فرق ہو تو اچھا نتیجہ کبھی سامنے نہیں آتا۔ تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں میں سعید صاحب کے والد کے زمانے سے وہاں ملازمت کر رہا ہوں۔ انہوں نے اور پھر سعید میاں نے مجھے گھر کے فرد کی طرح سمجھا۔ میں جب معذور ہوا تو انہوں نے مجھے نسل دی۔ تمہاری تعلیم کے حصول میں ہر طرح مدد کی۔ گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے تمہیں بہت اچھی ملازمت دلوائی۔ اب تم سوچو۔"

"ابی....." بڑی نے بات کاٹ دی۔ "میں خود بھی یہ سب کچھ سوچتا ہوں۔ وانا کو ایک بار نہیں کئی بار سمجھا چکا ہوں

لیکن وہ میری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں ہوتی۔ میں سمجھا ہوں کہ وہ کیا چاہ رہی ہے لیکن....."

"میں اس سے بات کروں؟" بڑی کے والد نے پوچھا۔

"نہیں ابی آپ مطمئن رہیں میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ وانا کو میری باتیں ماننا ہوں گی۔"

"اب وہ دونوں خاموشی سے لیٹے ہیں، میں بھی آرام کر لوں، تھک گیا ہوں۔" جاوید نے کھڑکی بند کی اور بیڈ پر لیٹ گیا۔

جاوید جب کمرے میں داخل ہوا تو ثار کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ بڑی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ خیریت تو ہے؟" ثار نے بے تابی سے پوچھا۔

"میری سانس پھول رہی ہے، سر میں درد بھی ہے ذرا سانس سنبھل جائے تو بتاتا ہوں۔" جاوید نے اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے پانی پیا۔ ایک گولی کھائی، پھر کچھ دیر بعد وہ ثار سے مخاطب ہوا۔

"میں اس وقت ٹھیلے ٹھیلے اس گھر کی طرف چلا گیا تھا۔"

"اچھا۔ خوب! ثار نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"بڑی صاحب سے یا ان کے والد سے ملاقات ہوئی؟"

"کسی سے بھی نہیں ہوئی۔" جاوید نے بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا۔ "دروازے پر سعید افضال کی شیم پلیٹ لگی ہوئی ہے اور نیچے ناظم علی لکھا ہوا ہے۔"

"اچھا تو کچھ اور بھی معلوم ہوا ہوگا؟" ثار سب کچھ جلد سے جلد جان لینا چاہتا تھا۔

"بس یہ معلوم ہوا کہ سعید افضال کے والد اس علاقے کے سب سے بڑے رئیس تھے۔ چاروں طرف جو دکانیں ہیں، آگے جا کے کئی ایکڑ کھیت ہیں، سب کے یہی مالک تھے۔ اب ان کا بیٹا اس علاقے کا گویا انتظامی سربراہ ہے۔ بڑی سخت سکیورٹی ہے۔ میں نے بڑی سے ملنا چاہا، ان کے والد سے ملنا چاہا تو گارڈز نے بتایا کہ اقبال چاچا ابھی ابھی قریب ہی اپنے ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں اور بڑی صاحب بیمار ہیں لہذا وہ کسی سے نہیں مل سکتے۔"

"یہ تو برا ہوا۔" جاوید نے ثار کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔ "معلوم ہوا ہے کہ گھر میں وانا کی امی اور پھوپھی رہتی ہیں۔ اقبال صاحب سعید صاحب کے والد کے زمانے سے

گھر کی ساری دیکھ بھال کے ذمے دار تھے۔ مالی، ملازمین، گھر کا سودا سلف، صفائی غرض یہ کہ گھر سے متعلق ہر کام کے ثمران تھے۔ بڑی عزت ہے ان کی، سب انہیں یہاں تک کہ سعید صاحب بھی اقبال چاچا ہی کہتے ہیں انہیں، پھر وہ گھٹیا کے مرض کا شکار ہو گئے اور ایک طرح سے پنشن پر چلے گئے۔ بڑی اور وانا بچپن میں ایک ساتھ کھیلتے تھے حالانکہ سعید صاحب کو یہ بات پسند نہیں تھی لیکن وانا کی امی کا کہنا تھا کہ جب کوئی اس کے ساتھ کھیلتے والا نہیں تو وہ بھلا کس کے ساتھ کھیلتے۔

بڑی صاحب تین چار سال سے چھوٹی بی بی کو شام کو پڑ جانے کے لیے گھر آتے ہیں۔ بی بی بارہویں کلاس میں پڑھتی ہیں۔" جاوید خاموش ہو گیا۔ ثار اسے اس طرح دیکھنے کا جیسے وہ کچھ اور بھی سننا چاہتا ہے..... جاوید نے یہ محسوس کر کے بات ختم کر دی۔ "بس بھائی اتنا ہی معلوم ہوا ہے اب تک۔ سوچتا ہوں کسی دن بڑی صاحب سے ملاقات کی جائے۔ گارڈز کہہ رہا تھا کہ وہ آٹھ بجے ہی ملازمت کے لیے گھر سے باہر جاتے ہیں۔ کوشش کروں گا کسی دن، ان سے ملاقات کرنے کی۔"

"ہاں ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ تب ہی کوئی صحیح بات معلوم ہو سکے گی۔ ویسے جاوید صاحب جس طرح آپ یہ سب بتا رہے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے کوئی کہانی سن رہے ہوں..... بہر حال بڑی صاحب سے ملیے گا تو اور بھی بہت کچھ معلوم ہوگا۔"

"ہاں دیکھیے۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ دس پندرہ دن بعد جب میں اسپتال سے فارغ ہو جاؤں گا تب آپ اکیلے تو بہت گھبراہٹیں گے۔"

"نہیں میں نے ڈاکٹر اور نرس دونوں سے وعدہ لے لیا ہے کہ آپ کے جانے کے بعد میرا بیڈ اس کھڑکی کے پاس آجائے گا۔"

"اچھا..... یہ تو اچھی خبر ہے....." جاوید نے پھر پانی پیا۔

"ویسے جاوید صاحب شام تو ہو گئی ہے۔" ثار بولا۔

"ہاں تو..... کیا کروں؟" جاوید نے پوچھا۔

"بھول گئے آپ۔ شام کو وانا بڑی سے اس کے کمرے میں پڑھنے کے لیے کہہ گئی تھی۔" ثار نے یاد دلایا۔

"ارے ہاں۔ دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر جاوید نے کھڑکی کھول دی اور غور سے باہر دیکھنے لگا۔

چند لمحوں بعد بولا۔ "کمرے میں ان دونوں کے علاوہ

کوئی نہیں ہے۔ وانا پڑھنے کے بجائے بڑی سے باتیں کر رہی ہے۔"

"سنا کی دے رہا ہے کچھ؟" ثار کی بے تابی بڑھ گئی۔

"ہاں ہاں خاموش رہیے میں بتاتا رہوں گا....."

وقت کے بعد جاوید بولا۔ "وانیا بڑی کے سوال کا جواب دے رہی ہے۔"

"بڑی صاحب یہ بات آپ کتنی بار سمجھا چکے ہیں لیکن میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور آج پھر کہہ رہی ہوں۔ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ یہ کوئی جرم نہیں اور پھر مجھے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ آپ کا ناول پورا ہونے والا ہے۔ مجھے دیجیے گا میں اسے چھپواؤں گی اور اس کی اشاعت کے بعد جب اس کی دھوم ہوگی تو ڈیڈی کو معلوم ہوگا کہ آپ کے پاس دولت کے علاوہ بہت کچھ ہے۔"

"مگر میرے ابی جی تو ان تمام باتوں سے مطمئن نہیں ہیں۔" بڑی کہہ رہا ہے وانا سے۔ "ان کا خیال ہے کہ ان کی جو عزت ہے سعید میاں کے گھر میں وہ ختم ہو جائے گی اور نہ تم خوش رہو گے اور نہ وانا۔"

جاوید خاموش ہو کر پھر کچھ سننے لگا۔

"وانیا کہہ رہی تھی یہ ان کا خیال ہو سکتا ہے کچھ دنوں بعد سب ٹھیک ہو جائے گا اور پھر میری امی میرے ساتھ ہیں انہیں سب معلوم ہے....." جاوید پھر خاموش ہو گیا۔

"شاید کوئی ملازمہ آگئی ہے، کچھ کہہ رہی ہے۔" وہ پھر سننے میں مشغول ہو گیا۔ "وانیا چلی گئی کمرے سے۔"

"ارے ایکدم....." ثار نے مایوسی سے کہا۔ "ابھی تو دونوں کو کچھ طے کرنا تھا۔ یہ ایکدم کیوں چلی گئی؟"

"آپ سننے تو ساری بات۔" جاوید مخاطب ہوا۔

"اس ملازمہ نے آکر کہا تھا بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں فوراً گھر آ جاؤ تمہارے ڈیڈی آنے والے ہیں دفتر سے، انہیں معلوم ہوگا کہ بڑی صاحب کے کمرے میں اقبال چاچا بھی نہیں ہیں تو بہت سخت خفا ہوں گے..... ظاہر ہے ثار صاحب، اسے جانا چاہیے تھا۔"

نرس کمرے میں داخل ہوئی۔ جاوید سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "گھنٹی بجائی تھی آپ نے؟"

"ہاں میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے اور یہاں بھی، سینے کے اوپر....." بھی ہلکا سا درد ہے۔" جاوید نے بتایا۔

"ٹھیک ہے، آپ بیڈ پر لیٹ جائیے، میں ڈاکٹر کو لے کر آتی ہوں۔" نرس نے جاتے ہوئے کہا۔

جاوید بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے سینے پر اس جگہ ہاتھ رکھ لیا جہاں درد ہو رہا تھا۔ ”کیا زیادہ تکلیف ہے؟“ غار نے پوچھا۔

”نہیں لیکن پھر بھی ڈاکٹر دیکھ لیں تو زیادہ مناسب ہے۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ غار یہ دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

﴿﴾

صبح تک جاوید کی حالت تشویش ناک ہو گئی۔ اس کے سینے کا درد اس حد تک شدید ہو گیا کہ ڈاکٹروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ نہ جانے کتنے انجکشن، کتنی دوائیں، کتنے ٹیسٹ ہوئے لیکن صورت حال میں کوئی بہتری نظر نہیں آرہی تھی۔ ڈاکٹر مایوس ہوتے جا رہے تھے۔ اس نازک اور تشویش ناک صحت کی بنا پر جاوید کو کسی بڑے شہر میں بھی منتقل کرنا مناسب نہیں تھا۔ ایک جونیئر ڈاکٹر کی رائے کے مطابق آخری کوشش کے طور پر اسے ایک انجکشن اور لگایا گیا اور تقریباً دو گھنٹے بعد جاوید کی حالت معجزانہ طور پر ایک دم بہتر ہوئی چلی گئی۔ شام کو جب اس نے آنکھ کھولی اور اس سے پوچھا گیا تو اس نے یہی بتایا، درد تو اب بالکل ختم ہو گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد یہ طے کیا کہ ابھی چوبیس گھنٹے تک یہ مکمل طور پر بیڈ پر رہیں گے، بخار کے لیے دوائیں تجویز کیں اور جاوید کو صاف گوئی کے ساتھ یہ بتا دیا کہ آٹھ دس روز اور حالت مکمل طور پر قابو میں آجائے گی آپ فوراً حیدرآباد یا کراچی جائیں، انجیوگرافی ضروری ہے جس کی سہولت یہاں نہیں ہے۔ ورنہ اب تیسرا دورہ اگر پڑا تو بچنا ناممکن ہوگا شاید۔ جاوید نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”میں کراچی تو نہیں جاؤں گا۔ ہاں حیدرآباد کے بارے میں سوچوں گا۔“ غار نے یہ تمام مراحل خود دیکھے اور ساری باتیں سنیں۔ اس کی بے چینی ختم ہو گئی تھی شاید اس وجہ سے کہ اب اسے امید ہو گئی تھی کہ جاوید صاحب دو تین روز بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ بڑی اور وانا کے بارے میں اس درمیان ہونے والی صورت حال سے آگاہ کریں۔ غار نے نرس سے کھڑکی کھولنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ ”جاوید صاحب کو بخار ہے اور ٹھنڈک بڑھ رہی ہے لہذا ان کے لیے ٹھنڈی ہوا نقصان دہ ہوگی۔“ شاید غار، نرس کے ذریعے کچھ باہر کے حالات جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ نرس نے جاوید کو ایک اور انجکشن لگایا اور غار کو ہدایت کی کہ ان سے باتیں نہ کیجیے گا اب۔ انہیں بہت اچھی نیند کی ضرورت ہے۔

﴿﴾

تین چار روز گزرنے کے بعد آج غار بہت مطمئن تھا۔ ڈاکٹروں نے جاوید کو چلنے پھرنے اور باہر چلنے کی اجازت دے دی تھی اور جاوید، بڑی سے ملنے کے لیے کافی دیر ہوئے جا چکا تھا۔ جاوید واپس آیا تو غار کا انتظار ختم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بڑی سے ملاقات کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ ”میں نے بڑی کو راضی کر لیا کہ وہ میری خواہش پر قریب ہی ہوں میں میرے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کر لے۔ جب میں نے اسے باتوں باتوں میں اس کی ان باتوں کے اشارے دیے جو میں نے کھڑکی کے ذریعے سنی تھیں تو وہ کچھ دیر حیران نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”آخر آپ کو ان تمام باتوں سے کیا مطلب اور یہ سب جاننے کا مقصد کیا ہے؟ دوستانہ لہجے میں مشورہ دیا کہ آپ نے اپنے دل کی بات نہ اپنے والد کو بتائی نہ وانا صاحبہ کو۔ مجھے یہ سب بتا کر آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے بچپن سے لے کر اب تک تمام اہم واقعات اور احساسات سے آگاہ کیا۔“

”جیسا کہ آپ کو علم ہو چکا ہے جاوید صاحب کہ میرے والد سعید صاحب کے گھرانے سے تقریباً چالیس سال سے وابستہ ہیں اور سب احترام کی نظروں سے انہیں دیکھتے ہیں۔ اسی لیے میں اور وانا بچپن ہی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ وانا کی کوئی دس سال کی عمر تھی کہ وہ ٹائیفائیڈ بخار میں مبتلا ہو گئی۔ میں اور میرے والد دن رات اس کی تیمارداری کرتے رہے۔ سعید صاحب اور بیگم صاحبہ کے سمجھانے کے باوجود میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ وانا کو اکیلا چھوڑوں حالانکہ دیکھ بھال کرنے والی خود اس کی امی تھیں، ملازمین تھے۔ وانا بھی مجھے اپنے پاس پا کر بے حد خوش رہتی۔ سعید صاحب کو میری یہ بات بہت اچھی لگی۔ اب جو چیز وہ وانا کے لیے لاتے میرے لیے بھی لے آتے۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ میں نے گریجویشن کر لیا تو مجھے سعید صاحب نے اسکول میں ملازمت دلوا دی۔ اب وانا کو بھی میں پڑھانے لگا تھا۔ ابی کے کہنے کے مطابق اب میں نے گھر میں آنا جانا بہت کم کر دیا ہے۔ جب میں وانا کو پڑھاتا تھا تو اکثر وہ ایک آدھ جملہ ایسا کہہ دیتی کہ میں حیران رہ جاتا تھا۔ مثلاً یہ کہ آپ کی، بڑی سوچتی ہوئی اور خوب صورت آنکھیں ہیں یا کہ آپ کے اچھے ہوئے بال مجھے بے حد پسند ہیں۔ ایک دن کہنے لگی یہ آپ کا سادہ سا لباس آپ پر بڑا بھلا لگتا ہے۔“ اور دل کی بات میں بھی کہہ دوں جاوید صاحب آپ سے وانا کے مزاج اور رویے سے میں بے حد

محظوظ تھا۔ مجھے بھی وہ بہت اچھی لگنے لگی۔ میں نے انٹر میں داخلے کے بعد سالوں کے لیے افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے۔ جو بہت پسند کیے گئے۔ وانا ان افسانوں کی اتنی تعریف کرتی کہ میں دم بخود رہ جاتا۔ تقریباً دو سال پہلے جب اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو ایک دن اس نے کہا۔ آپ میرے استاد ہی نہیں، میرے آئیڈیل بن گئے ہیں۔ صاف گوئی کی تو اس کی عادت تھی۔ ایک دن اس نے کہہ دیا، آپ مجھے بے حد اچھے لگتے ہیں جب آپ میرے پاس نہیں ہوتے تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں یہ تمام باتیں سننا لیکن جواب کبھی نہیں دیتا تھا، میں جانتا تھا کہ اگر میں نے بھی اس قسم کی باتیں کیں تو پھر وانا کو سبجانا مشکل ہو جائے گا۔ میں البتہ اسے سمجھایا کرتا تھا کہ ایسی باتیں مت سوچا کرو کیونکہ مجھے احساس تھا اور اب بھی ہے کہ سعید صاحب کا اس شہر میں، اس معاشرے میں کافی اونچا مرتبہ ہے میں وہ سب خواہش بھی کر سکتا تھا جو وانا چاہتی تھی اور نہ میں نے آج تک اس سے اپنے دل کی بات کی ہے۔ لیکن وہ ذہین ہے سمجھدار ہے۔ ایک دن اس نے کہا۔ بڑی صاحب، آپ کب تک خاموش رہیں گے، میں خاموشی کی آواز بھی سن سکتی ہوں، آپ بھی وہی سب کچھ چاہتے ہیں جو میں چاہتی ہوں۔ میں اس کی یہ بات سن کر دنگ رہ گیا۔ مجھے دل پر جبر کرتے ہوئے یہ کہنا پڑا۔ حماقت کی باتیں نہ کرو۔ اس بات پر وہ ہنسے لگی، بولی اور کچھ نصیحت استاد جی۔ وہ ہنس رہی تھی۔ میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ وہ یہ مسکراہٹ دیکھ کر بول اٹھی۔ دل کی بات چہرے تک آگئی نا۔“

جاوید باتیں کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ غار دم بخود اسے دیکھتا رہا۔ جاوید نے پانی پیا اور چند لمحوں بعد اس نے پھر بات شروع کی۔

”بڑی نے ایک واقعہ یہ بھی بتایا کہ میں اور وانا کتابیں خریدنے دکان پر گئے وہاں اس نے ضد کی کہ آج ہم دونوں ایک ساتھ کوئی فلم دیکھیں گے۔ میں نے لاکھ سمجھایا لیکن وہ نہ مانی۔ سنیما تو ہم دونوں نے ساتھ دیکھ لیا لیکن اس کی اطلاع سعید صاحب کو بھی ہو گئی اور بعد میں ابی کو بھی۔ آپ جان سکتے ہیں مجھے کتنی ڈانٹ کھانی پڑی ابی سے اور وانا کو بھی سزا ملی۔ وہ دو روز تک نہ کالج جاسکی، نہ مجھے پڑھانے کے لیے بلایا گیا۔ بڑی کو اپنی ملازمت پر جانا تھا لہذا میں نے اسے بس یہی تجویز دی کہ آپ سمجھدار ہیں اور جو کر رہے ہیں اور جس طرح وانا صاحبہ کو سمجھا رہے ہیں یہی مناسب ہے۔ بڑی آئندہ ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔“

”بس!“ غار نے بے بسی کے ساتھ خاموشی توڑی۔

”فی الحال تو اسی پر گزارہ کیجیے۔“ جاوید نے مری ہوئی اور تھکی ہوئی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ ”میں اب آرام کروں گا تھک گیا ہوں۔“

”بالکل بالکل۔“ غار کا جواب تھا۔

﴿﴾

دوسرے روز جاوید کی دن میں تقریباً ایک بجے آنکھ کھلی۔ اس نے اٹھ کر برش کیا، منہ دھویا اور بستر پر آکر بیٹھ گیا۔ ناشائستہ میں ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ اس نے سلاکس اٹھا کر کھانا شروع کیا۔ غار بے تابی سے سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے جاوید کو مخاطب کیا۔

”کیسی طبیعت ہے اب؟“

”میں آج تو بے حد فریش محسوس کر رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔“

”ویسے آپ ذرا اور ٹھیک ہو جائیں تو حیدرآباد علاج کے لیے چلے جائیں۔“

”سوچوں گا، جب میں بس میں آٹھ گھنٹے کا سفر کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ غار یہ کہہ کر خاموش ہو گیا لیکن پھر اس سے رہا نہ گیا۔ ”آج آپ بڑی سے نمل سکے۔“

”دیکھ رہے ہیں آپ ابھی تو میری آنکھ کھلی ہے۔ کل کوشش کروں گا۔“ جاوید نے تسلی دی۔

”لیکن کھڑکی کھول کر تو دیکھ سکتے ہیں۔ باہر اب کیا ہو رہا ہے؟“

جاوید نے اٹھ کر کھڑکی کھولی، بولا۔ ”کمرانظر آرہا ہے۔ بڑی تو ابھی واپس آیا نہیں لیکن اس کے والد کے پاس تخت پر کوئی بڑا بارعب سا آدمی بیٹھا ہے۔ میرا خیال ہے سعید صاحب ہیں۔“

”سعید صاحب!“ غار نے تعجب سے کہا۔

جاوید نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بات کرنے سے روکا اور کمرے کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ غار بے تابی سے انتظار کر رہا تھا کہ کمرے میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ پانچ چھ منٹ کی خاموشی کے بعد جاوید نے اپنا چہرہ کمرے کی طرف سے موڑ کر غار کی طرف کیا اور بتایا۔

”سعید صاحب بھی آئے تھے۔ ان کو دیکھ کر ابی نے پوچھا تھا ”خیریت تو ہے میاں، اس وقت آپ نے زحمت کی۔“

”خیریت تو نہیں ہے اقبال چاچا۔ پانی سر سے اونچا

ہو گیا ہے۔ آپ سے رائے لینے اور اپنا فیصلہ سنانے آیا ہوں۔“ سعید میاں نے بڑے سچ لہجے میں گفتگو کی تھی۔

”ہوا کیا، کچھ بتائیے تو سہی۔“ ابی بولے۔

”آج دوپہر کے چھ بجے پر میں کسی کے ساتھ یہاں کے ایک ہوٹل پہنچا تو میں نے کونے کی میز پر بزمی اور وانیہ کو دیکھا، وہ دونوں مجھے دیکھتے ہی کہیں میں چلے گئے۔ یہ بات مجھے بری لگی، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ چھپنا چاہ رہے تھے، آخر کیوں؟ اس کا مطلب اقبال چاہا یہ ہے کہ ان کے ارادے ٹھیک نہیں نکلتے مجھے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

ابی نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں لیکن میاں صاحب، ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں..... اس لیے نہیں کہ میں اپنے بیٹے کی طرف داری کروں گا بلکہ سچ یہ ہے کہ کئی بار میرے سامنے بزمی نے وانیہ بیٹی کو سمجھایا لیکن آپ جانتے ہیں وہ سمجھ دار ہونے کے ساتھ ساتھ ضدی بھی ہے۔“ ابی کی بات سن کے بعد سعید میاں بولے۔

”یقیناً آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن آپ میرے خاندانی ماحول اور اسٹیٹس سے واقف ہیں۔ میں نے مجبوراً فیصلہ کیا ہے کہ وانیہ کو اس کی ماں کے ساتھ اس کی خالہ کے پاس پرسوں شام کو لندن بھیج دوں کچھ دنوں کے لیے۔ دوری ہوگی تو فرق یقیناً پڑے گا۔ کیا خیال ہے آپ کا.....؟“

سعید صاحب نے ابی کی رائے معلوم کی وہ بولے۔

”میرا خیال ہے آپ کا فیصلہ سو فیصد درست ہے اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔“

سعید میاں نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ ”آپ نے میرے دل سے بوجھ اتار دیا، میں چلتا ہوں۔ بزمی آنے والا ہوگا میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا.....“ سعید میاں یہ کہہ کر چلے گئے۔ ابی سر جھکائے اس وقت تخت پر بیٹھے ہیں۔ ”جاوید خاموش ہوا تو غار نے کہا۔

”ویسے یہ ظلم ہے دونوں کے ساتھ۔“

”کیوں ظلم ہے۔ سعید میاں کی جگہ اور ایسی پوزیشن والا کوئی بھی ہوتا تو یہی فیصلہ کرتا۔“ جاوید نے کھڑکی بند کی۔

”میں چائے پینے کینٹین تک جا رہا ہوں۔“ اس نے جاتے ہوئے کہا۔

غار کے بار بار اصرار کے بعد دوسرے دن سہ پہر کو جاوید نے کھڑکی کھولی۔ باہر دیکھتے ہوئے بولا۔

”گھر کے پورچ میں کچھ لوگ آ جا رہے ہیں، کار بھی کھڑی ہے غالباً وانیہ اور اس کی امی لندن کے لیے روانہ ہونے

والی ہیں اور سامنے کمرے ہیں..... ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔ بزمی اور ان کے والد میں کچھ بات ہو رہی ہے۔ جاوید نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ مجھے سننے دو، خاموش رہنا۔“ غار نے وقفے کے بعد اس نے بتایا کہ ابی نے بہت سختی سے بزمی کو پوچھا۔ ”آخر تم لوگ ہوٹل کیوں گئے؟ بزمی نے جواب دیا۔ ابی وانیہ میرے اسکول آگئی اور مجھے لے کر ہوٹل پہنچنے میں نے منع بھی کیا لیکن وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے چائے پیتے ہوئے بتایا کہ اس نے میرا ناول پڑھ لیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ بیس سال سے اتنا اچھا ناول اب تک نہیں لکھا گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی امی نے ناول کے چھپوانے کے سارے اخراجات اپنے ذمے لے لیے ہیں۔“

وانیہ کا خیال تھا کہ یہ ناول چھپنے کے بعد نہ صرف پاکستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بے حد پسند کیا جائے گا۔ اتنی دیر میں سعید صاحب کئی لوگوں کے ساتھ آگئے۔

ابی کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔ ”بیٹے میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ برابر والوں کے درمیان کے رابطے بڑھنے کے امکانات ہوتے ہیں لیکن زمین آسمان کا فرق ہو تو اچھا نتیجہ کبھی نہیں نکلتا۔ یہی ہونا اب وانیہ ابھی تھوڑی دیر میں لندن چلی جائے گی۔ تمہیں علم ہے نا۔“ بزمی نے گردن ہلائی۔ ”مجھ سے سعید میاں نے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا ہے اور مناسب بھی یہی ہے، تم دونوں کچھ دن دور رہو گے تو فرق یقیناً پڑے گا۔“ بزمی خاموش تھا۔ ابی نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے سہارا دے کر انہیں کھڑا کیا۔

”میں کوشی کی طرف جا رہا ہوں، وانیہ بیٹی کو رخصت کرنے۔ تم وہاں نہ آ جانا..... خدا کے لیے۔“ وہ لنگڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

”تو گویا وانیہ لندن جا رہی ہے۔“ غار نے جاوید کی باتیں سننے کے بعد کہا۔

”ہاں بالکل..... میں دیکھ رہا ہوں دو برقعہ پہنے خواتین سیڑھیوں سے اتر رہی ہیں یقیناً وانیہ کی امی اور اس کی پھوپھی ہوں گی۔“

”اور وانیہ نظر نہیں آ رہی ہے؟“ غار نے جاننا چاہا۔

”نہ وہ کہیں ہے نہ سعید میاں نظر آ رہے ہیں۔ ہاں بزمی کے والد پورچ تک پہنچنے والے ہیں۔“

”اور کمرے میں بزمی اکیلا ہے؟“

”ہاں وہ اپنے ابی کے تخت پر گردن جھکائے بیٹھا ہے۔“ جاوید نے کہا۔

”کیا ہوا؟“ غار نے بے تابی سے پوچھا۔

”وانیہ بھاگتی ہوئی اور روتی ہوئی کمرے میں آئی ہے اور..... اور..... بزمی بھی کھڑا ہو گیا ہے اور شاید بزمی بھی رو رہا ہے۔ وہ کچھ کہہ رہا ہے۔ سننے دو۔“ پھر کافی دیر خاموشی رہی۔ غار بے تابی سے بزمی اور وانیہ کی باتیں سننے کا منتظر تھا۔ جاوید نے بولنا شروع کیا۔

”آج پہلی بار گفتگو بزمی نے شروع کی۔“ وانیہ تم مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو؟“

”کیا کروں بزمی صاحب۔ حالات نے مجبور کر دیا لیکن آپ گھبرائیے گا نہیں۔ دل چھوٹا نہ کیجیے گا میں چار پانچ ہفتے بعد آ جاؤں گی۔“ وانیہ نے روتے ہوئے بزمی کو تسلی دی، پھر بولی۔

”میں آپ کا ناول وہیں لندن میں چھپواؤں گی اور پھر آپ کو شہرت بھی ملے گی اور دولت بھی۔“ اور تب پھر بزمی نے وہ بات کی جس کا یقین اب بھی نہیں آ رہا۔

”کیا کہا اس نے.....؟“ غار جلد سے جلد جاننا چاہ رہا تھا۔

اس نے کہا ”وانیہ اب تک میں نے تمہارے جذبات کا جواب نہیں دیا، آج میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ اقرار کرتا ہوں۔ وانیہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا مجھے نہ دولت چاہیے نہ شہرت۔ مجھے صرف اپنی وانیہ چاہیے..... وانیہ..... جاؤ وانیہ۔ خدا حافظ! میں تمہارا انتظار کروں گا۔ ہم دونوں ایک دن ایک دوسرے کو پالیں گے، مجھے یقین ہے۔“ وانیہ روتی رہی نہ جاؤ۔ آنسو پونچھ لو اور اس یقین کے ساتھ جاؤ کہ ہم جلدی ملیں گے۔ ہنسی ہوئی جاؤ وانیہ تاکہ میرے وجود کے اندر تمہارا انتظار کرنے کی قوت قائم رہے۔“

وانیہ نے اپنے آنسو پونچھے اور بڑی حیرت اور خوشی کے ساتھ بزمی کو دیکھا۔ ”کاش یہ باتیں میں پہلے سن لیتی، کاش آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو پہلے آ جاتے تو میں چٹان بن گئی ہوتی۔“ اور پھر ایک ملازمہ بھاگی ہوئی آئی..... ”چلیے سرکار بے حد خفا ہو رہے ہیں۔ جلدی چلیے۔“ اور وانیہ خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ بڑا عجیب منظر تھا غار صاحب!

”ہاں..... یقیناً..... سوچتا ہوں دونوں کس دل سے جدا ہوئے ہوں گے۔“

جاوید پھر بولنے لگا۔ ”میں اب دیکھ رہا ہوں وانیہ بھی کار میں بیٹھ گئی اور سعید میاں بھی، پاس ہی ملازمین کھڑے ہیں۔ ابی بھی جھک کر کچھ وانیہ سے کہہ رہے ہیں..... اور..... اور.....“

فوری سزا

سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”ظلم اور زیادتی اور سچ قطع رحمی دو جرم ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی سزا کے ساتھ دنیا ہی میں ان کی فوری سزا بھی دے دیتا ہے۔ ان جرموں کے علاوہ اور کوئی جرم ایسا نہیں کہ جس کی سزا کا اللہ تعالیٰ اس طرح اہتمام کرتا ہو۔“ صحیح بخاری سے اقتباس

مرسلہ: محمد قیصر شہزاد، داجل، ضلع راجن

”اور کیا.....؟“ غار نے پوچھا۔

”اور بزمی بھی کمرے سے نکل کر لان کے وسط میں آ گیا ہے۔ کار چلی تو بزمی نے ہاتھ ہلایا۔ اور کار سے وانیہ کا ہاتھ بھی فضا میں بلند تھا۔ کار چلی گئی۔ پورچ میں کھڑے ہوئے تمام لوگ افسردہ سے کھڑے ہیں۔ وانیہ سب کی چہیتی تھی نا۔“

جاوید نے کھڑکی بند کی..... اور بیڈ پر لیٹتے ہوئے بولا۔ ”یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے بھی تکلیف ہوئی۔ سچ بات تو یہی ہے۔“

تین دن اور گزر گئے۔ آج صبح جاوید جب کمرے میں باہر سے آیا تو اس کے چہرے پر ٹھکن تھی، بے چینی سی تھی۔ وہ آتے ہی بیڈ پر لیٹ گیا۔ غار نے جھٹ پوچھ لیا۔

”ٹھکنے لگے تھے شاید؟“

”ہاں.....“ جاوید پھر خاموش ہو گیا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ غار نے معلوم کیا۔

”ہاں ٹھیک ہی ہے۔ کچھ الجھن سی ہو رہی ہے۔“

کچھ دیر ٹھہر کر پھر بولا۔ ”میں نے کھنٹی بجا دی ہے۔ نرس آ کر کوئی دوا دیدے گی.....“ کچھ وقفے کے بعد غار سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں، بہت ہی تھوڑی دیر کے لیے بزمی سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔“

”اچھا، کیا حال ہے اس کا؟“ غار کی جستجو بڑھ گئی۔

جاوید نے بہت آہستہ آواز میں بتایا۔ ”ٹھیک ہے بے حد خوش بھی ہے، اسے یقین ہے کہ وانیہ بہت جلد واپس

آئے گی۔“

Scanned By PAKISTANISTAN

آئے گی۔ وہ بے حد مطمئن تھا..... لیکن اس نے بتایا کہ سعید میاں نے اس کا تبادلہ کسی گاؤں میں کروا دیا ہے۔
”یہ تو برا کیا۔“ ثار نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

جاوید نے جواب دیا۔ ”وہ بہت خوش تھا، دو چار روز میں وہ جا کر چارج لے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خود اس ماحول سے کچھ دنوں کے لیے دور جانا چاہ رہا تھا۔“
”پھر.....“

”پھر وہ چلا گیا اپنی ملازمت پر۔“ نرس آپچی تھی اس نے جاوید کو ایک گولی کھلائی اور کہا۔ ”آرام کیجیے، اب بات نہ کیجیے گا۔“

شام کو جاوید کی حالت پھر بگڑ گئی اس حد تک کہ آکسیجن ماسک لگانا پڑا۔ ای سی جی اور ایکس رے ٹیمٹ ہوئے، کئی ڈاکٹر آگئے۔ دوائیں اور انجکشن دیے جانے لگے۔

ایک ڈاکٹر نے دوسرے ڈاکٹر سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”ہو سکتا ہے آج یا کل تک اسے ایک ایک اور ہو جائے۔ یوں اب تو حالت ٹھیک لگ رہی ہے۔“

نوبت رات تک جاوید نے آنکھیں کھولیں، نرس نے آکر اسے بٹھایا۔ اس نے کھانا کھایا پھر تھوڑی دیر میں نرس نے آکر دوائیں دیں۔ جاوید نرس سے مخاطب ہوا۔
”یہ گھنٹی شاید خراب ہو گئی ہے۔“

”آپ نے بجائی تھی؟“ نرس نے بھی کوشش کی۔
”ہاں گھنٹی تو خراب ہو گئی ہے اب صبح ہی ٹھیک ہوگی۔ کیوں بلایا تھا آپ نے؟“

”اس لیے کہ آپ نیند کی دوا دے دیں، میں سونا چاہتا ہوں۔“

نرس بولی۔ ”میں نے دوا دے دی ہے آپ کو جلد ہی نیند آ جائے گی، گھبرا ئیے نہیں اس وقت آپ بالکل ٹھیک ہیں۔“ نرس کمرے سے نکلنے سے پہلے ثار کے پاس گئی۔

”دیکھیے ہو سکتا ہے رات میں پھر انہیں کوئی تکلیف ہو جائے۔ آپ اپنی گھنٹی بجا کر کسی کو بلا لیجیے گا اگر ضرورت پڑے۔“ یہ کہہ کر نرس چلی گئی، جاوید نے آنکھیں بند کر لیں۔
ثار نے بھی تھوڑی دیر بعد نیند کی گولی کھائی..... لیکن

پھر اس کی آنکھ تھوڑی دیر بعد کھل گئی، عجیب سی آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے جاوید کی طرف دیکھا، وہ سینے پر ہاتھ رکھے زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ آہستہ سے بولا۔ ”سینے کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ کسی کو بلا لیجیے.....“ یہ کہہ کر وہ پھر کراہنے لگا اس کی سانس زیادہ

پھولنے لگی تھی۔ ثار نے گھبراہٹ میں گھنٹی تلاش کی لیکن اس لمحے اس کے ذہن میں ڈاکٹر کی ایک بات گونجی جو اس سے ایک ہفتے پہلے جاوید سے کی تھی۔ ”دیکھیے آپ ٹھیک ہوتے ہی کسی شہر میں جا کر انجیوگرافی کروالیں۔ اب ایک ہوا تو سب حد مشکل ہوگا علاج کرنا اس شہر میں۔“

ثار کو گھنٹی مل گئی لیکن اس کے وجود کے اندر سے شیطان نے نکل کر اس کے ذہن اور دل کو مفلوج کر دیا۔ پھر اسی نے ثار کے کان میں سرگوشی کی۔

”کل صبح یہ سامنے والا بستر خالی ہو سکتا ہے، تمہارا بیڈ پھر وہاں ہوگا۔ کھڑکی کھلے گی، سبز گھاس، پھول، باہر دوڑتی ہوئی زندگی نظر آئے گی۔“ سرگوشی جاری تھی۔ ”تم کانوں میں روئی ٹھونس لو اور نیند کی ایک گولی اور کھالو..... کھالو.....“

ثار نے یہ سب کچھ جلدی جلدی کیا۔ اس کے ہاتھ گھنٹی پر سے ہٹ گئے، اس نے آنکھیں بند کر کے ان پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ اسے ڈر تھا کہ وہ کچھ دیکھ نہ لے، کچھ سن نہ لے۔

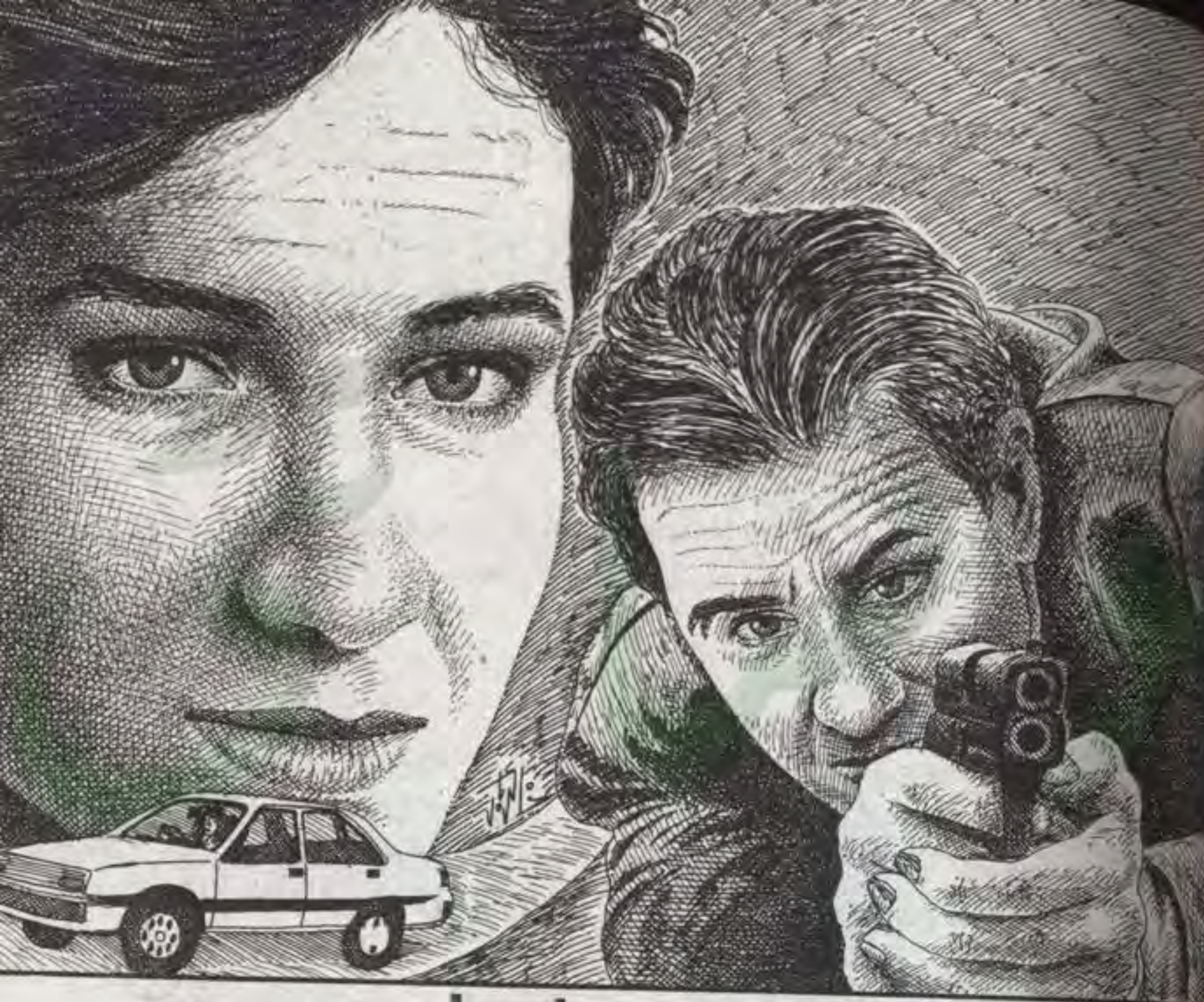
۴۴۴

دوسرے دن ثار دوپہر تک سوتا رہا۔ اس کی آنکھ کھلی تو گھبرا کر بیٹھ گیا لیکن نیند کی دو گولیوں کا اثر اب بھی تھا۔ دماغ میں سننا ہٹ ہو رہی تھی..... اس نے رات کی باتیں یاد کرنے کی کوشش کی لیکن سارے واقعات ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اس نے جاوید کے بیڈ کی طرف دیکھا وہاں جاوید کا بیڈ بھی نہیں تھا، اسے رات کی باتیں یاد آنی شروع ہو گئیں لیکن ایک دم وہ چونک پڑا۔ ایک بے حد فیشن ایبل جوان لڑکی غالباً اپنی ملازمہ کے ساتھ کمرے میں آگئی تھی اور اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے بے تاب لہجے میں ثار سے پوچھا۔

”بڑی صاحب کہاں ہیں؟“

”بڑی۔“ ثار کا اپنا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اسے یاد آیا، اس نے لڑکھرائی ہوئی زبان میں کہا۔ ”بڑی صاحب کا تو تبادلہ کسی گاؤں میں ہو گیا ہے۔“

لڑکی بڑی بے تابی کے ساتھ تیز لہجے میں بولی۔ ”ہاں مجھے معلوم ہے کل شام میں لندن سے کراچی آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ بڑی صاحب کا تبادلہ فرید کوٹ ہو گیا۔ وہاں آج صبح پہنچی تو معلوم ہوا کہ ان کی درخواست آئی ہے، انہیں دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ اس اسپتال میں داخل ہیں۔ یہاں آئی تو کوریڈور میں ایک لڑکے نے اس کمرے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ان کا بیڈ یہاں ہے۔ مگر یہاں تو صرف آپ



دولت کا رشتہ

ابوالمنصور

رشتوں کا بیوپار کرنے والے اکثر بھول جاتے ہیں کہ خود ان کا بھی کسی سے کوئی رشتہ ہے... مگر سفاکی اور عجلت ان باریکیوں کو سمجھنے کی مہلت ہی نہیں دیتی... اور جب انہیں یہ بات سمجھ آتی ہے تو اس وقت زندگی عجلت کا شکار موت کی جانب محو سفر ہوتی ہے۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے اکے کے مصداق بالخصوص جرائم کی دنیا ان ہی اذیتوں کا شکار مگر... پھر بھی روادار ہے۔

گھر کے بھیدی کی سفاکانہ

کارروائیوں کا وخرائش ماجرا

نو جوان کچھ خوفزدہ سا تھا۔

”بیٹھو۔“ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”معاف کرنا مجھے دیر ہوگئی۔“ اس نے کہا۔ ”راستے میں ٹریفک جام ہوگئی تھی۔“

”بیٹھو۔“ میں نے دوبارہ کہا۔

وہ بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ پائی جاتی تھی۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور پہلے ہی کش کے بعد کھانسنے لگا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس سوال پر وہ قدرے متعجب ہوا۔ اس کی پیشانی پر

ظلمتیں ابھر آئیں اور وہ اپنی عمر سے کچھ بڑا نظر آنے لگا۔

بڑے محسن ہی کو نہیں ایک نہایت شریف اچھے، ایک بڑے ادیب، ایک عظیم ناول نگار کو مار ڈالا۔ مجھ ایسے لاپٹی انسان کو جس نے پہلے اپنے بڑے بھائی کا خون کیا اور کل رات ایک بڑے انسان کو قتل کر دیا..... مجھے جینے کا کوئی حق نہیں۔“ نرس دو وارڈ بوائز کے ساتھ داخل ہوئی۔

”آپ جاگ گئے۔ ارے یہ آپ رو کیوں رہے ہیں۔“ وہ سمجھی شاید میں غم زدہ ہوں لہذا بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”مہر کیجیے نرس صاحب، اللہ کی یہی مرضی تھی..... مہر کیجیے۔“ ”نہیں سسر۔ میں اس لیے رو رہا ہوں کہ میں نے جاوید صاحب کو مار دیا.....“

”اتنے دن جاوید صاحب کے ساتھ رہتے رہتے یقیناً ان کی موت کا آپ نے بہت اثر لیا ہے۔ مہر کیجیے۔“ نرس نے یہ کہتے ہوئے وارڈ بوائز کی مدد کے ساتھ نرس کا بیڈ کھڑکی کے سامنے کر دیا۔ نرس کو کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ نرس نے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔

”لیجیے میں نے کھڑکی بھی کھول دی، آپ بار بار یہی کہتے تھے نا۔“ نرس نے آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اسے سکتے سا ہو گیا۔ ”یہ دیوار..... اور وہ کمر، حسین منظر، وہ گھر.....“ وہ بڑبڑاتا رہا۔ نرس نے اس کی بات سننے بغیر کہا۔ ”جی یہ سامنے بہت اونچی اور لمبی سی دیوار لڑکوں کے ہاسٹل کی پچھلی دیوار ہے.....“ نرس پچھنی پچھنی آنکھوں سے دیوار دیکھ رہا تھا۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

اسپتال سے باہر سڑک پر ایمبولینس میں جاوید کی میت رکھی جا چکی تھی۔ اس ایمبولینس کے آگے کھڑی ہوئی مرسدیز کار کی طرف وائیا کوئی نرس اور ان کی ملازمہ سہارا دے کر لے جا رہی تھیں۔ وائیا کے جسم کی ساری طاقت ختم ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری تھی اور وہ کہتی جا رہی تھی..... ”میں تو دنیا کی ساری خوشیاں آپ کے دامن میں ڈالنے آئی تھی۔ آپ نے دامن ہی سمیٹ لیا۔ کچھ کھنے اور انتظار کر لیتے۔ ہم دونوں کو وہ سب مل جاتا جس کی ہمیں ضرورت تھی، جس کی ہم دونوں کو خواہش تھی.....“ تھوڑی دیر بعد کار اور ایمبولینس روانہ ہوئیں سڑک پر کھڑا ہوا مجمع، نرس، اسپتال کے ڈاکٹر اور دوسرا عملہ سب دم بخود اس قافلے کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ایمبولینس کی تیز رفتار سے پیدا ہونے والی گرد نے فضا کو اور بھی سوگوار بنا دیا تھا۔

”ہیں، بڑی صاحب کہاں ہیں؟“

”اس کمرے میں بڑی صاحب نہیں تھے جاوید صاحب تھے۔“ نرس نے بڑی حیرت سے جواب دیا۔

”جی جی وہی، ان کا پورا نام جاوید بڑی ہے.....“

”جاوید بڑی!“ نرس نے زیر لب اپنے آپ سے کہا اور پھر لڑکی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”آپ وائیا ہیں؟“

”جی میں وائیا ہوں، آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“

”مجھے جاوید نے ہر بات بتائی تھی..... سارے واقعات۔“

”میں نے ان سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا۔ میں ان کے لیے کئی خوش خبریاں لے کر آئی ہوں۔ ان کا یہ ناول (کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) روزانہ دیوار لندن میں شائع ہوا ہے، پورے یورپ اور پاکستان میں اس ناول نے دھوم مچا دی ہے، بے حد پسند کیا گیا ہے یہ ناول اور دھڑا دھڑا بک رہا ہے۔ ایک لاکھ ڈالرز کا چیک میں لندن سے لے کر آئی ہوں اور سب سے اچھی خبر بڑی صاحب کے لیے یہ ہوگی کہ ڈیڈی نے میری ہر بات مان لی ہے میں اور بڑی صاحب بہت جلد ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔“ وائیا نے خوش ہوتے ہوئے جلدی جلدی سب کچھ بتا دیا۔ ”میں نے آپ کو اس لیے سب بتایا ہے کہ مجھے احساس ہو رہا ہے یہاں ساتھ رہتے رہتے آپ دونوں دوست بن گئے ہیں۔“

نرس کی آنکھوں میں آنسو آگئے..... اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ وائیا نے پھر پوچھا۔ ”آپ آخر بتا کیوں نہیں رہے ہیں کہ بڑی صاحب کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟“

نرس نے پوری طاقت جمع کرتے ہوئے بڑی مشکل سے بھرائی ہوئی آواز میں ایک جملہ ادا کیا۔ ”جاوید صاحب کی رات میں طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ شاید انہیں ایکسمرے وغیرہ کے لیے لے گئے ہیں۔ آپ نرسوں کے کمرے میں جا کر پوچھ لیجیے۔“ وائیا تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی نرس پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ وہ آہستہ آہستہ خود اپنے آپ سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ ”گویا جاوید صاحب اپنی آپ بیتی، اپنی زندگی کی داستان اس لیے سناتے رہے کہ میں بہلا رہوں، مجھے تنہائی کا احساس نہ ہو۔ تاکہ مجھ میں تکلیفیں برداشت کرنے کا حوصلہ قائم رہے۔ انہوں نے مجھے زندگی کی خوشیاں دیں اور میں نے اس صلے میں خود ان کی زندگی چھین لی۔ میں نے اپنے سب سے

”میرا نام فلائیڈ ٹالمن ہے۔ کیا مسٹر گرینڈ نے تم سے میرے بارے میں بات نہیں کی؟“ اس نے مدھم آواز میں کہا اور کچھ اس انداز میں دائیں بائیں دیکھنے لگا گویا کسی غلط جگہ پر آ گیا ہو۔

لیکن وہ بالکل ٹھیک جگہ پر آیا تھا۔ مجھے اس کا نام معلوم تھا، لیکن میں تسلی کرنا چاہتا تھا۔ میرے کام میں اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ کیونکہ ان باتوں کو نظر انداز کرنے سے کسی وقت بھی مصیبت نازل ہو سکتی تھی۔ ”تمہارے بال بہت لمبے ہیں فلائیڈ۔“ میں نے سرسری طور پر کہا۔

چند لمحوں تک وہ مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”لمبے بالوں میں کیا برائی ہے؟“ اب اس کی گھبراہٹ دور ہو چکی تھی اور چہرے پر اطمینان جھلک رہا تھا۔

”کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کو بہت زیادہ نمایاں کر دیتی ہیں۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”مثلاً تمہارے بال۔! لمبے بالوں کی وجہ سے تم بالکل منفرد نظر آتے ہو۔ تمہارا حلیہ ایسا ہوتا چاہیے جو تمہیں عوام کے ہجوم میں گم کر دے اور کوئی شخص ایک دفعہ دیکھنے کے بعد یاد نہ رکھ سکے۔“

”بات تو ٹھیک ہے۔“ اس نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں آج ہی بال کٹوا لوں گا۔“ ”آج شام سے پہلے پہلے۔“ ”ٹھیک ہے۔“

اس نے ٹیسٹ پاس کر لیا تھا اور کام کے لیے بالکل موزوں تھا۔ تاہم اس جیسے نوجوان کے ساتھ کام کرنے میں ایک قباحت تھی۔ یہ لوگ بہت جلد طیش میں آ جاتے ہیں اور بعض اوقات خواجواہ ہی موت کے منہ میں کود پڑتے ہیں اور نہ صرف بلکہ اپنے ساتھی کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔

”کھڑے ہو جاؤ۔“ میں نے کہا۔ وہ مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ”کیا میں نے امتحان پاس کر لیا ہے؟“

”ہاں۔ کیا تمہارا قد چھ فٹ اور وزن ایک سو اسی پونڈ ہے۔“

”قد ٹھیک ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن وزن تمہارے اندازے سے دس پونڈ کم ہے۔ میں ہمیشہ اپنے وزن کو مناسب سطح پر رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

دفعۃً میں نے میز پر پڑی ہوئی ایش ٹرے اس کی طرف اچھال دی۔ وہ ایک طرف جھک کر بچ گیا۔ تاہم اس نے ایش ٹرے کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔

”بہت خوب بہت خوب۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

وہ دوبارہ اسی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”اس حرکت کا کیا مطلب تھا؟“

”یہ بھی ایک قسم کا ٹیسٹ تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر تم نے مناسب چستی کا مظاہرہ نہیں کیا جو ایک خطرناک بات ہے۔ تمہیں فوراً اپنی اس کمزوری کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ ورنہ تم اپنے ساتھ مجھے بھی مصیبت میں پھنسا سکتے ہو۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم اس کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس حرکت سے بہت متاثر ہوا ہے۔ میں نے بریکل تذکرہ پوچھا۔

”گرینڈ نے میرے بارے میں تمہیں کیا بتایا تھا؟“ ”صرف اتنا بتایا تھا کہ تمہیں ایک ساتھی..... ایک بارنٹر کی ضرورت ہے۔ میں نے اس سے مزید استفسار کیا تھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

”یہ بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔“ گرینڈ میرا پرانا دوست اور نہایت قابل اعتماد شخص تھا۔ ”اس سے پہلے تم کیا کرتے رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”صرف دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ مارے تھے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”پہلی مرتبہ گرینڈ کے ساتھ مل کر ایک شراب خانہ لوٹا تھا اور دوسری مرتبہ فریڈ الیگزینڈر کے ساتھ ایک بینک پر ڈاک ڈالا تھا۔“

میں نے سر ہلاتے ہوئے الیگزینڈر کے بارے میں سوچا، وہ اچھا آدمی تھا اور وہ دوسری مرتبہ میرے ساتھ بھی کام کر چکا تھا۔

”بینک کون سا تھا؟“

اس نے میرے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ ”نام نہیں بتا سکتا۔ یہ بات میرے اصول کے خلاف ہے۔“

یہ بات مجھے پسند آئی۔ گویا وہ نہایت محتاط آدمی تھا اور بلا ضرورت اپنا نام نہیں کھولتا تھا۔

”بہت خوب۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے جو شخص میرے پاس تھا وہ سات سال سے میرے ساتھ کام کر رہا تھا۔ بہت ہوشیار آدمی تھا۔ بہترین ڈرائیور اور بہترین نشانہ باز تھا۔ اس کا نشانہ بھی خطا نہیں گیا تھا۔ لیکن اس میں صرف ایک ہی کمزوری تھی اور یہی کمزوری اس کی موت کا باعث بن گئی۔“

اسے کہیں سے ایک خوبصورت لڑکی مل گئی جسے اس نے گھر میں رکھ لیا۔ اس لڑکی نے دوسرے کے سامنے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ بہت زیادہ باتیں..... نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے ایک روز ہمیشہ کے لیے اس کی زبان بند کر دی۔ اس نے اپنی محبوبہ کا بدلہ لینے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور خود بھی قتل ہو گیا۔“

فلائیڈ کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ ”کیا وہ پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا تھا؟“

”نہیں۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”میرے ہاتھوں سے۔“ فلائیڈ کی افسردگی ایک دم دور ہو گئی۔

”ایک بات واضح کر دوں کہ چوری میرا پیشہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”چوری کے ذریعے میں خاصی بڑی رقم کما لیتا ہوں۔ میرے پاس کالج کی ڈگری بھی ہے۔ بلکہ دو ڈگریاں ہیں۔ لیکن ان کی میرے لیے کوئی حیثیت نہیں۔ مجھے دولت کی ضرورت ہے اور میں پوری شان و شوکت سے رہتا ہوں۔ لیکن میں ایک بات کبھی نہیں بھولتا اور تم بھی یہ بات نہ بھولنا۔ میں نے خود کو کبھی سوسائٹی کا فرد خیال نہیں کیا۔ میں ایک رد کیا ہوا آدمی ہوں۔ سوسائٹی میرا کوئی حصہ نہیں..... میرے پاس جو کچھ ہے میں اس پر مطمئن ہوں۔“

اس نے ہلکی سی چیخ ماری اور کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں تمہارا مدعا سمجھ گیا۔“

”اچھا.....!“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”ابھی نہیں میرے دوست یہ بات سمجھنے کے لیے بہت عرصہ چاہیے۔ یہ بات وقت کے ساتھ ساتھ تمہاری سمجھ میں آئے گی۔ بشرطیکہ تم زندہ رہے۔ ایک مجرم یا تو جیل سے باہر رہتا ہے یا اندر۔ ایک پیشہ ور مجرم ہمیشہ باہر رہتا ہے اور اس مقصد کی خاطر اسے زبردست جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔“

”اور اس کے کچھ اصول بھی ہوں گے؟“ فلائیڈ نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگوں سے دور رہو۔ کوئی ایسی عادت نہ ڈالو جس سے تمہارا پتا چلانا آسان ہو جائے۔ کبھی ایک ہی ہوٹل میں کھانا نہ کھاؤ۔ ایک ہی سینما ہال میں فلم دیکھنے نہ جاؤ۔ ایک ہی قسم کی چیز استعمال نہ کرو۔ بات بہت سیدھی سی ہے لیکن بہت اہم ہے۔ عادت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو مخصوص ٹھکانہ ہوتی لیکن پیچھے اپنا نشان چھوڑ جاتی ہے۔“

”پولیس میں ہوشیار آدمی بھی ہوتے ہیں اور کند ذہن بھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کچھ لوگ صحیح معنوں میں جینس ہوتے ہیں۔ پولیس کے پاس کتے بھی ہوتے ہیں جو مجرم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں۔ پولیس کے مقابلے میں کبھی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی کسی شخص کو قتل نہیں کرو۔ خصوصاً پولیس کے آدمی پر گولی نہیں چلاؤ۔ ورنہ وہ قبر تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔“

کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نوجوان ذہین اور پُر اعتماد تھا۔

”گرینڈ نے بتایا تھا کہ تم نے ایک منصوبہ بنایا ہے؟“ ”ہاں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”شہر کا ایک وکیل سوٹ کیس میں پچیس ہزار ڈالرز لے کر جانے والا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کب یہ پیسے لے کر نکلے گا اور کس راستے سے جائے گا۔“

”وہ یہ پیسے لے کر کہاں جائے گا؟“ ”ایک مضامینی فارم میں اس کے ایک موکل نے کسی فوری ضرورت کے تحت منگوائے ہیں۔ وہ خاصا امیر آدمی ہے لیکن دیانتدار نہیں۔“

”کیا یہیں نوٹوں کی تفصیل معلوم ہے؟“ ”نہیں۔ لیکن مجھے سوٹ کیس کا سائز معلوم ہے۔ تقریباً اتنا بڑا ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سوٹ کیس کا سائز بتایا۔

”خاصا پُرکشش معاملہ ہے۔“ میں نے تبصرہ کیا۔ ”کیا ہم ایک دوسرے کے پارٹنر بن چکے ہیں؟“ اس نے پوچھا لیکن میں نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

”اور یہ وکیل کب پیسے لے کر جانے والا ہے؟“ ”کل صبح دس اور گیارہ بجے کے درمیان۔“

میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی؟“ ”میں یہ بات بتانا مناسب نہیں سمجھتا۔“ اس نے جواب دیا۔

”وقت آنے پر تمہیں خود پتا چل جائے گا؟“ ”او۔ کے۔“ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے پاس تمہارا فون نمبر ہے۔ میں چھ بجے تمہیں فون کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“

”اس وقت تم کہاں جا رہے ہو؟“

”بال کٹوانے۔“ اس نے دانت نکالتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے گرینڈ کوفون کیا۔
”لڑکا تو ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔“ رابطہ ملنے کے بعد میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے چل جائے گا۔“
”ضرور چل جائے گا۔“ گرینڈ نے اپنی بھاری آواز میں کہا۔

”مجھے یقین تھا کہ یہ لڑکا کارآمد ثابت ہوگا۔ نہایت ٹھنڈے مزاج کا اور تجربہ کار شخص ہے۔“
”اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ملاقات پر تفصیلی باتیں ہوں گی۔“

”ضرور لیکن ذرا محتاط قدم اٹھانا۔“
پھر گرینڈ نے مجھے فلائیڈ کا ایڈریس بتانے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

فلائیڈ کی رہائش شہر کے خستہ و خراب علاقے میں تھی۔ چند ایک کے سوا تمام عمارتیں پرانی اور کہنہ سال تھیں۔ اس علاقے کی گلیاں گندی اور جا بجا اکھڑی پڑی تھیں۔ بعض جگہوں پر گٹر کا پانی جمع تھا۔ جہاں خود روگھاس اگ آئی تھی..... تھوڑی سی تلاش کے بعد میں مطلوبہ عمارت تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ایک مختصر سی دو منزلہ عمارت تھی جس میں چھوٹے چھوٹے فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ درمیان میں بنے ہوئے صحن میں جہاں کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی فولڈنگ کرسی پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر تھوڑا سا مسکرایا اور پوچھا۔
”کیوں جناب۔ کیا آپ فلائیڈ ٹالمن کا فلیٹ بتا سکیں گے؟“

بوڑھے نے آنکھیں سیکڑ کر میری طرف دیکھا اور جواب دیا۔
”پچھلی طرف فلیٹ بی میں رہتا ہے لیکن اس وقت وہ گھر میں نہیں ہوگا۔“

”کیا آپ فلائیڈ کو جانتے ہیں؟“
”بہت اچھی طرح۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔
”بڑا اچھا لڑکا ہے۔ بالکل خاموش طبیعت۔ آج کل کے رنگین مزاج چھوڑوں سے بالکل مختلف ہے۔ بلکہ وہ ان سے دوستی کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس کے فلیٹ سے بھی موسیقی کا شور سنائی نہیں دیا۔“
”ہاں، فلائیڈ نہایت سنجیدہ نوجوان ہے۔“ میں نے

کہا۔ ”بہت بہت شکریہ۔“

پھر میں عمارت کے پچھلے حصے میں فلیٹ بی کے سامنے پہنچ گیا۔ سامنے کا دروازہ مقفل تھا۔ داہنی طرف ایک کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ البتہ اس پر جالی لگی تھی، میں نے کھڑکی پر لگا دوڑائی۔ کوئی شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے جالی کے کنارے پر لگی ہوئی پتی اکھیر کر راستہ بنایا اور اندر داخل ہو گیا۔ فلیٹ بالکل مختصر تھا۔ ایک ڈرائنگ روم، ایک چھوٹی سی خواب گاہ اور باورچی خانہ۔ ڈرائنگ روم میں سستے قسم کا فرنیچر نظر آ رہا تھا۔ ایک بات مجھے بہت پسند آئی۔ فلیٹ کے اندر کوئی کتاب۔ آنوگراف بک یا گراموفون ریکارڈ وغیرہ موجود نہیں تھے۔ کوئی فوٹو البم بھی نہیں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کوئی نہیں رہتا۔

مجھے میکس سٹائیڈر کی گرفتاری کا حال خوب یاد تھا۔ وہ بڑا ماہر چور تھا لیکن کتابوں کی وجہ سے پکڑا گیا۔ وہ جرائم کی کتابیں پڑھتا تھا اور ہمیشہ ایک ہی اسٹور سے کتابیں خریدتا تھا۔ ہر کتاب کے اوپر اسٹور کی مہر لگی ہوئی تھی۔

ایک مرتبہ ایک جرم کے سلسلے میں پولیس نے اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی جہاں سے انہیں ایک ہی اسٹور سے خریدی ہوئی تقریباً تیس کتابیں ملیں۔ گو میکس روپوش ہو گیا تھا۔ لیکن پولیس نے اس کی تلاش میں زیادہ تنگ و دو نہیں کی۔ صرف مذکورہ اسٹور میں دو آدمی بٹھا دیے۔ چند روز کے بعد میکس وہاں کتاب خریدنے آیا اور پکڑا گیا۔

یہ بات خوش کن تھی کہ فلائیڈ اس قسم کی کسی عادت میں مبتلا نہیں تھا، نہ ہی اس کا کوئی گہرا دوست تھا۔ اس کے سامان میں کوئی خط، تصویر یا ذاتی قسم کی کوئی اشیاء نہیں تھیں۔ اس کی الماری میں تھوڑے سے کپڑے تھے لیکن کسی پر لاندڑی کا نشان یا لیبل وغیرہ نہیں تھا۔ گویا وہ نہایت محتاط شخص تھا۔ میز کی چکی دراز میں مجھے ریو اور پڑا ہوا ملا۔ وہ بالکل نیا تھا۔ اس پر کسی قسم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ میں نے ریو اور لور واپس رکھ دیا اور کھڑکی کے راستے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

”وہ..... وہ سامنے والی کار ہے۔“ فلائیڈ نے ایک کیڈلاک کار کی طرف اشارہ کیا اور جلدی سے اپنی کار اسٹارٹ کر کے ٹریفک کے جھوم میں اس کے پیچھے لگ گیا..... میں خاموشی سے کار کی طرف دیکھنے لگا۔ صبح خوشگوار تھی۔ چاروں طرف چمکدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف لوگوں کا خاصا جھوم تھا۔ جن میں بے شمار سیاح بھی تھے۔ فلائیڈ بڑا اچھا ڈرائیور تھا

اور بڑی مہمگی سے کیڈلاک کا تعاقب کر رہا تھا۔ اب اس کے بال کٹے ہوئے تھے اور میرے بالوں سے بھی چھوٹے تھے۔ وہ خاصا فاصلہ چھوڑ کر تعاقب کر رہا تھا۔ ہمارے درمیان چار پانچ گاڑیاں تھیں۔

کچھ دور جانے کے بعد کیڈلاک شہر سے باہر جانے والی شاہراہ پر مڑ گئی۔ ہماری کار خاصی پیچھے رہ گئی تھی۔ لیکن چونکہ فلائیڈ کو کیڈلاک کی منزل معلوم تھی اس لیے وہ زیادہ متفکر نہیں تھا۔ شہر سے چند میل دور پہنچ کر سڑک بالکل ویران ہو گئی۔ فلائیڈ نے ایک دم رفتار بڑھا دی اور فی الفور اپنی کار کیڈلاک کے بالکل برابر لے آیا۔ اس اثنا میں اس نے اپنے چہرے پر نقاب بھی چڑھا لیا تھا۔ چند قدم آگے ایک تنگ موڑ تھا جہاں پہنچ کر فلائیڈ نے اپنی کار کو ٹیڑھا کر کے کھڑا کر دیا۔

کیڈلاک والے شخص نے جلدی سے بریک لگا کر کار روک دی اور منکا ہلاتا ہوا بولا۔ ”کیا تماشا کر رہے ہو۔ گاڑی ہٹاؤ آگے سے۔“

پھر جیسے ہی اس کی نظر ہمارے چہروں پر پڑے ہوئے نقابوں پر پڑی وہ چپ ہو گیا۔ میں جلدی سے دروازہ کھول کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ میرے ایک ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا۔

”جلدی سے پیسے میرے حوالے کر دو۔“ میں نے پستول ہلاتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر ایک دم دہشت طاری ہو گئی۔ ”کک..... کیا؟“

”جلدی۔ وہ سوٹ کیس مجھے دے دو۔“

اس اثنا میں فلائیڈ دوسری کھڑکی کے سامنے پہنچ چکا تھا اور وکیل کے سر کا نشانہ باندھے کھڑا تھا۔ وکیل نے قدرے تامل کے بعد سوٹ کیس میرے حوالے کیا..... سوٹ کیس لیے ہی میں اٹنے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا۔ پھر جیسے ہی میں نے کار کا دروازہ کھولا میرے کانوں میں فائر کی آواز آئی کیے بعد چار فائر کیے گئے تھے۔

وکیل مر چکا تھا اور فلائیڈ بھاگتا ہوا کار کی طرف آ رہا تھا۔

”اوپا گل کے بچے! تم نے کیا کیا؟“
اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جلدی سے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور تیزی سے کار آگے بڑھا دی۔ دس منٹ کے بعد ہم دونوں ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گئے۔ فلائیڈ نہایت اطمینان کے ساتھ کرسی

پر بیٹھ گیا۔ میں نے ماتھے پر ہل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے اسے قتل کیوں کیا؟“

”وہ مجھے جانتا تھا۔“

”کیا..... کون تھا وہ؟“

”میرا باپ۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”جس نے میری کبھی پروا نہیں کی۔ وہ شراب کے نشے میں مجھے مارتا تھا اور ہوش میں مجھے بالکل نظر انداز کر دیتا تھا۔“

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔“
”نہیں، یہ بہت اچھا ہوا۔ اب کوئی شخص ایسا نہیں رہا ہو مجھے جانتا ہو۔“

مجھے یہ جواب بہت پسند آیا۔ اس کا انداز فکر بالکل میرے جیسا تھا اور یہ نوجوان حوصلہ مند بھی تھا۔ چند دنوں کے بعد یقیناً یہ پچاس فیصدی سے زیادہ حصہ طلب کرے گا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک پائی جاتی تھی۔ میں نے اپنا داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال کر سائیکلسر لگے ہوئے پستول کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔

”مبارک ہو۔ آج سے تم میرے نئے پارٹنر ہو۔“
میں نے کہا۔ ”لیکن افسوس ہے کہ یہ پارٹنر شپ بہت مختصر ثابت ہو رہی ہے۔“

یہ سن کر اس کے ماتھے پر ایک دم شکنیں ابھر آئیں اور ہاتھ جیب کی طرف بڑھا لیکن میں نے فی الفور اپنا پستول باہر نکال لیا اور کہا۔ ”نہیں میرے دوست! تم اتنی چستی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے اپنے ہاتھ اوپر کر لو۔ ابھی ایک آدمی اور ہے جو تمہیں جانتا ہے۔“

”لیکن..... ہم تو ایک دوسرے کے پارٹنر بن چکے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تم نے اپنے باپ کو قتل کر کے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میری حیثیت تمہارے باپ سے زیادہ تو نہیں ہو سکتی۔ تمہارے پستول کا رخ میری طرف بھی ہو سکتا ہے۔“

اچانک اس نے جھپٹنے کی کوشش کی لیکن میں نے ٹرائیگر دبا دیا اور وہ فرش پر لڑھک گیا۔ پھر میں گرینڈ کانبر ڈائل کرنے لگا۔ یقیناً وہ منصوبے کی کامیابی اور اپنے حصے کے لیے متفکر ہوگا۔ میں نے اپنے پارٹنر کے ساتھ بھی دھوکا نہیں کیا۔

محفل شہر و سخن



✽ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی..... خوشاب
تکلف کی حدوں کو خود گرا کر اب وہ کہتا ہے
تیرا بے باک سا لہجہ مجھے اچھا نہیں لگتا
✽ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر..... نئی منڈی سکھیکی
مدتوں ذہن میں گونجوں گا سوالوں کی طرح
تجھ کو یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح
ڈوب جائے گا جس روز یہ خورشید انا
مجھ کو دہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح
✽ نوید انجم بٹ گہیاں..... گجرات
ان رنجکوں کا آخر کب تک عذاب دیکھیں
ہم کو بھی نیند آئے ہم بھی خواب دیکھیں



✽ عرفان سیال بچی..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
محبت کیا ہے تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں
ترا مجبور کر دینا، میرا مجبور ہو جانا
✽ عمران حیدر بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ہم ہی وفا شکن تھے چلو ہم ہی بے وفا
تم تو وفا شناس تھے تم کیوں بدل گئے
✽ بابر عباس، مسز بابر عباس..... کھاریاں
جو مجھے کہہ رہے ہیں دیوانہ
وہ تعصب کی رو پہ بہتے ہیں
میں وہی ہوں جو میں سمجھتا ہوں
وہ نہیں ہوں جو لوگ کہتے ہیں
✽ رائے نعیم احمد بھٹی..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
جور کے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رو یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا
✽ تفسیر عباس بابر..... اوکاڑہ
خوابوں کے کچھ سفینے ساحل تلک نہ پہنچے
بے سمت کارواں تھے منزل تلک نہ پہنچے
اک ہم کہ عمر بھر کی چاہت کے باوجود
تیرے در تلک تو پہنچے تیرے دل تلک نہ پہنچے

✽ محمد اشفاق سیال..... شورکوٹ شی
دقت رخصت وہ چپ رہے عابد
اور آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل!
✽ احمد حسن عرضی..... قبولہ شریف
مجھ سے کہتی ہے سدا تیرے پاس رہوں گی فراز
دیکھ کتنا پیار کرتی ہے مجھ سے میری اداسی
✽ حسنین عباس بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
میرے احساس سے تیری خوشبو نہیں جاتی
لاکھ چاہا دل سے مگر تیری آرزو نہیں جاتی
کیسے سمجھاؤں دل کو مسافتوں کی بات
کہ تجھ سے ملنے کی جستجو نہیں جاتی
✽ مظہر علی خان..... مسلم ٹاؤن، کوٹری
بے سمت نہ چل اتنا، منزل ہی بدل جائے
آوارگی کر اتنی، دل جس سے بہل جائے
✽ بلقیس خان..... واہ کینٹ
ہم اپنی وضع کے بندے ہیں ہم اپنی طرز کے انساں ہیں
جو زیست مرا سرمایا تھی وہ زیست بھی تجھ پہ واری ہے
✽ عدنان ساحل..... سرگودھا
تم کیا جانو پیار کے کھیل میں جان کے ہم کیوں ہار گئے
جانتے تھے ہم جیت ملے گی دل کی ساری ماتوں میں
✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانیوال
جس جس کو ملی خبر اسی نے گلہ کیا
کیوں کی تم نے محبت؟ تم تو سمجھدار تھے
✽ محمد طلحہ..... کوئٹہ
اک میری جان ہے کہ لبوں تک آپہنچی
اک تو ہے کہ ابھی ”اگر مگر“ پہ ہے
✽ امداد علی..... نوشہرہ
میں نہ کہتا تھا! وقت ظالم ہے
دیکھ لو! خواب ہو گئے تم بھی
✽ زرین اعجاز..... نواب شاہ
دل روز سجاتا ہوں میں دہن کی طرح
غم روز چلے آتے ہیں بارات کی مانند
✽ حسنین عباس، کمیل عباس..... کھاریاں
یونہی مشق تصورات سہی، شوق کو آزما کے دیکھوں گا
ہند کرلوں گا اپنی آنکھوں کو، تجھ کو تجھ سے چھپا کے دیکھوں گا

✽ سیدگی الدین اشفاق..... فتح پور، لہ
یار کا ملنا ہے ارمانوں کی عید
شیع کا جلنا ہے پروانوں کی عید
✽ کنول زریں..... گلبرگ، لاہور
ورق ورق پر تیری عبادت تیرا فسانہ تیری حکایت
کتاب ہستی جہاں سے کھولی تری محبت کا باب نکلا
✽ عون عباس بابر..... اوکاڑہ
خشک آنکھوں سے جل نکال لیتے ہیں
گفتگو کے لیے ایک دو پل نکال لیتے ہیں
میرا مسئلہ محبت ہے اور تیرا مسئلہ انا
بھی ملتے ہیں کوئی حل نکال لیتے ہیں
✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
خداوند! یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں
تمنا جو نہ پوری ہو وہ کیوں پلتی ہے سینے میں

✽ محمد شہیرا سامہ سیال..... سکھر
ذرا سی دیر میں دل میں اترنے والے لوگ
ذرا سی دیر میں دل سے اتر بھی جاتے ہیں
✽ صوبیہ تفسیر..... اوکاڑہ
ثابت ہوا کہ تجھ کو محبت نہیں رہی
لیکن ہمیں بھی کوئی شکایت نہیں رہی
✽ ڈاکٹر وسیم خالد گہیاں..... گجرات
ہر اک روپ میرے واسطے ہے بے معنی
کہ بس چکا ہے میری آنکھ میں جمال اس کا
✽ شوکت علی..... گلبرگ، لاہور
غضب ہے جستجو دل کا یہ انجام ہو جائے
منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے
ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کہ اس کا محبت نام ہو جائے
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
شاید اسے عزیز تھیں آنکھیں میری بہت
وہ میرے نام اپنی بصارت بھی کر گیا
✽ لائبر علی..... کراچی
پھر پلٹ آئی ہیں ساون کی سہانی راتیں
پھر تیری یاد میں جلنے کے زمانے آئے
✽ میر و شاہ..... لاہور
یہ تیری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا چھائی ہے
یہ تیرے عارض ہیں کہ پھولوں کو ہنسی آئی ہے
✽ امتیاز علی..... سرگودھا
میں نے اس واسطے دروازہ کھلا رکھا ہے
کوئی آئے گا مجھے عید مبارک کہنے
✽ دین محمد..... گوادر
مجھے ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا
مگر وہ آنکھیں تمہاری کہاں سے لائے گا
✽ محمد یونس چوہدری..... سلطان پور، لاہور
دعا ہے آپ دیکھیں زندگی میں بے شمار عیدیں
خوشی سے رقص کرنی، مسکرائی، پر بہار عیدیں
✽ ارشد عباس..... حافظ آباد
وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ تو پھول کا ہے وہ کدھر جائے گا

✽ پرویز شاہ..... آزاد کشمیر
لوگ عجب ہیں رسوائی کے قصے بھی دہراتے ہیں
دل کا سکون بھی ڈھونڈتے ہیں وہ جذبول کی کشمیر میں

✽ بشیر احمد بھٹی..... بہاولپور
مسلسل خامشی یوں بھی تو ہم کو مار ڈالے گی
تو پھر اب خوف کیسا ہے چلو انکار کرتے ہیں
✽ احمد خان توحیدی..... پاکستان اسٹیل، کراچی
اپنی رہ مسدود کر دے گا یہی بڑھتا ہجوم
یہ نہ سوچا ہر کسی کو راستہ دیتے ہوئے

✽ عاقب اقبال جہاں..... سالم
جسے یہ ضد تھی محبت میں فاصلہ نہ رہے
وہ کہہ رہا ہے کہ ایفاء صلہ ضروری ہے
✽ محمد لطیف ساحل..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
لہو میں رنگ کی صورت بسا ہے تیرا خیال
میں کس طرح تیری یادوں سے فاصلہ رکھوں
✽ سجاد علی ترگویی..... عیسیٰ خیل، میانوالی
اک بار جو روٹھے تو مناتم نہ سکو گے
ہم جیسے لوگوں کو خفا سوچ کے کرنا
✽ سبحان احمد..... انک

سوچتا ہوں وہ مری اپنی ہی تصویر نہ ہو
میں جسے ڈھونڈ رہا ہوں تری تصویروں میں
✽ ملک آصف نعیم..... بھلوال
لگا کے آگ شہر کو یہ بادشاہ نے کہا
اٹھا ہے دل میں تماشے کا آج شوق بہت
✽ راجا افتخار علی افتی..... چوآسدن شاہ
یاد رہے گا یہ دور حیات بھی ہم کو
کہ ترستے تھے زندگی میں زندگی کے لیے
✽ پلوشہ..... پشاور

آج پھر رات نے چھیڑا ہے غم یار کا قصہ
کچھ کرو یارو مجھے آج بھی نیند نہیں آئے گی

✽ اختر شاہ عارف..... ڈھوک جمعہ، جہلم
محبت کی تمنا ہے تو پھر وہ وصف پیدا کر
جہاں سے عشق چلتا ہے وہاں تک نام پیدا کر

✽ محمد طاہر..... لاہور
دل سوز غم بھر سے جو گھبرائے بہت ہے
ساون کا مجھے ابر بھی ترسائے بہت ہے
✽ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی
اک عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں
وہ کون شخص تھا جسے دیکھا تھا خواب میں

✽ رئیس احمد..... چارسدہ
مجھ سے ہر چند بہت پیار کیا جاتا ہے
پر مرے ہونے سے انکار کیا جاتا ہے
✽ مہناز قریشی..... گوجرانوالہ
ناؤ بن جائے کوئی شور مچاتی ہوئی لہر
کیا خبر ڈوبنے والوں کو کنارہ مل جائے
✽ محمد بشارت..... بنگلہ دودرہ

دل کے زخم کا رنگ تو شاید آنکھوں میں بھر آئے
روح کے زخموں کی گہرائی کیسے دکھائیں تمہیں
✽ حکیم سید محمد رضا شاہ..... میانوالی
لکھا جائے گا یہ تاریخ کی پیشانی پر
عہد تاریک کی کس کس نے حمایت کی تھی
✽ عرفان احمد عاجز..... آڑہ چوا

بھولوں اسے میں مجھ میں بھلا یہ سکت کہاں
بھولا تو وہ ہے جو مجھے ویران کر گیا
✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
نشانی اس کی اپنے پاس جو بھی تھی مٹا ڈالی
مگر اک یاد ہے اس کی جواب تک پاس رکھتے ہیں
✽ شہلا قریشی..... ماڈل ٹاؤن، لاہور

مانا اب اظہار محبت کرنا بھی آسان نہیں ہے
لیکن اے فرقت کے مارے آخر یہ خاموشی کب تک

وہ اختتام مئی کی ایک گرم رات تھی۔ دوپہر تک جس کی
کی کیفیت رہی تھی اور پھر گرم ہوا میں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔
تک دیلوٹ نے ہوا کے رخ اور فائر بریگیڈ کی عمارت کے
فاصلے کو مد نظر رکھ کر خشک گھاس میں آگ لگائی تھی، شعلے
نیزی سے اس کی جانب لپک رہے تھے۔ وہ ایک جست لگا
کر لوٹے پھوٹے فارم ہاؤس سے پیچھے ہٹ گیا۔ لکڑی سے
بنے ہوئے اس شیڈ کی دیواروں نے آگ پکڑ لی تھی۔ تک کو
یقین تھا کہ شعلے کئی سمتوں میں دور سے دیکھے جاسکتے ہیں۔
وہ بھی دریا کنارے دور دور تک کسی قسم کی کوئی عمارت بنی

محض ذاتی مفاد کی خاطر گھروں کو آگ لگانے والوں کا قصہ

چوری کرنا ایک تو ویسے ہی بری بات... اور اس پر اسے کاروبار بھی
بنا لیا جائے تو "کرلیے اور نیم" کی بھرپور عکاسی محسوس
ہوتی ہے۔ بہر حال... یہ تو تک دیلوٹ کی ہی ادا ہے کہ
وہ اتنے خطرناک کام کو پیشہ بنائے ہوئے ہے... اور
یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "چوری چاہے لاکھ کی
ہو یا خاک کی" چوری ہی کہلاتی ہے... اس
بار تک دیلوٹ نے پلمٹ کی چوری کی تو کچھ
عجیب سا لگا مگر... حالات کی سنسنی
خیزی نے واقعات کو طول دیا اور بالآخر اس
چوری نے ایک دلچسپ کہانی کا روپ دھار
لیا۔ یہ اور بات کہ اس بار وہ قانون کے شکنجے
میں بری طرح پھنس گیا... اور ایسے میں اسے اپنے
شیطانہ دماغ کو استعمال کرنے کا بھرپور موقع ملا۔
ادھر شکنجہ کھلا ادھر وہ باہر۔ بس یہی اس کا کمال تھا۔

پلمٹ کی چوری بابر نعیم



محفل شعرو سخن

نام: _____
پتا: _____



والا انجن شور مچاتا ہوا باہر نکلا۔ آگ زیادہ بڑھی نہیں تھی۔ لیکن آگ بجھانے والے عملے کو آدھے گھنٹے تک مصروف رکھنے کے لیے کافی تھی۔ تک کو اتنا ہی وقت درکار تھا کہ وہ خوش اسلوبی سے انجام دے سکے۔

تک ویلوٹ عمارت کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو ایک چھوٹی سی سفید بلی نے اس کا استقبال کیا۔ وہ دائیں طرف کی دیوار کی جانب بڑھ گیا جس پر کئی ایک آہنی لاکرز لگے ہوئے تھے۔ پہلے تین لاکرز خالی تھے لیکن چوتھے لاکر میں وہ چیز موجود تھی جس کی تلاش میں تک یہاں آیا تھا۔ اس نے لاکر میں رکھے ہوئے سیاہ ہیلٹ کا جائزہ لیا جو عموماً آگ بجھانے والے عملے کے افراد کرتے ہوئے بلبے سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے پہنتے تھے۔ آگ بجھانے والے اس مرکز کا نمبر چوبیس تھا اور اس لحاظ سے ہیلٹ پر چوبیس نمبر اور قصبہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ تک کو معلوم تھا کہ ڈیوٹی پر موجود فائر مین عموماً انجن پر اپنے ہیلٹ چھوڑ دیا کرتے تھے تاکہ عجلت میں وہ انہیں بھول نہ جائیں۔

اس کے باوجود تک نے جو اکیلے کا فیصلہ محض اس امید پر کر لیا تھا کہ ممکن ہے دن کی شفٹ کے فائر مین اپنے ہیلٹ لاکر میں بند کر گئے ہوں۔ تک نے ہیلٹ بغل میں دبایا اور دوڑتا ہوا عمارت سے باہر نکل آیا۔ اب اس کا رخ کھیل کے میدان کی طرف تھا جس کے اختتام پر درختوں کے جھنڈ میں اس کی کار کھڑی تھی۔ اس نے بائیں طرف فارم ہاؤس کی طرف دیکھا جہاں فائر مین فلیش کی تیز روشنی میں آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ تک نے ہیلٹ پچھلی سیٹ پر اچھال دیا اور کار اسٹارٹ کر کے کچی سڑک پر آگیا۔ پانچ منٹ بعد اس کی کار بڑی شاہراہ پر شہر کی جانب رواں دواں تھی۔ پندرہ منٹ بعد وہ شہر کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اب اس کا رخ ایک سپر مارکیٹ کے پارکنگ پلاٹ کی طرف تھا جہاں اس نے اپنے گاڑی سے ملاقات کا وقت طے کیا کر رکھا تھا۔ وہ مقررہ وقت سے دس منٹ قبل ہی وہاں پہنچ گیا لیکن رافٹر اپنی کار لیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تک نے دروازہ کھولا اس کے برابر بیٹھ گیا۔

”یہ لیجیے جناب! آپ کا ہیلٹ۔“ اس نے کہا۔

”اور یہ رہے تمہارے بیس ہزار ڈالر۔ ایک گھنٹے کے کام کا یہ مناسب ترین معاوضہ ہے۔“

سام رافٹر پستہ قد تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمکدار تھیں۔ اس کے چہرے پر ٹوٹی ہوئی ناک بہت بری لگ رہی تھی۔ رافٹر کا کام اپنے ہم پیشہ لوگوں کی خامیوں سے

فائدہ اٹھانا تھا۔ وہ عموماً چھوٹے بد معاشوں پر ہاتھ مارتا تھا جو بڑا ہاتھ مارنے کے بعد مال کو سنبھال نہیں پاتے تھے۔ اسے برسوں سے جانتا تھا مگر اس نے آج تک اسے کسی کار کے لیے نہیں کہا تھا۔ اب سے دو گھنٹے قبل اس نے فون کر کے تک سے کہا تھا کہ اسے فوری طور پر کسی بھی فائر مین کا ہیلٹ درکار ہے۔ تک اس سے فیس وغیرہ طے کر کے نزدیک ترین فائر بریگیڈ چوبیس نمبر کی جانب چل دیا تھا تاکہ وہاں سے کسی شخص کا ہیلٹ چرا سکے۔ اس نے فارم ہاؤس میں آگ لگا کر عملے کو عمارت سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا اور یوں اس نے آسانی سے بیس ہزار ڈالر حاصل کر لیے تھے۔

”تمہیں آج رات ہیلٹ کی ضرورت کیسے پڑی گی؟“ تک نے بڑے نوٹ لگتے ہوئے رافٹر سے پوچھا۔

”آج رات ہم ایک لمبا ہاتھ مار رہے ہیں۔ اگر تم بھی شامل ہونا چاہو تو مجھے بڑی مسرت ہوگی۔“

”نہیں شکر!“

رافٹر نے پچھلی نشست پر کبل کے نیچے ہیلٹ رکھ دیا اور بولا۔

”آج رات شمالی بروئکس کے علاقے میں چند بد معاش ہیروئن آپس میں تقسیم کرنے والے ہیں۔ دس لاکھ ڈالر کی یہ کھپ آج صبح ہی جیٹی سے یہاں پہنچی ہے۔ منشیات کی اسمگلنگ کے لیے ان دنوں جو روٹ استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سے تم واقف ہی ہو گے۔ اسمگلر سیاحوں کے بھیس میں ہیروئن لے کر بحری جہازوں پر چڑھ جاتے ہیں اور پورٹوریکو کے قریب ہیروئن کے پیکٹ سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔

پورٹوریکو اور مین لینڈ کے درمیان کوئی کسٹم نہیں ہے لہذا ان کے پاس کوئی چیز برآمد نہیں ہوتی۔ ہیروئن کا خاص انداز میں بنا ہوا پیکٹ تیرتا ہوا نیویارک پہنچ جاتا ہے اور پھر اسے فروخت کے لیے مختلف لوگوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ گاڑیوں تک پہنچتے پہنچتے ہیروئن کی اس کھپ کی مالیت پچاس لاکھ سے تجاوز کر جائے گی۔“

رافٹر ہیروئن کا ذکر اس انداز میں کر رہا تھا جیسے اس کی اہمیت سگریٹ یا اشیائے خورد و نوش سے زیادہ نہ ہو۔

”اور تم وہ مال اڑانے کی فکر میں ہو؟“ تک نے پوچھا۔

”ظاہر ہے! شمالی بروئکس کے اس فلیٹ کی بیس لڑکیاں ہیروئن کی اس کھپ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر رہی ہوں گی۔ لڑکیوں نے غسل کے مختصر سوٹ پہن رکھے ہوں گے تاکہ وہ ہیروئن کی تھوڑی سی مقدار بھی کپڑوں میں چھپا کر نہ لے

جاسکیں۔ انتظام کچھ اس قسم کا کیا گیا ہے کہ کوئی شخص بھی اس فلیٹ میں داخل نہیں ہو سکتا۔“

”اب میری سمجھ میں آرہا ہے کہ تمہیں فائر مین کے ہیلٹ کی ضرورت کیوں پڑی گی۔“

”تم ٹھیک سمجھے۔ ہم اس عمارت کے ہال میں کوڑے کے ڈرم میں تھوڑی سی آگ لگا دیں گے۔ آگ اس انداز میں لگائی جائے گی کہ زیادہ سے زیادہ دھواں پیدا ہو۔

عمارت میں مقیم لوگ خوفزدہ ہو جائیں گے پھر میکس یا کوئی اور شخص فائر مین کا لباس پہن کر اوپر جائے گا اور فلیٹ کے دروازے کو بری طرح دھڑھڑانے لگے گا۔ وہ سوراخ میں سے میکس کو فائر مین کے لباس میں ملبوس دیکھیں گے اور ممکن ہے گھبرا کر دروازہ کھول دیں۔ ممکن ہے وہ ایک آدھ منٹ

ہیروئن کو تھیلوں میں بھرنے میں لگا دیں لیکن دروازہ وہ بہر حال کھول دیں گے۔ یہی وہ سنہری موقع ہوگا جب میں

ادھر میرے ساتھی دندناتے ہوئے فلیٹ میں داخل ہو جائیں گے۔ شمالی بروئکس کے علاقے میں اکثر و بیشتر آگ لگنے کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں لہذا عمارت سے دھواں نکلتے دیکھ کر کسی کو شبہ بھی نہیں ہوگا۔“

”ہیلٹ تو تم خود بھی چوری کر سکتے تھے اس طرح تم اپنے ڈالر بھی بچا سکتے تھے۔“ تک نے شانے اچکا کر کہا۔

”لغت سے میکس پر!“ رافٹر نے کہا۔ ”اسے فائر مین کے لباس کا انتظام کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور آخری لمحوں میں وہ ہیلٹ حاصل نہیں کر سکا۔ بڑی برساتی، مخصوص قسم کے جوتے اور کپڑاڑی کا انتظام اس نے بہ آسانی کر لیا تھا۔ مگر

ہیلٹ سب سے ضروری چیز ہے اور وہی وہ حاصل نہیں کر سکا۔ ہم لوگوں کا وقت پر وہاں پہنچنا انتہائی ضروری تھا۔ لہذا ہمیں تم ایسے تیز اور قابل اعتماد آدمی کی ضرورت تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہیروئن کی وہ کھپ اتنی بڑی ہے کہ ہم تمہاری فیس کے تحمل ہو سکتے ہیں۔“

”اچھا ابھی! تم عیش کرو۔ میں چلتا ہوں۔“ تک نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”کیا تم واقعی میں ہمارا ساتھ نہیں دو گے؟ میں چاہتا ہوں کہ تم پستول لے کر ہمارے ساتھ موجود رہو اور اس کام کا معاوضہ میں تمہیں پانچ ہزار ڈالر دوں گا۔ تمہاری موجودگی سے مجھے اطمینان رہے گا۔“

”شکر یہ رافٹر! میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا کیونکہ یہ میری لائن نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ ویسے بھی

تم بہت بڑے اور مشہور چور ہو۔“

تک ویلوٹ نے کار اسٹارٹ کی اور لاٹک آئی لینڈ میں واقع اپنے گھر کی طرف چل دیا جو اس نے گلوپیا کے ساتھ مل کر خریدا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو گلوپیا ٹیلی ویژن پر ایک جاسوسی فلم دیکھ رہی تھی وہ چھوٹے ہی بولی۔

”ایک ارجنٹ کام آگیا تھا۔“ تک نے کہا۔ وہ اب کوئی بات اس سے چھپاتا نہیں تھا۔ اس کی تمام سرگرمیوں کا علم گلوپیا کو ہو چکا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے تم کوئی چیز چرانے گئے تھے۔“

تک نے نوٹوں سے بھرا ہوا لفافہ گلوپیا کی گود میں پھینک دیا اور بولا۔ ”یہ رہے بیس ہزار ڈالر۔ کل اس رقم کو مختلف بینکوں میں جمع کر دینا۔“

”تم نے کیا چیز چرائی تھی؟ کیا تمہارا کام آسانی سے ہو گیا تھا؟“

تک ویلوٹ نے کار اسٹارٹ کی اور لاٹک آئی لینڈ میں واقع اپنے گھر کی طرف چل دیا جو اس نے گلوپیا کے ساتھ مل کر خریدا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو گلوپیا ٹیلی ویژن پر ایک جاسوسی فلم دیکھ رہی تھی وہ چھوٹے ہی بولی۔

”ایک ارجنٹ کام آگیا تھا۔“ تک نے کہا۔ وہ اب کوئی بات اس سے چھپاتا نہیں تھا۔ اس کی تمام سرگرمیوں کا علم گلوپیا کو ہو چکا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے تم کوئی چیز چرانے گئے تھے۔“

تک نے نوٹوں سے بھرا ہوا لفافہ گلوپیا کی گود میں پھینک دیا اور بولا۔ ”یہ رہے بیس ہزار ڈالر۔ کل اس رقم کو مختلف بینکوں میں جمع کر دینا۔“

”تم نے کیا چیز چرائی تھی؟ کیا تمہارا کام آسانی سے ہو گیا تھا؟“

”مجھے کسی فائر مین کا ہیلٹ چوری کرنا تھا اور میں نے وہ کام بڑی آسانی سے ایک گھنٹے میں انجام دے دیا۔“

تک اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا کیونکہ وہ اس بارے میں مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان لڑکیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ایک چھوٹے فلیٹ میں ہیروئن کے حصے بخرے کرنے میں مصروف تھیں وہ سام رافٹر کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس مال پر جھپٹنے والا تھا۔ تک نے اپنا کیریئر معمولی چیزوں کو چرا کر بنایا تھا کیونکہ اس کا ہمیشہ سے یہ نقطہ نظر رہا تھا کہ اس طرح کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچتا۔ اس نے آج تک کوئی قیمتی چیز نہیں چرائی تھی لیکن آج رات ہیلٹ چرانے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ اس مرتبہ کسی نہ کسی کو ضرور نقصان پہنچے گا کچھ لوگوں کے زخمی ہونے کا بھی احتمال تھا اور وہ اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے صبح اٹھ کر سب سے پہلے اخبارات کا جائزہ لیا۔ ان میں ہیروئن کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ نہ ہیروئن تقسیم کرنے والی لڑکیوں کا کوئی ذکر تھا۔ اس نے مختلف اخبارات کے دوپہر۔۔۔ کے ایڈیشن خریدے مگر ان میں بھی اس قسم کی کوئی خبر نہیں چھپی تھی۔ بالآخر شام کو ٹیلی ویژن پر اس نے وہ منحوس خبر تفصیل سے سن لی۔ شمالی بروئکس کے علاقے میں فائرنگ کی واردات ہوئی تھی جس میں ایک انیس سالہ خوبصورت لڑکی ہلاک ہو گئی تھی اور کئی دوسری لڑکیاں شدید زخمی ہوئی تھیں۔ پولیس اس واردات کے اسباب پر تفتیش کر رہی تھی۔ خبر میں ہیروئن کا کوئی ذکر نہیں تھا جس سے تک نے اندازہ لگایا کہ

سام راقرا اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہوگا۔

☆☆☆

نک ویلوٹ نے فائر بریگیڈ سے ہیلٹ جمعرات کی رات کو چرایا تھا۔ اس سے اگلے پیر کو وہ اپنی چھوٹی سی خوبصورت کشتی کو سمندر میں اتار رہا تھا کہ ایک دبلا پتلا گنجائش شخص اس کی طرف بڑھا۔ اس نے شیریں لہجے میں کہا۔

”تمہارا نام نک ویلوٹ ہے؟“

نک نے سر سے پیر تک اس کا بہ غور جائزہ لیا۔ پھر خشک لہجے میں بولا۔ ”ہاں میرا نام نک ویلوٹ ہے۔“

”میں سارجنٹ لارنس ہوں۔ میں تم سے چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔“

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ سوالات کس سلسلے میں پوچھے جائیں گے؟“

”سوالات کا تعلق ایک قتل سے ہے، اس واردات کی تفتیش میرے سرور کی گئی ہے۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم فوری طور پر کسی وکیل کا انتظام کر لو تا کہ اس کی موجودگی میں سوالات کیے جاسکیں ویسے اگر تم خاموش رہنا چاہو تو ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے کیونکہ یہ تمہارا قانونی حق ہے۔ سوالات کے دوران جوابات بھی کہو گے اسے تمہارے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا سارجنٹ! کیا مجھے گرفتار کیا جا رہا ہے؟“ نک نے پوچھا۔

”فی الحال تو تم زیر حراست نہیں ہو۔“

نک ویلوٹ کو یہ سب ایک بھیانک خواب معلوم ہو رہا تھا۔ قتل کا نام سنتے ہی اس نے تصور میں انیس سالہ حسین لڑکی کی لاش دیکھ لی تھی جسے بروکس میں گولی مار دی گئی تھی؟ کیا یہ قتل وہی ہے۔ اس نے سارجنٹ کی طرف ابھی ہوئی نظروں سے دیکھا اور جھٹکا کر بولا۔

”میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم کس قتل کی بات کر رہے ہو؟ میں تو کسی ایسے فرد کو نہیں جانتا جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہو۔“

”تم نے فائر مین ونس آر تھر کا نام تو سن رکھا ہوگا؟“

”تم کس آر تھر کا ذکر کر رہے ہو؟ میں اسے نہیں جانتا۔“

”فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا نک! تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔ اس واردات کی تفتیش کے سلسلے میں مجھے شدید مشکلات کا سامنا

کرنا پڑ رہا ہے۔ اور تم اپنے طرز عمل سے معاملے کو مزید پیچیدہ بنا رہے ہو۔“

نک نے گلو ریا کو پولیس اسٹیشن سے ٹیلی فون کر کے اس صورت حال سے مطلع کیا اور کہا کہ وہ اسے حالات سے پوری طرح باخبر رکھے گا پھر وہ سارجنٹ کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا جہاں عموماً مجرموں سے پوچھ گچھ کی جاتی تھی۔ وہاں دو افراد پہلے ہی موجود تھے۔ ایک سیکرٹری دوسرا ایک پولیس افسر تھا۔

”بہتر ہوگا کہ تم شروع سے ہمیں سارا معاملہ بتا دو۔“

نک نے کہا۔ ”بجدا مجھے اس قتل کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“

”اچھی بات ہے۔“ سارجنٹ نے کہا۔ ”جمعہ کی شام بندرگاہ کے قریب ایک گودام میں آگ لگ گئی تھی۔ ممکن ہے تم نے اس کے بارے میں اخبارات میں پڑھا ہو۔“

نک کو وہ خبر یاد آگئی۔ اس نے کہا۔

”آگ بجھاتے ہوئے ایک فائر مین ہلاک ہو گیا تھا۔“

”بالکل۔ میں اسی واردات کا ذکر کر رہا ہوں۔ ہلاک ہونے والے فائر مین کا نام ونس آر تھر تھا اور وہ دھوئیں کے سبب آکسیجن ماسک لگائے ہوئے تھا۔ آکسیجن کی ٹنگی اس کی پشت سے بندھی ہوئی تھی۔ اس قسم کی ٹنگیوں میں اتنی ہوا ہوتی ہے کہ انسان تیس منٹ تک سانس لے سکتا ہے۔ آگ بجھاتے ہوئے چونکہ دباؤ شدید ہوتا ہے لہذا یہ آکسیجن پندرہ منٹ تک کام دے جاتی ہے۔ ٹنگی پر ایک میٹر اور والو بھی نصب ہوتا ہے جس سے یہ جاننے میں آسانی ہوتی ہے کہ ٹنگی میں کتنی ہوا باقی ہے اور وہ کتنی دیر تک کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ آر تھر جلتے ہوئے گودام میں آگ بجھا رہا تھا کہ اس کی ٹنگی کی ہوا ختم ہو گئی۔ اور وہ دم گھٹنے سے ہلاک ہو گیا۔ ٹنگی کا معائنہ کرنے پر ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہوا کی مقدار ظاہر کرنے والے آلے کو ایک جگہ فکس کر دیا گیا تھا۔ گویا ٹنگی میں اتنی ہوا نہیں تھی جتنی کہ میٹر سے ظاہر ہو رہی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ ٹنگی کو جان بوجھ کر خالی کیا گیا تھا اور اس میں اتنی ہوا رہنے دی گئی تھی کہ پانچ منٹ تک سانس لیا جاسکے۔“

”تم کیا کہنے کی کوشش کر رہے ہو سارجنٹ؟ میرے پلے تمہاری ایک بات بھی نہیں پڑی۔“ نک نے کہا۔

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آر تھر کو جان بوجھ کر ہلاک کیا گیا تھا۔“

”اس بات کو درست مان لیا جائے تو پھر بھی اس کا مجھ سے کیا تعلق؟“

”نک نے کہا۔“

”میں نے اس قسم

کوئی شخص فائر بریگیڈ کی عمارت میں داخل ہوا تھا اور اس نے ہوا کی ٹنگی میں گڑبڑ کر دی تھی، ہمیں اس عمارت میں ایک لاکر کے دروازے پر تازہ انگلیوں کے نشانات ملے۔ مجھے افسوس ہے کہ انگلیوں کے وہ نشانات ہماری فائل میں موجود تمہاری انگلیوں کے نشانات سے مل چکے ہیں۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ نک نے کہا۔

”کیا تم اس بات سے انکار کرتے ہو کہ تم گزشتہ چند دنوں میں فائر بریگیڈ کی عمارت میں نہیں گئے تھے؟“

”میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ میں نے آکسیجن ٹنگی کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی تھی۔ ونس آر تھر سے میری کبھی واقفیت نہیں رہی اور اس کی موت سے میرا تعلق نہیں ہے۔“

اب تک سارجنٹ لارنس کا رویہ خوشگوار رہا تھا مگر نک کی اس بات سے اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اب وہ کڑی نظروں سے نک کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے پلٹ کر پولیس افسر اور اسٹینو گرافر سے مخاطب ہو کر کہا۔

”میرا خیال ہے تم لوگ باہر انتظار کرو، میں ان سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

نک کو معلوم تھا کہ سارجنٹ کی یہ حرکت اس پر رعب ڈالنے کی ایک کوشش ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کمرے میں کی جانے والی گفتگو ٹیپ کی جا رہی ہوگی۔ اس نے کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا اور چپ چاپ سارجنٹ کے اگلے قدم کا انتظار کرنے لگا سارجنٹ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

”تم ایک چور ہو نک ویلوٹ۔ ہمارا شعبہ تم پر برسوں سے نگاہ رکھ رہا ہے اور ہم نے تمہارے بارے میں تین اچھی موٹی فائل تیار کر رکھی ہے۔ اب تک تمہیں گرفتار اس لیے کیا نہیں جاسکا کہ تم عموماً دوسرے علاقوں میں وارداتیں کرتے ہو اور یہ کہ جو چیزیں تم چراتے ہو ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی لیکن مجھے افسوس ہے نک ویلوٹ! کہ تم اس مرتبہ بری طرح پھنس چکے ہو۔“

”اگر میں چور ہونے کا اعتراف کر لوں تو سارجنٹ! اس سے میں قاتل تو ثابت نہیں ہوتا۔“

”ہمیں معلوم ہے کہ تمہیں تمہاری خدمات کا بھاری معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص تمہیں کوئی چیز چرانے کے لیے بھاری رقم دے سکتا ہے تو آکسیجن کی ٹنگی خالی کرنے کے لیے بھی تمہاری خدمات معقول رقم دے کر حاصل کی جاسکتی ہیں۔“

”نہیں سارجنٹ!“ نک نے کہا۔ ”میں نے اس قسم

کا کوئی کام نہیں کیا۔ میں اتنی گھٹیا حرکت بڑے سے بڑے معاوضے پر بھی نہیں کروں گا۔“ نک کو بروکس کے فلیٹ میں ہلاک ہونے والی لڑکی کا خیال آ رہا تھا۔ اگر وہ فائر بریگیڈ کی عمارت میں داخل ہونے کا اعتراف کر لیتا اور سارجنٹ کو بتا دیتا کہ وہ کیوں وہاں گیا تھا تو اس کا نام مرنے والی لڑکی سے جوڑا جاسکتا تھا۔ وہ اس لڑکی کے قتل میں ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا۔ نک دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرنے لگا کہ لاکر پر اس کی انگلیوں کے نشانات کس طرح رہ گئے۔ عمارت میں داخل ہوتے وقت اس نے دستانے نہیں پہنے تھے کیونکہ اس طرح وہ لوگوں کی نظروں میں آسکتا تھا۔ اتنے گرم موسم میں دستانے پہننے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن اس نے لاکر کھولتے ہوئے کافی احتیاط سے کام لیا تھا۔ ممکن ہے کہ آخری لاکر کھولتے ہوئے وہ بے پروائی کا مظاہرہ کر گیا ہو۔ یا ضی میں اس نے جو چیزیں چرائی تھیں ان کی کوئی قیمت نہیں تھی اور اسی وجہ سے پولیس نے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ اپنی حماقت سے بری طرح پھنس چکا تھا۔ انگلیوں کے ان نشانات نے اسے ایک ایسے جرم سے وابستہ کر دیا تھا جس سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ وہ نک دیم دم نہ کشیدم کے مصداق بغیر پلکیں جھپکائے سارجنٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اگر تم بے قصور ہو تو تمہیں بتلانا ہوگا کہ تم فائر بریگیڈ کی عمارت میں کیا کر رہے تھے؟ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ انگلیوں کے تمام نشانات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔“

نک نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔

”میں وہاں اپنے ایک گاہک کے کہنے پر گیا تھا لیکن اس کا تعلق آر تھر سے ہرگز نہیں ہے اور نہ میں نے وہ آکسیجن ٹینک دیکھا تھا۔“

”اگر تمہاری بات کو تسلیم کر لیا جائے تو کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ تم وہاں کیا چیز چوری کرنے گئے تھے؟ میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ وہ چیز تم کس کے لیے چرا رہے تھے۔“

نک کو اپنے سر پر کموار لگتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل میں پھنس چکا تھا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے صورت حال پر غور کرنے لگا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں اور بولا۔

”مجھے اڑتالیس گھنٹوں کی مہلت درکار ہے۔ میں اس شخص کو تلاش کروں گا جس نے ونس آر تھر کو قتل کیا ہے۔“

سارجنٹ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی، اس نے کہا۔

”ہم بھی قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

کیا تمہیں اس بات سے اختلاف ہے؟“

”لیکن اس وقت تمہاری نظروں میں میرے علاوہ دوسرا کوئی شخص نہیں ہے۔ تم یہ ثابت کر سکتے ہو کہ میں فائر بریگیڈ کی عمارت میں گیا تھا مگر تمہیں آرتھر کا قتل میرے سر تھو تھوپنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس اس کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ تم یہ بات بھی ثابت نہیں کر سکتے کہ میں نے آکسیجن کی ٹنکی کو چھوا تھا۔ تمہارا کیس خاصا کمزور ہے سارجنٹ!“

سارجنٹ نے چند لمحے تک کی بات پر غور کیا پھر بولا۔
”تم اڑتا لیس گھنٹوں میں کس شخص کو میرے حوالے کرو گے؟ کیا تم اس شخص پر ہاتھ ڈالو گے جس نے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں؟“

”نہیں! کسی شخص نے فائر مین کو ہلاک کرنے کے لیے میری خدمات حاصل نہیں کیں۔“ نک نے جلدی سے کہا۔ ”دیکھو سارجنٹ! مجھے اڑتا لیس گھنٹوں کے لیے رہا کر دو اور میں کچھ نہ کچھ ضرور کر کے دکھاؤں گا۔ یہ ایک خطرہ ہے جسے تمہیں مول لینا پڑے گا۔ تمہارے پاس میری انگلیوں کے نشانات موجود ہیں اور بعد میں بھی فائر بریگیڈ کی عمارت میں داخل ہونے کا الزام مجھ پر عائد کر سکتے ہو۔ اگر میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو میرے خلاف کیس اور بھی مضبوط ہو جائے گا۔ اگر میں مقدمہ سے بچنے کی کوشش کروں گا تو تمہیں میرا جرم ثابت کرنے میں آسانی رہے گی۔“

”کیا خیال ہے تم ہم سے بہتر طور پر گفتیش کر سکتے ہو؟“

”نہیں! نجی طور پر پوچھ گچھ کی جائے تو بعض اوقات اس کے بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ تمہیں یہ خطرہ مول لینا ہوگا سارجنٹ! اس سے تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔“

”ممکن ہے تم اس شخص کو مطلع کرنا چاہتے ہو جس نے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں۔“

”میں یہ کام پہ آسانی جیل سے بھی کر سکتا ہوں۔“

سارجنٹ لارنس نے ایک سرد آہ بھری اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھی بات ہے ویلوٹ! میں تمہیں اڑتا لیس گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں لیکن ہمارا ایک آدمی مسلسل تمہارا تعاقب کرتا رہے گا۔ تمہیں اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“

نک ویلوٹ پولیس ہیڈ کوارٹر سے رخصت ہو گیا۔ عمارت سے باہر آ کر اس نے کئی گہرے گہرے سانس لیے،

بہت دیر بعد اس نے سکون کا سانس لیا تھا ورنہ سار لارنس نے تو اس کی جان نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اس کی کیفیت قتل کے اس مجرم کی سی ہو رہی تھی جس کو سزا موت دی گئی ہو۔ نک کو معلوم تھا کہ یہ سکون عارضی ہے۔ یا بہ دیر اسے مصیبت کا سامنا کرنا ہی تھا اور اس کی سمجھ آ رہا تھا کہ وہ آرتھر کے قاتل کا پتا کیسے چلائے؟ وہ موضوع پر سکون سے سوچنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

نک ویلوٹ نے اپنی پہلی فرصت میں فائر بریگیڈ چوبیس کے چیف فنلے سے ملاقات کی۔ اس کی عمر چالیس سال تھی اور وہ گزشتہ پندرہ برس سے آگ بجھا رہا تھا۔ ویلوٹ نے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

”آپ کے اسٹیشن کا جو فائر مین آگ بجھاتے ہوئے ہلاک ہو گیا تھا، میں اس کے بارے میں ایک فیچر تیار کر رہا ہوں۔ آپ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے؟“

”میں اس بارے میں پہلے ہی مختلف لوگوں سے بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔“ فنلے نے کہا۔ ”اگر تمہیں تفصیلات چاہیں تو شوق ہے تو تم ان دنوں کے اخبارات دیکھ سکتے ہو۔“

”میرا خیال ہے آپ سے گفتگو کے بعد میں اس کہانی کو ایک نئے رخ سے دیکھ سکوں گا۔“ نک نے کہا۔ ”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟“

”وہ ایک حادثہ تھا، ایک سیدھا سادا اتفاقی حادثہ جو ہم میں سے کسی کے ساتھ بھی پیش آ سکتا تھا۔ آکسیجن کی ٹنکیاں برساتیوں اور ہیلمٹ کی طرح انفرادی طور پر فائر مینوں میں تقسیم نہیں کی جاسکتیں۔ وہ فائر انجن پر بنی ہوئی مخصوص الماری میں رکھی رہتی ہیں۔ آکسیجن کی ٹنکیاں کل چار ہیں۔ ان میں صرف ایک خراب تھی۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی نے جان بوجھ کر آکسیجن ٹینک میں سے ہوا نکال دی ہو کیونکہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آرتھر اس ٹنکی کو استعمال کرے گا۔ میں اس بات کو

ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں کہ کسی نے آرتھر کو ہلاک کرنے کے لیے ٹنکی میں سے ہوا نکال دی ہوگی۔ ٹنکی کے بائو میٹر کی طرف اسپتال کا ایک ڈاکٹر متوجہ ہوا تھا۔ اس نے

بات پولیس افسر کو بتادی جو آرتھر کا معائنہ کرنے پہنچا تھا۔ آرتھر کو لے کر اسپتال پہنچے تو اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ میٹر کو دیکھ کر اس ڈاکٹر اور پولیس افسر نے یہ احمقانہ کہانی

گھڑی کہ آرتھر کو قتل کیا گیا ہے۔“

”لیکن مجھے تو معلوم ہوا ہے کہ آکسیجن کی یہ ٹنکیاں

منٹ تک کارآمد رہتی ہیں۔“

”اس کا انحصار آکسیجن استعمال کرنے والے فرد پر منحصر ہے۔ اگر وہ جسمانی طور پر شدید محنت کر رہا ہو تو ٹنکی اس سے کہیں کم وقت میں ختم ہو سکتی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آگ بجھانا آسان کام نہیں ہے۔ اس میں بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور یوں آکسیجن کی ٹنکیاں جلد ختم ہو جاتی ہیں۔“

”گویا آپ مطمئن ہیں کہ یہ محض ایک حادثہ تھا؟“

”یقیناً۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ بہر صورت پولیس پوری تندہی سے نامعلوم قاتل کی تلاش کر رہی ہے۔ وہ لوگ اٹلیوں کے نشانات وغیرہ کے لیے یہاں آئے تھے اور گھنٹوں سرکھپاتے رہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ نک نے کہا۔ ”کیا میں آپ کے عملے کے دیگر افراد سے مل سکتا ہوں؟“

”یقیناً۔ اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ رات کی شفٹ میں ہم سات آدمی ہیں۔ آرتھر کی جگہ فی الحال کسی کو نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ چھ آدمی اس وقت عمارت میں موجود ہیں۔“

فائر چیف نک کو عمارت کے عقب میں بنے ہوئے ایک بڑے سے کمرے میں لے گیا وہاں دو فائر مین پنگ پانگ کھیل رہے تھے۔ دو فائر مین ان کا کھیل دیکھ رہے تھے اور باقی دو کتا میں پڑھ رہے تھے۔ چیف نے فرداً فرداً سارے فائر مینوں کا تعارف نک سے کرایا۔ وہ تمام تندرست و توانا اور مضبوط کمرتی جسم کے مالک تھے۔

”میں آرتھر کی ناگہانی موت پر اپنے رسالے کے لیے فیچر لکھ رہا ہوں۔“ نک نے انہیں بتایا۔ ”اس ضمن میں آپ کے چیف نے میری خاصی مدد کی ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ آرتھر کی موت ایک اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہے کسی نے اسے جان بوجھ کر ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کی، کیا آپ حضرات اس بات سے متفق ہیں؟“

”آگ بجھانا جان جو کھوں کا کام ہے۔“ ایک فائر مین نے سراٹھا کر کہا۔ ”آگ بجھاتے ہوئے حادثے تو پیش آتے ہی رہتے ہیں۔“

”کیا اس رات کسی اور فائر مین نے بھی آکسیجن کی ٹنکی استعمال کی تھی؟“

”میں نے استعمال کی تھی۔“ ایک پستہ قد فائر مین بولا۔ ”چیف نے بھی پندرہ منٹ کے لیے ایک ٹنکی کو اپنی پشت پر باندھا تھا، وہ آگ بہت تیز اور خطرناک تھی۔“

”کیا آکسیجن کی ٹنکیاں افراتفری میں اٹھائی گئی

تھیں؟“

”ٹنکی آرتھر کو بہ طور خاص نہیں دی گئی تھی۔ وہ بھی مجھے میں آسکتی تھی۔“ ایک دراز قد فائر مین بولا۔

پنگ پانگ کھیلنے والے دونوں فائر مین میز کی جاچکے تھے۔

”فائر بریگیڈ کی عمارت میں کوئی اور غیر معمولی ہوئی تھی؟ خاص طور پر گزشتہ ہفتے کوئی خاص واقعہ وقوع ہوا تھا؟“

دراز قد فائر مین نے سر ہلا کر کہا۔

”دن کی شفٹ کے ایک فائر مین نے اپنے ہیلر کے چوری ہونے کی شکایت کی تھی۔ میری سمجھ میں اب تک بات نہیں آئی کہ کسی کو اس کا ہیلر چرانے کی ضرورت کیوں کر پڑ گئی؟“

”واقعی عجیب بات ہے۔“ نک نے اپنے پیڑ پر لکھتے ہوئے کہا۔ ”آرتھر کے خاندان کے دیگر افراد تو ہر گے؟ اخبارات کے مطابق وہ آجکل شادی شدہ نہیں تھا۔ میں اس کے پسماندگان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“

”اس کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی تھی۔“ چیف فٹلے نے کہا۔ ”وہ ویسٹ اسٹریٹ پر ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ کیا تم اس کی سابقہ بیوی سے بھی ملو گے؟ ممکن ہے تمہیں اس کے بارے میں کوئی خاص بات بتا سکے۔“

نک کا خیال تھا کہ وہ کوئی خاص بات نہیں بتا سکے لیکن اس نے اس معاملے میں اپنی دلچسپی ظاہر کر دی اور اس کا نام اور پتا نوٹ بک میں لکھ لیا۔ اس نے الوداعی کلمات کہے اور فائر بریگیڈ کی عمارت سے رخصت ہو گیا۔ اب وہ کوئی لائحہ عمل تیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملے کو آگے کیسے بڑھایا جائے۔

ساتوں فائر مینوں میں سے کوئی بھی ایسا انتظام کر سکتا تھا کہ آکسیجن کی خالی ٹنکی آرتھر کے ہاتھ لگ جائے اور وہ دم گئے سے ہلاک ہو جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فائر مینوں میں سے کوئی ایسا کیوں کر بنا چاہے گا۔ آرتھر کے ساتھیوں کے پاس اسے قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ نک کو کوئی راہ بھائی نہیں دے رہی تھی۔ قاتل کو تلاش کرنے کے لیے اڑتا لیس گھنٹوں کی مہلت اسے کم محسوس ہو رہی تھی، وہ آرتھر کی موت کو اتفاقی حادثہ ثابت کرنے کے لیے سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد نک نے آرتھر کی سابقہ بیوی سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ قاتل کی تلاش کے لیے اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

لیزا آرتھر فائر بریگیڈ نمبر چوبیس سے ایک میل کے پانچ منزلہ عمارت کی تیسری منزل کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ نک ویلوٹ لیزا کے دوست آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے طریقہ عمل سے وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے دل میں آرتھر کے لیے ذرا بھی محبت نہیں ہے۔

”آرتھر اچھا آدمی نہیں تھا۔“ لیزا نے ٹانگ پر ٹانگ جھاک کر کہا۔ ”میں اس کی تدفین میں شرکت کے لیے گئی تھی لیکن مجھے اس کی موت کا افسوس نہیں ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک دن یہ ہو کر رہے گا۔“

لیزا کی عمر تیس اور بیٹینس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک سادی گھریلو عورت نظر آرہی تھی۔ اس نے ہلکا میک اپ کر رکھا تھا اور بال بڑھے سلیقے سے باندھ رکھے تھے۔

”میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔“ نک نے کہا۔ ”کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کن معنوں میں اچھا آدمی نہیں تھا؟ میرا مطلب ہے اس میں کیا برائی تھی؟“

”اس کی سرگرمیاں شروع سے میرے لیے ناپسندیدہ رہی تھیں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم دونوں اگر محنت سے کام کریں تو اسے وہ کچھ کرنے ضرورت نہیں ہوگی جو وہ کر رہا تھا۔ لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔ تنگ آ کر میں نے اس سے طلاق لے لی۔ وہ ایک لاپچی آدمی تھا، اسے دولت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔“

”کیا آپ اس کی سرگرمیوں کی کچھ وضاحت کریں گی؟“

لیزا کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ اس کے کالے کروتات اخبارات میں شائع ہوں۔ اب اس کا فائدہ بھی نہیں ہے۔“

”اگر میں اس بات کو چھپانے کا وعدہ کر لوں تو کیا آپ مجھے بتائیں گی؟“ نک ڈرامائی انداز میں اپنی نوٹ بک بند کر کے بولا۔ ”اصل میں اس سے مجھے آپ کے سابق شوہر پر کچھ لکھنے میں آسانی رہے گی۔“

لیزا نے ایک سگریٹ سلگایا اور دو تین گہرے گہرے سانس لے کر بولی۔ ”بات یہ ہے کہ میں یہ بات بتا کر کسی سمجھت میں پھنستا نہیں چاہتی۔ اس چیز کے اخبارات میں آجانے سے مجھے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔“

”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس بارے میں ایک لفظ بھی اخبارات میں شائع نہیں ہوگا۔“

”وہ معقول رقم کے عوض لوگوں کے لیے کام کرتا تھا۔ جو لوگ اس سے کام کرواتے تھے ان میں زیادہ تر کا تعلق بروکس کے علاقے سے ہے لیکن اس علاقے میں بھی کچھ لوگ اس کی خدمات حاصل کیا کرتے تھے۔“

”وہ لوگوں کے لیے کس قسم کے کام انجام دیا کرتا تھا؟ وہ کس قسم کے لوگ ہیں؟“

لیزا نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا پھر بے بسی سے نک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ تو جانتے ہیں کہ اس کا پیشہ کیا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ ایسے کام کرتا تھا جو اسے کسی صورت میں زیب نہیں دیتے تھے۔ امید ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔“

”افسوس! کہ میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔“ لیزا خجالت سے اپنے ناخن دیکھنے لگی۔ اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ ”وہ معقول معاوضے کے عوض لوگوں کے لیے عمارتوں میں آگ لگایا کرتا تھا۔“

لیزا کی اس بات سے نک کو ذہنی طور پر شدید دھچکا پہنچا تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

لیزا نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ”ہاں یہی وہ اس کے کالے کروتات تھے جنہیں میں آپ سے چھپا رہی تھی۔ جو لوگ انشورنس کمپنیوں سے بھاری معاوضہ حاصل کرتا چاہتے تھے۔ وہ معقول رقم کے عوض آگ لگانے کے لیے آرتھر کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ آرتھر نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے آج تک کسی ایسی عمارت کو آگ نہیں لگائی جس میں لوگوں کا وجود ہو۔“

”وہ اس قسم کے کام کس شخص کے لیے انجام دیتا تھا؟“ نک نے پوچھا۔ اس کا ذہن تیزی سے اس پہلو پر سوچ رہا تھا۔

”ممکن ہے آرتھر کو اس شخص نے اس خدشہ کے پیش نظر قتل کر دیا ہو کہ کہیں وہ یہ راز فاش نہ کر دے۔“

”زیادہ تر وہ یہ کام بروکس کے ایک جرائم پیشہ شخص کے لیے کیا کرتا تھا۔ مجھے اس کا پورا نام معلوم نہیں ہے۔“

”آرتھر اسے کسی نام سے تو پکارتا ہی ہوگا۔“

”میں یہی تو یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میرا خیال ہے..... مگر مجھے یقین ہے..... غالباً اس شخص کا نام میکس تھا۔“

میکس، سام رافٹر کے ایک ساتھی کا نام بھی تو تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو فائر مین کی مکمل وردی لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور جس کی وجہ سے رافٹر نے میری خدمات حاصل کی تھیں۔ کہیں یہ وہی میکس تو نہیں ہے؟

”بہت بہت شکر یہ خاتون!“ نک نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اس تعاون کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔“

لیز اسے صدر دروازے تک رخصت کرنے آئی۔ اس نے نک کے چہرے کی طرف بی غور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ بات اب تک سمجھ میں نہیں آئی کہ آر تھر اس قسم کا کام کیوں کرتا تھا؟ یہ ٹھیک ہے کہ آگ لگانے کا اسے معقول معاوضہ دیا جاتا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے اس کی کوئی اور وجہ بھی تھی۔ بعض اوقات تو میں سوچتی ہوں کہ یقیناً اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔“

”میں آپ کی بات سمجھ چکا ہوں۔“ نک نے کہا۔

☆☆☆

نک ویلوٹ نے اگلا دن شمالی بروکس کے علاقہ میں میکس نامی شخص کو تلاش کرنے میں گزار دیا۔ کس کو تلاش کرتے ہوئے وہ خاص طور پر آس پاس کی ان جلی ہوئی عمارتوں پر توجہ دے رہا تھا۔ جنہیں آر تھر نے معاوضہ کے لیے آگ لگا دی تھی۔ وہ ان عمارتوں کو حیرت اور افسوس کے ساتھ دیکھتا رہا جنہیں انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے لیے جلا دیا گیا تھا۔ نک نے اس علاقے میں سام رافٹر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ جن علاقوں کے بارے میں اسے معلوم ہو گیا کہ رافٹر یہاں پہچانا جاتا ہے، نک نے ان علاقوں میں میکس کے بارے میں مختلف لوگوں سے پوچھنا شروع کر دیا۔ ایک گھنٹے کی جدوجہد کے بعد بالآخر اسے مطلب کی بات معلوم ہوئی گئی۔

”یقیناً تم میکس ونکل کی تلاش میں ہو؟“ ایک سگار اسٹور کے مالک نے اس سے کہا۔ ”وہ کبھی کبھار یہاں رافٹر کے ساتھ آتا ہے۔“

”میں اسے کہاں تلاش کر سکتا ہوں؟“ نک نے پانچ ڈالر کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ سگار اسٹور کے مالک نے اپنی آواز دھیمی کر کے کہا۔ ”گزشتہ ہفتے جو ہنگامہ ہوا تھا اس کے بعد سے وہ دونوں دکھائی نہیں دیے۔“

نک نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”تم اسی واردات کی بات کر رہے ہونا جس میں ایک لڑکی فائرنگ سے ہلاک ہوئی تھی۔“

”میری مراد اسی ہنگامے سے ہے، میں نے سنا ہے کہ ہیروئن تقسیم کی جارہی تھی کہ کچھ بد معاش حملہ آور ہوئے اور سارا مال لے اڑے۔“

”وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب کس طرح ہو گئے؟“ انہوں نے عمارت کے ہال میں پڑے ہوئے کوڑے دان میں آگ لگا دی تھی اور پھر ایک بد معاش فائرنگ کا مخصوص لباس پہنے فلیٹ میں گھس گیا۔

”کیا رافٹر اور میکس اس میں ملوث ہیں؟“ ”مجھے کچھ نہیں معلوم، میں کچھ نہیں جانتا۔“ وہ شخص معاگر کر بولا۔ ”میں نے تو محض اتنی بات کہی ہے کہ وہ دونوں سے دکھائی نہیں دیے۔“

”شکریہ!“ نک نے کہا۔ نک نے اس علاقے کے کئی شراب خانوں میں جا کر میکس کے بارے میں معلومات حاصل کیں لیکن کوئی شخص اسے میکس کے بارے میں کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ شام ہو رہی تھی لہذا نک نے طے کیا کہ سارجنٹ لارنس کے الزام سے بچنے کے لیے اسے کوئی ٹھوس قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔ اس نے ایک فون بوتھ میں داخل ہو کر سام رافٹر کے نجی ٹیلی فون کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کے استفسار پر ایک خاتون نے شیریں لہجے میں بتایا کہ رافٹر فلوریڈا جا چکا ہے۔

”میکس ونکل کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟ کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟“

”میں کسی میکس ونکل کے بارے میں نہیں جانتی۔“ ”نک نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ”دیکھیے محترمہ، مجھے ان دونوں سے ملنا ہے اور یہ بہت ضروری ہے۔ آپ ان سے رابطہ قائم کر کے کہہ دیں کہ نک ویلوٹ میکس سے رابطہ قائم کرنا چاہتا ہے۔“

نک نے سلسلہ منقطع کر دیا اور واپس اپنے فلیٹ پہنچ گیا۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ نک کی توقع کے مطابق رات دس بجے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سام رافٹر اس سے مخاطب تھا۔

”میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں سے میکس کے بارے میں پوچھتے پھر رہے تھے۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”بات کیا ہے؟“ ”میں اس کے کاروبار کے بارے میں ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اس بزنس کا تعلق تم سے بھی ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اس موضوع پر فون پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرو گے۔“

”کیا ہم اسی جگہ ایک گھنٹے کے اندر مل سکتے ہیں جہاں ہماری گزشتہ ملاقات ہوئی تھی؟“

”ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گا۔“

☆☆☆

رافٹر کی کار مقررہ جگہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ نک نے اپنی کار بھی پارکنگ پلاٹ کے شروع میں کھڑی کی اور پیدل اس طرف چل دیا۔ رافٹر اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھا سکرینٹ پی رہا تھا۔ نک نے اس کے برابر کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔

”اب مجھے تم یہ بتاؤ کہ میکس کے بارے میں تمہارے ارادے کیا ہیں؟“ رافٹر نے پوچھا۔ ”میں کسی بھی شخص سے نہیں ملا لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کے تعلقات آر تھر نامی کسی فائر مین سے تھے جس کا گزشتہ ہفتے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔“

”ان دونوں کے تعلقات کس نوعیت کے تھے؟“ ”وہ آر تھر کو معاوضہ دے کر بروکس کے علاقے میں عمارتوں کو آگ لگوا کر رہا تھا۔ پولیس میرے سر پر کھڑی ہے رافٹر۔ ان کا خیال ہے کہ کسی نے جان بوجھ کر آر تھر کو ہلاک کیا ہے اور وہ اس معاملے میں مجھے ملوث کرنا چاہتے ہیں۔“ ”تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”آر تھر فائر مین تھا اور انہوں نے میری انگلیوں کے نشانات فائر بریگیڈ کی عمارت سے حاصل کر لیے ہیں۔“ ”یہ تو تمہاری سیاہ بختی ہے نک۔ میرا تو خیال تھا کہ تم اس سے کہیں زیادہ چالاک ہو۔“ رافٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اگر آر تھر اور میکس مل کر کام کر رہے تھے تو ممکن ہے میکس کو اس کی موت کے بارے میں کچھ علم ہو۔“

”تمہیں یہ بات کیونکر معلوم ہوئی کہ اس کے میکس کے ساتھ اس نوعیت کے تعلقات تھے؟“

”آر تھر کی سابقہ بیوی کا بیان ہے کہ اس کا شوہر شمالی بروکس کے علاقے میں ایک شخص میکس سے معقول معاوضہ لے کر اس کے لیے عمارتوں کو آگ لگوا کر رہا تھا۔“ ”تم جانتے ہو کہ شمالی بروکس کے علاقے میں کتنے میکس ہیں؟“

”تمہارے ساتھی میکس کو تمہارے لیے فائر مین کا لباس مہیا کرنا تھا اور یہ بات تم نے ہی مجھے بتائی تھی۔ آر تھر سے اس کی نہ ملنے کے بعد تم نے میرے بارے میں سوچا تھا کیونکہ میں اسی علاقے میں رہائش پذیر ہوں۔ میں نے ہیلمٹ تھامنے کے لیے فائر بریگیڈ نمبر چوبیس کو اس لیے منتخب کیا تھا کہ ”میرے گھر سے نزدیک ہے۔ تم نے بھی یہی سوچ کر میری خدمات حاصل کی تھیں کہ میں اسی اسٹیشن سے ہیلمٹ چرانے کی کوشش کروں گا۔ عجیب اتفاق ہے کہ میں ہیلمٹ چرانے کے لیے اس اسٹیشن کو منتخب کر بیٹھا لیکن حالات کے پیش نظر میں

یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اس میں تمہاری سوچ کا خاص دخل تھا۔“ ”تمہارا خیال ہے اس معاملے میں میکس ملوث ہے؟“ ”مجھے اس بارے میں پورا یقین ہے۔“ نک نے کہا اور اسی لمحے اس نے اپنی گردن کی پشت پر پستول کی سر دی نال لگتی محسوس کی۔

”تمہیں کار میں بیٹھتے ہوئے پیچھلی نشست کی طرف دیکھنا چاہیے تھا۔“ پیچھے سے ایک سرد آواز سنائی دی۔

نک اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تو تم میکس ونکل ہو؟“

”ہاں میرا نام میکس ہے۔ رافٹر! تم اس کا پستول نکال لو۔“

رافٹر نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میرا خیال ہے نک ویلوٹ کے پاس پستول نہیں ہوتا۔ کیا خیال ہے نک؟“

”پستول میرے گھر پر موجود ہے۔“

میکس نے اب بھی پستول کی نال اس کی گردن سے لگا رکھی تھی۔

رافٹر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو نک؟“

”میرے چاہنے پانہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے مقامی پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اس وقت بھی پولیس کے دو تین افسران قریب ہی منڈلا رہے ہوں گے۔“

”خیر! اس وقت تو تم میکس کے قبضے میں ہو۔“ رافٹر نے کہا۔

”لعلت ہو آر تھر پر!“ میکس نے کہا۔ ”اس کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔“

”ایک بات تو بتاؤ میکس! تم نے گزشتہ ہفتے آر تھر سے فائر مین کا ہیلمٹ کیوں نہیں لے لیا تھا؟ رافٹر کو ہیلمٹ کے لیے میری خدمات حاصل کرنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟“

میکس نے گہرا سانس لیا اور بولا۔ ”آر تھر خوفزدہ ہو چکا تھا، اسے خدشہ تھا کہ فائر بریگیڈ میں اس کے ساتھی اس کی تمام حرکتوں سے واقف ہو جائیں گے۔ ان خدشات کا سبب وہ نوٹ بک تھی جس میں اس نے تمام وارداتوں کے بارے میں لکھ رکھا تھا اور یہ نوٹ بک اس سے فائر اسٹیشن کی عمارت میں کھو گئی تھی۔ وہ اتنا زیادہ فکر مند تھا کہ مجھے ہیلمٹ دینے پر تیار نہیں ہوا۔“

”میں نے جو ہیلمٹ چرایا تھا اس کا تم لوگوں نے کیا؟“

سام رافٹر نے جواب دیا۔ ”ہم نے اپنا مقصد حاصل کر کے

سب چیزوں سے چھپا چھڑا لیا تھا۔ ہم کسی قسم کا خطرہ مول لیتا نہیں چاہتے۔

”کیا تمہارا چھاپہ کامیاب رہا تھا؟“ نک نے پوچھا۔
”یقیناً! میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ہیروئن کی بہت بڑی مقدار ہمارے ہاتھ لگے گی۔“

نک نے بے چینی سے اپنی نشست پر پہلو بدلا اور بولا۔
”کیا ہم ساری رات اسی طرح بیٹھے رہیں گے؟ کیا تم پستول کی نال اسی طرح میری گردن سے لگائے رکھو گے؟“
”اس کا انحصار تم پر ہے“ میکس نے کہا۔ ”تم سام رافٹر کے دوست ہو اور اس بنا پر میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ لیکن تم نے اپنے بے ہودہ سوالات سے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“

”میں نے تو.....“
”وہ دیکھو ایک کار مڑ رہی ہے!“ سام رافٹر نے اچانک کہا۔

”کار پر لگے ہوئے لینینا کو دیکھو! میرا خیال ہے وہ پولیس کا رہے۔“

میکس نے اپنی نشست پر ایک جھٹکا کھایا اور نک نے بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر اس کی کلائی تھام لی۔ نک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر سارجنٹ لارنس قریب ہوا تو اس کی مدد کو آ سکتا تھا۔

رافٹر نے مغلظات بکتے ہوئے اپنی کار کو گیزر میں ڈالا۔ وہ اسٹیرنگ وہیل کو تیزی سے گھماتے ہوئے نک اور میکس کو پستول کے لیے چھینا جھپٹی کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ رافٹر نے ایک مرتبہ پھر وہیل کو تیزی سے گھمایا۔ اب کار پارکنگ پلاٹ سے نکل رہی تھی۔ نک نے کرائے کا ایک زوردار ہاتھ میکس کی گردن پر مارا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ معاً ایک کار تیزی سے ان کی طرف بڑھی اور نک نے اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھے ہوئے لارنس کو دیکھ لیا، اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا۔ پھر ایک اور پولیس کار رافٹر کے سامنے آگئی اور اس نے گیزر لگا کر کار کو ریورس گیزر میں ڈال دیا۔ اس دوران پیچھے سے ایک اور کار آچکی تھی۔ اسی اثنا میں نک پستول اٹھا کر اس کا رخ رافٹر کے سر کی طرف کر چکا تھا۔ رافٹر نے اپنی کار روک دی اور بولا۔

”میرے تصور میں بھی نہیں تھا ویلوٹ کہ تم پولیس کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہو!“

”میں نے کبھی پولیس کے ساتھ کام کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ بعض اوقات ایسا اتفاق ہو ہی جاتا ہے۔“

لارنس نے رافٹر اور میکس کو ہتھکڑیاں پہنا دیں اور انہیں ہیڈ کوارٹر لے جانے کے لیے اپنی کار میں بٹھا دیا۔ نک کی طرف آیا اور اس سے مخاطب ہوا۔

”میں تمہیں بتا چکا تھا کہ پولیس کا ایک آدمی مسلسل تمہارے تعاقب میں رہے گا۔“

”تمہاری بات مجھے یاد تھی۔“ نک نے کہا۔ ”لیکن نے میرے معاملے میں ایمانداری سے کام نہیں لیا۔ تم نے ان دونوں تک پہنچنے کے لیے مجھے استعمال کیا ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ لارنس نے طنز یہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں میری انگلیوں کے نشانات لاکر پر مل گئے تھے لیکن آکسیجن کی ٹنکیاں تو آگ بجھانے والی گاڑی میں ان کی مخصوص جگہ پر رکھی جاتی ہیں اور تم یہ بات قطعیت سے جانے ہو کہ میں انجن کے نزدیک بھی نہیں گیا۔ تم نے مجھے قتل کے جرم میں پھانسنے کی دھمکی دی تھی تاکہ میں تم کو ان دونوں تک لے جاؤں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟“

”کم و بیش بات تو یہی ہے۔“ لارنس نے اعتراف کیا۔ ”برونکس کی پولیس کو فائرمین کا ہیلمٹ اور برساتی ٹل گئی تھی۔ یہ دونوں چیزیں اس علاقے میں ہونے والی ایک واردات میں استعمال کی گئی تھیں۔ فائر بریگیڈ اسٹیشن کا ہیلیمٹ پر پڑا تھا لہذا یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہیلمٹ کو کہاں سے حاصل کیا گیا تھا۔ یہیں سے اسٹیشن کی عمارت کی پڑتال کی گئی اور ہمیں تمہاری انگلیوں کے نشانات مل گئے۔ ہمیں فائر مین آر تھر کی موت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اتفاق سے ہمیں ایک سنہرا موقع ہاتھ آیا تھا جسے ہم نے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ اگر میں نے آر تھر کی موت کا ذمہ دار تمہیں قرار دیا تو تم اپنی جان بچانے کے لیے ضرور تعاون کرو گے۔“

”اور اب تم نے رافٹر اور میکس کو گرفتار کر لیا ہے، ہتھکڑیاں پاس ان کے خلاف کس قسم کا کیس ہے؟“

”برونکس پولیس کی تحویل میں چند خوفزدہ لڑکیاں ہیں جنہوں نے ان دونوں کو دیکھ رکھا ہے۔ ہم ہیروئن کی بھاری مقدار کے بارے میں ان سے پوچھ گچھ کریں گے۔ ہیلمٹ کے اندرونی حصے سے چند بھورے بال بھی ملے ہیں جو یقیناً میکس کے ثابت ہوں گے اور یوں ان کے خلاف بڑا مضبوط مقدمہ بن جائے گا۔“

”میرے بارے میں کیا خیال ہے؟“
سارجنٹ نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تمہیں کسی بڑے

حصے میں پھانسنے کی کوشش کروں گا۔ میں اس معاملے میں تمہارا نام نہیں لوں گا لیکن میری ایک بات مان لو تو تمہارا بڑا کرم ہوگا۔ اگلی مرتبہ اپنا کام کسی دوسرے علاقے میں انجام دینا۔“

☆☆☆

نک گھر پہنچا تو گور یا بڑے انہماک سے ٹیلی وژن دیکھ رہی تھی اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔ ”تم کہاں رہے کئی؟“
”بڑی لمبی کہانی ہے گزشتہ ہفتے جو کام میں نے انجام دیا تھا۔ اس نے پیچیدگی اختیار کر لی تھی۔“
”تم سونے جا رہے ہو؟“

اس وقت بارہ بج رہے تھے اور وہ بہت تھکا ہوا تھا مگر اس کا جی سونے کو نہیں چاہ رہا تھا لہذا اس نے کہا۔ ”ابھی نہیں مجھے تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا ہے۔“

نک نے کار سنہالی اور تیزی سے چلاتا ہوا کھیل کے میدان میں پہنچ گیا جس کی دوسری طرف فائر بریگیڈ نمبر چوبیس کی عمارت واقع تھی اس نے کئی سوگز پہلے کار کھڑی کر لی اور پیدل عمارت کی جانب چل دیا۔ پورے چاند کی روشنی میں اس نے چلے ہوئے فارم ہاؤس کو دیکھا اور ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ نک کی توقع تھی کہ زیادہ تر لوگ سو رہے ہوں گے اور پھر الارم کی گھنٹی بجنے لگے گی اور انہیں بھاگنا پڑے گا۔

لیکن ایک شخص عمارت سے باہر چوتھرے پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ نک نے اسے دور سے پہچان لیا۔ وہ فائر چیف فٹلے تھا۔

”ہیلو چیف!“ نک نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔
”ہیلو مسٹر!“ اس نے منہ سے پائپ نکال کر کہا۔ ”آپ نے کہانی تیار کر لی؟“

”ہاں! لیکن میں نے اسے نہ لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔“
”یہ تو بہت برا ہوا۔ خیر! یہ آپ کا مسئلہ ہے میں تو اس حسین رات سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔“

”واقعی بڑی سہانی رات ہے۔“ نک نے کہا ”اتنی حسین رات میں کہیں آگ لگ جائے تو..... تو بہت افسوس ہوتا ہے۔“

”آگ کسی بھی رات کو لگے، افسوسناک ہوتی ہے۔ مجھے آگ سے نفرت ہے، شدید نفرت“ اس نے پہلو بدل کر کہا۔ ”میرا خیال ہے اسی سبب سے میں یہ پیشہ اختیار کیے ہوئے ہوں۔“
نک نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”زیادہ تر فائر مینوں کے جذبات اور احساسات آپ سے ملتے جلتے ہیں۔ آپ لوگوں کے کم سے کم بے شمار انسانی جانیں تلف ہونے سے بچ جاتی ہیں اور گھروں ڈالرز کی جائداد تباہ و برباد ہونے سے بچ جاتی

ہے۔ میرا خیال ہے ایک فائر مین کے نزدیک جان بوجھ کر آگ لگانے والا شخص دنیا کا سب سے زیادہ قابل نفرت انسان ہوتا ہے۔“

فٹلے نے تاریکی میں گھورتے ہوئے کہا ”آپ یہ بات کہہ سکتے ہیں۔“

”میں نے ایک فائر مین کے بارے میں سنا ہے جو فارغ اوقات میں آگ لگانے کا کام کرتا تھا۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ظاہر ہے، مجھے ایسے آدمی سے ہمدردی نہیں ہو سکتی۔“
”وہ اپنے کرتوت ایک نوٹ بک میں لکھ لیا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ ان معاذوں تک کا اندراج کرتا تھا جو آگ لگانے کے عوض اسے ملتے تھے۔ پھر ایک دن وہ اپنی یہ نوٹ بک گم کر بیٹھا اس طرح اس کے ساتھیوں کو اس بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا۔“

فٹلے پائپ کے کش پر کش لگاتا رہا۔ پھر اس نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ”میں آر تھر کی موت کے بارے میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ یہ بات کسی کے علم میں نہیں تھی کہ وہ کون سی ٹشکی کا انتخاب کرے گا لہذا کوئی فائر مین اس کی موت کا ذمہ دار نہیں ہے۔“

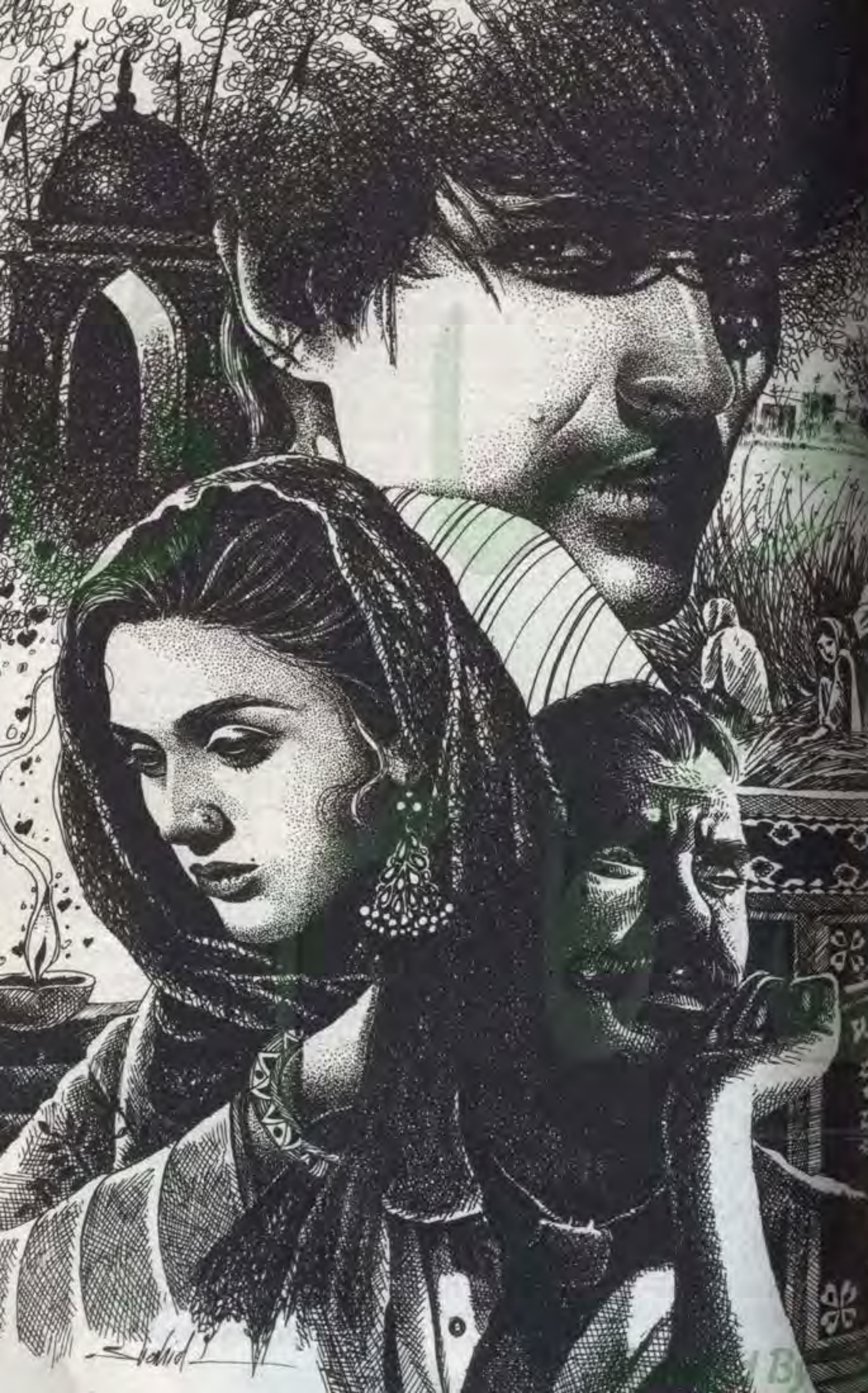
”کسی فائر مین نے اسے ہلاک نہیں کیا۔“ نک نے کہا۔ ”لیکن تم سب مل کر اس کی حادثاتی موت کا بندوبست کر سکتے تھے۔ آخر ایک فائر مین کو اس کے بدترین مجرم ہونے پر سزا تو ملنی چاہیے تھی۔“

”تمہارا خیال ہے لوگ اس بارے میں یقین کر لیں گے؟“

”نہیں!“ نک نے کہا۔ ”پولیس مطمئن ہے اور آر تھر کی سابقہ بیوی کو بھی اس کی موت کی پروا نہیں ہے جن لوگوں کے لیے وہ کام کر رہا تھا۔ اس وقت کسی دوسرے الزام میں جیل میں ہیں۔ اور میں جاسوس نہیں ہوں۔ آر تھر کی موت کس طرح واقع ہوئی، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

فٹلے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ایسا ہونا بھی چاہیے۔ بہر حال جو ہونا تھا ہو چکا، ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“

اب کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ لہذا نک ویلوٹ نے الوداعی کلمات کہے اور واپس چل دیا، ابھی وہ کھیل کے میدان میں داخل ہی ہوا تھا کہ الارم کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس سہانی رات میں دور کہیں آگ لگ گئی تھی۔



ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر: 7

گل و گزار سے راہ پر خارتک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زاد سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود پر اداء پر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور ابلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاؤں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساس زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کر دینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر ہیں، راہ کی کھنائیوں سے بے خبر اپنے سفر پر رواں ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہر یار ہے جسے لوگ پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانہ عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد میں، والد امام دین عرف سوہتا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا۔ والد صاحب کھیتوں میں مزدوری کر کے عزت کی روزی کھاتے تھے کیا ایک روز جب میری عمر پانچ برس کی ایک خوب نکلا دافے میں میرے والدین کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا گھر اور اپنے تین بچوں کی طرح ہماری تربیت کی۔ حالانکہ وہ بھی کوئی آسودہ حال گھرانہ نہیں تھا۔ گاؤں ہی میں چھوٹی کبریٰ رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی نانی غزالہ سے میرا رشتہ طے کر دیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی، میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد میں نور پور واپس آ گیا۔ گاؤں میں دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نبرداریات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی شہی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا

لے کر کہاں جائیں گے؟

کھالے نے کہا۔ ”اے کسی اسپتال میں ڈال آتے ہیں۔“

”تا کہ جاتے ہی دھر لیے جائیں..... ہیں؟“ بیانے تلخی سے کہا۔

بیانے درست کہا تھا۔ وحید کی سانس کی رفتار اُس کی طرف بڑھتی ہوئی اندوہ ناک موت کی خبر دے رہی تھی۔ میں نے ایک پل کو سوچا۔ وحید کی ہمدردی میں ہاتھ سے نکلنے والا ہر لمحہ مجھے پروین سے دور کر رہا تھا۔ یہ بھی سوچا، اگر میں وحید کو ایسے ہی پھینک کر آگے بڑھ جاتا ہوں تو واپسی پر اسے جانور نوچ چکے ہوں گے۔

اچانک دل میں ہمدردی کا جذبہ پوری شدت سے بیدار ہو گیا۔ میں نے سر جھٹک کر کہا۔ ”نہیں بیاجی! اسے لے جا کر فرسٹ ایڈ دیتے ہیں اور گاڑی میں لٹا دیتے ہیں۔ واپسی پر اگر یہ زندہ ہوا تو ملتان لیے چلیں گے۔ اگر مر گیا تو اس کی قسمت..... پیلے میں کہیں پھینک کر اپنی راہ چل دیں گے۔ پلیز!“

بیانے بیزاری سے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں نے جلدی سے وحید کے نیم جان وجود کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور گاڑی کی طرف چل پڑا۔ کھالے نے میرا ساتھ دیا۔

پیا عقب سے بولا۔ ”ہم ادھر ہی کھڑے ہیں، جلد آ جانا۔“

چونکہ اُس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا، اس لیے میں نے اُسے چھیڑنا اور ساتھ چلنے پر مجبور کرنا مناسب نہیں سمجھا اور وحید کو کندھے پر ڈالے گاڑی تک لے آیا۔ ڈالے کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر میں نے برقی رفتار سے میڈیکل کٹ کھول لی۔ مجھے ایک ٹیکے کی تلاش تھی جو خوش بختی سے مل گیا۔

بیاجی نے جب اُس کا طبی معائنہ کیا تھا، تب مجھ پر باور ہوا تھا کہ وحید پر زخموں کی وجہ سے گہری بے ہوشی نہیں طاری تھی۔ وہ یا تو خوف کی شدت سے کوما میں چلا گیا تھا یا اُسے کوئی تیز نشہ آور دوا دی گئی تھی۔ دوا کی مقدار میں زیادتی سے بھی اس کی یہ حالت ہو سکتی تھی۔ گردن، چھاتی اور ٹانگ پر لگنے والے زخم گہرے تو تھے مگر عام نوعیت کے تھے۔

گاڑی کی چھت والی بتی روشن کی، انجکشن تیار کیا اور اُس کے بازو کی وین تلاش کر کے دوا انجیکٹ کر دی۔ زود اثر دوا نے چند لمحوں میں ہی اپنا کام کر دکھایا اور وحید کی ماند پڑتی ہوئی سانس اور نبض میں جان پڑ گئی۔

کھالے کی گھبرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں چلنے ہوئے سیسے کی طرح پڑی۔ ”اوئے شہرے! اہ تاں عاشی دا بھرا، سجاو ل کر یانے آ لے دا پتر وحید ہے.....“

(اوئے شہرے! یہ تو عاشی کا بھائی اور سجاو ل کر یانہ مرچٹ کا بیٹا وحید ہے)

میں بھی وحید کو پہلی نظر میں ہی پہچان گیا تھا۔ بیانے کھالے سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

کھالے اُسے سجاو ل اور وحید کی ماں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں اس دوران کھالے کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹا کر اُس کے چہرے پر جھک گیا تھا۔ وحید کا سرخ و پید چہرہ اس وقت پیلا پڑ چکا تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے اور مٹی میں اُٹے تھے جبکہ بال بری طرح کیچڑ میں لٹھرے ہوئے تھے۔ اگر میں نے اُسے کئی مرتبہ پہلے دیکھ نہ رکھا ہوتا تو شاید پہچاننے میں تامل ہوتا۔ میں نے اُس کے گال کو چھوا۔ سرد اور بے جان..... فوراً یہ خیال ذہن میں ابھرا کہ وہ زندہ نہیں تھا مگر میرے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ میرے ہاتھوں کی باریک لوؤں نے سانسوں کی بہت خفیف آمد و رفت کو محسوس کر لیا تھا۔ میں نے جلدی سے اُس کی نکائی تھامی۔ کمزور سی نبض چل رہی تھی۔ اُس کے سینے پر ہاتھ رکھا، دل دھڑک رہا تھا۔ یہ بڑی خوش آئند بات تھی۔

میں نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔ ”یہ زندہ ہے، اسے گاڑی میں لے چلو۔“

کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں نے اُسے اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ ایک طرف لڑھک گیا۔

ایسے ہی وقت میں پیا کی آواز سنائی دی۔ ”اسے یہیں چھوڑ دو اور اپنے مشن کی فکر کرو۔ اگر ہم اسے گاڑی میں لے کر گئے تو بہت سا روقت ضائع ہو جائے گا۔“

وہ درست کہہ رہا تھا مگر میں نے کھالے کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا، کہا۔ ”کھالے! زیادہ دیر تو نہیں لگے گی۔“

بیانے جلدی جلدی لاش کی طرح ساکت پڑے وحید کا مہرمانہ انداز میں معائنہ کیا۔ اُس کی بائیں ٹانگ بڑی طرح زخمی تھی۔ گردن اور چھاتی پر کئی زخم لگے تھے جن سے خون بہہ رہا تھا۔ دائیں کندھے کے جوڑ پر بھی ایک نسبتاً بڑا زخم تھا۔ بیانے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ”یہ مرنے والا ہے۔ اسے یہیں پڑا رہنے دو ورنہ یہ قتل مفت میں ہمارے کھاتے میں پڑ جائے گا۔ یہ تو سوچو، اس حالت میں اسے

خالد عرف کھالہ تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی دیکھ کر چلتا تھا اور ساریاں لے کر قریشی موڑ تک جاتا تھا، اسی نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی جبکہ میرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹری حیثیت سے تعینات تھے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی کیونکہ اس سے پہلے کوئی ڈاکٹر زیادہ عرصے گاؤں میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ میں زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتا تھا۔ وہ ایک سچے ہوئے علقص مگر کچھ قوی انسان تھے لیکن بڑا روہیہا تھا۔ میں ان سے ملنے کی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا اور ساتھ ہی چھوٹے بڑے کام کر دیا کرتا اس کے علاوہ مجھے ان کے ہاں سے کتابیں بھی پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ ایک روزی مراد بخش دیوانہ سے بھی دوستی تھی جو کہ شاعر بھی تھا اور اس کے درد بھرے دوہڑے کافی اثر رکھتے تھے۔ خالد عرف کھالہ سردار حیدر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپرست بھی تھا، کی بیٹی اسامہ کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہو گیا اور اپنی قلبی کیفیت کا مجھ سے اظہار کیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا اور اپنے عشق کی روداد سے مجھے آگاہ کرتا رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں خبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان تھا جو سب سے الگ تھلک رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسامہ کی طبیعت خراب ہوئی تو ہر گاہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے سے لے کر دوڑا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ مریض کو اسپتال لایا جائے جس پر وریام خان سخت چراغ پا ہوا اور اس کی حکامتانہ آواز کو سخت ٹھٹھکی۔ چونکہ وہ ایک متمم مزاج شخص تھا اس لیے مجھے خدشہ تھا کہ وہ کوئی انتقامی سازش ضرور کرے گا جو کہ شاہ جی کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے کھالے سے مشورہ کیا اور ہم دونوں نے شاہ جی کی رہائش گاہ کی نگرانی کی لیکن شاہ جی بھی غافل نہیں تھا انہوں نے پیش بندی کر رکھی تھی، یہ سازش ناکام ہو گئی جس میں بخت خان معاون ثابت ہوا۔ اس کے بعد میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ ان تمام واقعات کے تناظر میں وریام خان نے شاہ جی سے میری حمایت پر مجھے سرزنش کی میں نے سوچا کہ حیات خان سے ان کی شکایت کروں گا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں شاہ جی کی صحبت چھوڑ دوں۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں لٹک تھا اور وہ شاہ جی کے زیر علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی اور جب ماسٹر جی اس کا رشتہ لے کر شاہ جی کے پاس آئے تو شاہ جی نے انہیں سخت ستا کر انکار کر دیا۔ پھر زبانوں نے میرے ذریعے شاہ جی کو وہ خط دے دیا لیکن شاہ جی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ شاہ کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرتا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے کے صندوق کی نوک میری ریزہ کی ہڈی میں چھبی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اس نے میرے جسم کو فوج کے ذریعے زخمی کر دیا اور آخری وار کرنا چاہتا تھا کہ اسے میری حالت کا احساس ہوا اور وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ گاؤں میں، سب کھالے پر لعن طعن کر رہے تھے میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سامیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا اور یہ کام سونپا کہ ہم اس کی جاسوسی کریں۔ سامیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ بخت خان نے ہی مجھے معقول معاوضے پر اپنی بیٹی ملکہ کو پڑھانے پر مامور کر لیا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسامہ نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ اسامہ اسی دوران لمبے بالوں والا ہیر وٹا سب نو جوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کی بات پر لڑائی شروع ہو گئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نو جوان موٹی کاکل ہو گیا۔ کھالہ تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھا نے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب و لہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میر و شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور وہ ابھی یہی، میڈم ٹکلیڈ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم ٹکلیڈ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نو جوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر و سحر نہایت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی وہ نور پور کے حالات سے بھی واقف تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کر لیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر نور پور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاہتی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ کھالہ بھی لاپتہ تھا، ایسے میں دیوانے نے مجھے دلاسا دیا اور امیر نواز پریشک کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی غائب تھا۔ میں میڈم ٹکلیڈ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اٹھاتا ہوں۔ میر و شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹریننگ آزمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا اور قتل کا نشان مٹانے کے لیے اس کی لاش کو ڈیرے پر چلا ڈالا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ لیکن اس تمام عرصے میں، میں اپنے والدین کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ شاہ جی کے مطابق اس کے ڈائریج میری تھمال شاہ جمال میں تھے لیکن مجھے یقین نہیں تھا۔ میڈم کے اڈے پر میری ملاقات سونیامی لڑکی سے ہوئی جس نے مجھے میڈم کے متعلق منفی اطلاعات فراہم کیں لیکن میں یہ ماننے پر تیار نہیں تھا۔ سونیامی نے بتایا کہ وہ مجھے ایک چھڑو دکھانا چاہتی ہے اور اپنے کمرے میں لے گی۔ وہاں ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو چونک گیا، وہ اسامہ تھی، سردار حیدر خان کی بیٹی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا اور مختلف محاذوں پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی کہ اسے اطلاع ملی کہ اڈے پر حملہ ہو گیا ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچا تو وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ اس کے چہرے کا رخ جب واضح ہوا تو میں اسے دیکھ کر شدت سے چونک اٹھا۔ اسکرین پر نظر آنے والا امیر اجگري دوست کھالہ تھا جو استاد بھلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالہ اس کی قید میں آ گیا۔ اسی دوران میڈم کے اظہار الفت سے میں سخت پریشان تھا۔ پروین ہنوز لاپتہ تھی لیکن میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسامہ کو اغوا کر لیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسامہ نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ابا پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرادی لیکن کھالہ اسامہ کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ ایک زبردست مقابلے کے بعد میں نے اسے دھول چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ آخر کار طے یہ ہوا کہ ہم براہ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربہ کار شخص تھا۔ ہم جب ڈیرے تک پہنچے تو ہمیں جھاڑی میں ایک لاش نظر آئی، اسے دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔

کمرے واقع تھے۔ کسی کمرے میں بتی روشن نہیں تھی۔ ابھی سوئے ہوئے تھے یا حویلی میں اس وقت کوئی موجود نہیں تھا۔ کھالے نے سرگوشی کی۔ ”شہرے! جو بھی ہے، اسی چھت کے نیچے ہے جس پر ہم کھڑے ہیں۔ چلو، نیچے اترتے ہیں۔“

اُس نے بائیں ہاتھ چلنے کا اشارہ کیا تھا۔ میں اس طرف بڑھا۔ چھت کے اختتامی حصے میں سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔ گاگڑ کی مدد سے میں یہ دیکھ پانے میں کامیاب رہا کہ سیڑھیوں کی حالت خاصی ناگفتہ بہ تھی۔ بھی پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہا تھا۔ کھالا میرے عقب میں چلا آ رہا تھا۔ سیڑھیاں کشادہ برآمدے میں ختم ہوئیں۔ اس دس فٹ چوڑے برآمدے میں تین پرانی طرز کے چوبی دروازے دکھائی دے رہے تھے مگر ان میں بھی کوئی بتی نہیں جل رہی تھی۔

کھالے نے تشویش ناک لہجے میں سرگوشی کی۔ ”شہرے! کوئی گڑبڑ ہے یا؟“

اس کی آواز میں چھپی ہوئی تنگی مجھے وجود میں اُترتی محسوس ہوئی۔ میں نے کان لگائے، کچھ سننے کی کوشش کی مگر سوائے درختوں کی مخصوص سرسراہٹ کے فضا بالکل خاموش تھی۔ پہلے دروازے کے پاس پہنچ کر کھالے نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور خود دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد دروازہ ہلکی سی جڑا ہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ کھالے نے اندر جھانکا۔ مطلق اندھیرے میں اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا ہوگا۔ وہ بلی کی طرح دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد کمرے میں ہلکی سی روشنی پھیلی۔ میں خود پر اختیار نہ رکھتے ہوئے کمرے میں جھانکنے پر مجبور ہو گیا۔ کھالا ایک ہاتھ میں نخی سی ٹارچ لیے کمرے کے صحن میں کھڑا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کمرہ بالکل خالی تھا۔

کوئی وقت ضائع کیے بغیر ہم دونوں نے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ اُس کمرے میں بھی سوائے چار پائیوں، ٹرنکوں اور روایتی بندوقوں کے کچھ نہ ملا۔

کھالے نے سرگوشی کی۔ ”شہرے! کام خراب ہے۔ لگتا ہے کہ حیدر خان کے کارندوں کو ہماری آمد کی خبر مل گئی ہے۔ وہ یا تو یہاں سے کسی اور ٹھکانے میں منتقل ہو گئے ہیں یا پھر چھپ کر ہمارے گرد گھیرائنگ کرنے کے چکر میں ہیں۔ جلدی کرو..... ہمیں جلد از جلد تلاشی لے کر یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

ہم دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے تیسرے کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ کمرہ بھی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ میرے رگ و پے میں آگ بھڑکنی۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”کھالے! میں حیدر خان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا.....“

اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ دھرا اور ٹارچ کی روشنی ارد گرد مارنے لگا۔ کمرے میں موجود سامان کو دیکھنے پر بہ آسانی احساس ہوتا تھا کہ کمرے میں رہنے والے فوری طور پر کمرے سے نکل گئے تھے۔ انہیں اتنی مہلت نہیں مل سکی تھی کہ وہ اپنا سامان سمیٹ لیتے۔ کونے والے کمرے کے آگے اسٹور بنا ہوا تھا۔ میں نے جونہی اسٹور کی کنڈی کھولی اور ٹارچ کی روشنی میں سیلن زدہ اسٹور کے اندر جھانکا، میرے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ٹارچ کی ناکافی روشنی میں دکھائی دینے والے تلکے منظر نے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ میرے بدن میں اتار دیا تھا۔

کمرے کی داہنی دیوار کی جڑ میں چار لاشیں آدھی ترچھی فرش پر پڑی تھیں۔ ان کے زینیں بوس ہونے کا انداز چٹکی کھاتا تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے پلٹ کر کھالے کو دیکھا جو میری جانب پشت کیے چوکس انداز میں کھڑا ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے کھڑا رہنے دیا اور خود محتاط انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔ چاروں چہروں پر باری باری ٹارچ کی روشنی چھینکی۔ وہ بھی میرے لیے اجنبی تھے۔

میں نے بیروں کے بل بیٹھ کر پہلے شخص، جس کے بدن پر بڑا سا جالگہ اور سفید رنگ کی عام سی بنیان تھی، کی کلائی تھامی۔ نبض تھامنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ اُس کے بدن میں موت کی خفگی اُتر چکی تھی۔ ٹھنڈی کلائی نے سمجھا دیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے سرد ہو چکا تھا۔ میں نے اُس کے سینے پر ٹارچ کی روشنی چھینکی۔ کوئی زخم دکھائی نہیں دیا۔ چہرے کو غور سے دیکھا تو پتا چل گیا کہ اُس کی موت سانس گھٹنے سے واقع ہوئی تھی کیونکہ اُس کے موٹے ہونٹ نیلگوں ہو چکے تھے۔ بند آنکھوں کے پپوٹوں پر نیلا ہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اُس کی گردن میں رتی کا پھندا دکھائی دیا تو میں اک طویل سانس پھینچوں میں اُتار کر اُٹھا اور دوسری لاش کے پاس جا بیٹھا۔ وہ زندگی میں دبے پتلے جسم کا مالک رہا تھا۔ اس وقت ویل کی سفید ٹیٹس اور شلوار میں ملبوس تھا اور اُس کی گردن میں نائیلون کی باریک مگر بہت مضبوط رتی پھنسی ہوئی تھی۔ چہرہ نیلا ہٹ پکڑ چکا تھا۔ آنکھیں وحشت

ناک انداز میں کھلی ہوئی تھیں۔ تیسرا شخص کافی فریبی مائل تھا۔ اُس نے تہ بند اور سفید رت کا میلا سا سلوکا پائین رکھا تھا۔ اُس کا کسرتی بدن بھی موت کا پیر بن اور ڈھ چکا تھا۔ اُسے قتل کرنے کا طریقہ بھی وہی تھا یعنی گلے میں رتی باندھ کر پھانسی دی گئی تھی۔ چوتھا شخص خاصا لمبا ترنگا تھا۔ اُس کا چہرہ صحنی ڈاڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں میں چھپا ہوا تھا۔ سر کے بال بھی خاصے بڑے بڑے تھے۔ اس وقت وہ کمرے کی ٹکڑ میں گردن کے بل یوں ڈھیر ہوا پڑا تھا جیسے اُس کا منکا ٹوٹ چکا ہو۔ گلے کی رتی بڑے کاروں والی ٹیٹس کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر مجھے یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ اس کے گلے میں بھی موت کی رتی تن چکی تھی۔

اس کے باوجود کہ میں یہاں مرنے مارنے کی نیت سے ہی آیا تھا، چار مردہ بدن دیکھ کر میرے تن بدن میں خوف کی لہریں سرسرا نے لگیں۔ میرے سامنے ایک قطار میں چار انسانی لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کاتھ کباڑ کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس ہولناک کمرے سے نکل کر کھالے کے پاس پہنچا، اُسے ہولے سے پکارا۔ وہ میری جانب پلٹا۔ ”ہاں! کیا ہے وہاں؟“

میں نے کہا۔ ”کھالے! کمرے میں چار لاشیں پڑی ہیں۔“ وہ چونکا، میرے پہلو سے نکل کر کمرے میں گیا، پلٹا تو اُس کے تن بدن میں غیر معمولی پھرتی بھری ہوئی تھی بولا۔ ”جلدی کر شہرے..... اُن کمروں کی تلاشی لیتے ہیں۔“ وہ مجھے دیکھے بغیر تیزی سے صحن کو چہرتے ہوئے قطار میں بے ہوئے کمریوں کی طرف بڑھا۔ اب اُس نے احتیاط پس پشت ڈال دی تھی۔ میں بیجان آ میز انداز میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ پہلے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے میں تین جھلنگ سی چار پائیاں پڑی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ ایک چار پائی پر کئی ہوئی رستیوں کے ٹکڑے اور سرخ رنگ کا دو پٹا پڑا ہوا تھا۔ میں نے جھپٹ کر دو پٹا اُٹھا لیا اور دانت پیس کر بولا۔ ”کھالے! یہاں پتوں دی جتنی اے.....“

(کھالے! یہ تو پروین کا دو پٹا ہے) کھالے نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ وہ اس کے ساتھ دانی چار پائی کے نیچے ٹارچ کی روشنی پھینک کر کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر عجیب سی دیوانی طاری ہو گئی۔ میں نے دوپٹے کو اپنی

مسافر

گردن کے گرد لپیٹ لیا اور چار پائی کے گرد برق رفتاری سے چکر لگایا۔ فرش پر جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں دکھائی دیے رہی تھیں اور بلاشبہ یہ پروین کی کلائیوں سے ٹوٹ کر گری تھیں۔ کھالے نے میری کیفیت بھانپتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ”باؤلا ہو گیا ہے کیا؟ عقل کے ناخن لے، ہماری تھوڑی سی حماقت ہماری جان لے لے گی۔“

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ کھالے نے اچانک میرے سامنے آ کر مجھے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ شاید ایسا نہ کرتا تو میں اپنے حواس میں نہ رہتا اور واقعتاً کوئی حماقت کر بیٹھتا۔ یوں لگا جیسے میں یکا یک ہوش میں آ گیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں ہمیں پروین کا ایک جوتا، ٹوٹا ہوا فقری ٹنگن اور مردانہ کھٹری چپل کی جوڑی نظر آ گئی۔ کمرے میں دوبارہ بور کی بندوقیں، ایک پستول اور استعمال کی کئی اشیاء موجود تھیں۔ فرش پر جگہ جگہ سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔

کھالا بولا۔ ”یہ تو طے ہو گیا کہ پروین کو یہیں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ اس چار پائی پر کسے باندھا گیا تھا؟ یہ سوچنے والی بات ہے۔“

”مگر پروین کہاں ہے اس وقت؟“ میں تیز لہجے میں بولا۔

کھالا مجھے کھینچ کر کمرے سے باہر لے آیا۔ کمرے کے باہر پیا اور عقل ہمارے منتظر تھے۔ پیانے پوچھا۔ ”اس کمرے میں کیا ہے؟“

میں نے تفصیل سے آگاہ کیا۔ وہ پریشان کس انداز میں بولا۔ ”پوری حویلی خالی پڑی ہے۔ ٹکڑ والے چھوٹے کمرے میں چار لاشیں پڑی ہیں جو یقیناً اس حویلی میں رہنے والے حیدر خان کے غنڈوں کی ہیں جنہیں کسی نے بے دردی سے قتل کیا ہے۔ قاتل نے انہیں مزاحمت کرنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم سے پہلے یہاں آنے والے یا آنے والوں نے سوتے میں ہی ان کا قتل قمع کر دیا ہے۔“

”کیا تم نے یہ کمرے دیکھے ہیں؟“ کھالے نے پوچھا۔

”ہاں.....“ پیا بولا۔ ہم اس دوران چلتے ہوئے صحن کے بیچ آن کھڑے ہوئے تھے۔ ”ایک کمرے میں ایسے آثار دکھائی دیے ہیں جیسے وہاں کسی لڑکی کو باندھ کر رکھا گیا ہو۔ رستیوں اور چوڑیوں کے ٹکڑے فرش پر بکھرے ہوئے ہیں۔ حویلی کا بڑا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔“ ہم چاروں متشکر انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”مگر اس کمرے میں، جس کمرے کی ہم

نے تلاشی لی ہے، ایسا سب کچھ ہم نے بھی دیکھا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ پروین کے علاوہ بھی کسی لڑکی کو یہاں باندھ کر رکھا گیا تھا؟

پیانے کندھے اُچکائے۔ ہمیں ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کھالا تیز تیز قدموں سے پیانے کے بتائے ہوئے کمرے میں گھسا۔ چند لمحوں کے بعد اس کمرے سے نکل کر حویلی کے آخری کمرے میں گھس گیا۔

میں مایوس انداز میں ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ میری تمام تر ریاضت اکارت گئی تھی۔ حویلی کی چھت پر کھڑے ہو کر میں نے جن امیدوں کا دامن تھاما تھا وہ بے جان انداز میں میرے گلے سے لپٹ گئی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ میری سانس تک کرنے لگی تھیں۔ کھالے نے واپسی پر بتایا۔ ”پیانے ٹھیک کہا ہے۔ اس کمرے میں بھی کسی لڑکی کو رکھا گیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اور آخری کمرے میں؟“

”وہ تو خان کا عشرت کدہ ہے۔“ اس کے لہجے میں غیر معمولی نفرت گھل گئی۔ پھر پیانے کے کہنے پر ہم سب نے پوری حویلی چھان ماری۔ یہ تو جتنی تھا کہ ہم سے پہلے یہاں کوئی آیا تھا اور خان کے شاہ زوروں کی خواہیدگی کو موت کی اتھاہ گہرائی میں بدلتے ہوئے پروین سمیت دو یا تین لڑکیوں کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ کھالے کا خیال تھا کہ حملہ آور دو لڑکیوں اور ایک مرد کو حیدر خان کے چنگل سے نکال کر کہیں لے گیا تھا۔ ایک مرد اور ایک عورت کون تھے؟ یہ علم نہیں ہو سکا تھا۔ کوئی کلیو ہمارے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی آسمان سے سیدھا حویلی میں اُترا تھا اور چار زور آوروں کو ہلاک کرنے اور تین مغویوں کو کاندھوں پر لا کر واپس آسمان کی طرف پرواز کر گیا تھا۔

پیانے کا ذہن جاگ رہا تھا۔ اُس پر مایوسی کی تھکن طاری نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک کمرے سے ایک چھوٹا سا چوبی صندوق کھینچ کر باہر نکال لایا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے مسکرا کر بتایا۔ ”اس میں جدید اسلحہ ہے، ایسا کہ میڈم دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ہمارے ناکام دورے کا مالی نعمت ہے۔“

ہمیں حویلی میں دندناتے ہوئے آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ کسی نے دخل نہیں دیا تھا۔ جہاں دن کے اُجالے میں کوئی آنے کی جرات نہیں کرتا تھا، وہاں رات کے اس پہر، کسے آنا تھا۔ حویلی کا اندر مردہ ہو چکا تھا۔ حویلی کا باہر زندہ تھا مگر گہری نیند کے استغراق میں تھا۔ مایوسی میرے رگ و پے میں سرایت ہو چکی تھی۔

جب پیانے نے واپسی کا حکم دیا، یوں لگا جیسے میری ہڈیوں میں ہونٹیں ہوں اور واپسی کی راہیں تاریک..... میں نے کھالے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور گلو گلو ہو گیا۔ ”کھالے! پروین نہیں ملی۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہوگی؟“

کھالے نے مجھے سینے سے لگایا، تسلی دی اور کمر میں ہاتھ ڈال کر حویلی کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ اسلحہ والا صندوق عقیل نے اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ اُس کے چلنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ صندوق خاصا وزنی تھا۔ ہم جس راستے سے آئے تھے، اُسی پر چلتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچے۔ ابھی تک چار سو دبیز اندھیرا طاری تھا۔ گاڑی میں وحید کو دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس حلق میں اُتاری۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا یا گہری نیند میں تھا۔ پیانے کی مدد سے عقیل نے صندوق گاڑی کے عقبی حصے میں رکھا اور ہاتھ جھاڑ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ہم چاروں نے لباس بدلا، غیر ضروری اسلحہ چھپا دیا اور واپسی سفر کا آغاز کیا۔ پروین کا سرخ دوپٹا میں نے اپنی جھولی میں رکھ چھوڑا تھا اور عجیب یاس بھری سرد نگاہیں اُس پر جمادی تھیں۔

پیانے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہی بیک مرر میں میرے اور کھالے کے درمیان گردن ڈھلکائے پڑے ہوئے وحید کو دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا بچ جائے گا؟“

میں نے غیر ارادی طور پر وحید کی نبض ٹٹولی اور مطمئن انداز میں کہا۔ ”ہاں..... یہ خطرے سے باہر ہے۔“

کھالے نے وحید کی کمر میں بازو جھانک لیا اور اُسے بڑی نرمی سے اپنی جھولی میں لٹھک لیا۔ میں نے کہا۔ ”کھالے! وہ کون ہو سکتا ہے جس نے موت کے منہ میں چھلانگ لگا کر پروین کو حیدر خان کی حویلی سے نکال لے جانے کی جرات کی؟“

کھالے نے کندھے اُچکائے، بولا۔ ”ہمارا کوئی نہیں..... جو بھی ہے، وہ یا تو حیدر خان سے پر خاش رکھتا ہے یا اُس دوسری لڑکی کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ شہرے! اگر ہماری قسمت جاگ رہی ہے تو پھر میرا اندازہ درست بھی ہو سکتا ہے۔“

”مگر پھر وہ پروین کو اپنے ساتھ کیوں لے گیا؟“

”بچوں جیسی باتیں کرتے ہو یا ر!“ کھالا حسبِ عادت جھنجھلا گیا، ماتھے پر ہل ڈال کر بولا۔ ”اگر ہم پروین کے ساتھ کسی اور قسمت ماری کو قید میں پڑا دیکھتے تو کیا اُسے یہیں چھوڑ جاتے؟“

مجھے اپنے احمقانہ سوال پر ایک ذرا خفت ہوئی۔ میں

نے کہا۔ ”اس کا کیا قصہ ہے؟“

میرا اشارہ اُس کی گود میں پڑے وحید کی طرف تھا۔ پیانے کی آواز گاڑی میں گونجی۔ ”میرا شاہ کے غنچے کا خیال ہے کہ یہ سارا اسلحہ ملے تم نے سجایا ہے۔ کیوں خالد؟“

یہ کہہ کر اُس نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔ کھالے نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ میں نے حشمگیں نظروں سے باری باری دونوں کو دیکھا اور کہا۔ ”مجھے تم دونوں کا یوں ہنسنا بہت برا لگ رہا ہے۔“

کھالے نے جلدی سے کہا۔ ”تو کیا تمہاری یہ بے معافی تفتیش ہمیں اچھی لگ رہی ہے؟ تم نرے گاؤ دی ہو۔ پیانے نے سچ کہا ہے۔ کیا میں نے یہ سارا ناک رچا رکھا ہے جو تم مجھ سے سوال پر سوال کیے جا رہے ہو؟ جو کچھ تم نے دیکھا، وہی کچھ ہم سب نے دیکھا ہے۔ جو اندازہ ہم لگا سکتے ہیں، تم بھی لگا سکتے ہو۔“

میں نے ایک نگاہ شکایت کھالے کو دیکھا۔ وہ بدل گیا تھا یا پھر میری نظر بدل گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”کھالے! یارا! میں بہت پریشان ہوں۔ دیکھو! ہمارے ساتھ قسمت نے کیا کھیل کھیلایا ہے۔ وحید کی نیم مردہ حالت، چار لاشوں والی خالی حویلی، ہمارا ناکام سفر..... کیا یہ سب کچھ پریشان کن نہیں ہے؟“

کھالے کے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھری، بولا۔ ”سامنے کی بات ہے، مجھے کسی کوشش کو تو سمجھ جاؤ گے۔ وحید کی یہاں موجودگی ہم پر یہ واضح کرتی ہے کہ پروین کے ساتھ یہاں قید میں رکھی گئی لڑکی عاشری کے سوا کوئی دوسری نہیں تھی۔ یہ بھی سامنے کی بات ہے کہ خان کے غنڈوں نے وحید کو مردہ تصور کر کے یہاں پیلے میں پھینک دیا تھا کہ اس کی لاشیں جنگلی جانور نوچ کھا لیں۔ اس کی قسمت بھلی تھی کہ ہم غیر متوقع طور پر عین اُس وقت یہاں پہنچ گئے جس وقت یہ ایک ماہر (بھیڑیے) کا نوالہ بننے والا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تیسرا قیدی امیر نواز تھا جسے پروین کے ساتھ یہاں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ اب یہاں ہم سے پہلے کون پہنچا، اُسے کس کی تلاش تھی، پروین، عاشری یا امیر نواز کی..... یہ تو اللہ سو ہوتا ہی جانتا ہے۔ یہ بھی علم نہیں کہ باہر سے کوئی آیا یا اندر موجود مغوی جو امیر نواز بھی ہو سکتا ہے یا کوئی اور بھی، خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا ہو اور اس نے یہ کارروائی کی ہو..... بہر حال ان باتوں کا وقت آنے پر پتا چلے گا۔“

میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ شرمندگی ہوئی۔ خواہ لفظ ہی ثابت ہوئی، اس کے ذہن نے اندازوں کی بنیاد پر

ایک کہانی تیار تو کر لی تھی جبکہ میرے ذہن نے اب تک کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اس کی باتیں دل کو لگ رہی تھیں۔ تیسرا قیدی امیر نواز ہو سکتا تھا کیونکہ وہ بھی نور پور سے غائب تھا۔ اُس کے پُر اسرار غیاب نے اُس کی ذات مشکوک کر دی تھی۔ اغوا کاروں نے عاشری کو جب اغوا کیا ہوگا، تب وحید بھی اُس کے ساتھ ہو گا۔ انہوں نے وحید کو بھی عاشری کے ساتھ اغوا کر لیا ہوگا تاکہ ان کی کارروائی کا گہنی شاہد کسی کو کچھ بتانہ پائے۔ حیدر خان کے پالتو غنڈے حد درجہ ظالم فطرت اور سفاک تھے۔ زندگی، عزت اور رحم ان کے قرب کو چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ علاقے کے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ حیدر خان کے پاس اشتہار یوں اور قاتلوں کا ایک گروہ ہے جو اُس کے ہلکے سے اشارے پر خون کی ندیاں بہانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ان اشتہاریوں میں سے آج چار دنیا سے کوچ کر چکے تھے۔

بچکولوں کی تال پر بنی اور آرام دہ گاڑی عازم سفر تھی جبکہ میرے ذہن میں خان کی سالخورہ مگر محفوظ اور بھانک حویلی کے مناظر جاگ رہے تھے۔ چاروں مردہ نیلگوں چہرے، ان کی گردنوں میں دھنسی ہوئی تانیلیوں کی سرخ ڈوری اور سکوت اور اندھیرے کا ڈراؤنا راج..... چشم تصور میں ایک بہت ہی جسیم اور طاقت ور وجود ابھرا جس نے آن کی آن میں چاروں شاہ زوروں کا زندگی سے ناکا کاٹ دیا اور تین قیدیوں کو اٹھا کر چلتا بنا۔ کیا کوئی شخص اتنا دلیر ہو سکتا تھا؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ چاروں پر نوٹ پڑنے والا کوئی ایک شخص نہ ہو بلکہ کوئی مضبوط اور ان سے بھی زیادہ ظالم فطرت گینگ ہو..... سردار حیدر خان کا کوئی دشمن بھی یہ وار کر سکتا تھا۔ اس صورت میں میری پروین ایک بھیڑیے کے چنگل سے نکل کر دوسرے کے بھیانک جبرؤں میں جا پھنسی تھی۔ میں نے جب اپنے اس خدشے کو کھالے پر آشکار کیا تو وہ بولا۔ ”یہ بعید از قیاس بھی نہیں مگر میرا دل نہیں مانتا۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ کوئی ایک شخص ہی تھا، دل جلا، یا کوئی من چلا..... رہی بات تین قیدیوں کو اٹھا کر لے جانے کی، تو ممکن ہے کہ تینوں اپنے پیروں پر چلنے کے قابل ہوں اور اس کے ساتھ روانہ ہو گئے ہوں۔“

اچانک میری توجہ وحید کی طرف مبذول ہوئی۔ میں نے کہا۔ ”اس کا کیا کرنا ہے؟“

پیانے نے ہنس کر کہا۔ ”یہ تو تمہارا کیس ہے، جہاں کہو گے، وہیں پھینک کر ملتان چلے جائیں گے۔“

میں نے گاڑی کے باہر قدم پھیلے ہوئے سرکندوں

سے الجھتے ہوئے رات کے آخری پہر کو دیکھا، کچھ سوچا پھر پوچھا۔ ”ہم اسے کہاں اتار سکتے ہیں؟“

”چوک قریشی کے آس پاس۔۔۔۔۔“ کھالے نے جلدی سے کہا۔

”کیا ہم اسے اپنے ساتھ ملان نہیں لے جاسکتے؟“

میں نے پوچھا۔ ”میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم اس سے بہت کچھ پوچھ سکتے ہیں۔“

پیانے کہا۔ ”نہیں شہر یار! یہ صرف یہی بتا سکتا ہے کہ اسے اور اس کی بہن کو کس طرح اغوا کیا گیا۔ ہمیں اس منظر کشی کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تو۔۔۔۔۔ پھر کیا چوک قریشی میں اتار دیں؟“

”بہتر تو یہی ہے۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔“

”کیا مگر۔۔۔۔۔؟“

”میرا خیال ہے کہ۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔“ پیاسوچ میں پڑ گیا۔

”اسے ساتھ لے جانا ہی بہتر ہوگا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ اسے پھر اغوا کر لیا جائے۔“

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کا اندیشہ بے محل نہیں تھا۔ پھر کچھ سوچ بچار کے بعد یہ طے پایا کہ وحید کو اپنے ساتھ ملان لے جانا چاہیے۔

ڈیر اوڈ پر چڑھتے ہی گاڑی کا میٹر سو کا ہندسہ عبور کر گیا۔ چوک قریشی، بصیرہ اور مظفر گڑھ کے باسی ابھی گہری نیند میں ہی تھے جب ہم گزر کر دریائے چناب کے پل پر پہنچے۔ ٹول پلازے اور دریا کے پل کے درمیان پولیس نے ناکا لگا رکھا تھا۔ پیانے گردن موڑے بغیر تیز لہجے میں کہا۔

”شہر یار! یہ تمہارا بیٹا ہے اور سخت بیمار ہے، اسے ہم ڈیرہ غازی خان سے نشتر اسپتال میں داخل کروانے کے لیے لے جا رہے ہیں۔ ہم بہت جلدی میں ہیں۔ اوکے؟“

میں نے طبیی انداز میں سر ہلایا۔ اسی دوران ہماری گاڑی لین میں رُک چکی تھی۔ ہم سے آگے چار پانچ کاریں کھڑی تھیں۔ ایک ویگن بھی لین میں لگی ہوئی تھی پیاسوچ۔

”یار! یہ تو بڑی سخت چیکنگ کر رہے ہیں اور کاروں کی ڈگیاں بھی کھول کر دیکھ رہے ہیں۔ لگتا ہے ہمارے کسی بھائی بند نے کوئی بڑا ہاتھ مارا ہے کہیں پر۔۔۔۔۔“

پندرہ بیس منٹ کے بعد ہماری باری آئی۔ دونوں جانب سے وردی پوشوں نے گاڑی کو گھیرے میں لے لیا۔ پیانے طرف آنے والے اہلکار نے اُسے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ پیانے شیشہ اُتار کر نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”بھائی! ہم ایمر جنسی میں ہیں۔ ہمارا بچہ بیمار ہے۔ اسے فوری طور پر نشتر

اسپتال میں پہنچانا ہے۔“

ساتھ ہی اُس نے ہماری سمت ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اہلکار نے عقبی دروازے کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھنا چاہا مگر اُسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پیانے فوراً لائٹ آن کی، شیشہ اُتار اور کہا۔ ”دیکھ لیجیے۔۔۔۔۔ ہم ڈیرہ غازی خان سے آ رہے ہیں۔ اپنی سلی کر لیجیے اور خدا را ہمیں جلد فارغ کر دیجیے۔“

اہلکار کو بے ہوش بچہ دکھائی دیا۔ بچے کی بینڈج بھی نظر آ گئی۔ بولا۔ ”یہ تمہارا کیا لگتا ہے؟“

پیانے کہا۔ ”یہ میرا کچھ نہیں لگتا۔ یہ سردار احمد بخش کھوسا کا نواسہ ہے، میں اس کا ڈرائیور ہوں۔“

سردار احمد بخش کھوسا ڈیرہ غازی خان کا معروف سیاست دان تھا۔ جونہی اُس کا نام کانٹیل کے کانوں میں پڑا، اُس کی تمام حسیں یکا یک بیدار ہو گئیں، بولا۔ ”ٹھیک ہے سائیں۔۔۔۔۔ تم جاسکتے ہو۔“

ساتھ ہی اُس نے اپنے ساتھیوں کو مخصوص انداز میں بیریز ہٹانے کا اشارہ کر دیا۔ پیانے دونوں شیشے چڑھائے اور گاڑی نکال لی۔ طویل سانس لے کر بولا۔ ”نئی اور بڑی گاڑی کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ چھوٹے موٹے افسر پر اس کی چمک کا دبدبہ پڑ جاتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر وہ سردار سے کنفرم کر لیتا تو۔۔۔۔۔“

ہم اس وقت چناب کے پل کے وسط میں پہنچ چکے تھے۔ وہ فلک شکاف قہقہہ لگا کر بولا۔ ”یہ کانٹیل تھا۔ اگر ایس ایچ او بھی ہوتا تو کنفرمیشن کی جرأت نہ کرتا۔ ایک بات ہے۔۔۔۔۔ یہ منڈا ہمارے کام آ گیا ورنہ انہوں نے تلاشی لیے بغیر ہمیں گزرنے نہیں دینا تھا۔ ہمارے پاس گاڑی میں اتنا اسلحہ رکھ کر گھومنے کا کوئی جواز نہیں ہے، اس لیے فوراً دھر لیے جاتے۔“

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ہمارے پاس جدید طرز کے اسلحے کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود تھا۔ حیدر خان کی حویلی سے اٹھایا گیا اسلحہ میں نے دیکھا تو نہیں تھا مگر میں جانتا تھا کہ اس کی نوعیت بہت خطرناک تھی۔ پیاجی نے عام نوعیت کی بارہ بورر انگنوں اور سی آئی ٹوینک گنوں کی طرف آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ اگر ان گنوں کی اُس کے نزدیک کوئی اہمیت ہوتی تو حویلی میں موجود گنوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انہیں گاڑی میں رکھنے کی گنجائش بھی نہ نکل پاتی۔

ابھی رات کا اندھیرا ملتان کے درود یوار سے لپٹا ہوا تھا جب ہم اپنی کوشی پر پہنچے۔ ظاہر شاہ نے چیک کرنے کے بعد گیٹ کھولا۔ پورچ میں گاڑی روکنے کے بعد پیانے کہا۔

”شہر یار! تم اس بچے کو اٹھا کر گیٹ روم میں لے جاؤ۔ ہم اسلحے کو اسٹور کر کے چلے جائیں گے۔ میرا شاہ سے رابطہ کر کے اُسے رپورٹ دیدینا۔ اوکے؟“

میں نے اُسے ”اوکے“ کہا اور گاڑی سے اتر کر بچے کو کھینچ کر کندھے پر ڈال لیا۔ کھالامیرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ گیٹ ہاؤس کے مین لاؤنج میں کرسی پر براہمان کن مین سے میں نے میڈم اور میرا شاہ کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے لاٹلی کا اظہار کیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے وحید کو رمان سے بیڈ پر لٹا دیا اور خود صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ کھالامیرے پیچھے پیچھے گھومنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”کھالے! اب کیا ہوگا؟“

کھالے کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا، ایک نظر وحید پر ڈالی اور کہا۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں یار؟ ایک کوشش ناکام ہو گئی ہے، دوسری کوشش بھی ناکام ہو سکتی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم شکست تسلیم کر کے بیٹھ جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم کسی بھی وقت پروین تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اللہ ہماری مدد کرے گا۔“

تھوڑی سی تاخیر نے میری بہن کو مجھ سے نجانے کتنا دور کر دیا تھا۔ اگر ہم گھنٹا بھر پہلے پہنچ جاتے تو وہ ہمیں مل جاتی۔ مجھے افسردہ اور متاسف دیکھ کر کھالے نے ہمدردی سے کہا۔ ”غم نہ کرو شہرے خان! مجھے یقین ہے کہ پروین کے ساتھ امیر نواز ہے، وہ مرنے کو جائے گا مگر اُس پر آج نہیں آنے دے گا۔“

میں نے ٹھٹک کر اُسے دیکھا۔ اس یقین کا پس منظر کوئی نہیں تھا میں نے کہا۔ ”کھالے! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سردار حیدر خان کے کسی دشمن نے یہ کارروائی کی ہو اور وہ بھی اسی قماش کا آدمی ہو، پھر؟“

کھالے کے لبوں پر آذر وہ سی مسکراہٹ تیر گئی بولا۔ ”شہرے! تم نے پڑھ لکھ کر گنوا دیا ہے۔ بھلے آدمی! یہ کارروائی اکیلے آدمی کی ہے۔ اگر وہ بھی خان کے قبیل کا کوئی فرد تھا تو اُسے لڑکیوں کے ساتھ ساتھ امیر نواز کو لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ جہاں چار آدمیوں کو قتل کر چکا تھا، وہیں ایک اور قتل بھی کر دیتا۔ وہ ہمارا خیر خواہ تھا یا نہیں، وہ اغوا ہونے والوں کا ہمدرد ضرور تھا۔“

میں نے فون پر میرا شاہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کئی مرتبہ بیل بجنے کے بعد بھی فون اٹینڈ نہیں کیا گیا۔ وہ شاید سو رہا تھا۔ میرے پاس میڈم کا نمبر نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی

تو میں اس سے اس وقت رابطہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ چونکہ ہم اپنے مشن میں ناکام رہے تھے، اس لیے کسل مندی اور نقاہت بدنوں پر طاری تھی۔ میں نے جمائی لی، پانی کا ایک گلاس حلق سے اُتارا اور وحید کا معائنہ کرنے لگا۔ ایک غلطی ہو گئی تھی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے میں میڈیکل کٹ اٹھانا بھول گیا تھا۔ وحید کے لیے کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

وحید کی نبض کی رفتار نارمل تھی۔ دھڑکن بھی ٹھیک تھی۔ وہ ٹیکوں کے گہرے اثر میں تھا اور اسے جگانا مناسب نہیں تھا۔ تجھی میں اُس کے برابر لیٹ گیا۔ کھالے نے بھی میری تقلید کی۔ تھکے تھکے انداز میں بولا۔ ”شہرے خان! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری نیکی ہمارے گلے کا پھندا بن جائے۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونکا۔

”اس کی آنکھ کھلے تو اسے پچھلے منظر بھول جائیں اور ہمارے چہرے یاد رہ جائیں۔ یہ ہمیں ہی اغوا کر سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں یار! یہ اتنا بھی بچہ نہیں ہے۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں تشکیک کے ڈورے بہ دستور لہراتے دیکھے تو میں نے کہا۔ ”تم نے ابھی تک اپنے بارے کچھ نہیں بتایا۔“

اس نے کشن سے ٹیک لگالی، سر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر تک ایسی ہی حالت میں پڑا رہا، پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ ”میرے پاس بتانے کے لیے لمبی کہانی نہیں ہے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ میں چمن زار سے بھاگا تو میرے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ ایسا کوئی ٹھکانا ذہن میں نہیں تھا جہاں پہنچ کر خود کو محفوظ خیال کر لیتا۔ بس ناک کی سیدھ میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، جب میں نے سوچا کہ میں آخر کب تک بھاگ سکتا ہوں، تو رُک گیا اور ایک رکشا میں بیٹھ گیا۔ اُسے میں نے لاری اوڑے چلنے کا کہا۔ جونہی اُس نے رکشا سڑک پر ڈالا، پولیس کے سائرن چاروں طرف بجنا شروع ہو گئے۔ اُس نے بیک مرر میں مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اُس نے عجیب حرکت کی اور رکشے کو گھما کر ایک کشادہ گلی میں ڈال لیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ تم مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟ تو اُس نے کہا۔

”وہاں، جہاں پہنچ کر تم پولیس والوں سے محفوظ رہ سکتے ہو۔“

”میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور تعجب بھری داستان کو غور سے سننے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”شہرے خان! وہ استاد بلو کا کارندہ تھا۔ وہ مجھے گلیوں میں گھما پھرا کر ایک کوشی میں لے گیا جہاں استاد بلو کا نائب میرا استقبال کرنے کے لیے موجود تھا۔ اس نے مجھے چناہ دی اور کئی روز تک چھپائے رکھا۔ پولیس میری

پُر لطف

بیوی: ”اگر میں پاکستان کی سب سے بڑی
چوٹی 2-K پر چڑھنے میں کامیاب ہو جاؤں تو آپ
مجھے کیا دیں گے؟“

شوہر: ”ہلکا سا دھکا۔“

تین لڑکوں نے ایک لڑکی کو پروپوز کیا۔
پہلا لڑکا: ”میں تمہارے لیے اپنی جان دے
سکتا ہوں۔“

لڑکی: ”وہ تو سب کہتے ہیں۔“
دوسرا لڑکا: ”میں تمہارے لیے چاند تارے
توڑ کر لاسکتا ہوں۔“

لڑکی: ”پرانا ڈائلاگ ہے۔“
تیسرا لڑکا: ”میں تمہیں شادی کے بعد جزیئر
لگوادوں گا۔“

لڑکی خوشی سے بولی: ”پاگل! اتنا چاہتے ہو
مجھے؟“

دو عورتیں ایک درخت کے نیچے بیٹھی کافی دیر
سے باتیں کر رہی تھیں کہ اچانک درخت سے ایک
آدمی گرا۔ پہلی عورت بولی: ”یہ آدمی کیسے گرا؟“
دوسری عورت کچھ بولنے ہی لگی تھی کہ آدمی خود
بول پڑا۔

”اللہ کے واسطے چپ ہو جاؤ تمہاری باتیں
سن سن کر پک گیا تھا اس لیے گر پڑا ہوں۔“

سیکرٹری باس سے ”سر آپ ہمیشہ شادی شدہ
مرد درخواست گزاروں کو ہی ملازمت کیوں دیتے
ہیں؟“

باس (مسکراتے ہوئے): ”اس کی دو وجوہات
ہیں۔ 1 ان کو بے عزتی سہنے کی عادت ہوتی
ہے۔ 2 اس کے علاوہ ان کو گھر جانے کی بھی جلدی
نہیں ہوتی۔“

مرسلہ محمد قورق اللہ نیازی مغانیوال

ہے، جل سکتا ہے مگر بے وفا کی نہیں کر سکتا۔ مگر شہرے! اب
جیکہ پروین سردار حیدر خان کی جیل سے نکل چکی ہے، کیا اس کو
آزاد کر دیا جانا بہتر نہیں ہوگا؟“

”میں اس بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔
میڈم کو رپورٹ کر دوں گا۔ وہ کیا فیصلہ کرتی ہے، میں کچھ نہیں
کہہ سکتا۔“

”کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ تمہیں سردار حیدر خان پر
کیوں شک گزرا؟“

اس نے یکا یک سوال داغا تھا۔ میں چونک سا گیا،
بوللا: ”کیا مطلب؟ کیسا شک؟“

اُس نے سگریٹ نکالا، سلگایا اور لمبا کش لے کر
دھواں قضا میں چھوڑتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرانے
لگا۔ کمرے کی قضا بڑی صاف ستھری تھی۔ سگریٹ کا تیز
دھواں آن واحد میں پورے کمرے میں پھیل گیا اور سانسون
پر ناگوار بوجھ محسوس ہونے لگا۔ میں نے اٹھ کر ایگزاسٹ
ٹین کا بٹن پیش کر دیا۔

”یہی کہ پروین کو اُس نے اغوا کر لیا ہے۔“ اس نے
براہ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے یہ غلت آنکھیں موند لیں۔ سائیں دل جیت
میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ میں نے سوچا، کھالے کو
سائیں کے بارے بتاؤں یا نہ بتاؤں، کیا مناسب رہے گا؟
پھر میں نے اپنے تئیں اس معاملے کو آئندہ کسی وقت پر
موقوف کیا اور کہا: ”ہمارے علاقے میں اتنی بڑی حرکت کوئی
ادر نہیں کر سکتا تھا۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، سیدھی طرح بتاؤ۔ کیا تمہیں
ڈاکٹر شاہ جی نے کہا تھا؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”سردار بخت خان نے؟“

میں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا: ”تو کیا میڈم نے؟“

میں نے کہا: ”کوئی اور بات کرو یا ر..... یہ فضول سا
موضوع پکڑ بیٹھے ہو۔“

وہ بولا: ”یہ فضول موضوع نہیں ہے مگر خیر..... تم اس وقت
کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں ہو تو پھر کسی۔ یہ تو بتا دو کہ تمہاری
میڈم کو تجھ میں کیا نظر آ گیا ہے جو اتنا تعاون کر رہی ہے؟“

میرے پاس اس کے اس سوال کا جواب بھی موجود
نہیں تھا۔ میں نے کہا: ”کھالے! یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔“

میں عام سا آہنی ہوں۔ وہ اتنی آمیزش بلد و بونج اور خوب

اس نے پانی پیا، بھرپور انگڑائی لی اور بولا۔
”شہرے! جب میں بہت سارے میسے گھر والوں کو دے کر
ملتان پہنچا تو اپنے پورے گروپ کو مضطرب اور برا بیچتے پایا۔
معلوم ہوا کہ سردار حیدر خان کی بیٹی اس کو کسی نے اغوا کر لیا
ہے۔ یہ خبر میرے لیے بھی بڑی تکلیف دہ تھی۔ وہ نہ صرف
میری محبوبہ تھی بلکہ میرے چیف باس کی بیٹی تھی۔ استاد بیلو اور
اس کا نائب ریاض ملغانی بھوکے بھیڑیوں کی طرح شہر
بھر میں پھیل کر اس کے اغوا کار کی بوسو گھتے پھر رہے تھے۔
میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ پھر پتا چل گیا کہ اس کو
میڈم شکیلہ نامی کینیگسٹر نے اغوا کیا تھا۔ میڈم کا بڑا بدبہ تھا۔
استاد بیلو سمیت سبھی لوگ اُس سے خائف رہتے تھے۔ سردار
حیدر خان نے استاد بیلو اور ریاض ملغانی کو اپنی کونٹری پر بلا
لیا۔ انہیں فی الفور اس کو بازیاب کرانے کا حکم دیا۔ اشتہاری
غنڈوں کا ایک خونخوار گروہ بھی ان کے حوالے کر دیا۔ پورے
شہر میں میڈم کے شکاروں کی تلاش جاری ہو گئی۔ بالآخر اس
کی کونٹری پر ہمیں حملے کا حکم صادر ہوا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ تم میڈم
کے پاس ہو، ورنہ میں کبھی گروہ کے ساتھ نہ جاتا۔ چونکہ مجھے
اس کی سلامتی عزیز تھی، اس کی بازیابی میرے نزدیک دنیا کا
سب سے اہم کام تھا، اس لیے میں نے سودوزیاں کا شمار نہیں
کیا اور اسلحہ اٹھائے میڈم کی کونٹری پر ہلا بول دیا۔ آگے کے
حالات تمہارے سامنے ہیں۔“

کھالے کی کہانی انجام کو پہنچ چکی تھی۔ وہ خاموش ہو
گیا۔ میں نے کہا: ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

وہ بولا: ”میں اپنے گروہ میں لوٹ جاؤں، میں
تمہارے ساتھ میڈم کے گینگ میں شامل ہو جاؤں، یہ فیصلہ
مجھ سے نہیں ہو پارہا۔ چونکہ اس میڈم کے قبضے میں ہے اور
میں جان چکا ہوں کہ میڈم نے محض تمہاری وجہ سے سردار
حیدر خان پر ہاتھ ڈالا ہے، اس لیے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں
اس کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں۔ نہ ہی یہ میرے بس
کی بات ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ تم اس صورت حال میں
میرا ساتھ دو۔“

میں نے کہا: ”ہاں! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میڈم
نے مجھ پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ میں اسے دھوکا نہیں
دے سکتا۔ اگر میں چاہوں بھی تو تمہاری اس معاملے میں مدد
نہیں کر سکتا۔“

”ہاں شہرے! میں سمجھتا ہوں۔ اگر تم نے اس موقع
پر میڈم کو دھوکا دیا تو وہ تمہارا خون پی جائے گی۔ ویسے بھی
تمہاری رگوں میں غیرت مند خون دوڑ رہا ہے۔ یہ چرچا سنا

تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ زور آور
نامی غنڈا اپنے جگری یار موبی کے قاتل کی تلاش میں اپنے
گروہ کے ساتھ ملتان شہر میں دندناتا پھرتا ہے۔ تب مجھے پتا
چلا کہ میں نے عام آدمی کو نہیں، ملتان کے ایک معروف
غنڈے کو قتل کر دیا تھا۔ پھر مجھے استاد بیلو کے نائب ریاض
ملغانی نے اپنے گروہ میں شامل ہونے کا مشورہ دیا۔ اس نے
مجھے سمجھایا کہ اب میرے پاس واپسی کا راستہ نہیں ہے، میں
اگر نور پور جاؤں گا بھی تو پکڑا جاؤں گا کیونکہ پولیس نے اس کا
سراغ لگا لیا تھا۔ اس کے بقول پولیس کو میرا نام دیتا بھی معلوم
ہو گیا تھا۔“

میں نے اس کی بات میں دخل نہیں دیا تھا۔ ہمہ تن
گوش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سانس لی اور کہا: ”میں
نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اس کے گروہ میں شامل
ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا تھا کہ کچھ عرصہ اس کے
ساتھ رہ کر حالات کا جائزہ لوں گا۔ جو بھی خطرہ ملا، نور پور
سدھار جاؤں گا۔ پھر مجھے پروین کے اغوا کا پتا چلا۔ میرے
تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسی دوران مجھے استاد بیلو سے
ملنے کا موقع ملا۔ تب پتا چلا کہ اس سارے گورکھ دھندے کا
ماسٹر مائنڈ اور سرپرست سردار حیدر خان تھا۔ میں یہ تو جانتا
تھا کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ اتنا
بڑا کینیگسٹر ہے۔ مجھے تحفظ کا احساس ہوا کہ اب مجھ پر کوئی
ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ پھر کچھ دن گزر گئے۔ ایک مرتبہ مجھے نور
پور جانے کا موقع ملا۔ وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر میری حالت غیر
ہو گئی کہ وہاں تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ میرے گھر والے تو
جو پریشان تھے، سو تھے، تمہارا گھر برباد ہو چکا تھا۔ میں
چاچی اور چاچے سے ملا۔ تمہارے بارے میں کسی کو کچھ
معلوم نہیں تھا۔ ہر کوئی یہی کہہ رہا تھا کہ شہر اب نامی سے ڈر کر
کہیں بھاگ گیا، کہیں منہ چھپا کر نکل گیا۔ سائیں دل جیت
کا پتا چلا کہ وہ کسی نامعلوم جگہ پر چلے کاٹنے کے لیے چلا گیا
تھا۔ میں ڈاکٹر شاہ جی سے بھی ملا تھا۔ وہ تمہارے اور تمہاری
بہن کے لیے بہت متشکر تھا۔ اس نے مجھے راز رکھنے کا وعدہ
لے کر بتایا تھا کہ شہرے، امیر نواز، پروین اور سائیں دل
جیت کا غیاب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس نے مجھے کہا
تھا کہ میں سردار حیدر خان کی ٹوہ لگاؤں، کہیں اس نے تو کبھی
کو اغوا کر کے نہیں رکھا ہوا۔“

وہ دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ وہ جب بھی
اپنا کوئی واقعہ مجھے سنایا کرتا تھا، ایسے ہی ٹھہر ٹھہر کر، ہاتھ لہرا
لہرا کر بولا کرتا تھا۔ میں نے کہا: ”شہرے!“

صورت ہے کہ مجھ جیسے کئی جوان خرید سکتی ہے۔ پتا نہیں اُسے مجھ میں ایسا کیا نظر آ گیا جو آج تک مجھے یا تجھے بھی دکھائی نہیں دیا۔“

وہ قدرے شرارت آمیز لہجے میں بولا۔ ”یار شہرے! اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ تم جیسا خوب صورت اور سڈول شخص لاکھوں میں ایک ہی ہو سکتا ہے۔ غوری رنگت، شفاف اور معصوم آنکھیں، چست اور متوازن جسم..... مگر..... یہ ایسی خوبیاں نہیں ہیں جو میڈم جیسی عورت کو متاثر کریں۔“

میں ہنسا۔ ”نہ تم میڈم جیسے ہو، نہ میں اس لیے ہم اس کی ترجیحات کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ مجھ پر مہربان ہے، میرے لیے یہی بڑی بات ہے۔ رہی بات سونپ (خوب صورتی) کی، تو کیا اساتذہماری شکل و صورت سے متاثر ہوئی تھی؟“ وہ قدرے شرمسار ہو کر بولا۔ ”بڑے لوگوں کی باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔“

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات ڈھل چکی تھی۔ کھالے کو آرام کرنے کا مشورہ دیا، وحید کا بہ غور جائزہ لیا اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ چونکہ میڈم کی کوٹھی میں صبح خاصی دیر سے اُترتی تھی، اس لیے میں بہ آسانی دو چار گھنٹے کی نیند حاصل کر سکتا تھا۔

میں نے سونا چاہا مگر یہ میرے لیے سہل نہیں رہا تھا۔ ذہن ان گنت ہولناک اندیشوں اور واہموں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں ایک ایسی ہشت پہلو کی کہانی کا مرکزی کردار بن کر رہ گیا تھا جس کا کہیں انت ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان زندگی کے ناگفتہ بہ حالات میں بھی اپنی محبت کو ایک لمحے کے لیے فراموش نہیں کر سکتا مگر میرے ساتھ حالات ایسا کھیل کھیلتے چلے آ رہے تھے کہ میں نے کسی مل بھول کر بھی غزالہ کو یاد نہیں کیا تھا۔ گجاوہ فراغت بھری زندگی کہ ہر لمحہ اُسی کی طرف دھیان رہتا تھا، گجاوہ مصروف لحاظ کہ اس کی یاد بھی بھولے سے نہیں آتی تھی۔ میں پروین کی تلاش میں اس سے یکسر بے گانہ ہو گیا تھا۔ مجھے چاچا چراغ اور چچا زاد بہنوں کی یاد نے بھی کسی مل نہیں ستایا تھا۔ مجھے ڈاکٹر شاہ جی کی یاد نے بے چین نہیں کیا تھا۔ ایک وقت تھا جب میں عاشری کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے چوک قریشی تک کھنچا چلا جاتا تھا۔ ان دنوں مجھے اس کی شکل بھی بھول چلی تھی۔ اگر یاد تھا تو بس پروین کا چہرہ جس سے میں دن بہ دن دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی ذات اس گھڑی خود غرض محسوس ہوئی۔ کھالے کے خزانے کمرے میں گونجنے لگے۔ وہ گہری

نیند میں مستغرق ہو گیا تھا۔ میں کوشش کے باوجود سونپیں پائی تو پہلو بدلا اور وحید کے گرد آلود بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ وہ بہت معصوم صورت اور خوب رو بچہ تھا مگر اس وقت اُس کی حالت خاصی دگرگوں تھی۔ اس کی گردن اور چھاتی پر ننھے ننھے کئی زخم تھے۔ ٹانگ بھی زخمی تھی۔ میں نے اُس کی بینڈیج بڑے اچھے انداز میں کی تھی۔ شکر یہ تھا کہ کسی بھی زخم کی اسپرنگ نہیں کرنا پڑی تھی۔ میں نے اُس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ جم نے از حد حدت پکڑ لی تھی۔ گردن پر چمکی ہوئی پیٹیوں کو چھیڑا۔ شاید میں چاہتا تھا کہ وہ ہوش میں آ جائے۔ پھر میرے چھیڑنے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ ہلکا سا کسمایا۔ ایسے میں اُس کے ہونٹ تھوڑے سے سکڑے، ننھی سی آہ خارج ہوئی اور وہ پھر غیر متحرک ہو گیا۔ یہ یقین ہو گیا کہ اب وہ بے ہوش نہیں تھا، محض نیند اور انجکشن کی وجہ سے غنودگی میں تھا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے پھٹے کپڑوں کو جائزہ لیا۔ یہ بھیڑیے کے نوکیلے دانتوں کا کمال تھا۔ یہ بھی عیاں تھا کہ اُس کے جسم پر لگنے والے زخم بھی بھیڑیے کی کارستانی تھی۔ کوئی بھی زخم ایسا نہیں تھا جو انسانی ہاتھوں سے اُس کے بدن پر لگا ہو۔ پھر..... اُسے مردہ کیوں کر تصور کر لیا گیا؟

میں نے اُس کی ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹی کو چھوا۔ اس نے فی الفور ٹانگ کھینچ کر دہری کر لی۔ وہ کسی پل میں جا گئے والا تھا۔ میں نے اپنا منہ اُس کے کان کے قریب کر کے آواز دی۔ ”وحید..... وحید..... جاگو.....“

وہ بیدار نہیں ہوا تو ناچار مجھے اُس کی ناک دبانا پڑی۔ سانپوں کے تسلسل میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو اس کے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے ناک چھوڑ دی۔ اُس نے چند لمبی لمبی سانس لیں اور آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحوں تک پچی پچی نظروں سے چھت کو گھورتا رہا۔ پھر ارد گرد دیکھنے لگا۔ ایسے میں مجھ پر نگاہ پڑی اور ٹھہر گئی۔ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کئی لمحوں کے بعد اُس کی آنکھوں میں شائستگی کی ہلکی سی لہر موجزن ہوئی جو رفتہ رفتہ توانا ہو گئی۔ وہ نہایت دھیمے انداز میں بولا۔ ”باجی..... امی..... آپ کہاں ہیں؟“

میں نے پھر پکار کر اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ کچھ دیر تک پلکیں جھپکاتا رہا، پھر بے یقینی کے عالم میں بولا۔ ”بھائی جان آپ.....؟ شہر یار؟“ میں نے کہا۔ ”ہاں وحید! میں شہر یار ہوں۔ تمہیں موت کے منہ سے نکال لایا ہوں۔ ہوش میں آؤ اور مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟“ وہ کافی دیر تک خالی الذہنی کی سی کیفیت میں ساکت

بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنی گردن اور چھاتی پر ہاتھ پھیرا۔ منہ سے سکاری نکلی اور وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ عجیب سی نظروں سے اپنی ٹانگ پر بندھی ہوئی پیٹیوں کو دیکھنے لگا بولا۔ ”میں زندہ ہوں ناں؟“

وہ ابھی تک نارمل نہیں تھا۔ اُسے پوری طرح سنبھلنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ میں نے اُس کی دل جوئی کی دیکھا اور یقین دلایا کہ وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔ پھر اُس کی یادداشت پوری طرح لوٹ آئی وہ بولا۔ ”باجی کہاں ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میں یہ تو نہیں جانتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے، مگر یہ جانتا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہے، خیریت سے ہے۔“ ”نہیں بھائی جان!“ اُس کی آواز مزید مدہم ہو گئی۔ ”وہ خیریت سے نہیں ہے۔ وہ لوگ اُسے مار دیں گے۔ وہ بہت ظالم ہیں۔“

میں نے پچکارا، پوچھا۔ ”تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟“ وہ بولا۔ ”وہی..... جنہوں نے ہمیں باندھ کر کمرے میں رکھا ہوا تھا۔“

”وہ کون تھے؟“

”بھائی جان.....“ وہ جواب دینے کے بجائے رونے لگا۔ اس کا تنہا سا بدن ہچکیوں کے بل پر ننھے ننھے جھٹکے لینے لگا۔ میں نے کھالے کی طرف دیکھا جو سوتے میں کروٹ بدل کر نئی ٹیون میں خرائے لینے لگا تھا۔ میں نے وحید کو سینے سے لگالیا اور اُس کی پشت کو سہلانے لگا۔ وہ کئی منٹوں تک پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا پھر اچانک مجھ سے علیحدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ ”وہ بڑا کتا کہاں ہے؟“

میں چونکا۔ ”بڑا کتا؟“

اُس کی آنکھیں فرط دہشت سے پھلنے کو آ گئیں۔ جگر جھری لے کر بولا۔ ”وہی..... جس نے میری گردن پر.....“ ساتھ ہی اُس کے دونوں ہاتھ گردن سے چپک گئے۔ میں سمجھ گیا۔ وہ اُس بھیڑیے کی بات کر رہا تھا جس کے پنجوں سے اسے ہم نے چھڑایا تھا۔ چونکہ بھیڑیے کی شکل بگیاڑی کتے سے ملتی جلتی ہوتی ہے اور اس نے زندگی میں پہلے بھی بھیڑیا نہیں دیکھا ہوگا، اس لیے اُسے کتا سمجھنے کی غلطی کر بیٹھا ہوگا۔ میں نے اُسے دلاسا دیا کہ اس کتے کو میں نے مار بھگا یا ہے۔ اب وہ یہاں نہیں آئے گا۔ میں نے اُس پر کچھ وقت صرف کیا۔ وہ جب سنبھل گیا، اسے قید سے نکلنے کا یقین ہو گیا تو اس نے مجھے کچھ یوں اپنی روداد سنائی۔

اُس کا باپ، سجاد عشرت عرف عاشی کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتا تھا۔ عاشی کی ماں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اُس کے دل سے اپنے خاندان کی حد سے بڑھی ہوئی محبت محو نہیں ہوئی تھی۔ عاشی اپنے کسی کزن سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ حقیقت میں کوئی اُس کے ہم پلہ نہیں تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور نفیس مزاج کی لڑکی تھی جبکہ اُس کے باپ کے خاندان میں تعلیم کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ سبھی کا شکاری کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے۔ عاشی کی ماں چاہتی تھی کہ اُس کی شادی کسی پڑھے لکھے خاندان میں ہو۔ عاشی نے اپنی ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ مظفر گڑھ کے ایس پی سلیم شہزاد کے بیٹے شاہد سلیم میں دلچسپی لیتی ہے۔ دونوں بارہا مل چکے تھے اور ایک دوسرے پر اپنی پسندیدگی عیاں کر چکے تھے۔ وہ فوج میں بہ طور سیکنڈ لیفٹیننٹ ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ اس نے عاشی کو یقین دلایا تھا کہ جونہی اُسے کمیشن ملا، وہ اپنے گھر والوں کو عاشی کے بارے بتا دے گا اور اس کے گھر شادی کا پیغام بھجوا دے گا۔ عاشی اپنی ماں کو ایک مرتبہ ساتھ لے کر مظفر گڑھ گئی تھی جہاں اس نے بہانے سے شاہد سلیم کو بلا کر ماں سے ملوا بھی دیا تھا۔ عاشی کی ماں کو بیٹی کا انتخاب اچھا لگا تھا۔

یہی گھر میں فساد کا بنیادی سبب تھا۔ عمومی طور پر ناکامی اور مایوسی کی کیفیت میں دیہاتی لوگ پیروں کی درگا ہیں اور تعویذ دھاگوں کا سہارا لیتے ہیں۔ عشرت کی ماں پڑھی لکھی ہونے کے باوجود مایوسی کے عالم میں اپنی بیٹی کو سانپ جگ جیت کے مزار پر بھیجنے لگی۔

سانپ جگ جیت نیک آدمی تھا مگر منوں منی تلے دبا ہوا تھا۔ جو منی کے اوپر تھا، وہ اُس کا بیٹا سانپیں دل جیت تھا جو دل جیتنے کا ہنر جانتا تھا۔ اُس نے عاشی کا دکھڑا سنا اور اُس کی مدد کا وعدہ کیا۔ تعویذ دے جنہیں گھول کر سجاد کو اکیس دنوں تک پلایا جاتا تھا۔ عاشی تعویذ گھول گھول کر اپنے باپ کو پلاتی رہی مگر وہ بہ دستور اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ سانپیں دل جیت نے دوسرا پتا پھینکا۔ عشرت سے کہا کہ وہ اُس کی خاطر چلے کاٹے گا۔ اسی امید پر وہ اپنی ماں سے رقم لاتی رہی اور دل جیت کے ہاتھ پر رہتی رہی۔ اس نے کبھی تو کالے بکرے کا تقاضا پورا کیا، کبھی سیاہ مرغوں کی جوڑی پہنچائی اور کبھی نذر نیاز کے نام پر سیکڑوں روپوں کی قربانی دی مگر معاملہ جوں کا توں رہا۔ اسی دوران سجاد نے اپنے بھانجے کے حق میں حتمی فیصلہ سناتے ہوئے منگنی کے دن کا اعلان کر دیا۔ عشرت موقع پا کر اپنے بھائی وحید کے ساتھ موٹر

سائیکل پر بھاگی بھاگی سائیں دل جیت کے پاس پہنچی۔ یہ وقت مریدوں کی آمدورفت کا نہیں تھا۔ شام کو مزار پر کوئی نہیں جاتا تھا۔ وہ پہنچ گئی۔ سائیں دل جیت نے اُسے دیکھا تو دونوں کو اپنے حجرے میں لے گیا اور عاشی سے پوچھا۔ ”کیا تم کسی کو بتا کر آئی ہو کہ یہاں آ رہی ہو؟“

عاشی نے کہا۔ ”نہیں..... سائیں جی! میں بہت پریشان ہوں۔ صرف دو دن باقی ہیں۔ کچھ کیا جاسکتا ہے تو کریں ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سائیں سے مدد مانگنے لگی۔ سائیں نے پوچھا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ابھی تک بہت رعایت سے کام لے رہا تھا کہ کہیں اُس بد بخت کو نقصان نہ پہنچے ورنہ وہ کیا، اُس کی اوقات کیا، ایک ہی وار میں پچھاڑا جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ کیا تم نے اپنی ماں کو بتایا ہے؟“

عاشی نے کہا۔ ”نہیں وہ گھر میں نہیں تھیں۔ مجھے بڑی مشکل سے یہاں آنے کا موقع ملا ہے۔ شاید دوبارہ نہیں آسکوں گی۔“

وہ اُٹھ کر اس کے بھائی کے قریب گیا اور وحید سے بھی یہی سوال پوچھا۔ جب تسلی ہو گئی تو اُس نے عاشی اور وحید کو حجرے میں بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور کچھ دیر کے لیے اندر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اُس نے ہاتھوں میں ایک نفیس ٹرے تھام رکھی تھی۔ ٹرے میں تین بڑے بڑے گلاس پکڑے ہوئے تھے۔ پیار سے بولا۔ ”لو..... شربت پیو۔ پھر بیٹھ کر تمہیں ایسا تعویذ لکھ کر دیتا ہوں جو فوری طور پر اپنا کام شروع کر دے گا۔ دیکھنا، وہ تمہارے احمق باپ کو کیسے چند منٹوں میں سیدھا کرتا ہے۔“

اُس نے عاشی اور وحید کو گلاس تھمائے اور خود بھی بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔ شربت بڑا خوش ذائقہ تھا۔ تینوں نے پی لیا تو اُس نے برتن سمیٹ لیے اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر تعویذ تیار کرنے لگا۔ عاشی اُس کے سامنے بیٹھی تھی جبکہ وحید سائیں کا اشارہ پا کر اندرونی کمرے میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ اُسے نیند آنے لگی۔ بے اختیار اُس نے صوفے پر سر ڈال دیا۔ یہی حال عاشی کا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر تک بیٹھی رہی، پھر جاہلیاں لینے لگی۔ چند ہی منٹوں میں نیند کی یلغار سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اُس کے حواس نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اُس کے بعد کیا ہوا، کون آیا، کس نے اٹھایا، ان باتوں کا نہ تو وحید کو علم تھا، نہ عاشی کو معلوم ہوا تھا۔ دونوں کو بے ہوشی کے عالم میں حجرے سے اٹھا کر

بڑے خان کی نیلے والی حویلی کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وحید کو علم نہیں تھا کہ انہیں کہاں رکھا گیا تھا۔ وہ محض اُس کمرے کے بارے میں جانتا تھا جہاں دونوں بہن بھائیوں کو قید رکھا گیا تھا۔ کمرے کے باہر کا ماحول کیسا تھا، اُس نے نہیں دیکھا تھا۔

وحید کی آنکھ کھلی تو اُس نے خود کو کمرے میں بان کی چار پائی پر لیٹے پایا۔ اُٹھ کر چیخنے چلانے لگا۔ کم سن تھا، یہ بھائی نہیں دیتا تھا کہ اُسے اور اس کی جوان بہن کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ باہر سے بند تھا۔ چیخ و پکار سے تھا تو چار پائی پر بیٹھ کر رونے لگا۔ اسی اثنا میں اس کی نظر برابر والی چار پائی پر آدھی تر چھٹی لیٹی عشرت پر پڑی۔ اس نے جھنجھوڑ کر باجی کو جگانے کی کوشش کی۔ وہ بیدار ہو گئی۔ یا گلوں کی طرح کمرے میں دیکھتی رہی پھر چیخ اُٹھی۔ وہ جوان تھی، عورت ذات تھی، فوراً سمجھ گئی کہ اُس کے ساتھ بہت بڑی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ دونوں نے بہت شور کیا، چیخ چیخ کر مدد طلب کی مگر قریب میں کوئی ہوتا تو ان کی مدد کو آتا۔

انہوں نے کمرے کا دروازہ کھولنے اور توڑنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی کامیابی نہیں ملی۔ دروازے کی درزوں سے باہر جھانکنے پر سوائے اندھیرے کے کچھ معلوم نہ پڑا۔ کمرے سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ پا کر دونوں تھک کر چار پائیوں پر گر گئے۔ زندگی کی طرح طویل رات بڑی مشکل سے گزری۔ صبح جب انہیں ناشتا دیا گیا، تب اجنبی اور خوفناک چہرے دیکھ کر ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ عاشی نے ان لوگوں کی بہت منت سماجت کی، روٹی پٹنی اور خدا رسول کے واسطے دیے مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تب اس نے مزاحمت کا فیصلہ کیا اور ناشتا لانے والے پر حملہ کر دیا۔ ناخنوں اور دانتوں سے اُسے اچھا خاصا زخمی کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بلانے پر اس کے دو ساتھی کمرے میں آگئے جنہوں نے دونوں کو چار پائیوں پر تائیوں کی رستیوں سے باندھ دیا۔

انہوں نے پھر یہ معمول بنالیا تھا کہ رفع حاجت اور کھانے پینے کے اوقات میں ان کے ہاتھ پاؤں کھول دیتے۔ پھر باندھ کر باہر سے کنڈی لگا کر چلے جاتے۔ دو راتیں ایسے ہی گزر گئیں۔ عاشی ہر مرتبہ کھانا لانے والے سے اپنا قصور اور مستقبل کے بارے میں پوچھتی تو اُسے یہی جواب ملتا کہ جلد ہی پتا چل جائے گا۔

تیسری رات کے پچھلے پہر میں دروازے کی کنڈی کھلی۔ ایک لسیہ ترنگا شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے کندھوں پر

ایک لڑکی لدی ہوئی تھی جسے اُس نے وحید کے برابر والی چار پائی پر ڈال دیا۔ وہ بے ہوش تھی اور صبح تک مردوں کی طرح پڑی رہی۔ دن چڑھے وحید کو اُس کمرے سے نکال کر ساتھ والے کمرے میں ڈال دیا گیا۔ حویلی میں آنے والے لوگوں کی تعداد دس سے زیادہ تھی۔ مستقل طور پر حویلی میں رہائش پذیر رہنے والے چھ افراد تھے جن میں سے چار کو میں اسٹور میں مردہ حالت میں دیکھ چکا تھا۔ وحید نے بھی ان سب کے حلیے مجھے بتائے تھے۔ وہ جن ناموں سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے تھے، وحید کو وہ کبھی نام یاد تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ ان ناموں کو ازبر کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ چار تو اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے جبکہ باقی لوگوں سے ہمارا انکار نہیں ہوا تھا۔

وحید ان کے نزدیک فالتو پرزہ تھا۔ شاید سردار حیدر خان کے حکم کا انتظار تھا یا کوئی اور مصلحت کا فرما تھی کہ انہوں نے وحید کو آتے ہی موت کے گھاٹ نہیں اتارا تھا بلکہ اسے لڑکیوں کے ساتھ قید میں زندہ رکھا گیا تھا۔ پھر ایک دن کمرے میں مل چل پیدا ہوئی۔ شور اُٹھا کہ بڑا خان آ گیا ہے۔ کبھی ایک دم کمرے سے بھاگ نکلے۔ بڑا خان اس کمرے میں نہیں آیا تھا جس میں وحید کو باندھ رکھا گیا تھا اس لیے وہ بڑے خان کو دیکھنے سے محروم رہا تھا۔ بڑا خان وحید کے اندازے کے مطابق عاشی کے کمرے میں گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد حویلی میں رہنے والے بد معاشوں کا رویہ یک لخت وحید سے بدل گیا۔ انہوں نے نہ صرف اسے نہلایا بلکہ اچھا کھانا بھی کھلایا۔ کھانے کے بعد اسے سلور کے گلاس میں ایک شربت پینے کو دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ گلاس میں پانی نہیں، آگ بھری ہوئی تھی جس نے اُس کے حلق سے شکر تک آگ لگا دی۔ ذائقہ بھی اُسے پسند نہیں آیا تھا مگر اُسے پینا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں شراب نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور وحید خود کو فضاؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ ایسے حالات سے وہ زندگی میں کبھی نہیں گزرا تھا۔ ماں باپ نے ہمیشہ پیروں تلے اپنی ہتھیلیاں رکھی تھیں اور زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رکھا تھا۔ تبھی نہیں سمجھ پایا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

وحید کی سنائی ہوئی کہانی کے پیش نظر مجھے یقین تھا کہ بڑے خان نے اسے مار کر پھینک دینے کا حکم صادر کیا تھا۔ ابھی اس کے کارندوں کی ہوس کے گھوڑے اچانک بے لگام ہو گئے تھے۔ جب ایک وجود کو ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے

مٹا ہی دینا تھا تو پھر اس سے کچھ عرصہ سفلی آتش کدہ دہکائے رکھنے میں حرج ہی کیا تھا۔ آنے والے کئی دنوں تک چاروں نے اس کی خوب صورتی کو اس کی بد قسمتی بنا کر اپنی اپنی بھوک غیر فطری انداز میں مٹائی اور انسانیت کی دھجیاں کسی خوف و اندیشے کے بغیر اڑائیں۔ وہ پینا نہیں چاہتا تھا، کھلوتا بن کر چار پائیاں بدلنا نہیں چاہتا تھا مگر برسوں عورت کے سائے تک کو ترسنے والے بھیڑیے اُس کی ایک نہیں سنتے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہونے والا تھا۔ وہ کبھی ہوش میں ہوتا تو کبھی لڑھک رہا ہوتا۔ اس کی یادداشت بھی رفتہ رفتہ اس کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں وہ بے حس ہو کر رہ گیا اور اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئیں۔

پھر ایک دن اسے بھنجوڑنے والوں کی بھوک مٹ گئی یا انہیں کوئی اور مشکل درپیش آ گئی تھی کہ اسے مار پھینکنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس نے منت سماجت نہیں کی، زندگی کے لیے واویلا نہیں کیا بلکہ بڑی خاموشی اور بے پروائی سے بیٹھا ان کے درمیان اپنے بارے میں ہونے والی گفتگو سن رہا۔ یوں جیسے اُسے مارنے کا نہیں، کسی اور کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہو۔ بڑی مونچھوں والے لمبے تڑنگے شخص نے اُسے اُٹھا کر چار پائی پر پھینکا۔ اس کی گردن پر دونوں ہاتھ جمائے اور جبراً اُٹھایا۔ وحید کو یہی یاد تھا کہ اس سے اُس کا سینہ پھٹنے کو آ گیا تھا۔ وہ سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت وہ بے ہوش ہو گیا اور اسے مردہ تصور کر کے پیلے میں پھینک دیا گیا۔ اس کی جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو بھیڑیے کے رحم و کرم پر پایا۔ شاید اسی کے نوکیلے دانتوں کی بدولت ہونے والے تیز درد نے اُسے موت جیسی اندھی بے ہوشی سے نکالا تھا۔ اس نے اپنے طور پر بھیڑیے کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اس کی چھاتی اور گردن پر بھیڑیے نے دانت گاڑے اور خون بہہ نکلا۔ جب وہ چیختے چلاتے اور مزاحمت کرتے تھک گیا تو نڈھال اور بے جان انداز میں سرکنڈے میں گر گیا۔ بھیڑیے نے اُس کی ٹانگ اپنے جبرے میں دبوچی اور جھاڑیوں سے کھینچ کر باہر نکالا۔ وہ اُسے اپنی کچھار تک لے جانا چاہتا تھا۔ یہ وحید کی خوش بختی تھی کہ عین اُسی لمحے ہم پیا کی سربراہی میں وہاں سے گزرے اور ہماری نگاہ اُس پر جا پڑی ورنہ اس کا نازک اور کم سن وجود اب تک جنگلی درندوں کے پیٹ کی آگ بجھا چکا ہوتا۔

چونکہ وہ پوری طرح مارا نہیں تھا، اس لیے بے ربط انداز میں اپنی آپ بیتی سن رہا تھا۔ میں اپنی سوچ کے مطابق

اس کی کہانی کے خالی حصوں کو پُر کرتا جاتا تھا۔ میرے کربد نے پر اس نے بتایا کہ اس نے نئی لانے والی لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے سامنے اوندھے منہ چارپائی پر ڈالی گئی تھی۔ علیحدہ کمرے میں لے جائے جانے کے بعد اس نے اپنی بہن کو ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی آواز سنی تھی۔ میں نے جب وہاں کسی مرد قیدی کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس نے کسی مرد قیدی کو وہاں لائے جاتے یا رکھے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس نے ایسا کچھ سنا تھا۔

وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ عاشری یا عاشری کے بعد لائی جانے والی لڑکی کو اغوا کرنے کا کیا مقصد تھا اور وہ اس کے حویلی سے نکلنے تک وہیں موجود تھیں۔ وہ مزید کوئی کارآمد بات نہ بتا سکا اور گھنٹوں میں سر ڈال کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے بار بار اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آتے تھے۔ چونکہ میرے پاس میڈیکل کٹ نہیں تھی، اس لیے میں نے اس کے زخموں پر بندھی ہوئی پٹیوں کو چھیننے یا کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی سوچ کر خاموش رہا کہ دن چڑھے میڈیکل باکس منگوا کر اس کی از سر نو بینڈج کر دوں گا اور اگر ضروری ہو تو میڈم سے کہہ کر اسے کسی ڈاکٹر کے پاس بھجوا دوں گا۔

کھالا اس رام کہانی کے دوران مسلسل خراٹے لیتا رہا۔ وہ تھکا ہوا تھا۔ اچھا تھا کہ اس کی کسلندی اور تھکاوٹ دور ہو جاتی اور وہ بیدار ہونے پر ہشاش بشاش ہوتا۔ میں نے پانی پیا، وحید کو پلایا پھر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ اس وقت نور پور مکمل طور پر جاگ چکا ہوتا تھا۔ کھیت آباد ہو چکے ہوتے تھے۔ یہ چونکہ بڑا شہر تھا۔ یہاں تصنع اپنے آکٹوپس پوری طرح پھیلا چکی تھی، اس لیے لوگ آدھی رات کے بعد بستر پر گرتے تھے اور دن چڑھے جاگتے تھے۔

وحید نے میرے استفسار پر بتایا کہ اسے بھوک لگی ہے۔ بھوک مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کمرے سے نکلا۔ ظاہر خان کا پتا کیا۔ وہ سونے کے لیے جا چکا تھا۔ وہ بڑا کارآمد بندہ تھا۔ ایک ہی وقت میں گن مین، گیٹ کیپر اور کلک کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے بھی خوش باش اور چاق و چوبند رہتا تھا۔ اس کی جگہ پر زوار سکیورٹی گارڈ کی ڈیوٹی سنبھال چکا تھا۔ اس سے ابھی تک میری علیک سلیک اس مرحلے میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ اسے چائے پانی کا کہہ سکتا۔ اس لیے میں گیٹ ہاؤس کے کچن میں گیا۔ وہاں شبکو موجود نہ پا کر اپنی مدد آپ کے تحت میں نے چائے کے تین

کپ تیار کیے۔ کچن کینٹ میں پڑے ہوئے بسکٹ بیکر اور کریم رول اٹھائے اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ لدی چندی ٹرے بیڈ پر رکھی اور کھالے کو چنگایا۔ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ چائے کے پیالوں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھ کر خوشی سے بولا۔ ”واہ خاندانے! ایک فرسٹ کلاس..... تمہاری یہی مہربانیاں تو مرتے دم تک مجھے یاد رہیں گی۔ اوہ! تو یہ بھی جاگ گیا۔ کیسے ہو بھی؟“

اس کی اچانک وحید پر نگاہ پڑ گئی تھی۔ وحید اسے نہیں جانتا تھا مگر اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ بھی میری طرح اس کا ہمدرد تھا۔ اس نے پھیکے روکھا۔ ”ٹھیک ہوں بھائی!“ کھالے نے بغیر منہ ہاتھ دھوئے چائے کا کپ اور ایک کریم رول اٹھالیا۔ میں نے بسکٹ کا پیکٹ کھول کر وحید کو تمہا دیا اور خود بھی کپ اٹھالیا۔ کھالے نے وحید کا انٹرویو لیا چاہا تو میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”اسے ڈسٹرب نہ کرو۔ میں اس سے تمام باتیں معلوم کر چکا ہوں۔“

وحید نے کہا۔ ”مگر آپ نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں یہاں کس طرح پہنچا ہوں اور باجی کہاں ہے؟“ میں نے اپنی جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم دھیان سے ناشتا کرو۔ پھر میں کچھ دیر سوؤں گا۔ تم بھی سونا چاہو تو سو لینا ورنہ یہ ساری کہانی تمہیں کھالا سنائے گا۔“

اس نے بے چارگی کے عالم میں پہلے مجھے پھر کھالے کو دیکھا اور چائے پینے میں رُجھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں گہرے فکر اور اضطراب کی پرچھائیاں لرزنے لگی تھیں۔ اس کے اعصاب پر سوار شراب کا نشہ بتدریج اپنا تسلط ختم کرتا جاتا تھا اور اس کی گم شدہ حسیں جاگنے لگی تھیں۔ یہ اچھی بات تھی ورنہ اس کا پاگل یا نفسیاتی مریض ہو جانا بعید از قیاس نہیں تھا۔ وہ بہ دقت تمام بسکٹ نگل رہا تھا۔ حلق سے گزارتے ہوئے اسے شدید نوعیت کے درد کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر میرے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے وہ جیسے تیسے بسکٹوں کو نگل رہا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی کی صحبت نے مجھے آدھا ڈاکٹر بنا دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ابھی کافی دیر تک اس کے جسم میں اینٹھن ہوتی رہے گی۔ اس کا خون شراب طلب کرتا رہے گا اور دم بہ دم اس کی رگوں میں کشیدگی اور اضطراب کی لہریں دوڑاتا رہے گا۔ اسے انا لجانسک میڈیسن کی ضرورت تھی جو فی الوقت ناموجود تھی۔

پیٹ کی آگ بجھی تو مجھ پر غنودگی نے حملہ کر دیا۔ میں نے دونوں کو باتیں کرتے چھوڑا اور لیٹ گیا۔ میرا نہ صرف بدن بلکہ ذہن بھی طویل مشقت کے بعد تھک گیا تھا۔

مجھے کسی نے جگا یا نہیں تھا بلکہ میں از خود نیند پوری ہونے کے سبب بیدار ہوا تھا۔ گھڑی دیکھی تو دو بجنے والے تھے۔ کھالا صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا جبکہ وحید میرے داہنے ہاتھ بیڈ پر برابر میں سویا ہوا تھا۔ کھالے نے کہا۔ ”تمہیں میڈم نے بلایا ہے۔ تیار ہو کر اس سے مل لو۔“

میں نے ہاتھ روم کا رخ کیا۔ تیار ہو کر کھالے سے پوچھا۔ ”کیا تم نے کھانا کھالیا ہے؟“ ”کسی نے پوچھا تک نہیں۔“ ”مجھے اُس کے انداز سے پتا چل گیا کہ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ وہ چائے کا رسیا تھا۔ دوپہر تک وہ پانچ سات پیالے چائے کے پیٹ میں اتار لیا کرتا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اچھا! میں میڈم سے مل لوں، پھر کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“

وہ مجھے کمرے سے نکلتا ہوا دیکھ کر جلدی سے بولا۔ ”کھانا تو اتار رہے گا، بھلے آدمی! چائے کا کچھ کرو ورنہ میرا مردہا کے ساتھ پھٹ جائے گا۔“

میں مسکرا کر کمرے سے نکل آیا۔ کچن میں گیٹ روم کا اکلوتا چست وجود والا کلک شبکو کھانا تیار کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے اسے چائے تیار کر کے کھالے کو دینے کا کہا اور بالائی منزل پر واقع میڈم کے کمرے کا رخ کیا۔ دستک کے جواب میں اس کی مترنم مگر تھکسا نہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”کم ان!“

میں نے آہستگی سے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ میڈم اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھی۔ اس کے ہاتھ میں شیشے کا نفیس گلاس دبا ہوا تھا جس میں ہلکے اور نچ کلر کا مشروب دکھائی دے رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اعلیٰ قسم کی کسی ولایتی شراب سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ایک ذرا مسکرائی اور بولی۔ ”شہر یار! مجھے پتا چلا ہے کہ تم لوگوں کو جزدی طور پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کیا میں نے ٹھیک سنا ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی میڈم!“

”نفسیاتی رپورٹ دو۔“ اس نے کہا، پھر ایک ادائے دل کشا سے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور ننھا سا گھونٹ بھرا۔ میں لمحاتی طور پر اُس کے حسن کی جولانی میں کھو کر اس کا حکم بھول گیا۔ یاد آیا تو جھٹ سے لپ پلیر کی طرح بول پڑا۔ الف سے بے تک تمام شب بیتی کہ سنائی۔ وہ انتہا تک سے سختی رہی، شراب سے کھلتی رہی۔

پھر میرے خاموش ہونے پر بولی۔ ”یہ تو نہ سمجھ میں آنے والی سچویشن ہے۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس کا سیل فون بج اٹھا تھا۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور کال ریسیو کر لی۔ ”بول رہی ہوں۔“

دوسری طرف کی بات سن کر ہنس پڑی۔ ”تم کبھی بھی سدھر نہیں سکتے میرا شاہ..... گڈ مارنگ صبح کے سلام کو کہتے ہیں، اب دوپہر ڈھلنے لگی ہے۔ تم نے یہ لفظ کس سے سنا ہے؟“ میرے لبوں پر بھی مسکراہٹ تیر گئی۔ میرا شاہ فون پر میڈم کو گڈ مارنگ کہہ رہا تھا۔ میڈم اس کی بات بڑی توجہ سے سننے لگی۔ بیچ بیچ میں ٹوک کر کچھ پوچھ بھی لیتی پھر قدرے اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میرا شاہ! تم بے دھڑک جا کر خان باز وخیل سے ملو۔ اس سے فیئرڈیلنگ کرو۔ مخدوم جی نے تمہاری ملاقات کا بندوبست کر دیا ہے، اس کا احسان ہے مگر ہمیں اپنے بزنس کی سیکریسی کا بھی خیال رکھنا ہے اور ہاں! باز وخیل پر بھی واضح کر دینا کہ مخدوم جی کا کردار بس رابطہ کرانے تک محدود ہے۔ اسے کوئی بھی بزنس سیکریٹ نہ دیا جائے۔ اوکے؟“

اس نے فون بند کر دیا۔ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”میں کیا کہہ رہی تھی؟“ ”آپ نے ہماری کارگزاری کو عجیب سچویشن قرار دیا تھا۔“ میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

وہ مسکرائی اور بولی۔ ”ہاں! پیاداپس چلا گیا؟“ ”جی میڈم!“ میں نے کہا۔ ”اس نے کہا تھا کہ میں ہی آپ کو یا میرا شاہ کو رپورٹ دے دوں۔“ ”وہاں سے جو اسلحہ ہاتھ لگا تھا، تم نے دیکھا تھا؟“ ”نہیں میڈم.....“

”کیوں؟ کیا تم میں تجسس کا مادہ نہیں ہے؟“ ”ہے تو سہی پر اُس وقت میں بہت زورس تھا۔“ ”کیوں؟ کیا تم یہ طے کر کے گئے تھے کہ اپنی بہن کو بازیاب کرا کر ہی لوٹو گے؟“ اس کے لہجے میں عجیب سی کات تھی۔

میں نے سر جھکا لیا۔ ”شہر یار! جب بھی کسی کو جلانے کا ارادہ کرو تو یہ بھی دھیان میں رکھو کہ تم خود بھی جل سکتے ہو۔ خیر..... کیا وہ بچہ، جو تمہیں بیلے سے ملا، اب ٹھیک ہے؟ اس نے کیا کہانی سنائی؟“

میں نے وحید کی سنائی ہوئی داستان کو من و عن بیان

کر دیا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ اوپر والے پر چڑھایا، سر کو دائیں بائیں حرکت دی اور کہا۔ ”کوئی فائدہ نہیں، اس کہانی میں کوئی کیونہیں ہے۔“

میں خاموش کھڑا رہا وہ بولی۔ ”تمہارے خیال میں تمہاری بہن کو وہاں سے نکالنے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟“ میں اپنے تئیں اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا بولا۔ ”میرے خاندان میں ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔“

”کوئی دوست؟“

”کھالا میری خاطر اگلی میں سر دے سکتا ہے، وہ میرے ساتھ ہے۔“

”تم نے مجھے بخت خان اور ڈاکٹر منور شاہ کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ تمہیں بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کیا وہ ایسا کر سکتے ہیں؟“

میں نے ایک لمحے کو سوچا، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیا امیر نواز کا باپ اس کی تلاش میں وہاں تک پہنچ سکتا ہے؟“

میری نظروں کے سامنے سردار حیات خان کا بوڑھا چہرہ گھوم گیا۔ وہ دلیر تو تھا مگر اس کے جھریوں بھرے بازوؤں میں اتنا دم نہیں رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”میڈم! میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے مگر یہ معاملہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔“

وہ تھکی انداز میں سر ہلانے لگی۔ پھر اس نے مجھے اپنے خالی گلاس میں شراب ڈالنے کا حکم دیا۔ میں شراب کو پسند نہیں کرتا تھا مگر وہاں انکار کی تاب نہیں تھی۔ میں نے شیشے کی خوب صورت سی تپائی پر پڑی ہوئی بوتل کھولی، گلاس میں آگ بھری اور اسے تھمادی۔

وہ فریج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اس میں تھوڑا پانی ڈالو..... ٹھنڈا.....“

میں نے حکم کی تعمیل کی اور اس کے سامنے گلاس رکھ دیا۔ اس نے ایک گھونٹ حلق میں انڈیلا، مجھے آدھ کھل مدھ بھری آنکھوں سے دیکھا اور مسکرائی، بولی۔ ”شہریار! تم نے بھی شراب نہیں پی؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کہا۔ ”نہیں میڈم! مجھے اچھی نہیں لگتی۔“

وہ ایک ادا سے بولی۔ ”بن پیئے یہ رائے کیونکر قائم کی جاسکتی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”پڑھا سنا ہے کہ یہ اچھی چیز نہیں۔“

انسان کے حواس کو خنثی کر دیتی ہے۔“

”کیا اس دنیا میں کسی کے حواس اس کے اختیار میں ہیں بھی؟“

وہ شاید ہنسنے لگی تھی یا مجھے چھیڑنے کے لیے نیم باتیں کر رہی تھی۔ میں نے کوئی جواب دیے بغیر سر جھکا لیا۔ اس نے شاید بھانپ لیا کہ مجھے اس موضوع سے دلچسپی نہیں، بھیجی بولی۔ ”شہریار! تمہاری راہوں میں کاش پھیلائے جا چکے ہیں اور تم اس وقت سخت امتحان میں ہو۔ تم میری بات کو سمجھ رہے ہو؟“

میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے میڈم کو دیکھا۔ وہ میری نظروں کے تعجب خیز تاثر کو بھانپ کر بولی۔ ”ہاں! تم ابھی نا تجربہ کار ہو۔ تمہیں اپنی طرف بڑھتے ہوئے خطرات کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں بتاتی ہوں..... ایک ذرا ٹھہرو.....“

اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور تین چار گھونٹ ایک ہی سانس میں پی گئی۔ میں مؤدبانہ انداز میں اس کے سامنے کھڑا تھا، نہ تو اس نے مجھے بیٹھنے کی اجازت دی تھی اور نہ ہی میں نے بیٹھنا چاہا تھا۔

وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی رہی، آنکھیں موندے سوچتی رہی، پھر آدھ کھلی آنکھیں مجھ پر مرکوز کر کے بولی۔ ”شہریار! وہ حرام زادہ حیدر خان..... اس وقت باؤلے کتے کی طرح اپنی بانہیں کاٹ رہا ہوگا۔ وہ یقیناً یہی سمجھ رہا ہوگا کہ میں نے اس کی حویلی پر حملہ کیا اور اس کے چار قیمتی بندوں کو ہلاک کر کے مغوی لوگوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ چونکہ اس کی بیٹی میری تحویل میں ہے اور اسے احساس ہو چکا ہے کہ وہ مجھ تک اور اپنی بیٹی تک طاقت اور سیاسی اختیارات کے بل پر نہیں پہنچ سکتا، اس لیے وہ کوئی اور کھیل کھیلے گا، کوئی چکر چلائے گا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ سے میرے معاملات طے پا چکے ہیں۔ پہلے کی طرح یہاں اپنے غنڈوں کو نہیں بھیجے گا۔ اگر بھیجے گا تو بھی کی لاشیں وصول کرے گا۔“

وہ بڑی روانی سے بول رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لکھی ہوئی کسی عبارت کو پڑھ رہی ہو۔ میں نے ”جی میڈم“ کہنے پر اکتفا کیا۔

وہ سانس لے کر بولی۔ ”وہ سمجھ رہا ہے کہ اسے مات ہو چکی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو حاصل نہ کر سکا اور نہ ہی تمہاری بہن کو اپنی حراست میں رکھ سکا۔ مجھ پر بھی کامیاب حملہ نہیں کر سکا اور نہ ہی آئندہ کر سکتا ہے۔ تم بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو۔ اب سوچو، وہ کیا کر سکتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میڈم! جو آپ سوچ سکتی ہیں، وہ میں

سوچ سکتا۔“

وہ تعریف پر کھل اٹھی، احساسِ تفاخر سے مسکرائی اور

”تمہیں اپنے دماغ کو وسعت دینا ہوگی ڈیئر! ہاں.....“

وہ اب دندنا تا ہوا نور پور میں جائے گا اور تمہارے خاندان کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔ تمہاری کمزوریوں پر ہاتھ ڈالے گا۔ اب تم سوچو، تمہاری ذات کے کون سے پہلو کمزور

ہیں؟

میرا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سانس رکنے کو لگی۔ وہ واقعتاً اتنا کمینہ تھا کہ میرے خاندان پر چڑھ

رہتا۔ مجھے اب تک یہ خیال نہیں آیا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

اس نے گلاس اٹھایا۔ ایک دو گھونٹ پیچے تھے، حلق میں اتارے اور سر جھکا کر خالی گلاس سے کھیلنے لگی۔ میں نے اس کی سوچ کے ارتکاز کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کافی دیر کے بعد سر اٹھائے بغیر بولی۔

”تم نور پور جاؤ، اپنے گھر والوں کو فوری طور پر وہاں سے نکال لاؤ اور محفوظ جگہ پر پہنچا دو۔“

”اکیلا؟“ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

”نہیں..... اپنے دوست خالد، پیا اور عقیل کو ساتھ لے جاؤ۔ سبھی انتظامات میرا شاہ کر دے گا۔ آج رات ہی یہ کام نمٹا لو ورنہ تمام عمر پچھتاؤ گے۔ اور ہاں! نور پور میں کوئی ایسا سنسر بھی فٹ کر دینا جو وہاں کی خبریں تم تک پہنچاتا رہے۔“

”میں سمجھا نہیں میڈم؟“

”میرا کہنے کا مطلب ہے کہ نور پور میں کسی آدمی کو آنکھیں کھلی رکھنے پر مامور کر دو۔ وہ گا ہے بہ گا ہے ملتان آئے، کسی مقررہ مقام پر تم سے ملاقات کرے اور نور پور کی صورت حال سے آگاہ کرے۔ تمہیں اپنے گاؤں سے باخبر رہنا چاہیے۔ اگر وہاں سیلولر سگنلز موصول ہوتے ہیں تو کسی کو موبائل فون لے کر دیدینا۔ اگر کوئی دوست اس کام پر راضی نہ ہو تو کسی کو خرید لیتا۔“ اس نے مجھے سمجھایا۔ ”یاد رہے خان کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنا۔ کیا وہاں تمہارا کوئی ایسا دوست نہیں ہے جو تمہارے کام آئے؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”جی میڈم! میرا ایک دوست ہے..... بڑے کام کا آدمی ہے..... مراد بخش دیوانہ.....“

”ٹھیک ہے، اس سے مل لیتا۔“

”وہ حیدر کا کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ.....“

الو کی نصیحتیں

کہتے ہیں ایک بار حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آلو آیا اور کہا السلام علیک یا نبی اللہ علیہ السلام آپ نے سلام کا جواب دیا۔ پھر آپ علیہ السلام نے پوچھا بتا کہ تو دانے کیوں نہیں کھاتا؟ کہا اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اسی دانے کی وجہ سے جنت سے نکالا گیا، پوچھا تو پانی کیوں نہیں پیتا؟ کہا..... قوم نوح علیہ السلام ڈوب کر ہلاک ہوئی تھی۔ اس لیے نہیں پیتا۔ پوچھا تو نے آبادی کو کیوں خیر باد کہہ دیا اور تجھے ویرانے میں رہنا کیوں پسند ہے؟ عرض کی ویرانہ اللہ تعالیٰ کی میراث ہے اور میں اللہ تعالیٰ کی میراث میں رہتا ہوں۔ پوچھا کہ جب تو کسی ویرانے میں بیٹھتا ہے تو کیا بولتا ہے۔ میں کہتا ہوں، وہ لوگ کہاں گئے جو اس جگہ مزے سے رہتے تھے۔ پوچھا۔ جب تو آدمی سے گزرتا ہے تو کیا کہتا ہے۔ عرض کی، ہلاکت ہو اس آدم پر کہ ان کو نیند کیسے آ جاتی ہے۔ حالانکہ مصائب کے طوفان ان کے سامنے ہیں۔ پوچھا تو دن میں کیوں نہیں نکلتا۔ کہا انسانوں کے ایک دوسرے پر ظلم کرنے کی وجہ سے۔ پوچھا تو برابر بولتا رہتا ہے اس میں تیرا کیا پیغام ہے؟ کہا..... اے غافل لوگو! زور راہ اور اپنے سفر آخرت کے لیے تیار رہو۔

اس وقت آپ علیہ السلام نے فرمایا!

الو سے زیادہ انسانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد کوئی نہیں اور جاہلوں کے نزدیک الو سے زیادہ کوئی پرندہ برا نہیں۔

بحوالہ: حیات الحیوان

انتخاب: طالب حسین طلحہ

قیدی سزائے موت، نیو سینٹرل جیل بہاولپور

”وہی جسے ہم پہلے میں سے اٹھا کر لائے ہیں۔“
”اچھا..... ہاں! میں اسے زرینا کی تحویل میں دیدیتی ہوں۔“

میں نے زرینا کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ سونیا نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور اس کے گھر پہنچا دیں۔“ میں نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا، بولی۔ ”نہیں..... ابھی اسے اس کے گھر پہنچانا مناسب نہیں ہوگا۔“

”اس کی ماں بہت پریشان ہوگی میڈم!“ میں نے سہارا لیا۔

”مجھے اندازہ ہے۔ مگر تمہیں ایسے حالات سے روشناسی نہیں ہے۔“ اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”ہر ابھن سیدھے طریقے سے حل نہیں کی جاسکتی۔ اگر اس کی ماں نے اپنے بیٹے کو دیکھتے ہی پولیس کو بلا لیا، آس پاس کے لوگوں کو اکٹھا کر لیا اور تم سے پوچھا کہ اس کے ساتھ اس کی بہن بھی تھی، وہ کہاں ہے، تو تم کیا جواب دو گے؟ تمہارے پاس تو اس سوال کا جواب بھی نہیں ہے کہ تمہیں یہ بچہ کہاں سے ملا؟ کیا پہلے کا کہو گے؟..... پولیس نے پوچھا کہ تم پہلے میں کیا کرنے گئے تھے، تو کون سی کہانی سناؤ گے..... کہاں کہاں سے ابھی اسے گھر پہنچانے کا مناسب وقت نہیں آیا، جب آئے گا، تب کوئی وقت ضائع کیے بغیر اسے یہاں سے روانہ کر دیا جائے گا۔ وہ یہاں محفوظ ہے، یہاں سے نکل کر محفوظ نہیں رہے گا۔ کیا میری بات کو سمجھ گئے ہو؟“

اس کی باتیں سیدھی میرے دل میں اتر گئیں۔ وہ بہت چالاک تھی۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ یہ بعید نہیں تھا کہ میں وحید کی ہمدردی میں پھنسے خان بن کر اس کی ماں کے پاس چوک قریشی میں جاتا اور مفت میں دھریا جاتا۔ میں نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا اور نفی میں انداز میں سر ہلا دیا۔

”اگر تم اپنے ارد گرد دیکھاؤ اور ہمدردیوں کے گلاب اگانے لگو گے تو شک اور بے یقینی کے چھتوں سے اٹھنے والی کھیاں اپنے زہریلے ڈنک تمہارے بدن میں اتار دیں گی۔ ان کا ڈسپانی نہیں مانگتا۔ اور ہاں! میں آج رات، ساڑھے نو بجے دہلی کے لیے فلائی کر جاؤں گی۔ بہت ضروری معاملات ہیں جنہیں نمٹانے میں ہفتہ لگ جائے گا، زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ میرے بعد میرا شاہ تمہیں کمانڈ کرے گا۔“

نہ صرف اس سے رابطے میں رہنا، بلکہ اس کا حکم بھی ماننا۔ مجھے بہت پیارا ہے۔ تمہیں یہ تو یاد ہے ناں کہ تمہیں یہاں لانے والا وہی تھا؟“

میں اسے چند دن دینی جانے سے روکنا چاہتا تھا مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی یہاں موجودگی میرے لیے بڑی طمانیت بخش تھی۔ میں نے قدرے مایوسی سے کہا۔ ”میڈم! آپ فکر نہ کریں۔ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

اس نے جو کہنا تھا، کہہ چکی تھی اور اب آنکھیں موندے، سر صوفے پر ٹکائے، لمبی لمبی سانس لے رہی تھی۔ شراب نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ اس کے بھرے بھرے گال تھمتارہے تھے۔ گردن پر سرخ سرخ لہریں نمودار ہو گئی تھیں۔ اس کے حسن تاب ناک پر سے میری نگاہیں نیٹے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وہ بہت متوازن الاعضاء عورت تھی۔ نہ صرف اس کی ہر ادا یکتا تھی بلکہ اس کے پاس اعتماد اور دلیری جیسے اوصاف بھی موجود تھے جو عموماً عورتوں کے ہاں نہیں دیکھے جاتے۔

اس وقت اس نے گہرے سبز رنگ کا کڑھائی دار کرتہ اور پیرٹ کٹر کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ لائے لائے بلیک اور براؤن کٹر کے امتزاجی بال بکھر کر دونوں شانوں پر سے آشاروں کی طرح بہہ کر چھاتی پر پھیلے ہوئے تھے۔ میک آپ سے یکسر بے نیاز گلابی چہرہ، سوچے پپوٹوں اور پلکوں والی بڑی بڑی آنکھیں، آن چھدی ستواں ناک..... میں آنکھیں پھاڑے اس نیم خوابیدہ حسن کی زیارت میں مشغول تھا جب اچانک اس نے اپنی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ میں ایک دم شرمسار سا ہو گیا۔

اس کی ناراضی کا احتمال ہوا مگر وہ ناراض نہیں ہوئی بلکہ بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر بولی۔ ”تم نے خیال کیا کہ بچنے کے بعد میرے حواس متزلزل ہو گئے اور میں سو گئی..... ہاں؟ سچی بے خوفی سے دیدے پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔“

میں نے کہا۔ ”جی میڈم! آپ بہت خوب صورت ہیں۔ میں نے آپ جیسا دنیا میں کوئی اور نہیں دیکھا۔“

”مرد جب بھی عورت کی تعریف کرتا ہے تو عورت کا دل گدگدائے لگتا ہے۔“ وہ ہاتھ لہرا کر بولی۔ ”وہ قریب آتی ہے تو مرد کی آنکھیں بے وفا ہو جاتی ہیں اور وہ کسی اور کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ سکندر اعظم بھی ایسا ہی تھا۔ ایک سلطنت کو فتح کرنے کے بعد دوسری کی جانب کھینچے لگتا تھا۔ کبھی مرد سکندر اعظم ہوتے ہیں؟..... ہاں، شاید نہیں..... کیا

کشادگی

اللہ تعالیٰ کے عام بندوں کے حقوق رزق میں کشادگی اور عمر میں اضافے کا باعث سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

”جسے یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں کشادگی اور اس کی عمر میں اضافہ ہو، تو اسے چاہیے کہ وہ صلہ رحمی (یعنی رشتے داروں کے حقوق ادا) کرے۔“

صحیح بخاری سے اقتباس
مرسلہ: محمد قیصر شہزاد، داخل، ضلع راجن پور

لڑکا۔ ”سوٹرا اچھا پہنا ہے۔“

لڑکی۔ ”شکریہ۔“

لڑکا۔ ”میک اپ بھی بہت اچھا کیا ہے۔“

لڑکی۔ ”تھینکس۔“

لڑکا۔ ”مہندی بھی بہت اچھی لگائی ہے۔“

لڑکی۔ ”شکریہ بھائی جان۔“

لڑکا۔ ”مگر خوبصورت تم پھر بھی نہیں لگ رہی ہو۔“

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور، ضلع مظفر گڑھ

جی لوگ اپنی جستجو اور فتوحات سے ایک دن تھک جاتے ہیں اور اپنی رسوئی کی طرف لوٹ جاتے ہیں؟“
اس کا لہجہ ٹوٹنے لگا تھا۔ آواز بھی کچھ بھاری ہو گئی تھی۔
میں نے کہا۔ ”میڈم! میں سکندر اعظم نہیں، ایک معمولی سا انسان ہوں۔“

”تم شہر یار ہو..... شہر یار بادشاہوں کا نام ہے۔ بادشاہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”مگر تم یہ سن لو، سچی عورتیں رسوئی جیسی نہیں ہوتیں، میرے جیسی بھی ہوتی ہیں جو منہ پھیرنے والے کو ہمیشہ کے لیے اندھا کر دیتی ہیں۔ آنکھوں میں سلاخیں پھر دیتی ہیں۔ ہر جاکی ماس کو کتوں کے آگے پھینکوا دیتی ہیں۔ تم جب بھی مجھ سے بے وفائی کر کے جانے لگو، یہ دھیان میں ضرور رکھنا..... میری ڈنٹری میں معافی کا لفظ شامل نہیں ہے۔“

میں اس کی بلاغت دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی بڑی گہری اور عالمانہ باتیں کرتا تھا۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا مگر کبھی میڈم جیسی ہستی سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ کبھی دھوکا دے کر، بے وفائی جیسے جرم کا ارتکاب کر کے یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ ویسے بھی میں ایسے گرداب میں پھنسا تھا کہ میرے پاس کہیں جانے کا راستہ ہی نہیں بچا تھا۔ یہاں سے نکل کر کہاں جاتا؟

وہ میرے چہرے کے مد و بندر کو بہ غور پڑھتی رہی، پھر بولی۔ ”تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو، پتا نہیں کیوں؟ ادھر آؤ، مجھے اٹھا کر بیڈ پر ڈال دو..... آرام سے اٹھانا..... جیسے کوئی ببول کو بڑی نرمی سے اٹھاتا ہے..... آؤ ناں.....“

میں سن ہو گیا۔ قدم بڑھانے کی سکت نہ رہی۔ اس قتالہ صبا کو چھوٹا دل گردے کا کام تھا، کجا آسے یوں بکھرے ہوئے وجود سمیت بانہوں میں بھر کر اٹھانا اور بیڈ پر لٹانا..... میں نے ہچکچا کر کہا۔ ”میڈم! یہ بہت مشکل ہے؟“

وہ ہنسی تو پھر ہنستی چلی گئی۔ کمرے میں کافی دیر تک جھڑک جکتی رہی۔ پھر نصف برہنہ بانہوں میں اپنے سیاہ بال چھاتی پر بچھنچ کر شرارت سے بولی۔ ”بہت مشکل ہے..... مگر..... میرا وزن اتنا زیادہ بھی نہیں ہے، اونٹنی فوری ایٹ کے جی..... اٹھا لو مجھے..... میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔“

میں گھبرا رہا تھا۔ اس افتاد سے بچنے کی میرے پاس کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے مدد طلب نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ شرارت اور دعوت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میری ہچکچاہٹ پر تمکلا نے کے بجائے دلکش انداز

رہی نے شرمناک لڑکے سے پوچھا: تم نے اب سے بات کی؟

ہاں۔ لڑکے نے جواب دیا۔

بھراؤنوں نے کیا کہا؟

انہوں نے پوچھا کہ میڈم بیک بلیس کتنے ہیں؟

نہ کما دس ہزار۔

پھر کیا ہوا؟ لڑکی نے اشتیاق سے پوچھا۔

ہونا کیا تھا، انہوں نے وہ رقم مجھ سے ادھار لی اور

کہا کہ تم تو دو کڑی کے آدمی بھی نہیں ہو۔

شہکتی تھی، قہریشا، جیک آباد، سندھ

کرتا ہوں۔ پلیز ویٹ!

وہ منہ بنا کر بولا۔ "پلیز ویٹ..... واہ بھی واہ....."

آگنی ناں انگریزی بولنی اور چند دنوں تک تمہیں اپنی ماں

بولی بھول جائے گی، ماں بھی ایک دن بھول جائے گی جس

نے تمہیں نور پور میں جنم دیا تھا۔ پھر تم آدھے تیر اور آدھے

بیر بن جاؤ گے۔ نہ گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے....."

چائے پینے کے دوران میں نے کھالے کو میڈم کے

تحفظات اور پیش بندی کے بارے میں بتایا۔ اس نے تائید

کی اور وقت ضائع کیے بغیر میڈم کی ہدایات پر عمل پیرا ہونا

ضروری قرار دیا۔ میں نے میرا شاہ کا نمبر لٹا کر اس نے

'بڑی' کر دیا۔ وہ مصروف تھا۔ میرے پاس پیا کا نمبر نہیں تھا

وگرنہ میں اس سے بھی رابطہ کرتا۔ ایسے وقت میں وحید نے

محسومانہ انداز میں گھر جانے کی ضد شروع کر دی۔ وہ اپنی

ماں سے ملنا چاہتا تھا۔ اپنی بہن کے بارے میں ماں باپ کو

بتانا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے والدین اس کی بہن کو

بہت جلد باز یاب کرالیں گے۔ یہ غیر فطری بات نہیں تھی۔

بچے اپنے والد کو دنیا کا طاقت ور انسان سمجھتے ہیں جس کے

پاس ان کی ہر مشکل کی دواموجود ہوتی ہے۔ وہ بھی ایسا ہی سمجھ

رہا تھا۔ جو کچھ جانتا تھا، بہت جلد اپنی ماں کو بتانا چاہتا تھا۔

میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی، اپنی مجبوری بتائی اور

وعدہ کیا کہ اگلے دن اسے گھر پہنچا دوں گا۔ اس کا دل نہیں

مان رہا تھا مگر ناچار سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ اس نے کچھ نتائج

میرے اور کھالے کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اخذ کر

لیے تھے، کچھ میری بات سمجھ لی تھی، تبھی خاموش ہو گیا۔

میں نے احتیاط سے اس کا منہ ہاتھ اور سر دھلوا دیا۔

میڈیکل کسٹ منگوا کر اس کی پٹیاں کھولیں اور زخموں کی معائنہ

جب میں میڈم کی گنگناہٹ سہم گئی، مدھ بھری آواز

بھری۔ "شہریار! میرا موبائل فون میرے پاس رکھ کر اپنے

کمرے میں جاؤ۔ فون پر میرا شاہ سے رابطہ کرو اور نور پور

جائے کا پروگرام تشکیل دو۔ میں کچھ دیر آرام کروں گی۔"

جی میڈم!

صوفے پر پڑے ہوئے موبائل فون کو اٹھایا اور پہلی

ی حالت میں لیٹی ہوئی میڈم کے عقب میں رکھ دیا۔ ٹوٹے

پے بدن کے ساتھ میڈم کے آراستہ و پیراستہ بیڈ روم کم

آفس سے باہر نکلا اور سر جھکائے گراؤنڈ فلور پر آ گیا۔ میں

بے دھیانی میں اپنے ہونٹوں کو کاٹ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا

جیسے بون پر تنگی نھی چنگاریاں چپک گئی ہوں۔ میڈم نے جس

دار فطرتی اور شدت جذبات سے مجھے لمس کا اعزاز دیا تھا، وہ

میرے لیے ناقابل بیان اور میرے قلب کی انوکھی اور شدید

واردات تھی تبھی میں میڈم کے کمرے سے نکلنے کے بعد بھی

اس کے حصار سے نہیں نکل پایا تھا۔

کھالا اور وحید کھانا کھا چکے تھے۔ کھالے کی جتنی

اشیہا کسی انتظار کو تسلیم کرنے والی نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی

آنکھوں میں شرارت چل گئی، بولا۔ "کیا بات ہے خان

راؤ؟ چہرے پر نور ہی نور برس رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میڈم نے

آئندہ کا پروگرام ترتیب دیا ہے۔"

میرے پہلو میں میرا دل کچوکا لگا کر بولا۔ "کیوں

جھوٹ بولتے ہو؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آج بے وفا کی کا

ارتکاب کر آئے ہو۔ یہ ثابت کر آئے ہو کہ مرد ہمیشہ خوب

سے خوب تر کی تلاش میں عورت، عورت گھومتا ہے، من مندر

کے لیے غی سے نئی مورتی تلاش کرتا ہے اور اس سفر میں کبھی

پچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ تم غزالہ کے دیوانے تھے، مگر تب تک،

جب تک تم نے اس سے زیادہ خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی

تھی۔ میڈم کو دیکھ کر تمہارے عشق نے پگڈنڈی بدل لی

ہے..... قف ہے تم پر!"

شاید میرے اندر کی جنگ میرے چہرے سے ہویدا

ہونے لگی تھی، تبھی کھالا صوفے سے اٹھ کر میرے پاس

آ گیا۔ میری آنکھوں میں براہ راست جھانک کر بولا۔

"تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو شہرے خان! سچ سچ بتاؤ،

کیا بات ہے؟"

میں نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"میں چائے کا کپڑا دوں، پھر تمہیں میڈم کی پلاننگ سے آگاہ

کے ڈھیلے مگر آتشیں بدن کو ہوا میں بلند کر لیا۔ اس کا سر، زنجیر

اور پنڈلیاں فرش کی طرف ڈھلکی ہوئی تھیں جب میں اس کے

قدموں پیچھے ہٹ کر بیڈ کی طرف بڑھا۔ اسے بڑی آہستگی

سے لٹایا، بازو اس کے سر میں وجود کے نیچے سے کھینچے اور

چاہا کہ اس دہکتی ہوئی آگ سے دور ہٹ جاؤں مگر اس نے

ناگاہ میرا ہاتھ تھام لیا۔ دفور شوق سے مجھے دیکھتی رہی، دہلی

دلی مسکراہٹ میں لپٹی ہوئی دعوت اچھالتی رہی، پھر کمر

بدل گئی۔ بیڈ پر جوانی کے پونٹھوہار کے مقابل حسن کا ہماری

استوار ہو گیا۔ پہلو کے بل لیٹی ہوئی میڈم کے سڈول بدن

کے اتار چڑھاؤ سے نظر ہٹانا دل گردے کا کام تھا۔ ایسے ہی

وقت میں میڈم کی بہکی بہکی مگر مترنم گنگناہٹ کمرے میں پھیل

گئی۔ "سو بار جنم لیں گے، سو بار فنا ہوں گے..... اے جان

وفا پھر بھی ہم تم نہ جدا ہوں گے....."

وہ گنگناہٹ تھی۔ ہولے ہولے تھرک رہی تھی۔ میں

نے رخ پھیر لیا۔ ایسے ہی پل میری چشم تصور میں غزالہ کا

وجود آن ابھرا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہونٹ سیکڑ کر شکوہ

کناں ہوئی۔ "بس..... یہی تھا تمہارا پیار؟ کہتے تھے کہ جنم

جنم سے تمہارا ہوں۔ زندگی کی آخری سانس تک تمہارا رہوں

گا۔ یہی کہتے تھے ناں کہ حسن دیہات میں ملتا ہے، شہروں

میں میک اپ زدہ چہرے اور کھوکھلے وجود ملتے ہیں۔ پھر ایک

شہر زادی نے میرے ہر جانی شہر یار کی سیمابی آنکھوں میں

اپنی شباہت نقش کر دی ناں؟"

وہ سچ کہتی تھی۔ میں نے سر جھکا لیا کیونکہ میں اپنی کبھی

پر قائم نہیں رہ پایا تھا، اُن کبھی کا پہرا کیا دے سکتا تھا۔ میڈم

کے حسن کا جادو مجھ پر پوری طرح چل گیا تھا۔ سانس سانس

میں اُس کی خوشبو رچ گئی تھی۔ میں نے سر جھکا۔ غزالہ کے

طنے کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، تبھی اپنی آنکھوں کی

سلطنت سے اس شکوہ کو کوبھگا دیا۔ کبھی تو یہی سکتا تھا۔

میرے عقب میں بیڈ پر شعلے اگتا ہوا سر میں وجود

تھا۔ نظر کے سامنے شلف میں رقص کرتی ہوئی، رنگ بہ رنگ

لبوس میں لپٹی ہوئی پتھر کی تنھی سی مورتی رقص کی حالت میں

کھڑی مجھ پر ہنس رہی تھی۔ یکبارگی جی چاہا کہ پلٹ کر اسے

دیکھوں جسے دیکھنا عشق کی ریاضت میں شمار ہوتا تھا مگر جرات

نہ ہوئی۔ اجازت لیے بغیر کمرے سے نکلنا آداب کے منافی

تھی، اجازت لینے کے لیے میڈم کو مخاطب کرنا قیامت تھا،

تبھی شش و پنج میں پڑ کر تھم گیا۔ سانسوں کی مالا میں چھپے

ہوئے انتشار کو صبر کی ہوا سے دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

کے بعد کسی اور وجود کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ تم اس کی فکر نہ

کرو..... آؤ اور مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر اٹھاؤ۔"

اس کی حکم عدولی کی تاب مجھ میں نہیں تھی۔ اسے

تاراض کرنے کا واضح مطلب یہی تھا کہ میں بھری دنیا میں

بے چھت اور بے سہارا ہو جاتا۔ میں نے کندھے اچکائے اور

قدم بڑھا دیے۔ اس نے فاتحانہ انداز میں ہنس کر آنکھیں

بند کر لیں۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اسے احتیاط سے

اپنی بانہوں میں بھر کر اٹھا لیا۔ اس نے سچ کہا تھا کہ اسے

اٹھانا مشکل کام نہیں تھا۔ ایک تو اس کا وزن زیادہ نہیں تھا

دوسرا اس نے اپنی بانہیں میری گردن میں جامل کر لی تھیں۔

اس کے وجود سے پھوٹی ہوئی خوشبو نے مجھے مسحور کر دیا اور

میری بانہیں لرزنے لگیں۔

وہ بولی۔ "ابھی نہیں رکو....."

میں تھم گیا۔ اس نے اپنا چہرہ میرے چہرے کے

قریب کیا۔ میری آنکھوں میں بے غور جھانکا، ایک نئی ادا سے

میرے ہونٹوں پر پھونک ماری اور کہا۔ "شہریار! آئی لو

یو..... تم بہت مختلف انسان ہو۔"

میری سانسیں غیر معتدل ہو چکی تھیں۔ بہ دقت تمام

میرے ہونٹوں سے نکلا۔ "مم..... مگر یہ امتحان مجھ پر

بھاری ہے۔"

اس نے میری بات پر توجہ نہیں دی تھی بلکہ غیر معمولی

آہستگی سے اپنے سرخ تر ہونٹ میرے ہونٹوں سے مس کر

دیے۔ میں جہاں کا تھاں رہ گیا۔ یوں لگا جیسے میرے بدن کا

تمام تر خون نچو کر میرے ہونٹوں میں سمٹ آیا ہو۔ میں

کوشش کے باوجود اپنا سر پیچھے نہ کر سکا۔ اس نے اسی پر اکتفا

نہیں کیا بلکہ اچانک اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کر بے جان کر لیا۔

میرے جسم میں پہلے ہی جان نہیں رہی تھی، اوپر سے یہ افتاد

پڑی تو میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ پایا اور اسے لیے صوفے

کی آرم فیک اور شیشے کی تپائی پر گر پڑا۔ میری داہنی کہنی کی

ضرب سے تپائی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ چھتا کے کی زوردار آواز

میں میڈم کی تیز ہنسی کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ وہ آدھی

صوفے پر، آدھی تپائی کے فریم پر اور میں اُس کی ہنسی کی تال

پر ہچکولے لیتے وجود پر گرا لپی لپی سانس لے رہا تھا۔

اچانک جلتنگ تھم گئی۔ اس کی آواز میرے کانوں

میں پڑی۔ "بس؟"

مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ میں نے اپنے بازوؤں کے

موتختہ اعصاب میں اپنی تمام ہڈیاں اتار لیں اور اُس

کاری کے بعد پتھر لگا کر نئی بینڈ تاج کر دی۔ اس کے زخم گہرے تھے مگر خطرناک نہیں تھے۔ کندھے کے جوڑ کے زخم سے ابھی قلیل مقدار میں خون ریس رہا تھا۔ دو چار مرتبہ پٹی کرنے کی ضرورت تھی، پھر کھرٹ آ جانے پر پٹی کی بھی ضرورت نہ رہتی۔ اس کے لباس کی حالت بہت خراب تھی مگر یہاں اس کے سائز کا سوٹ ملنا محال تھا، اس لیے اسی پر گزارا کرنا پڑا۔ اسے سکون ملا تو پھر سو گیا۔ نہ جانے اس کے دماغ کو کتنی نیند درکار تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد میر و شاہ کا فون آ گیا۔ میں نے ریسو کیا۔ اس کی آواز کانوں میں پڑی۔ ”اڑے او غنچے! یہ تیا فساد پھوٹ میں میری جان پر ڈال دیوے ہے، اب کے نورپور میں ریڈ کرنا ہووت۔ اڑے مروا دیا ناں لاڈے..... ادھر نفری شارٹ ہووے، ادھر ملکہ رانی کو تیرے لاڈ سو جھٹ ہیں۔“

”میڈم نے کہا.....“

”اڑے ناں کر غنچے!“ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

”ماڑی میڈم نے ساری بات ماڑے کو بتا دیوت ہے۔ وہ دہی پروانج (پرواز) کرنے کو تیار ہے اور ماڑے کو سولی پر ٹانگ دیوت ہے، ایک بات کر کے..... اپنے لاڈے کا کے کو جرینا (زرمینا) کے حوالے کر کے تیاری کرت..... اس کا لے گلاب کے پھول کھالے کو بھی تیار کر لیوت ہے۔ ماڑے کو جرا (ذرا) مصروفیت ہووے، فارغ ہو کر تیرے پاس آوت ہے۔ پھر مل بیٹھ کر پلاننگ کرت ہیں۔ او کے؟“

”او کے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”زرمینا کہاں ہے؟“

”وہ سالی جرورت (ضرورت) سے جیادہ (زیادہ) سووے ہے بالا خانے میں..... پر تیرے کو فکر کی جرورت نہیں ہے۔ میں سالی جرینا کو فون کر کے تیرے کمرے میں بھیج دیوت ہے، تم کا کے کو اس کے حوالے کر دیوے۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔ کھالا کان نزدیک کر کے اس کی باتیں سن رہا تھا بولا۔ ”یہ میر و شاہ کوئی خاص قسم کی چیز ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! توپ ہے۔ یہ سمجھ لو کہ میڈم کے بعد اس سارے نیٹ ورک کا انچارج ہے۔“

”لگتا تو نہیں.....“ اس نے استہزاءیہ انداز میں کہا۔

”مگر ہے بڑی چیز.....“ میں بولا۔ ”میڈم اس کی ہر بات مانتی ہے۔ اس کا ہر خرا اٹھاتی ہے۔ وہ جس طرح میرے ساتھ باتیں کرتا ہے، بالکل اسی طرح میڈم کے

سامنے بولتا ہے۔ کھالے! میڈم بڑی دھانسو قسم کی عورت ہے۔ اس کے سامنے بڑا دیکھ سوچ کے بولنا پڑتا ہے۔“

وہ مسکرایا۔ ”کیا بندے کھاتی ہے؟“

”ہاں..... بندے کو ایسے نگل لیتی ہے، جیسے بندہ ہو، ببل گم ہو۔“

”تمہیں لگتا؟“

”میں کیا، میری اوقات کیا؟“

”زبان کچھ اور کہتی ہے، آنکھیں کچھ اور..... جھوٹ بولنے کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔“

”یار کھالے! ان باتوں کو چھوڑو، یہ سوچو، ہمیں کرنا کیا ہے؟“ میں نے موضوع بدلا کیونکہ اس کی بے مقصد طوفانی گفتگو چھڑ گئی تھی جسے روکنا ضروری تھا۔ ”کیا چا چا چراغ اور چاچی ہمارے ساتھ آنے پر تیار ہو جائیں گے؟“

وہ بولا۔ ”یہ بعد کی بات ہے، یہ دعا کرو کہ وہ خیری سلامتی (بخیر و عافیت) ہوں۔“

میرے دل سے دعا نکلی۔ ”یا اللہ! انہیں اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔“ میں نے لمبی سانس پھینچڑوں میں اتاری اور کہا۔ ”سچ پوچھو تو میں نورپور سے ادھر (اواس) ہو گیا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھے کئی سال ہو گئے ہوں نورپور سے نکلے ہوئے۔ وہ گلیاں، وہ گھر، وہ کھیت..... سب کچھ آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔“

”میں نے محسوس کیا ہے کہ تم یہاں آ کر غزالہ کو بھول گئے ہو۔ کیا وہ تمہارے دل سے اتر گئی ہے؟“ کھالے نے چپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اونہیں یار! وہ میرا عشق ہے اور عشق ہمیشہ غیرت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میری غیرت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ جب تک پروین زندہ سلامت مجھے نہیں مل جاتی، تب تک میرے دل میں غزالہ تو کیا، کوئی اور خیال بھی نہیں آ سکتا۔“

”میڈم کا خیال بھی نہیں آ سکتا؟“

میں کہنے لگا کہ ہرگز نہیں، پھر یاد آ گیا کہ میں اس وقت میڈم کی کوٹھی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ یہ طلسم کدہ تھا۔ کیا خبر کہ یہاں ہونے والی گفتگو بھی میڈم کے کانوں تک پہنچ رہی ہو۔ میں نے کہا۔ ”میڈم کی بات اور ہے، وہ نہ صرف میری محسنہ ہے بلکہ وہ مجھے اہمیت دیتی ہے۔“

”کیا تم اس سے محبت کرنے لگے ہو؟“ کھالے نے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے ہونٹ بھیج لیے۔ وہ ہر آن کوئی حساس

مسافر

”وہ اسامی بی کو اپنی نوہ (بہو) بنانے کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی غیرت پر تم نے چوٹ ماری ہے، وہ تمہارا خون پی جائے گا۔“

”میں نے؟“

”ہاں تم نے.....“ اس کے لہجے میں بہت خستگی تھی۔

”جو بات حیدر خان تک پہنچ جاتی ہے، سمجھو وریام خان کے کانوں میں پڑ جاتی ہے۔ حیدر خان کی وفاداری میں وہ کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔“

اس نے درست کہا تھا۔ پروین اور اسما کے اغوا کی کڑیاں ملائی جا چکی تھیں اس لیے یقینی طور پر اب تک نورپور کی فضا مجھ پر تنگ کی جا چکی ہوگی۔ غنیمت تھا کہ سائیکس دل جیت کی لاش جل کر خاک ہو گئی تھی اور اس کے قتل پر ہمیشہ کے لیے مٹی پڑ گئی تھی ورنہ اس کے گرگے اور بھی خواہ بھی میری ٹکا بونی کرنے کے لیے تڑپ رہے ہوتے۔

میرا رخ آدھ کھلے دروازے کی طرف تھا۔ چست جامنی لباس والی ایک سرو قامت لڑکی گیلری میں رُکی، کمرے میں جھانک کر بولی۔ ”مسٹر شہر یار؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اندر آ گئی۔ سونیا نے کہا تھا کہ زرمینا بہت حسین و جمیل ہے۔ جو بھی اسے دیکھتا ہے، دیکھتا ہی رہتا ہے۔ آنے والی کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ زرمینا ہی ہو سکتی تھی کیونکہ وہ حسن کا مکمل شاہکار تھی۔ جدید وضع کا گہرا جامنی لباس، کھلے اور کولھوں تک کمر کا احاطہ کے ہوئے جھرنے جیسے ہلکے براؤن بال اور بڑی بڑی مخمور آنکھیں..... اسے دیکھنے کے بعد واقعی کچھ اور دیکھنے کی طلب نہیں رہتی تھی۔ میں نے ازراہ اطمینان دریافت کیا۔ ”تم زرمینا ہونا؟“

وہ مسکرائی۔ ”جی..... میر و شاہ نے کسی بچے کو لے جانے کا حکم دیا ہے۔ کیا وہ یہی ہے؟“

اس کا اشارہ بیڈ پر پانچتے کے رخ لیٹے ہوئے وحید کی طرف تھا۔ میں نے ہاں کہا تو وہ بولی۔ ”اسے جگائیں، میں اسے اوپر لے جاتی ہوں۔“

ایسے میں کھالے کی نظر اس پر پڑی۔ یوں لگا جیسے وہ نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔ اس کی ندیدی آنکھیں اپنی پوری وسعت میں پھیل گئیں۔ منہ بھی کھل گیا۔

زرمینا وحید کی طرف متوجہ بھی اس لیے کھالے کا گستاخ انہماک دیکھ نہ پائی بولی۔ ”اس کے کپڑے بہت گندے ہیں، کیا بازار سے دو تین سوٹ منگوا لوں؟“

شاید وہ یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا وہ اتنا اہم تھا کہ اس

”وہ ہمیں کیا کہے گا؟“ میں چونکا۔

”تم پاگل ہوئے ہو، کیا آدمی رات کو ہم لوگوں کے دروازے کھٹکھٹاتے پھرے گا۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حیدر خان کا بڑا چچہ، سردار وریام خان ہمارا شاندار طریقے سے سوگت کرنے کے لیے جاگ رہا ہو اور ہمیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔“

”وہ ہمیں کیا کہے گا؟“ میں چونکا۔

کے لیے کپڑے خریدنے کا تردد کیا جائے، میں نے جواب دیا۔ ”اگر ممکن ہو تو ضرور منگوا لیتا۔“

میں نے وحید کو جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اسے زرمینا کے ساتھ جانے کا کہا تو اس کا چہرہ بجھ گیا۔ وہ میرے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ میری موجودگی میں اسے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ میں اس کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا تھا مگر مجبوری تھی، اس لیے اسے بہلا پھسلا کر زرمینا کے ساتھ بھیج دیا۔ قیامت کی طرح ہم دونوں پر ٹوٹ پڑنے والی زرمینا ایک ادائے بے نیازی سے وحید کا ہاتھ تھامے لہرائی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو میں نے کھالے کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ ”ابے او بے اوقات، نظر باز کی اولاد! اب جاگ جاؤ، جانے والی جا چکی ہے۔ تم نے شاید یہ سمجھ رکھا تھا کہ اسمانی بی سے زیادہ دنیا میں کوئی بھی خوب صورت نہیں ہے۔“

وہ چونکا اور لمبی آہ بھر کر بولا۔ ”یار یہ تو بڑی پُری (بالکل) نیلم پری تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا۔۔۔۔۔“

میں نے حسب روایت اس کی بات کاٹ دی۔ ”کہ جیسے دنیا اس کے پیروں میں سٹ آئی ہو، جیسے اس کے سامنے اسماجیسی سیکڑوں لڑکیاں پانی بھرنے پر لگ گئی ہوں۔۔۔۔۔“

اگر میں فوراً پیچھے نہ ہٹ جاتا تو اس کا طوفانی منہ میرے کاندھے پر پڑتا۔ کم بخت کا ہاتھ بہت بھاری تھا۔ گرز کی طرح پڑتا تھا، وہیں نیل ڈال دیتا تھا۔ وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی ایک ہزار دوتیس لڑکیوں پر۔۔۔۔۔ اسمانی بی کو ایسی پرکٹی لڑکیوں کے ساتھ نہ جوڑا کرو۔ مجھے غصہ آتا ہے۔“

میرا قہقہہ اس کے غصے کو آنچ دینے لگا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے دروازے میں میرا شاہ کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے مجھ پر نظر پڑتے ہی اپنی مہین سی بائیں کھول کر پرتاک انداز میں نعرہ لگایا۔ ”او ماڑے غنچے۔۔۔۔۔ او ماڑے لاڈے۔۔۔۔۔ بڑا نکھر جاوت ہے میڈم کے محل میں گھس کر۔۔۔۔۔“



میرا شاہ کی ہدایت پر جب میں، کھالا اور پیا مظفر گڑھ کی نواحی بستی بصیرہ میں میڈم کے خاص کارندے سردار انصر حیات کے ڈیرے پر پہنچے، تب سات بج چکے تھے۔ چونکہ موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا اس لیے شام جلد ڈھلنے لگی تھی۔ سات بجے ہی معمول کے مطابق دیہاتی فضا پر اندھیرے کے تسلط کی ابتدا ہو چکی تھی۔

سردار انصر کا ڈیرا بستی سے ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ پیا کی پہچانی کئی معلومات کے مطابق یہاں اس کے پندرہ ایکڑ زرعی رقبہ تھا جس کے عین وسط میں اس نے شاندار وضع کا ڈیرا تعمیر کر رکھا تھا۔ اس کی رہائش بصیرہ بستی کے قریب میں واقع تھی۔ پیا نے بتایا کہ اس کی تین مربع زرعی اراضی جنوب میں گودر کے موضع میں ہے۔ سردار انصر کا یہ ڈیرا مکمل اور جدید طرز کے گیٹ ہاؤس کا درجہ رکھتا تھا۔ پتا چلا کہ میرا شاہ نے اسے ہماری آمد کی خبر کر دی تھی، تبھی وہ ہمارا منتظر تھا۔ ڈیرے پر دو دیہاتی چلے کے نوکر موجود تھے جنہیں اس نے مہمانوں کی خاطر تواضع کا حکم صادر کیا اور ہمیں ایک نیم بڑے اور محفوظ کمرے میں پہنچا دیا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں یہاں سے بارہ بجے کے بعد کسی وقت نکلنا تھا۔ چونکہ نور پور یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور ہمارے پاس بھی نئے ماڈل کی اسوز وٹرو پر گاڑی تھی جو ہمیں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹوں میں یہاں سے نور پور پہنچا سکتی تھی، اس لیے بجائے ملتان میں بیٹھ کر انتظار کرنے کے، میرا شاہ نے یہاں آرام سے بیٹھنے کا حکم صادر کیا تھا۔

سردار انصر سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”سائیں! یہاں سب کچھ موجود ہے۔ ان کے پانی (کھانے) کا انتظام میں نے کر رکھا ہے۔ پینے پلانے کا اہتمام بھی ہے۔ ادھر فوٹو شوٹ بھی دیکھ سکتے ہو۔۔۔۔۔“

اس نے کمرے کے کارنر میں رکھی ٹی وی ٹران کی طرف ہنس کر اشارہ کیا، پھر بولا۔ ”سائیں! یہ شہر تو نہیں ہے مگر یہاں میں نے شہر کی ہر رونق اکٹھی کر رکھی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ صرف ٹی وی نظر آئے گا، ہر چیز چیل دیکھا جاسکتا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ اس نے ٹی وی پر ڈش ریسور لگا رکھا تھا۔ اس نے ہمیں ڈیرے کے بارے میں معلومات دیں، سینے پر روایتی انداز میں ہاتھ رکھا اور اجازت چاہی۔

اس کے جانے کے بعد پیا نے کہا۔ ”یہ بڑا امن مونی آدمی ہے۔ اس نے سچ کہا ہے، یہاں سب کچھ ملتا ہے۔“

ابھی وہ ہمیں اس کے بارے میں بتا رہا تھا کہ نوکروں نے کمرے کے وسط میں دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ کھانا واقعتاً پُر تکلف اور مزیدار تھا۔ اصل مرغ کا بھنا ہوا نمکین گوشت، تنوری روٹیاں، دیہاتی انداز سے تیار کیا ہوا سلاو، مکھن اور ابلے ہوئے دسی انڈے۔۔۔۔۔ کھانے کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ اس سے بہ آسانی چھ سات آدمی ہر شکم ہو سکتے تھے۔

کھانے سے فراغت پاتے ہی پیا نے ایک نوکر کو بلا کر کوئی مخصوص اشارہ کیا۔ نوکر نے روایتی انداز میں سر ہٹ کر سینے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ”حکم دی تعمیل تھیں۔۔۔۔۔“

(حکم کی تعمیل ہوگی میرا سائیں!)

کھالے کی آنکھیں جل اٹھیں جب اس نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اسکاچ کی میڈیم پیک بوتل اور شیشے کے گلاس دسترخوان پر رکھ دیے۔ پیا نے برف کی فرمائش کی۔ نوکر نے فریج سے برف کے ننھے ننھے ٹکڑے، اسٹیل کی ٹی اور پانی کی ٹیخ بستہ بوتل بھی نکال کر پیش کر دی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے ان کی محفل چھوڑ دی اور چارپائی پر دم دراز ہو گیا۔ کھالا اور پیا یہ دستور وہیں بیٹھے رہے۔ مجھے ایک نیا کھیل دیکھنے کو ملا۔ پیا نے اسکاچ کی بوتل کھولی۔ دو گلاس آدھے آدھے بھرے، چٹنی کی مدد سے ان میں برف کے ننھے ننھے چوکور ٹکڑے بڑی نفاست سے ڈالے اور تھوڑا سا پانی شامل کیا۔ جام تیار ہو چکا تھا۔ دونوں نے گلاس گرائے، لبوں سے لگائے اور مزہ لینے لگے۔

انہوں نے اس عمل کو اس وقت تک دہرائے رکھا جب تک بوتل خالی نہیں ہو گئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ پوری بوتل بڑھالنے کے باوجود دونوں پوری طرح اپنے حواس میں تھے اور وہ ہنسے ہوئے ہرگز نہیں تھے۔ مجھے ڈرتا تھا کہ کہیں ان کی بے نوشی کی وجہ سے آج کا مشن التوا میں نہ پڑ جائے، مگر خیر گزری کہ وہ اپنے پیروں پر چل کر چارپائیوں تک آئے اور پھیل کر بیٹھ گئے۔

کھالا بولا۔ ”خانزادے! تھوڑا اوکھا تھی تے! میں بے کون کھلا بجا کر۔۔۔۔۔“

(خانزادے! تکلیف کرو اور اس ڈبے پر لعنت بھیج دو)

اس نے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے اٹھ کر ٹی وی اور ڈش ریسور آن کر دیا۔ وہ ریموٹ کنٹرول اٹھائے چارپائی پر آن بیٹھا اور عادتاً چینل بدلنے لگا۔ کھالے کو موج متی والا چینل درکار تھا بھی ”آگے“ کا نعرہ بار بار بلند کر رہا تھا۔ ایسے میں ایک مقامی نیوز چینل پر میری نظریں ٹھہر گئیں۔ بریکنگ نیوز نشر کی جا رہی تھی۔ نیوز کا شرکی پُریجان آوازنی والی کے اسپیکروں سے نکل کر کمرے میں پھیلنے لگی۔ وہ بتا رہی تھی کہ غازی گھاٹ کے قریب دریائے سندھ کے پیلے میں پولیس کا اشتہاریوں کی خفیہ پناہ گاہ پر چھاپہ، چار ڈاکو ہلاک، دو سپاہی اور ایس ایچ او زخمی۔۔۔۔۔ تقریباً ایسی الفاظ اسکرین کے نچلے حصے میں یہ طور سلائیڈ رچل رہے تھے۔ اسکرین پر

تھانے کی حدود میں چارپائیوں پر رکھی ہوئی ڈاکوؤں کی لاشیں دکھائی جا رہی تھیں۔ میرے ساتھ ساتھ کھالا اور پیا بھی چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ جونہی اسکرین پر ڈاکوؤں کے چہرے دکھائے گئے اور ان کے سروں کی مقررہ قیمتیں بتائی گئیں، ہم بری طرح چونک گئے۔ وہ چاروں وہی تھے جنہیں ہم نے حیدر خان کی خفیہ حویلی کے اسٹور میں مردہ حالت میں دیکھا تھا۔

میرے لبوں سے نکلا۔ ”یہ کیا کھالے! یہ تو وہی ہیں جنہیں کسی نامعلوم آدمی نے رتی کا پھندا دے کر قتل کیا تھا۔“

کھالے نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور توجہ سے دیکھنے لگا۔ اسکرین پر زخمی ایس ایچ او انک انک کر بتا رہا تھا۔ ”ہمیں ان ڈاکوؤں کی موجودگی کی خبری ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے بہت بڑا کریمنل گینگ بنا رکھا تھا اور جو بڑی بڑی وارداتیں کرنے میں مشہور تھا۔ ان لوگوں پر ان گنت مقدمات درج تھے اور حکومت نے ان کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر اٹھارہ لاکھ روپے انعام مقرر کر رکھا تھا۔ ان سے کئی مرتبہ ہماری مدد بھیڑ ہوئی مگر یہ ہر مرتبہ جھل دے کر نکل گئے۔ اس مرتبہ ہم نے خبری کے بعد اپنے ریڈ کو بالکل خفیہ رکھا۔ ایس پی صاحب نے یہ نفس نفیس ہماری رہنمائی کی اور میرے ساتھ تھانہ چوک قریشی کے سات دلیر اور محب وطن اہل کاروں نے ریڈ میں حصہ لیا۔ ہم نے جب ان کا گھیراؤ کیا تو انہیں متعدد بار ہتھیار پھینک کر خود کو قانون کے حوالے کرنے کی پیش کش بھی کی۔ بار بار مائیکروفون پر اعلان کیا مگر انہوں نے مورچے سنبھال کر ہم پر قاتل کھول دیا۔۔۔۔۔“

وہ اپنی بہادری کی داستان بڑے جوش و خروش سے سنا کر اسکرین سے اوجھل ہو گیا۔ دوسرا زخمی اہلکار اسکرین پر نظر آیا۔ ایک مرتبہ پھر کیرامین نے کیرا مردہ ڈاکوؤں پر فوکس کیا۔ نیوز رپورٹر نے اپنی اینکر کورپورٹ دیتے ہوئے کہا کہ چاروں ڈاکو پولیس کی گولیاں لگنے سے ہلاک ہوئے ہیں۔ میں نے آنکھیں مزید کھولیں، غور سے دیکھا تو ڈاکوؤں کی بنیانوں اور کپڑوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے دکھائی دیے۔

کھالا بولا۔ ”لگتا ہے کوئی تین چار کلو کا کلز (مرغا) حلال کر کے خون چھڑکا گیا ہے۔“

وہ خون مرنے کا تھا، یا کسی جانور کا، بہر حال ان کا نہیں تھا کیونکہ مردوں کے بدن میں گولیاں تو اتاری جاسکتی ہیں مگر خون نہیں نکلتا۔

پیا بولا۔ ”یار یہ لوگ کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بولتے

ہیں، یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے پوری سروس میں محض جھوٹ بولنا ہی سیکھا ہے۔ زخمی اہلکاروں کو نہ جانے کس طرح ان لوگوں نے زخمی کیا ہوگا۔“

کھالا بولا۔ ”ان لوگوں کو مفت میں اٹھارہ لاکھ روپے کا انعام مل گیا ہے، دیکھو تو..... اللہ تو یہ ہے بھی.....“

نوکر نے میرے سامنے چائے کا بڑا پیالہ اور دونوں عیش کوشوں کے سامنے آم کے اچار سے بھری چھوٹی سی پلیٹ رکھ دی۔ کھالے کی سنگت نے یہ سمجھا رکھا تھا کہ اچار کھانے سے شراب کے نشے میں کی واقع ہو جاتی ہے، اس لیے مجھے ان دونوں کو عورتوں کی طرح اچار کی ڈلیاں چوستے دیکھ کر مطلق حیرانی نہیں ہوئی۔ میری توجہ ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھی جہاں ڈی ایس بی کے بعد مظفر گڑھ کا ایس پی اپنے بہادر اہلکاروں کی تعریف کر رہا تھا اور محکمہ انعامات و اعزازات کا اعلان کر رہا تھا۔

کیمبرے نے زوم ان کیا۔ اب جو شخصیت اسکرین پر نظر آئی، اس کو دیکھ کر یکبارگی میرا خون کھول اٹھا۔ وہ سردار حیدر خان تھا جو عادتاً اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کڑک دار آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”ان ظالم درندوں نے میرے حلقے کے لوگوں کا جینا محال کر رکھا تھا۔ ان کی وارداتوں کی شکایات میرے حلقے کے لوگ بار بار مجھے کر چکے تھے۔ میں نے ذاتی طور پر ایس بی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب کو درخواست کی کہ ان لوگوں کا قلع قمع کیا جائے۔ آج جب مجھے پتا چلا کہ جناب ایس بی صاحب کی زیر نگرانی ایس ایچ او نے کمال دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گینگ کو تھمس تھمس کر دیا ہے، تو میں نے اور میرے حلقے کے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا ہے اور پولیس پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ میں اپنی طرف سے ان سرکاری اہل کاروں کو جنہوں نے اس ریڈ میں حصہ لیا، بیس بیس ہزار روپے بہ خود انعام دینے کا اعلان کرتا ہوں۔“

میراجی چاہا کہ میں ٹی وی اسکرین توڑ دوں۔ وہ بہت بڑا جھوٹا اور کمینہ صفت انسان تھا۔ اس نے اپنے اتنے بڑے نقصان سے بھی سیاسی فائدہ کشید کر لیا تھا۔ اب تک اس کے کارندے اس کی باتوں کو بڑھا چڑھا کر عوامی حلقوں میں پیش کرنے لگے ہوں گے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے نہ صرف ان لاشوں کو ٹھکانے لگا لیا تھا بلکہ قانون اور علاقے کی نظروں میں اپنا قد بھی بڑا کر لیا تھا۔

کھالا بولا۔ ”یہ ہوتی ہے سیاست..... دیکھو..... کیا پانسا پلٹا ہے شیر کے بچے نے! پُر اندر کا بھانجھڑ اس کی روح کو

جلارہا ہوگا۔“

پیانے دانش مندانہ انداز میں کہا۔ ”نہیں کھالے! اسے کارندوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ دو چار اور اشتہاری بھرتی کر لے گا۔ ان اشتہاری ڈاکوؤں کی زندگی کی قیمت بہت کم ہوتی ہے۔ جب بھی مرتے ہیں، کتے کی موت مرتے ہیں۔“

”کیا تم بھی اشتہاری ہو؟“ کھالے نے اسے دیکھا۔ ”تو اور کیا..... جب میں ڈاکو ہوا کرتا تھا تو میں نے بڑی بڑی مونچھیں اور ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ جب میڈم کے پاس آیا تو اس نے مجھے جنگی سے شہری بنا دیا۔ میڈم نے مجھ پر احسان کیا، میری شکل میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کرادی، میرا نیا شناختی کارڈ بنوا دیا اور مجھے نئی شناخت دیدی۔ اب میری پہلی پہچان ختم ہو چکی ہے۔ نیا نام، نیا کارڈ اور نئی زندگی..... اور یہ سب کچھ میڈم کی دین ہے۔“

میں نے پلٹ کر ایک ذرا غور سے اسے دیکھا۔ شکل میں تھوڑی بہت تبدیلی کیسے ممکن تھی؟ پھر نگاہوں میں میڈم گھوم گئی۔ سوچا، اس کی دنیا میں یہ بھی ممکن ہوگا۔ ٹی وی پر بریکنگ نیوز بدل گئی۔ کسی اور علاقے کے خبر چل نکلی۔ وہ بھی پولیس مقابلے کی تھی۔

پیانے کہا۔ ”اور دیکھو..... یہاں بھی سردار حیدر خان کا کوئی بھائی بند موجود ہے۔“

میں نے تقریبی انداز میں سر ہلا دیا۔ چونکہ اس پولیس مقابلے کے پس منظر سے میں پوری طرح واقف تھا، اس لیے اس پر جھوٹ کی اتنی بڑی عمارت کی تعمیر دیکھی تو اب تک نے اور ٹی وی پر دیکھے جانے والے بھی پولیس مقابلے میری نظر میں مشکوک ہو گئے تھے۔ لوگ سچ کہتے تھے کہ بڑے لوگوں کی باتیں غریب عوام کی سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ وہ ایک تیر سے دو نہیں، کئی کئی شکار کرتے ہیں اور پھر چہرے پر مصحوم تبسم لیے ہیرو بن جاتے ہیں۔ مجھے حیدر خان کے نام سے صحن آنے لگی۔ نفرت سے ہونٹ سیڑھے اور چینل بدل دیا۔ اب کسی انڈین چینل پر بیجان خیز رنگوں میں لپٹی جوانی تھرکنے لگی۔ کھالے نے نعرہ لگایا۔ ”بس بابا بس..... یہیں دو گھڑی سکھ کا سانس لینے دو ہمیں۔ کیوں پیاجی؟“

پیاجی نے بھی اس کی بے طرح کی حمایت کردی تو میں نے ریموٹ کنٹرولر چار پائی پر رکھ دیا اور سرھانے پر سر ڈال دیا۔ سردار حیدر خان کو پس نظر ڈال کر اپنے درپیش مشن کے بارے میں سوچنے لگا۔ ہم تینوں اس وقت جدید اسلحہ سے لیس تھے۔ عقیل میر و شاہ کے کسی اور مشن میں مصروف تھا اس لیے

مسافر

ان کا قاتل ہو سکتا ہے جس کے ظلم نے قیمتی میری قسمت کردی تھی۔ وہ سردار حیدر خان بھی ہو سکتا تھا، وریام خان بھی اور..... وسیب کا کوئی اور وڈیرا بھی..... بارہ بجے کے قریب پیاجی کے موبائل پر میر و شاہ کی کال رسیو ہوئی۔ پیاجی ’نیس باس‘ کہہ کر ہمہ تن گوش ہو گیا اور میر و شاہ کی آواز بھنبھناہٹ کی صورت میں ہمارے کانوں تک پہنچنے لگی۔ وہ اپنی دی ہوئی ہدایات کو دہرا رہا تھا اور بار بار میرے بارے میں تاکید کر رہا تھا کہ میرا خیال رکھا جائے۔

میں نے کہا۔ ”پیاجی! پوچھو تو کیا میڈم چلی گئی ہیں؟“ میری آواز میر و شاہ نے سن اور سمجھ لی فوراً کہا۔ ”ہاں ماڑے غنچے..... میڈم جہاج (جہاز) میں سوار ہو جاوے ہے۔ پُر تم فکر کا ہے کو کرت ہے، ماڑے کو اپنے اپنے ساتھ کچھ ہووت.....“

میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرے لیے تسلی کی بات تھی کہ وہ مجھ پر مہربان تھا، میرا خیال رکھتا تھا۔ پیاجی فون بند کر کے بولا۔ ”میر و شاہ کا حکم ہے کہ ہم یہاں سے ایک بجے نکلیں اور دو بجے تک اپنا کام نمٹا کر واپس نہیں پر آ جائیں۔“

میں نے کہا۔ ”پیاجی! میرا خیال ہے کہ بغیر کسی رکاوٹ کے ہم اپنا کام کر کے لوٹ آئیں گے۔“ کھالا بولا۔ ”لگتا تو ایسے ہی ہے مگر..... مگر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بھیڑاویلا (براوقت) بتا کر نہیں آتا۔ میر و شاہ نے ٹھیک کہا ہے کہ ہمیں ہر لحظہ کسی بھی افتاد کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔“

پیانے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے اپنی بارہ سالہ سروس میں ایک بھی سبق سیکھا ہے اور ایک سبق یہ بھی سیکھا ہے کہ دنیا میں کسی پر بھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔“

ان کا قاتل ہو سکتا ہے جس کے ظلم نے قیمتی میری قسمت کردی تھی۔ وہ سردار حیدر خان بھی ہو سکتا تھا، وریام خان بھی اور..... وسیب کا کوئی اور وڈیرا بھی.....

بارہ بجے کے قریب پیاجی کے موبائل پر میر و شاہ کی کال رسیو ہوئی۔ پیاجی ’نیس باس‘ کہہ کر ہمہ تن گوش ہو گیا اور میر و شاہ کی آواز بھنبھناہٹ کی صورت میں ہمارے کانوں تک پہنچنے لگی۔ وہ اپنی دی ہوئی ہدایات کو دہرا رہا تھا اور بار بار میرے بارے میں تاکید کر رہا تھا کہ میرا خیال رکھا جائے۔

میں نے کہا۔ ”پیاجی! پوچھو تو کیا میڈم چلی گئی ہیں؟“ میری آواز میر و شاہ نے سن اور سمجھ لی فوراً کہا۔ ”ہاں ماڑے غنچے..... میڈم جہاج (جہاز) میں سوار ہو جاوے ہے۔ پُر تم فکر کا ہے کو کرت ہے، ماڑے کو اپنے اپنے ساتھ کچھ ہووت.....“

میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرے لیے تسلی کی بات تھی کہ وہ مجھ پر مہربان تھا، میرا خیال رکھتا تھا۔ پیاجی فون بند کر کے بولا۔ ”میر و شاہ کا حکم ہے کہ ہم یہاں سے ایک بجے نکلیں اور دو بجے تک اپنا کام نمٹا کر واپس نہیں پر آ جائیں۔“

میں نے کہا۔ ”پیاجی! میرا خیال ہے کہ بغیر کسی رکاوٹ کے ہم اپنا کام کر کے لوٹ آئیں گے۔“ کھالا بولا۔ ”لگتا تو ایسے ہی ہے مگر..... مگر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بھیڑاویلا (براوقت) بتا کر نہیں آتا۔ میر و شاہ نے ٹھیک کہا ہے کہ ہمیں ہر لحظہ کسی بھی افتاد کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔“

پیانے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے اپنی بارہ سالہ سروس میں ایک بھی سبق سیکھا ہے اور ایک سبق یہ بھی سیکھا ہے کہ دنیا میں کسی پر بھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔“

پیا بڑے مدبرانہ انداز میں کھالے کو سمجھا رہا تھا۔
”دیکھ بھئی کھالے! پولیس والوں کو دیکھ کر گھبرانا خود کو
پھنسانے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ کوئی ایسی رائی مخلوق نہیں
ہیں بلکہ فطری طور پر ہم لوگوں سے بہت کمزور ہیں۔ انہیں
اپنی جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ ہم جان کی بازی لگا کر روڈ
پر آتے ہیں، یہ جان بچانے کے لیے وظیفے پڑھتے ہیں۔
اگر ہم انہیں بتا بھی دیں کہ ہم کریمنل لوگ ہیں تو پھر بھی یہ
فوراً ہی راستے سے ہٹ جائیں گے۔۔۔۔۔ بلکہ بھاگ کر چھپ
جائیں گے۔ کسی کو بتائیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے ہمیں
دیکھا ہے، سمجھے؟“

کھالے نے فرماں بردار طالب علم کی طرح ”اچھا جی“
کہا۔ کھالے کی طرح میں بھی وردی پوشوں سے ڈرتا تھا، ان
سے دور بھاگتا تھا بلکہ بچ تو یہ تھا کہ ابھی تک سرکاری
سائڈوں کو دیکھ کر میری سٹی کم ہو جاتی تھی۔ چونکہ پیا کی بارہ
سالہ ’سروس‘ آن دی ریکارڈ تھی، اس لیے وہ انہیں خاطر میں
نہیں لاتا تھا۔

ہمیں نور پور تک کسی رکاوٹ یا غیر متوقع صورت حال
کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کھالے نے حیات خان کی حویلی کے
سامنے پہنچ کر پیا سے کہا۔ ”میں نے اس راستے کی بات کی
تھی۔ ہم اس راستے سے واپس جائیں گے اور ریلوے
بھانگ کے قریب مظفر گڑھ میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ بڑا
محفوظ راستہ ہے۔“

پیا نے بھی انداز میں سر ہلایا پھر کھالے کا اشارہ پا کر
دائیں جانب اسٹیرنگ گھما دیا۔ نور پور کے در و دیوار پر
خاموشی کا راج تھا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، نہ ہی
کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا مگر ہم جونہی اپنی گلی میں گھر کے
دروازے کے سامنے گاڑی روک کر اترے، میرا دل بری
طرح گھبرا گیا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا خاموش سائن
بجا دیا۔ میں نے اپنے کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ کان
لگایا۔ مجھے اندر سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ آواز
بہت مدہم تھی مگر اتنا ضرور پتا چلتا تھا کہ ایک سے زیادہ لوگ
باتیں کر رہے ہیں۔ رات کے اس خاموش پہر میں میرے
گھر میں جاگنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس وقت بھی لوگ گہری
نیند میں مستغرق ہوا کرتے تھے۔

میں نے مڑ کر عقب میں کھڑے ہوئے کھالے اور پیا
سے سرگوشی کی۔ ”میرے گھر میں کوئی جاگ رہا ہے کون؟ یہ
علم نہیں ہے۔ لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہے۔“
کھالے نے بھی میری طرح دیوار سے کان لگایا۔ اس

پیا نے کہا۔ ”آج تمہارے استقبال کے لیے مجھے نے یہ
جیانیہ بیڑ کے سامنے گاڑی روک دی۔ ہارن
بزنے پر ایک سپاہی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈھابے سے
کڑی کے پاس پہنچا۔ پیا نے شیشہ اُتار دیا۔
ادھیڑ عمر کا شیل قدرے مودبانہ لہجے میں بولا۔
”کہاں سے آرہے ہیں صاحب جی؟“

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تیر گئی۔ اس نے کیا
کرتا بھی جو آپ ماڈل کی اسوز وٹرو پر دیکھ کر ہی بھیگی ملی
کر بچھ گیا تھا۔

پیا نے دنگ لہجے میں کہا۔ ”کہاں سے آرہے ہیں،
نہیں بتانا بالکل ضروری نہیں ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ ہم
سردار حیدر خان کے مہمان ہیں۔“

سپاہی اکیلا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی تھا بھی تو وہ کہیں
بپ کر نیند کے مزے لوٹ رہا ہوگا۔ سردار حیدر خان کا نام
سننے ہی بھیگی ملی کا قد مزید چھوٹا ہو گیا۔ گاڑی کے اندر
اندھیرا تھا اور باہر بلبوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی، اس لیے
سپاہی جھانکنے کے باوجود ہمیں دیکھ نہیں پایا تھا۔ سرکاری
ایوانی سرانجام دینے کے بعد اس نے عاجزانہ انداز میں
اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھا، سلام کیا اور بیریز کی رسی کھول دی۔
ہماری پتھر نے لمبے ڈنڈے کو اچانک فضا میں اوپر اٹھا دیا
اور پیا نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ شیشہ
چڑھاتے ہوئے اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”الو
کے پٹھے! ٹرو پر کو دیکھ کر بچھ جاتے ہیں۔ پیدل چلتے ہوئے
فٹس کو اُوئے“ کہہ کر بلاتے ہیں اور کپڑے اتروا کر تلاشی
لیتے ہیں۔ ہونہہ! قانون کے رکھوالے۔۔۔۔۔ پولیس مقابلے
کرتے ہیں۔“

کھالے نے کہا۔ ”شکر ہے اس کم بخت نے گاڑی
کے اندر نہیں جھانکا ورنہ وہ مجھے ضرور پہچان جاتا۔“
”کیا وہ تمہیں جانتا ہے؟ کون ہے؟“ میں نے تعجب
سے پوچھا کیونکہ میں نے اس کی شکل پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔
کھالے بولا۔ ”یہ اس ہومیو پیٹھک ڈاکٹر کا سالہ ہے۔ وہ
ڈاکٹر، جس سے میں کپی خرید کرتا تھا۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ میں نے زیر لب کہا اور شیشے کے باہر پھیلے
اندھیرے میں نظریں پیوست کر دیں جہاں کچھ بھی
دعا نہیں دے رہا تھا۔ ایسا کچھ یہاں موجود بھی نہیں تھا جسے
دیکھا جاتا، میں تو بس عادی جھانک رہا تھا۔ اس سڑک پر
لنگ نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ معمول کی بات تھی۔

بھی ہو سکتی ہے۔“

”جی! میں سائیں دانو کر ہاں۔۔۔۔۔ جیس ویلے وی
آسو، ہتھ بدھی ملساں۔“ وہ بولا۔
(جی ہاں! میں آپ کا نوکر ہوں۔ جب بھی آپ
واپس آئیں گے، میں ہاتھ باندھے استقبال کے لیے موجود
ہوں گا)

ہم تینوں اس وقت دہرے لباس میں تھے۔ اوپر
عمومی نوعیت کا لباس جبکہ ہم نے نیچے سیاہ رنگ کا چست لیڈر
سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہم نے اوپر والا پیرا ہین اُتار کر ایک
چارپائی پر ڈھیر کر دیا۔ آج فلک پر چاند نہیں سجا تھا اس لیے
فضا پر گہرے اندھیرے کا راج تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں
دیتا تھا۔ کھالے ڈرائیونگ کرنا چاہتا تھا مگر پیا نے روک دیا اور
خود ڈرائیونگ سنبھال لی۔ گاڑی ریٹنگی ہوئی ڈیرے کا مین
گیٹ عبور کر کے کچی سڑک پر آ گئی۔ پیا جی نے ہیڈ لائٹس
روشن نہیں کی تھیں بلکہ چھوٹی نیم لائٹس روشن کی تھیں جن کا رخ
زمین کی طرف تھا۔ یہ احتیاط اس لیے بروئے کار لائی گئی تھی
کہ گاڑی دور سے دکھائی نہ دے۔

میں روڈ پر چڑھنے کے بعد اس نے ہیڈ لائٹس روشن
کر دیں۔ ایک دو گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ اس سڑک پر دن
میں بہت رش ہوتا ہے۔ رات کو صرف ٹرک، ٹرالر اور لمبے
روٹ والی بسیں ہی چلتی ہیں۔ کھالے فرنٹ سیٹ پر جبکہ میں
عقبی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر بولا۔ ”شہرے! پناہ والا
کچا راستہ ٹھیک رہے گا، کیا خیال ہے؟“

وہ سڑک کی نسبت زیادہ محفوظ تھا۔ مگر ایک قباحت تھی
کہ وہ راستہ نور پور سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر میرے
بھانے کے تقریباً برابر میں پہنچ کر ختم ہو جاتا تھا۔ اتنی رات
گئے اندھیرے میں پیدل اتنا سفر طے کر کے جانا اور آنا
خطرے سے خالی نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ”ہم گاڑی کہاں کھڑی کریں گے؟“
اس نے کچھ دیر سوچا، پھر بولا۔ ”نہیں یارا گڑبڑ
ہے۔ ہم نوری چوک والی سڑک سے ہی جائیں گے اور اگر
کوئی خطرہ ہوا تو اسپتال والی سیدھی سڑک پر سیدھا نکل
جائیں گے۔ چکر کاٹ کر لال پیر سے محمود کوٹ والی سڑک پر
چڑھ کر بھٹ پور کی طرف نکل جائیں گے ٹھیک؟“

میں نے اس کی شیطانی کھوپڑی کی دل ہی دل میں
داد دی۔ چوک قریشی پہنچ کر جونہی موڑ کاٹا، سامنے سڑک پر
پولیس والوں کا چوٹی بیریر دکھائی دیا۔

میں چونکا۔ ”یہاں تو کسی نا کا بندی نہیں ہوئی۔“

یہی ان کا مستقبل اور بڑھاپے کا سہارا تھا۔ سائیں دل جیت
نے ایک ہی لمحے میں ان پھولوں کو ٹہنی سے جدا کر دیا اور
پیروں تلے روندنے کے لیے سردار حیدر خان کی تحویل میں
دیدیا۔ کسی کی فصل اجاڑتے ہوئے اسے رائی بھر دکھ نہیں ہوا
ہوگا۔ پھر وہ چاروں اشتہاری جنہیں ان کے والدین نے نہ
جانے کتنی کٹھنائیوں کے روبرو سینہ سپر ہو کر پالا پوسا ہوگا، کیا
کچھ نہیں سکھایا ہوگا۔ مگر معاشرے نے فراری ڈاکو اور پھر
حیدر خان نے شعلہ جوالا بنا دیا۔ قانون کے ہر کاروں نے
ان کی لاشوں پر کاروبار کی شطرنج بچھائی اور لاکھوں روپے
کے انعامات اور تحفے حاصل کر لیے۔

سردار انہرنے جانے کس قماش کا آدمی تھا۔ یہ تو طے تھا
کہ وہ بھی کوئی نیک یا ک آدمی نہیں تھا کیونکہ وہ میڈم کے لیے
کام کرتا تھا۔ کیا کام کرتا تھا؟ یہ آنے والے وقت میں ہی پتا
چل سکتا تھا۔ اس کا ڈیرا مجھے بہت پسند آیا تھا۔ یہاں سب
کچھ تھا اور سب سے بڑی سہولت تو رازداری کی حاصل تھی۔
یہاں کسی کی آمد و رفت نہیں تھی یہی یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں
تھا۔ یہ بات میرا شاہ نے بھی ہمیں بتائی تھی۔

اس ڈیرا نما ریٹ ہاؤس میں تین بڑے بڑے
کمرے تھے۔ ایک یہ، جس میں ہم تینوں بیٹھے تھے، ایک
میں نوکر مستقر رہائش پذیر تھے جبکہ تیسرا کمرہ خاص کر اکلانا
تھا۔ اس میں شاید ہم سے بھی زیادہ اہم لوگوں کو ٹھہرانے کا
انتظام ہوگا۔ تینوں کمرے انچھڑے تھے۔ ایک اسٹور، کچن اور
بڑا سا برآمدہ جو کمروں کے آگے واقع تھا۔ برآمدے کے
ستونوں کے بیچ میں بڑی سی آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔ ایک بڑا
ریٹنگ گیسٹ بند کرنے سے سارا ریٹ ہاؤس بند ہو جاتا تھا۔
شاید یہاں پر اور بھی کچھ ہو۔۔۔۔۔ سی ٹو کی طرح۔۔۔۔۔ مگر فی الحال
یہی کچھ نظر آ رہا تھا۔

ایک بجنے والا تھا جب ہم نے رخت سنبھال دیا۔ پیا
کی ہدایت کے مطابق چھوٹا اسلحہ لوڈ کر کے لباس میں چھپا
لیا۔ کنسپیرسیٹ کے نیچے بنے ہوئے مخصوص خانے میں
پڑی تھیں۔ انہیں نکال کر لوڈ کیا اور دوبارہ وہیں پر چھپا کر
رکھ دیں۔ اسی اثنا میں ہماری آؤ بھگت پر مامور نوکر
ہمارے پاس چلا آیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر نہایت مودبانہ
لہجے میں بولا۔ ”سائیں جی! ڈو وہ جے توڑیں تساں پروہیاں
کوں گھن آسو؟“

(کیا آپ دو بجے تک مہمانوں کو لے کر پہنچ جائیں
گے؟)

میں نے کہا۔ ”ہاں! تم ہمارا انتظار کرنا۔ کچھ دیر سویر

انگلستان

کے ایک سابق وزیر اعظم نے
اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے
کہ ایک بار وہ سرے کی
ایسی تقریب میں شریک

تھے جو ان کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ سرے کا میئر
اس کی صدارت کر رہا تھا۔ مہمانوں کو کافی پیش کی جا رہی
تھی کہ صدر نے قریب بیٹھے ہوئے چیمبرلین سے سرگوشی
میں کہا۔ ”کیوں جناب، کیا خیال ہے، ہم یہاں آنے
والوں کو کچھ دیر اور لطف اندوز ہو لینے دیں یا آپ سے
ابھی تقریر کرالیں؟“

ایک دولت مند بوڑھا طویل عرصہ سے بیمار تھا مگر
ڈاکٹر کی تمام تر مہارتوں کو کششوں کے باوجود وہ چٹنے پھرنے
کے قابل نہ ہو سکا تو ڈاکٹر نے گی لپٹی رکھے بغیر اسے
اپنے دنیاوی معاملات سمیٹ لینے کا
مشورہ دیا۔

”میں تمام انتظامات پہلے ہی کر چکا
ہوں، صرف وصیت لکھنا باقی رہ گئی ہے۔“
دولت مند بوڑھے نے جواب دیا۔ ”میں وصیت
میں اپنا سب کچھ اس ڈاکٹر کے لیے چھوڑنے والا
ہوں جو میری زندگی بچائے گا۔“

وصیت

دائرہ بنا کر تھم گئی۔ وہ مردہ ہوتے ہوئے ہاتھ کی گرفت سے
آزاد ہو گئی تھی۔ پیانے پستول کا رخ دوسرے شخص کی جانب
کر لیا۔ ”اب تمہاری باری ہے۔ تمہیں بھی زندگی کا ایک موقع
دیتا ہوں۔ دن..... ٹو.....“
وہ جلدی سے بول پڑا۔ ”تم کون ہو اور کیا چاہتے
ہو؟“

پیا بولا۔ ”مجھے اسی سوال کا جواب چاہیے۔ تمہارا نام
کیا ہے؟“
وہ بولا۔ ”میرا نام نذیر ہے۔“
”یہاں کیا کر رہے تھے؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے اپنے قدموں میں
دیکھا۔ وہاں شاید اس نے کچھ رکھا ہوا تھا جو چارپائی کی وجہ

فخوں میں ہی پوزیشن بدل کر پیا کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ شاید
غیر متوقع طور پر پڑنے والی افتاد نے اس کی سوچنے سمجھنے کی
ملا جیت قبض کر لی تھی، ورنہ وہ اب تک یہ ہاتھ دکھا چکا ہوتا۔
میں نے بیلٹ میں اڑی ہوئی پستول تارچ نکالی اور
روشن کر دی۔ تارچ کی تیز روشنی نے کمرے کا اندرونی ماحول
روشن کر دیا۔ اب اگر وہ اپنی تارچ آف بھی کر لیتا تو نقصان
نہیں پہنچا سکتا تھا۔

پیا دونوں چارپائیوں کے بیچ کھڑا تھا اور اس کی گن کا
رخ دونوں کی طرف تھا۔

”کون ہو تم؟“ پیا کی درشت آواز سنائی دی۔
دونوں خاموش کھڑے رہے۔ نا کافی روشنی میں ان
کے خدو خال دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے اپنی توجہ
محکم کی طرف مبذول کی۔

پیا نے کہا۔ ”میں نے پوچھا ہے تم کون ہو اور اس
وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“

کوئی جواب نہیں ملا۔ یوں لگا جیسے دونوں بہرے یا
گونگے تھے، پیا غرایا۔ ”گھر والے کہاں ہیں؟“

ایک نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ”اگر تمہیں اپنی
جان عزیز ہے تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ پچھتانے کا موقع
نہی نہیں ملے گا۔“

بھاری آواز میں دھمکی دینے والے کا لہجہ مقامی تھا مگر
آواز میرے لیے یکسر ناشناختھی۔ اس وقت میرے قلب و
ذہن کی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ
میں کیا کروں؟ شبھی حکم کا غلام بن کر دروازے میں چوبند
ایستادہ تھا۔

میں ابھی اسی عجیب سی خالی الذہنی کی سی کیفیت میں
جھٹکا تھا جب پیا کی آواز سنائی دی۔ ”میں تین تک گنوں گا.....
اگر مجھے جواب نہ ملا تو ایک کو گرا دوں گا۔“

پیا کا لہجہ یک لخت سرد ہو گیا تھا بولا۔
”ون..... ٹو.....“ اس نے تھوڑا توقف کیا، پھر اٹھنے لگا ہاتھ سے
ہولسر سے پستول کھینچ لیا۔ ”تھری.....“

دونوں بڑے دل گردے والے تھے یا شاید انہیں
یقین تھا کہ پیا محض دھمکی دے رہا ہے مگر پیا کے سائیلنسر لگے
پستول سے ’شش‘ کی آواز برآمد ہوئی اور بائیں جانب
کھڑے ہوئے طویل قامت تارچ بردار شخص کی پیشانی میں
گولی پھوست ہو گئی۔ وہ پیچھے کی جانب گرا پھر دونوں ہاتھ ہوا
میں لہراتا ہوا فرش پر گر گیا۔ چند لمحوں تک تارچ کی روشنی
کمرے میں تیزی سے چکراتی رہی پھر دیوار پر ایک ننھا سا

تک جائزہ لیتا رہا، پھر دبے پاؤں سرعت سے دیوار کے
ساتھ ساتھ چلتا ہوا میرے کمرے کی طرف بڑھا۔ ہاتھ سے
ہاتھ کو اوچھل کرنے والے اندھیرے میں میرے کمرے میں
نہایت کم روشنی دور سے نظر آ رہی تھی۔ فضا میں مٹی کے تیل کی
ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے اگلا کمرہ چاچی کا تھا۔ اس
میں بھی کوئی تارچ روشن تھی۔ میں پیا کے نقش پایہ برق رفتاری
سے چل رہا تھا۔ مجھے اس کے غیر معمولی اعتماد نے حیران
کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے میرے گھر کو بخوبی دیکھ رکھا
تھا حالانکہ یہ حقیقت تھی وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اس گھر میں
قدم رنجہ ہوا تھا۔

محکم میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اندر جو بھی تھا، یا جو بھی
تھے، انہیں شاید کوئی ڈر خوف نہیں تھا اور نہ ہی کسی کے آنے کا
اندیشہ..... بھی نگرانی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ میرا
دل میرے قابو سے ہر پل نکلتا جا رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ مجھ پر
گراں گزر رہا تھا مگر میں اس وقت پیا کی معاملہ فہمی اور
مہارت پر بھروسہ کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہم جوں
جوں دروازے کے قریب ہوتے جاتے تھے، مٹی کے تیل کی
بو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میرے کمرے کے دروازے کے
قریب پہنچ کر پیا گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور چہرہ زمین
سے ٹکا کر اندر جھانکنے لگا۔ اس نے شخص چند لمحے اندر کی
صورت حال کو سمجھنے میں لگائے اور پھر اچھل کر دروازے کے
بیچ کھڑا ہو گیا۔ فضا میں اس کی کھٹی کھٹی مگر دہشت انگیز آواز
اُبھری۔ ”ہاتھ اٹھا دو ورنہ گولی مار دوں گا۔“

میں نے دیوار کے ساتھ پشت ٹکا دی اور گن کو مضبوطی
سے تھام کر فائر پوزیشن سنبھال لی۔ اس وقت مجھے پیا کو
کور دینا تھا تا کہ کوئی اس پر عقب سے حملہ نہ کر سکے۔ پیانے
تلی انداز میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے اٹھنے لگے ہاتھ
کے اشارے سے مجھے دروازے میں رکنے کا اشارہ کر دیا
تھا۔ میں بجلی کی سرعت سے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
میرا رخ چاچی کے کمرے کی طرف تھا جس میں کسی کی
موجودگی ممکن تھی۔

میں نے بڑی احتیاط سے گردن موڑ کر اپنے کمرے
میں جھانکا۔ مٹی کے تیل کا تیز اور ناگوار بھبکا میرے نتھوں
سے ٹکرایا اور میرے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ سامان والی بیٹی
اور چارپائی کے درمیان دو آدمی اپنے اپنے ہاتھ سروں سے بلند
کے کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بھی سی تارچ تھی جس کی
روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اگر وہ اچانک تارچ آف
کر دیتا تو کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا اور وہ چند

نے کچھ مختلف سنا اور ایک جھٹکے سے ساتھ سیدھا ہوا اور برقی
مستعدی سے گاڑی کی طرف لپکا۔ پیا نے اس کی تقلید کی۔
دونوں نے چند لمحوں میں ہی تین تین اور اضافی میگزین نکال
کر دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔ ایسے ہی وقت میں جب پیا
مجھے گن تھما رہا تھا، میرے عقب میں حویلی کے بند دروازے
کے عقب سے تیز سرگوشی کی آواز ابھری۔
”شیت..... شیت..... گاڑی ادھر کیوں لائے ہو؟“

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس سرگوشی نے واضح
کر دیا تھا کہ اندر کوئی موجود تھا یا موجود تھے جن کا ساتھی آس
پاس گاڑی لیے چھپا ہوا تھا۔ سرگوشی کی آواز پیا نے بھی سن لی
اور ایک دم دروازے کے سامنے سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ
چپک گیا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ کھالا دروازے کے آگے
نکل کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

اندر سے سرگوشی میں پوچھنے والے کو جواب نہیں ملا تو
اس نے اپنا سوال دہرایا۔ پیا نے جواباً سرگوشی کی۔ ”کیا
واپس چلا جاؤں؟“

”نہیں..... اب یہیں رکو..... تھوڑی سی دیر ہے۔“
پیا دروازے کی طرف جھکا۔ کان لگا کر کچھ سن رہا پھر
مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”وہ اندر چلا گیا ہے۔ گڑ بڑ ہے،
جلدی کرو.....“

ایک دم میرے بدن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ میرا
خاندان خطرے میں تھا۔ پیالی کی سی پھرتی سے دروازے
کے افقی ڈنڈوں پر پیر رکھ کر دیوار پر چڑھا اور آن واحد
میں اندر کود گیا۔ بہت ہلکی سی ’دھم‘ کی آواز میرے کانوں
میں پڑی۔ جو بھی میں دروازے کے سامنے پہنچا، اس نے
اندر سے کنڈی کھول دی۔ مجھے غلطی کا احساس ہوا۔ یہ کنڈی
میں ہاتھ ڈال کر بھی کھول سکتا تھا، اسے ناحق اتنی تکلیف کرنا
پڑی تھی۔

میں اور کھالا اندر داخل ہوئے اور اس کی تقلید میں محکم
میں داخل ہو کر رُک گئے۔ وہ اچانک پلٹا اور نہایت دھیمی
سرگوشی میں بولا۔ ”کھالے! تم باہر جاؤ۔ گاڑی تلاش کرو اور
اس کے ڈرائیور کو قابو کرو۔ شور شرابا بالکل نہ ہو۔ ہری آپ!“
کھالا پلٹ گیا۔ حکم کی فوری تعمیل اس کی سرشت کے
منافی تھی مگر وقت کی نزاکت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ بلا جوں
چراں پیا کی بات مانتا۔ میرا شاہ نے پیا کو ہماری ٹیم کا
ماسٹر مقرر کیا تھا اور ہم دونوں کو پیا کی اطاعت کا سختی سے
حکم دیا تھا۔

پیا کمرے کی دیوار سے چپکا، سر باہر نکال کر چند لمحوں

لنگی اور وہ ایک دم کھڑا ہو کر ہاتھ جھٹکنے لگا۔ پیانے قدم بڑھا کر اسے گریبان سے پکڑ کر چارپائی کے اوپر سے باہر گھسیٹ لیا۔ تب مجھے ایک پل کو اس ڈاکو کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کی شاید تمام تر بد معاشیاں اس کے چہرے پر نقش ہو گئی تھیں، بھی بہت خوف ناک دکھائی دیتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اور لمبی فٹمیں، وہ شکل سے ہی چھٹا ہوا بد معاش معلوم ہوتا تھا۔

اس نے چارپائی پر گرتے ہی اپنا گھٹنا پیانے کے پیٹ میں مارا۔ پیانے کی چارپائی پر گر کر اس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی بلکہ سائڈ کی طرح اس پر پل پڑا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے اڑیل بد معاش کی درگت بنا کر رکھ دی۔ وہ پہلے ہی زخمی تھا، لاتوں اور لمکوں کی تاب نہ لا کر زمین پر گر کر بری طرح تڑپنے لگا۔

پیانے اس کے سینے پر زور دار ٹھوکر ماری اور غرایا۔
”جلدی بولو، یہاں کیا کرنے آئے تھے؟“
”مم..... مم..... میں بتاتا ہوں.....“
”پاپی..... پاپی.....“ اس کی گھسکی بندھ گئی۔
”پانی نہیں ملے گا، گولی مل سکتی ہے۔ کہو، دوں؟“ پیا کی آواز بہت ڈراؤنی تھی۔
”وہ بڑے..... خان جی نے بھیجا تھا۔ دو..... دو لڑکیوں کو اور..... اغوا..... باقی کونفش.....“ اس نے بہ مشکل اپنی بات پوری کی پھر ایک جانب گردن لڑھکا گیا۔

پیانے اس کی پیشانی میں عین آنکھوں کے بیچ گولی مار دی۔ وہ بالشت بھرا دھچکا پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ دماغ میں گھسنے والی گولی نے اس کے منہ سے چیخ تک برآمد نہیں ہونے دی تھی۔ سنا تھا کہ دماغ یا دل میں لگنے والی گولی سسکی کو بھی بدن سے باہر نہیں نکلنے دیتی، اب اپنی آنکھوں دیکھ لیا تھا۔ پیانے گن کندھے پر ڈالی، اپنی ٹارچ نکال کر روشن کی اور میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”شہر یار! دوسرے کمرے کو دیکھو، احتیاط سے جانا، اس کا کوئی ساتھی وہاں موجود ہو سکتا ہے۔“

میں نے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ آہستہ آہستہ پورے صحن میں کیرو سین آئل کی بو پھیل گئی تھی۔ میں دروازے کے پاس رُکا، پیا کے سے انداز میں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا اور زمین سے چہرہ نکا کر اندر جھانکا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی جو ٹنک پر پڑی ہوئی کسی ٹارچ سے پھوٹ رہی تھی۔ کمرے میں کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرے

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کی اور کھڑکی کھول کر جوہڑ اور گھنے جنگل کی درمیانی پگڈنڈی پر سر پٹ دوڑ پڑا۔

لنگی اور وہ ایک دم کھڑا ہو کر ہاتھ جھٹکنے لگا۔ پیانے قدم بڑھا کر اسے گریبان سے پکڑ کر چارپائی کے اوپر سے باہر گھسیٹ لیا۔ تب مجھے ایک پل کو اس ڈاکو کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کی شاید تمام تر بد معاشیاں اس کے چہرے پر نقش ہو گئی تھیں، بھی بہت خوف ناک دکھائی دیتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اور لمبی فٹمیں، وہ شکل سے ہی چھٹا ہوا بد معاش معلوم ہوتا تھا۔

اس نے چارپائی پر گرتے ہی اپنا گھٹنا پیانے کے پیٹ میں مارا۔ پیانے کی چارپائی پر گر کر اس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی بلکہ سائڈ کی طرح اس پر پل پڑا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے اڑیل بد معاش کی درگت بنا کر رکھ دی۔ وہ پہلے ہی زخمی تھا، لاتوں اور لمکوں کی تاب نہ لا کر زمین پر گر کر بری طرح تڑپنے لگا۔

پیانے اس کے سینے پر زور دار ٹھوکر ماری اور غرایا۔
”جلدی بولو، یہاں کیا کرنے آئے تھے؟“
”مم..... مم..... میں بتاتا ہوں.....“
”پاپی..... پاپی.....“ اس کی گھسکی بندھ گئی۔
”پانی نہیں ملے گا، گولی مل سکتی ہے۔ کہو، دوں؟“ پیا کی آواز بہت ڈراؤنی تھی۔

”وہ بڑے..... خان جی نے بھیجا تھا۔ دو..... دو لڑکیوں کو اور..... اغوا..... باقی کونفش.....“ اس نے بہ مشکل اپنی بات پوری کی پھر ایک جانب گردن لڑھکا گیا۔
پیانے اس کی پیشانی میں عین آنکھوں کے بیچ گولی مار دی۔ وہ بالشت بھرا دھچکا پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ دماغ میں گھسنے والی گولی نے اس کے منہ سے چیخ تک برآمد نہیں ہونے دی تھی۔ سنا تھا کہ دماغ یا دل میں لگنے والی گولی سسکی کو بھی بدن سے باہر نہیں نکلنے دیتی، اب اپنی آنکھوں دیکھ لیا تھا۔ پیانے گن کندھے پر ڈالی، اپنی ٹارچ نکال کر روشن کی اور میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”شہر یار! دوسرے کمرے کو دیکھو، احتیاط سے جانا، اس کا کوئی ساتھی وہاں موجود ہو سکتا ہے۔“

میں نے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ آہستہ آہستہ پورے صحن میں کیرو سین آئل کی بو پھیل گئی تھی۔ میں دروازے کے پاس رُکا، پیا کے سے انداز میں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا اور زمین سے چہرہ نکا کر اندر جھانکا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی جو ٹنک پر پڑی ہوئی کسی ٹارچ سے پھوٹ رہی تھی۔ کمرے میں کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرے

سے مجھے اور پیا کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

پیا غرایا۔ ”جلدی بولو ورنہ.....“

”آ..... آگ.....“ وہ ہکلا یا اور بولتے بولتے ٹرک گیا۔

”گھر والے کہاں ہیں؟“

”وہ..... وہ..... دوسرے کمرے میں ہیں۔“

”زندہ ہیں؟“ پیا کی آواز میں موت کی سردی کھل گئی۔

”ہا..... ہا.....“ اس پر پیا کی بربریت بھری آواز کی دہشت طاری تھی۔ وہ بار بار اپنے دائیں پہلو میں فرش پر گر کر تڑپتے ہوئے طویل قامت شخص کو دیکھ رہا تھا۔

پیانے کہا۔ ”کیا کمرے کو آگ لگانا چاہتے تھے؟“
”ہا..... مگر تمہارا اس گھر سے کیا تعلق ہے؟“ اس نے بہ دقت تمام کہا۔

”پتا چل جائے گا۔ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟“
”کسی نے نہیں..... ہم ڈاکو ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”ڈاکو لوٹتے ہیں، آگ نہیں لگاتے۔“ پیانے دانت چس کر کہا۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ نے حرکت کی اور اس کے پستول سے نکلنے والی دوسری خاموش گولی اس کی ران میں بوسٹ ہو گئی۔ وہ کراہ کر ایک ٹانگ پر ٹپکنا چنے لگا۔

پیا سفاک لہجے میں بولا۔ ”دوسری گولی سیدھی دل میں اترے گی، جلدی بولو، تمہیں کس نے بھیجا ہے؟“
”وہ..... وہ..... بڑے خان نے.....“ وہ درد کی شدت سے چند لمحوں میں ہی بے حال ہو گیا تھا۔ ”سردار حیدر خان نے.....“

”باہر کتنے آدمی ہیں؟“ پیانے پوچھا۔
”دو.....“

”دوسرے کمرے میں کتنے شیطان ہیں؟“
”کوئی نہیں.....“

”وہاں بھی مٹی کا تیل چھڑک چکے ہو؟“
”ہا.....“ اس کے ساتھ ہی وہ زمین پر بیٹھ گیا۔

پیانے قدم بڑھایا اور ٹارچ بردار شخص کے سینے پر قوس رکھ کر اس کی طرف جھکا۔ ایسے ہی وقت میں اسے گویا رنٹ لگا اور وہ غیر معمولی تیزی سے پیچھے ہٹا۔ کوئی چیز لمحہ بھر چمکی تھی۔ سمجھ میں آیا کہ اس نے کسی تیز دھار آلے کا وارہ پر کیا تھا جو کارگر ثابت نہیں ہوا تھا۔ پیا کے پستول سے گولی

لڑکیوں کی الجھنیں اور پریشانیوں کو دور کرنے کے مشورے
پیانے والی خاتون سے ایک نوجوان لڑکے نے پوچھا کیا
”آپ لڑکوں کو بھی مشورے دیتی ہیں؟“
”نہیں۔ میں صرف لڑکیوں کو مشورے دیتی ہوں۔“
”لڑکیوں کو مشورے کیوں نہیں دیتیں؟“
”اگر میں لڑکیوں کو مشورے دینا شروع کر دوں تو ساری
لڑکیاں کنواری رہ جائیں گی۔“

کندھے پر لنگی ہوئی بھاری گن تیز دوڑنے میں مشکل پیدا کر رہی تھی مگر میں اسے پھینکنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ چونکہ یہ راستہ میرا دیکھا بھلا تھا، اس لیے ٹارچ کی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اسے دوڑنے کے دوران آف کر کے اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔

میرے گھر پر حملہ کرنے والوں کی گاڑی لامحالہ طور پر سائیں کے احاطے میں پارک کی گئی تھی کیونکہ اگر نور پور کے اس جانب کی پانچوں گلیوں میں کہیں بھی کھڑی کی جانی تو وہ آتے ہوئے ہماری نظروں میں ضرور آتی۔ میں نے جونہی جنگل کا موڑ کاٹا اور مزار کی دیوار کی طرف بڑھا، نور پور کی حویلیوں کے بیرونی بلب روشن ہو گئے۔ فائر کی آواز نے خاموش اور پرسکون فضا میں ارتعاش پیدا کر کے خوابیدہ لوگوں کو جگا دیا تھا۔ یہ اچھی بات نہیں تھی مگر مجھے اس وقت کھالے اور چاچے چاچی کے علاوہ کچھ سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے کسی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر اچھل کر مزار کی دیوار پھانسی اور پارکنگ کی جانب والی احاطی دیوار کے قریب کھڑی ہوئی سفید رنگ کی لینڈ کروزر کی طرف بگٹ دوڑ لگا دی۔ یہ گاڑی پہلے نور پور کے علاقے میں کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ ابھی میں سائیں دل جیت کے حجرے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ فائر کی ہولناک آواز فضا میں گونجی۔ میرے بائیں بازو کو انگڑا سا چھو گیا۔ ایسے ہی وقت مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل پختہ اینٹوں کے فرش پر گر گیا۔ اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ فائر کی تیز اور خوف ناک آوازیوں سے میں یہ اندازہ نہیں کر پایا کہ مجھ پر کس سمت سے فائرنگ ہو رہی ہے۔ یوں محسوس ہوا جیسے چاروں جانب سے آواز پھوٹ پڑی ہو۔

شانے اور کہنی کے بیچ ماس پر جلن کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی جنگ میں لپٹی ہوئی موت کی ہولناکی کا بھی اندازہ

میں نے کہا۔ ”تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ وہ غرایا۔ ”بکومت..... خاموش رہو۔“

”میں تھک گیا ہوں۔ اب تب میں گر جاؤں گا۔“

میں نے کہا۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ میرے گرنے کے انداز کو مشکوک حرکت قرار دے کر گن کی لبلبی دبا نہ دے۔

وہ بولا۔ ”آہستہ سے نیچے اتر آؤ، اپنا گندامنہ دیوار کی طرف ہی رکھنا..... ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو زندہ نہیں رہو گے۔“

میں مگر سے اتر کر زمین پر کھڑا ہو گیا۔ میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا اور اس پر غلبہ پانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ مگر کچھ سوچہ نہیں رہا تھا۔

اس کی غراہٹ گونجی۔ ”کیا تم نے باہر خان کو قتل کر دیا ہے؟“

میں چونکا۔ ”کون..... باہر خان کون ہے؟“

”میرا ساتھی جو جیپ کے پاس کھڑا تھا۔“ اس نے میری ریڑھ کی ہڈی پر گن کی نال کا دباؤ بڑھایا۔

”ہاں..... اس نے مجھ پر فائرنگ کی تھی۔ فائر کا جواب فائر سے ہی دیا جاسکتا ہے، مگر پاشی سے نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا وہ تمہارا ساتھی تھا؟“

”اوہ ہٹ!“ اس کے منہ سے نکلا پھر اس کے حلق سے ایسی آواز برآمد ہوئی جیسے اُسے شدید قلق پہنچا ہو اور وہ برداشت نہ کر پا رہا ہو۔ اس کے رد عمل نے مجھے باور کرا دیا کہ مجھے ٹلی ہوئی مہلت اب تب میں تمام ہونے والی ہے۔ مجھے اسی ایک لمحے میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرنا تھا۔ سو میں نے رسک لے لیا اور چپے کی سی پھرنی سے پلٹ پڑا۔ وہ فوری طور پر سنبھل نہیں پایا اور میرا پستول والا ہاتھ دائرے میں گھومتا ہوا اس کی کنپٹی پر پڑا۔ ”خ“ کی آواز ابھری اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تو میں نے اس کی گن پر ہاتھ ڈال کر نال کا رخ دائیں ہاتھ پر فصولوں کی جانب کر دیا۔ اس نے فائر نہیں کیا بلکہ زور دار کلک میری دونوں ٹانگوں کے بیچ ماری۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے تارے ناچ اٹھے اور میں توازن برقرار نہ رکھ پایا اور پشت کے بل زمین پر گر گیا۔ اچھا ہوا کہ میری گرفت گن پر سے کمزور نہیں ہوئی جس کی وجہ سے وہ بھی بچ کر مجھ پر آن گرا۔

اس کی گن میری پسلیوں پر لگی تو درد کی تیز کٹیلی لہر میرے بدن میں پھر گئی۔ میں نے اسے خود پر سے جھکنے کی کوشش کی مگر وہ خاصا بھاری تھا۔ اس نے مجھ پر پورا وزن ڈالا اور اپنے سر کی زوردار ٹکڑ میری پیشانی پر رسید کی۔ میرا

نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ سائیلنسر لگے ہوئے پستول کی مخصوص آواز کے ساتھ ہی اس کا سر ٹائر کور سے ٹکرایا اور اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر گر گئی۔ میں نے اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کا نشانہ لیا تھا۔ مجھے یہ تو پتا نہیں چل سکا کہ میرا نشانہ درست تھا، یا تھوڑا بہت اوپر نیچے ہو گیا تھا، یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ کام آچکا تھا۔ وہ ”غرر غرر“ کی بھیانک آوازیں حلق سے خارج کرتے ہوئے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے تڑپنے کا انداز چغلی کھاتا تھا کہ وہ ترخ کے عالم میں ہے اور چند لمحوں میں ہی اوپر پرواز کر جائے گا۔ میں نے یہ نظر احتیاط ارد گرد دیکھا مگر اس کا ساتھی دکھائی نہیں دیا۔

پیادے کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے دوسرے ڈاکو نے بتایا تھا کہ گاڑی میں دو آدمی ہیں۔ دوسرا کہاں چھپا ہوا تھا؟ ابھی مجھے کھالا بھی کہیں دکھائی نہیں دیا تھا جسے میں تلاش کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اس کی پیچ بڑی کر بناک تھی جو ابھی تک میرے کانوں میں سننا رہی تھی۔ کہیں وہ بھی دنیا سے رخصت تو نہیں ہو گیا تھا؟ یہ خیال بڑا سوہان روح تھا۔ ایسے ہی وقت میں جب میں دیدے پھاڑے جن میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، میری کمر سے کوئی سرد اور نوکیلی چیز آن ٹکرائی اور ٹھہر گئی۔ ساتھ ہی ایک کرخت اور بھاری آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”خبردار! ذرا سی بھی حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔“

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ بہت برا پھنسا تھا۔ بندر کی طرح دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا، پاؤں زمین سے اٹھے ہوئے تھے اور میں جوتوں کی ٹو دیوار کی فاؤنڈیشن کی باہر کونٹکی ہوئی ننھی سی گھر پر ٹکا کر یہ وقت تمام کھڑا تھا۔ میری گن میرے کندھے پر لٹک رہی تھی جبکہ پستول والا ہاتھ فائر کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں نے نیچے اترنا چاہا تو میرے عقب میں کھڑے ہوئے شخص نے نوکیلی چیز، غالباً گن کی نال پر دباؤ بڑھا دیا، ساتھ میں غرایا۔ ”اول ہوں..... ذرا سی حرکت بھی کی تو گولی مار دوں گا۔ یہیں کھڑے رہو۔“

میں ساکت ہو گیا۔ میری نظروں کے سامنے لینڈ کروزر کھڑی تھی جس کے بندشیشوں کے اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ احساس بڑا جان لیوا تھا کہ میرے عقب میں کھڑا ہوا شخص اتنا ڈی نہیں تھا۔ وہ میری ذرا سی حرکت پر برا بیچتے ہو کر فائر کر سکتا تھا۔ اتنے قریب سے نکلی ہوئی گولی کا خطا جانا ممکن نہیں تھا۔

ہوا اور میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پہلو کے بل کروٹ لے گیا۔ زندگی ساتھ دے گئی۔ ایک فائر ہوا اور عین اسی جگہ سے اینٹوں کا چورا اڑا جہاں ایک لمحہ قبل میں موجود تھا۔ میں دائیں جانب لڑھک کر ہال کے دروازے تک پہنچا۔ تب تک مجھ پر ایک اور فائر داغا گیا۔ میری خوش بختی تھی کہ سوائے ایک گولی کے کوئی مجھے چھونے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اچانک اٹھ کر جست بھری اور ہال کی ٹکڑ عبور کر کے سائیں دل جیت کی سرخ ٹوپیٹا کرولا کی طرف چھلانگ لگا دی۔ میرے پاس گن بردار کی نظروں سے اوجھل ہونے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

فائرنگ رُک گئی۔ عارضی طور پر میں محفوظ ہو گیا تھا مگر مجھے یہیں دیک کر بیٹھنا نہیں تھا۔ بھاری گن کے ساتھ قتل و حرکت میں مشکل پیش آرہی تھی مگر میرے پاس اس کی موجودگی ضروری تھی۔ تنگ سی جگہ میں یہ مشکل گھسٹ کر پارکنگ کی عقبی دیوار کی طرف بڑھا، کار کے بونٹ کے اوپر سے جھانک کر سفید لینڈ کروزر کی طرف دیکھا۔ اندھیرے میں سوائے گاڑی کے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہاں تک پہنچنا ناممکن حد تک مشکل تھا۔ چھپا ہوا دشمن کسی بھی لمحے بہ آسانی میرے سینے میں گولی اتار سکتا تھا۔ ہر بار قسمت ساتھ نہیں دیتی، یہی سوچ کر میں نے نئی راہ اختیار کی اور کھسک کر پارکنگ کی عقبی دیوار تک پہنچا۔ قسمت اسی راہ پر لے آئی تھی جہاں سے پہلے بھی میرا گزر رہو چکا تھا۔

میں نے کوئی آواز پیدا کیے بغیر دیوار پھاندی اور مشرق کی سمت جھکے جھکے انداز میں دوڑ پڑا۔ یہ جگہیں میرے بچنے کی آنکھ میں منقش تھیں، یہی مجھے اندھیرے میں کوئی ٹھوکر نہیں لگی اور میں دیوار کی ٹکڑ عبور کر کے شمالی جانب لینڈ کروزر کی طرف بڑھا۔ اندازے کے مطابق اس جگہ پر پہنچا جہاں اندرونی سمت میں گاڑی کھڑی تھی۔ بچوں کے بل اٹھ کر دیوار کی منڈیر سے جھانکا۔ میرا اندازہ بڑا لا جواب اور کانیاں تھا۔ میں نے عین اسی جگہ سے سر نکالا تھا، جہاں میں پہنچنا چاہتا تھا۔

میرے سامنے لینڈ کروزر کی چیمت تھی۔ میں کچھ اور اوپر اٹھا۔ اب مجھے لینڈ کروزر کے اگلے ویل کی آڑ میں دیوار کی جانب پشت کر کے پیروں کے بل بیٹھا ہوا شخص نظر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی گن دلی ہوئی تھی اور وہ بونٹ کے اوپر سے سر نکال کر پارکنگ میں کھڑی سرخ کرولا کی طرف دیکھ رہا تھا اور میری موجودگی کے مقام کو تلاش کر رہا تھا۔ میں نے پستول دیوار کے اوپر سے گزارا اور اس کا

انسان کا گھر

ایک شخص نے ایک اللہ کے بندے سے پوچھا۔ ”ایک دن کے اندر اتنی ساری نیکیوں کو اکٹھا کرنا کیسے ممکن ہے؟“

وہ بزرگ مسکرائے اور جواب دیا۔ ”اللہ نے انسان کے اندر ایک گھر بنا رکھا ہے جس کی زمین مغفرت ہے اور اس کا آسمان ایمان ہے۔ اس کا آفتاب شوق ہے اور اس کا چاند محبت ہے۔ اس کی مٹی ہمت اور اس کا بادل فضل ہے۔ اس کی بجلی امید، اس کی گرج خوف ہے۔ اس کی بارش رحمت اور اس کا درخت وقار ہے۔ اس کا پھل حکمت اور اس کا فراست بھرا دن ہے اور یہی اس کی روشنی ہے۔ اس کی رات برائی اور مصیبت ہے۔ اس میں ایک دروازہ علم کا ہے اور دوسرا دروازہ ظلم (برداشت) ہے۔ اس میں ایک دروازہ یقین اور غیرت کا ہے۔ اس کا ستون انس اور دوسرا ستون بھروسہ ہے، تیسرا ستون سچائی کا ہے۔ اس گھر پر فکر کا تالا لگا ہوا ہے جو بلاشبہ دین اسلام کے ارکان کی چابی سے ہی کھولا جاسکتا ہے۔

مرسلہ: طالب حسین طلحہ
قیدی سزائے موت، نیو سینٹرل جیل، بہاولپور

اپنی پلیٹ لے جاؤ

ایک انگریز کا کسی گاؤں سے گزر ہوا۔ گاؤں والوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور ایک موٹی سی مٹی کی روٹی پر سرسوں کا ساگ رکھ کر پیش کیا۔ انگریز نے ساگ تو کسی نے کسی طرح کھا ہی لیا لیکن روٹی واپس کرتے ہوئے بولا۔ ”تھینک یو، اپنی پلیٹ لے جاؤ۔“

آج کل

آج کل تحفہ دیے بغیر کسی لڑکی سے اظہار محبت کرنا فیوز بلب سے روشنی کی توقع رکھنے کے مترادف ہے۔

انتخاب: ریاض بٹ، حسن ابدال

سرچکرا گیا۔ ایک..... دو..... پھر وہ جنوبی انداز میں ٹکریں مارنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں میری مزاحمت دم توڑنے لگی اور حواس میرا ساتھ چھوڑنے لگے۔ وہ بہت خطرناک داؤ کھیل رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پھنسے ہوئے تھے۔ اس کی گن کی نال کے رخ کا مجھے اندازہ تھا، اپنے پستول کے رخ کا علم نہیں تھا۔ میں اس ڈر سے ٹریگر نہیں دبا رہا تھا کہ کہیں اس سے نکلنے والی گولی میرے جسم میں ہی داخل نہ ہو جائے۔ آخری چارہ کار جان کر میں نے 'اوغ' کی دردناک آواز حلق سے خارج کی اور آنکھیں بند کر کے سر ایک جانب لڑھکا دیا۔ میرا داؤ کامیاب رہا۔ اس نے ٹکریں مارنے کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ میرے اوپر سے اٹھنے کی کوشش میں وہ جونہی پیروں کے بل تھوڑا بلند ہوا، میں نے اپنا گھٹنا موڑا اور اس کی ٹانگوں کے بیچ پوری قوت سے دے مارا۔

میں نے اس ضرب میں اپنی تمام تر توانائی سمیٹ دی تھی۔ زندگی اور موت کے کھیل میں جان کی بازی لگائی جائے تو بساط پلٹی جاسکتی ہے۔ وہ 'ہائے' کی تیز آواز نکال کر میرے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور پیٹ کے بل میرے چہرے پر گر گیا۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ چکی تھی۔ میری گرفت بھی برقرار نہ رہ سکی اور گن زمین پر لڑھک گئی۔ وہ پرانا کھلاڑی تھا۔ سر اور ناف کے نیچے کی، اوپر تلے دو چوٹیں کھا کر بھی سرعت سے اٹھ بیٹھا مگر تب تک میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے پستول اس کی پسلیوں پر رکھا اور دانت کچکا کر کہا۔ "ذرا سی حرکت سے میری انگلی ٹریگر دبا دے گی۔"

وہ چابی ختم ہونے والے کھلونے کی طرح ایک دم ساکت ہو گیا۔ اندھیرے میں اس کے چہرے کے تاثرات دکھائی نہیں دیتے تھے مگر مجھے علم تھا کہ وہ میرا تسلط ختم کرنے کے لیے کوئی ترکیب سوچ رہا تھا۔ میں نے پستول کی نال پر دباؤ بڑھایا، مضبوط لہجے میں کہا۔ "کوئی چالاکی دکھائے بغیر نیچے اترو....."

وہ اٹھنے لگا۔ میں نے فوراً کہا۔ "خبردار! کھڑے نہیں ہوتا۔"

"پھر میں نیچے کیسے اتروں؟" اس نے بھڑک کر کہا۔ "کوئی بات نہیں..... یہیں پڑے رہو۔" میں بولا۔ وہ جس طرح سے بھی نیچے اترتا، میرے نشانے سے ہٹا تھا۔ اس لیے اس کا مجھ پر اندھے رہنا ہی بہتر تھا۔ جس لمحے میں نے اسے گولی مارنا چاہی، اُسی لمحے میرے دل میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا اور میں نے اپنا ارادہ بدل

دیا۔ وہ چاروں ڈاکوؤں میں آخری زندہ شخص تھا۔ ممکن تھا کہ ہمیں اس سے کام کی کوئی بات معلوم ہو جائے، اس سے کچھ پوچھنا پڑے، تب اسے مارنے کا افسوس ہوگا، میں نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

اسے تقویت ملی کہ میں اسے قتل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ بولا۔ "نام میں کیا رکھا ہے، جو اچھا لگے، وہی رکھ لو۔"

میں نے کہا۔ "بکواس نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے، نہیں کرتا، تم کر لو۔" اس نے اتنی بے پروائی سے کہا کہ میرا ذہن جھنجھٹا اٹھا، میں نے غرا کر کہا۔ "یہ تم کس انداز میں بات کر رہے ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے کانوں میں مسجد کے اسپیکر سے پھوٹنے والی امام مسجد کی آواز پڑی۔ وہ نور پور کے مکینوں کو گاؤں میں ڈاکوؤں کی موجودگی کی اطلاع دے رہا تھا اور بار بار اپیل کر رہا تھا کہ نور پور والو! جاگ جاؤ ورنہ لیکھ ہمیشہ کے لیے سو جائیں گے۔ اپنا اپنا اسلحہ اٹھا کر باہر نکل آؤ، کوئی بھی ڈاکو فوج کرنے جانے پائے۔ یہ سردار بخت خان کا حکم ہے۔

نور پور جا گئے والا تھا۔ مجھے بخوبی احساس ہو گیا کہ ہم بری طرح پھنس چکے تھے۔ اس وقت ہماری پوزیشن بھی ابتر تھی کیونکہ ہم بھی ڈاکوؤں کے سے چلے میں تھے۔ سردار بخت خان نے اپنے کارڈ لیس فون پر پولیس کو بھی مطلع کر دیا ہوگا اور وہ نیلی جی ٹی گھماتے ہوئے کسی پل پہنچ سکتے تھے۔ ابھی نہ تو کھالے کی خبر تھی، نہ ہی موجود کے علاوہ کوئی گھر والا ہمارے ہاتھ لگا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے سرخی پھیلنے لگی۔ میں نے کڑا فیصلہ کیا اور پستول کا ٹریگر دبا دیا۔

اسے سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ وہ بھیانک چیخ مار کر تڑپا اور پہلو کے رخ زمین پر گر گیا۔ میں بجلی کی سی سرعت سے اٹھا، اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور تڑپنے کی رفتار دگنی ہو گئی۔ میں نے ٹھوکر مار کر اس کی گن اس سے دور کر دی اور دیوار پر چڑھنا چاہا مگر تیوراً کر زمین پر گر گیا۔ اس کی پے در پے ٹکروں نے میرا دماغ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بہ دقت تمام خود کو سنبھالا، سر کو دائیں بائیں جھٹکا اور پھر دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ کئی کوششوں کے بعد کامیاب ہوا اور لینڈ کروزر اور دیوار کی درمیانی جگہ پر کود گیا۔ باہر خان دیوار کے ساتھ پشت لگا کر بیٹھنے کے انداز میں گرا ہوا تھا۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور فوراً گاڑی کا عقبی دروازہ کھول دیا۔

سیٹ پر دو وجود ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ میں نے بیلٹ سے نارنج پھینکی اور آن کر دی۔ ننھے سے بلب کی تیز روشنی لینڈ کروزر کے اندرونی ماحول کو منور کر گئی۔ میرے حلق سے طویل سانس برآمد ہوئی۔ وہ فرزانہ اور شانو تھیں جو ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئی پڑی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ نیند میں یا اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھیں۔ انہیں ہلایا جلا یا، چہروں پر روشنی ڈالی، پتا چلا کہ ان کے ہونٹوں پر بھی چوڑی ٹیپ چھکی ہوئی تھی۔ میں نے ٹیپ کھینچ دی۔ نبضیں چپک کیں، سانسوں کی آمد و رفت کا معائنہ کیا اور اطمینان کی سانس لی کہ دونوں بخیریت تھیں۔

میں نے نارنج کی روشنی جیب کے عقبی حصے میں ڈالی۔ کھالا اوندھے منہ پڑا تھا۔ میں نے اسے لباس اور گھٹنریالے سیاہ بالوں کی وجہ سے پہچانا تھا۔ اسے لٹایا نہیں گیا تھا بلکہ ٹھونسا گیا تھا کیونکہ عقبی حصے میں جگہ کم تھی۔ میں جلدی سے لینڈ کروزر کے عقب میں آیا، بیک ڈور کھولا اور بالوں سے پکڑ کر کھالے کا سراو پر اٹھایا۔ چہرہ دیکھا۔ چہرہ مٹی میں آٹا ہوا تھا۔ اس کی نبض محسوس کی، شکر تھا کہ وہ زندہ تھا۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے جلدی سے جیب میں گھس گیا اور چند ہی لمحوں میں اس کے جسم کو ٹٹولنے کے بعد بھانپ گیا کہ اسے کہیں چوٹ نہیں لگی تھی۔ اگر کوئی چوٹ آئی بھی تھی تو اس سے خون نہیں رسا تھا۔ اس کی گن اور پستول دکھائی نہیں دیا۔ بیلٹ میں سوائے ایک پستول کی میگزین کے کچھ بھی نہیں تھا۔ سردست اس کا سامان تلاش نہیں کیا جاسکتا تھا، اس کے زندہ مل جانے پر اللہ کا شکر بجا لایا جاسکتا تھا۔

میں نے غلت میں اسے ہوش میں لانے کی اپنی سی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ملی تو میں نے بیک ڈور بند کیا اور برقی مستعدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ چابی انکیشن میں موجود تھی۔ حملہ آوروں اور ڈاکوؤں کی گاڑیاں ممکنہ فراری ضرورت کے تحت بھگانے کے لیے تیار حالت میں کھڑی کی جاتی ہیں۔

ایسے ہی وقت میں نور پور میں شور مچ گیا۔ لوگ نعرہ زنی کرنے لگے تھے۔ میں ان دیہاتیوں کے مزاج کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ڈاکوؤں اور چوروں کے نام پر یہ ہر موجود اسلحہ تمام کر گھروں سے نکل آتے تھے اور سینہ پھر ہو جاتے تھے۔ میں نے مزار کے گنبد کی طرف دیکھا اور آوازوں کے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ یہ تو علم نہ ہو سکا کہ لوگ کس جانب جمع ہوئے ہیں، مگر گنبد کے پار پیلی روشنی اور

دھوئیں کا مرغولہ فضا میں اڑتا ہوا دکھائی دیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے سمجھنے میں ذرا تاخیر نہیں ہوئی کہ میرے گھر کو آگ لگ گئی تھی۔ کمروں کے اندر اندر بیٹا ہوا مٹی کا تیل ایک دیا سلائی کا منتظر تھا۔ دیا سلائی جلانے والا کوئی زندہ نہیں بچا تھا مگر دیا سلائی جل کر میرے گھر کو خاکستر کرنے لگی تھی۔

میرا ذہن بری طرح جھنجھٹا اٹھا۔ یہ کیسے ہو گیا تھا؟ دو حملہ آور پیاجی کے پستول کا لقمہ بن چکے تھے، دو کو میں نے راہ عدم دکھا دی تھی، پھر دیا سلائی جلانے والا پانچواں کون تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ پیا کے شکار نے غلط بیانی کی تھی اور اس کے ساتھیوں کی تعداد چار سے زیادہ تھی۔ باقی بچ جانے والوں نے پیا پر قابو پا لیا ہو اور گھر کو آگ لگا دی ہو..... پیا، موجود، چاچا اور چاچی آگ کا نوالہ بن گئے ہوں..... میری سانس رکنے کو آگئی۔ میں نے گیزر لگایا۔ گاڑی آگے بڑھانا چاہی تو وہ جھٹکا لے کر بند ہو گئی۔ میں نے آج تک ایسی گاڑی نہیں چلائی تھی۔ میں نے پھر چابی گھمائی۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور گیزر لگانے کے بعد بڑی احتیاط سے کچھ چھوڑا۔ اس مرتبہ گاڑی بند نہیں ہوئی اور اچھل کر تیزی سے آگے بڑھی۔ میں نے رفتار بڑھاتے ہوئے یوٹرن لیا اور گیٹ عبور کر کے ناپختہ راستے پر موڑ لی۔ میرا رخ نور پور کی طرف تھا۔ جونہی میں اپنی گلی میں پہنچا، اپنے دروازے پر کھڑی ہوئی اسوز وٹرو پر کو غائب پایا۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی تھیں کیونکہ مجھے ناب کا علم نہیں تھا اور نہ میرے پاس ٹٹول کر اسے تلاش کرنے کا وقت تھا۔ میرے گھر کو لگی ہوئی آگ لے لے اور بھڑکیلے شعلے اگل رہی تھی اور گلی کے چوک میں اکٹھے ہونے والے لوگ آگ کی پرہیز روشنی میں بہت پر اسرار معلوم ہو رہے تھے۔ کئی لوگ پانی کی بھری ہوئی گھریلو استعمال کی بالٹیاں اٹھائے میرے گھر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ انہیں میری گاڑی کو دیکھتے اور سمجھنے کا کوئی ہوش نہیں تھا۔

پیا نکل چکا تھا یا اسے مارنے والے ہماری گاڑی لے کر نور پور سے رخصت ہو چکے تھے۔ امید جاگی کہ پیا ہی نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا ہوگا۔ وہ جاتے ہوئے میرے بقیہ گھروں کو بھی نکال کر، اسوز وٹرو پر میں ڈال کر نور پور سے نکلا ہوگا۔ میں نے گھر کے برابر گاڑی نہیں روکی بلکہ لوگوں کی طرف بڑھا۔ نور پور سے نکلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہاں کم و بیش پندرہ بیس افراد اکٹھے تھے۔ شور و غوغا فضا میں بچا تھا۔ میرے گھر کا سامان جلنے کی تیز آوازیں، لوگوں کی چیخ و پکار، مسجد کے اسپیکر سے پھوٹنے

والی اطلاع..... آوازوں کے جھوم میں کسی آواز کو پہچاننا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں جونہی چوک پہنچا، لوگوں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ میں نے دیکھا کہ کبھی کے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی ہتھیار موجود تھا۔ بندوقیں، پستول، لائٹیاں اور کلہاڑیاں..... لینڈ کروزر کو دیکھ کر دو تین بندوقیں سروں سے بلند ہوئیں، ہوائی فائرنگ کی خوف ناک آواز گونجی پھر لوگوں نے گاڑی کا رخ کیا۔

میں نے جلدی سے گردن باہر نکالی اور چیخ کر کہا۔ ”میں شہر ہوں..... چاچے چراغ کا بھتیجا.....“ پرے ہٹ جاؤ، ایمر جنسی ہے.....“ میرا یہ اقدام ناگزیر تھا کیونکہ میں ہوائی فائر کر کے ان لوگوں کو پرے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ قریب آنے والوں نے میری آواز سن لی۔ ایک بڑی نارنج نے میرا احاطہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے پہچاننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جب تسلی ہو گئی تو آگے کھڑا ہوا کالا بزدل چیخ کر بولا۔ ”اوائے شہرے! توں اتھ کیا کریندیں تے! اہ کیا ڈراما ہے؟“

(تم یہاں کیا کر رہے ہو اور یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے؟) میں نے چیخ کر غصے سے کہا۔ ”مجھے فوراً نکلنے دو، ایمر جنسی ہے۔ میری بہنیں مر رہی ہیں، انہیں اسپتال پہنچانا ہے۔“

ساتھ ہی میں نے ایکسی لریٹر دبا دیا۔ اب مجھے اطمینان تھا کہ وہاں کھڑے ہوئے لوگ مجھ پر گولی نہیں چلائیں گے۔ ان سب کو علم ہو گیا تھا کہ گاڑی میں چراغ دین کا بھتیجا شہر یا موجود تھا۔

کبھی پرے ہٹ گئے۔ مجھے راستہ مل گیا۔ گاڑی ایک جھٹکا لے کر پکی سڑک پر چڑھ گئی۔ میں نے نوری چوک کی طرف جانے کی بجائے ناک کی سیدھ میں جانا مناسب خیال کیا۔ ایک تو ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ واپسی پر لال پیر والا راستہ لیا جائے گا۔ دوسرا یہ خوف لاحق تھا کہ پولیس اب تب میں پہنچنے والی ہوگی۔ نوری چوک والے راستے پر جانے کی صورت میں پولیس موبائل وین سے مدد بھیڑ ہونے کا احتمال تھا۔ میں نے ایک نظر دائیں ہاتھ واقع سرکاری اسپتال کی خوابیدہ عمارت پر ڈالی، ایک نظریارن خان کی حویلی کو دیکھا، پھر گیزر بدل کر نہایت تیزی سے نور پور سے نکلتا چلا گیا۔ نور پور کی خونیں جنگ سے محفوظ نکل آنے کے باوجود ابھی تک میرا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ دو چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد چاکھیں رک کر میرا انتظار کرے گا، اس لیے میں ارد گرد

بائی چانس

ایک عورت کا شوہر گم ہو گیا۔ وہ اپنی پڑوسن کے ساتھ پولیس اسٹیشن رپورٹ درج کروانے گئی۔ پہچان کے لیے اس نے حلیہ بتایا۔ ”لبا قد، گوارنگ، ہینڈسم، عمر 25 سال۔“ پڑوسن نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”جھوٹ کیوں بول رہی ہو، تمہارا شوہر تو چھوٹے قد کا، موٹا اور کالا ہے اور اس کی عمر بھی 40 سال ہے۔“ عورت نے کہا ”جو گیا، سو گیا..... اب جو ملے وہ تو اچھا ہو۔“

سرزنش

ایک صاحب جھومتے ہوئے ٹائٹ کلب سے نکلنے لگے تو دربان ان کے لیے دروازہ کھولنے کی غرض سے لپکا مگر کسی چیز میں الجھ کر گر پڑا۔ کلب کے منیجر نے باہر آ کر اس کو ڈانٹا۔ ”ذرا احتیاط سے چلا کرو، تمہارے اس طرح گرنے سے کوئی سمجھے گا کہ تم دربان نہیں، کلب کے ممبر ہو۔“

مبالغہ آمیزی

”امی دیکھیے! ہمارے گھر کے باہر ایک بہت بڑا کالا بلا کھڑا ہے بالکل ہاتھی کے برابر۔“ ایک بچے نے اپنی ماں سے کہا۔ ماں نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ”بات کو بڑھا چڑھا کر بیان نہ کیا کرو۔ تمہاری اس عادت پر میں تمہیں پچاس کروڑ مرتبہ ٹوک چکی ہوں۔“

مرسلہ: فہیم تبسم، شورکوٹ

دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔

میری ساری تنگ و دواسی انداز سے پر استوار تھی کہ
پیارے گھر والوں کو لے کر نور پور سے کامیاب نکل گیا ہو
گا۔ میری سانس گھٹنے لگی جب اس خوف ناک سوچ نے
دماغ میں بسیرا کیا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو..... اگر پناہ گشت میں
بھاگا ہو اور وہ کسی کو بھی ساتھ نہ لے سکا ہو، یا وہ کسی بھی وجہ
سے چاچا اور چاچی کو کمرے سے نکالنے میں کامیاب نہ
ہو سکا ہو تو..... اس کے آگے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ختم
ہو گئیں اور ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ میں نے اپنا ماتھا
اسٹیرنگ ویل پر مارا، پھر سر جھٹک کر اس ہولناک سوچ
سے چھٹکارا پانا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اسی لمحے مجھے یوں
محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے پکارا ہو۔ میں نے فوراً بریک
لگائے۔ اس ویرانے میں مجھے کون آواز دے سکتا تھا؟
حیرانی سے سر باہر نکال کر عقب میں دیکھنے لگا۔ اتنے دبیز
اندھیرے میں کیا نظر آتا تھا۔ ایک مرتبہ پھر آواز سنائی
دی۔ ”شہریار.....“

میرے کان بجے نہیں تھے۔ میں پیا کی آواز پہچان
چکا تھا۔ بجلی کی سی سرعت سے دروازہ کھولا اور پیچھے کی طرف
بھاگ کھڑا ہوا۔ کوئی تیس گز کے فاصلے پر، جہاں میرے
اندازے کے مطابق پیا کو موجود ہونا چاہیے تھا، پہنچ کر رُک
گیا۔ کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ میرے دائیں ہاتھ پر کماد کی
فصل لہلہا رہی تھی، چند قدموں کی دوری پر اسکول کی عمارت
اندھیرے کا حصہ بنی کھڑی تھی۔ میں نے پیا کی آواز
پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ کہیں چھپا ہوا تھا۔ میں
نے ہلکی سی آواز دی۔ ”پیا جی!“

کوئی جواب موصول نہیں ہوا تو میں نے پہلے سے بلند
آواز میں پکارا۔ جواب نہیں ملا مگر کماد میں مخصوص سرسراہٹ
ہوئی۔ کوئی وہاں موجود تھا۔ میں نے پھر پکارا۔ اسی اثنا میں
ایک ہیولا برآمد ہوا اور تیر کی طرح میری جانب بڑھا۔ وہ پیا
تھا۔ قریب پہنچ کر بولا۔ ”شکر ہے کہ تمہیں زندہ دیکھ رہا ہوں
ورنہ میں نے تو سمجھا تھا کہ تمہاری جی گل ہو گئی ہے۔“
میں نے جلدی سے کہا۔ ”تم یہاں کیسے؟ گاڑی
کہاں ہے؟“

وہ بولا۔ ”گاڑی کو میں نے ادھر اسکول کے قریب
چھپا رکھا ہے۔“ وہ اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے بولا۔
”مگر تم یہاں کیوں چھپے تھے؟“
”میں کچھ وقت گزرنے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ لوگ
اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں تو تم دونوں کو تلاش کرنے

کے لیے دوبارہ نور پور جاؤں گا۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا
جیسے کوئی گاڑی اس جانب آرہی ہے۔“ وہ مجھے پکڑ کر اسکول
کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں جلدی سے کماد میں
چھپ گیا۔ میں نے سوچا تھا، اگر یہ تم ہوئے تو روک لوں
گا۔ تم نہ ہوئے تو چھپا رہوں گا۔“

”پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ گاڑی میں، میں
ہوں؟“ میں نے پوچھا۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی
کیونکہ میں نے لینڈ کروزر کی روف لائٹ آف کر رکھی تھی۔
گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی آف تھیں۔ کوئی انڈیکسٹر بھی آن
نہیں تھا۔ پھر اس نے مجھے کیسے پہچان لیا؟
یہ معما اسی نے حل کر دیا۔ ”میں نے آواز دی تھی۔ تم
نے سن لی اور آتے آئے۔ کوئی اور ہوتا تو گاڑی نہ روکتا اور
آگے گزر جاتا۔“

وہ واقعی بہت زیرک اور معاملہ فہم انسان تھا۔ اس
دوران ہم دونوں اپنی اسوز و ثرو پر کے قریب پہنچ گئے تھے
جسے اس نے اسکول کی دیوار کے ساتھ، بیر کے گھنے اور کم
قامت درخت کے عقب میں کھڑا کر رکھا تھا وہ بولا۔
”ہیڈ لائٹس کے بغیر اتنے اندھیرے میں گاڑی چلانا موت
کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔“

”یہ راستے میرے دیکھے بھالے ہیں، ازبر ہیں۔“
میں نے کہا۔ ”باقی لوگ گاڑی میں ہیں؟“
وہ چونک کر رُک گیا، تاسف سے بولا۔ ”باقی
لوگ.....“ پھر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کرفی میں سر ہلانے لگا۔
میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ پیا
کسی کو بھی نکال لانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ میں پھٹی پھٹی
آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا جو بذاتِ خود اندھیرے کا ہی
حصہ معلوم ہوتا تھا۔

پیا نے مجھے دونوں شانوں سے تمام کر اپنی چھاتی
سے لگا لیا اور ہمدردانہ انداز میں بولا۔ ”میں تمہارے دکھ
سے آشنا ہوں مگر اوپر والا جیسے بن مانگے دیتا ہے، ویسے ہیں
بن پوچھے واپس لے لیتا ہے۔ یہی سچائی ہے جسے بہادر لوگ
حوصلے کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔“
بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا۔ ”یا اللہ!
رحم..... رحم.....“

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو
کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری
اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ



فریب کار

نظارتِ نصر

جب دوستی زہر سے ہو اور رشتوں سے دشمنی تو یہ مشکل جان کو
امان مل پاتی ہے... وہ جو آبِ حیات کی تلاش میں سرگرداں تھا...
جسے اپنے ہنر پر بڑا گھمنڈ تھا اور خود کو سکندرِ ثانی تصور کرتا تھا کہ
اچانک اپنے ہی ایک رشتے سے مات کھا گیا۔ جس کی آنکھوں کی چمک
دنیا کو شدید حیرانی میں مبتلا رکھتی تھی مگر اس ایک لمحے میں
کائنات کی تمام حیرت سمٹ کر اس کی آنکھوں میں اتر آئی کیونکہ
حقیقت بڑی جان لیوا ثابت ہو رہی تھی۔

اس فریب کار دنیا میں آزمائش کن لحات کی سنی خیز واردات

جسٹن گڈ چھ فٹ قد کا مالک ایک نیل جیسا مضبوط
آدمی تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اتنے مضبوط دکھائی دیتے
تھے جیسے فولاد کے بنے ہوں۔ اس کی بھوری رنگت قدرے
سرخ مائل تھی اور چہرے پر بہت سے تل کے نشان تھے۔
اس کی موٹی ناک یوں محسوس ہوتی تھی جیسے چہرے پر غبارہ
فٹ کیا ہو لیکن سب سے زیادہ اس کی توجہ دہنی تھی جسٹن کی
سبز مائل نیلی آنکھوں نے۔
”سانپ جیسی پراسرار اور ڈراؤنی۔“ اس نے

زیر لب کہا۔ وہ سمجھ نہیں سکا تھا پوچھنے لگا۔
”مجھ سے کچھ کہا تم نے لڑکی؟“ لٹڈا نے نفی میں سر ہلایا۔
”نہیں میں کیا کہوں گی۔“ وہ چند لمحے غور سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

”تو پھر تم نے کیا سوچا ہے میری آفر کے بارے میں؟“ وہ لمحے بھر کو رکا پھر جیسے اسے یقین دلاتے ہوئے بولا۔

”میں تمہیں فورس نہیں کر رہا۔ اگر تمہیں میری آفر معقول لگے تو دو تین گھنٹوں تک مجھے بتا دینا۔ کیونکہ میں کل شام تک واپس جانا چاہتا ہوں۔“ لٹڈا نے ایک لمبی سانس لے کر اس کے بدن سے اٹھتی مہک کو اپنی سانسوں میں جذب کیا پھر سوچنے ہوئے بولی۔

”خیر مجھے سوچنے کے لیے دو تین گھنٹے ہی درکار ہوں گے۔ میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے جس کو بتانے کے لیے مجھے رکنا ہوگا۔ اگر میں تمہاری آفر قبول کرتی ہوں تو تم جب کہو گے میں تیار ہو جاؤں گی۔“

اس نے دیکھا جشن کی سانپ جیسی آنکھوں میں ایک تیز چمک لمحے بھر کو لہرائی تھی پھر وہ نارمل نظر آنے لگا۔ وہ بولی۔ ”اچھا اب میں چلتی ہوں۔ مجھے سوچنے کے لیے تنہائی درکار ہے۔“ جشن نے سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ لٹڈا نے اپنا چھوٹا سا پرس سنبھالا اور ایک مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا رخ لفٹ کی طرف تھا۔ جشن اس ہول کی پانچویں منزل پر ٹھہرا ہوا تھا۔

لفٹ کے ذریعے وہ گراؤنڈ پر آئی اور تیز قدموں سے بار کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔

”ہائے لٹڈا! کیسی ہو۔ اب تو دکھائی ہی نہیں دیتیں، آج پھر نئے حلیے میں، خیر تو ہے؟“ لٹڈا نے ایک نمائی مسکراہٹ ہونٹوں پر چپکالی۔

”اوہ دراصل بات یہ ہے جارڈن کہ میں آج کل کام کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہوں۔ آج اسی سلسلے میں حلیہ بدل کر ادھر آئی تھی۔“ اس نے بائیں آنکھ دبائی۔ جارڈن کھل کر مسکرا دیا۔

”خیال سے..... کبھی کبھی بہت بے ضرر نظر آنے والے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔“ لٹڈا نے شانے اچکا دیے پھر قدرے آگے کو جھکتے ہوئے بولی۔
”مجھے دراصل کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ جیسے ہی

میں کچھ کمالوں گی تو تمہیں لوٹا دوں گی۔“ بات مکمل کر کے وہ پرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جارڈن چند لمحے اپنی بڑی سی تھوڑی کھجائو رہا پھر معذرت آمیز لہجے میں بولا۔

”لٹڈا ڈارلنگ یقین کرو۔ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم وعدے کی پکی ہو اور پیسے لوٹا دوں گی مگر اس وقت واقعی میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اگر تم کہو تو میں اپنے کسی ساتھی سے تمہیں کچھ رقم دلا دیتا ہوں۔“

لٹڈا چند لمحے سوچتی رہی۔ اس دوران ویٹر آرڈر لے آیا تھا۔ حالانکہ اس وقت وہاں کوئی رش نہیں تھا پھر بھی اگاد کا لوگ ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ جارڈن اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور لٹڈا خاموشی سے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ آرڈر سرو کر کے وہ پھر سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا وہ بولی۔

”ٹھیک ہے تم کسی سے ہی دلا دو۔ اصل میں اس وقت میں رقم کے بغیر بالکل بھی گزارہ نہیں کر سکتی۔“ جارڈن سر ہلاتے ہوئے کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر ایک راہداری میں مڑ گیا۔ لٹڈا جانتی تھی اس راہداری میں آگے جا کر ایک کمرہ اسٹاف روم کے طور پر بنایا گیا تھا۔ اس میں ہونٹ کے ورکر یونیفارم تبدیل کرتے تھے اور فارغ وقت میں وہاں سستا بھی لیتے تھے۔

تقریباً پانچ منٹ کے بعد جارڈن واپس آتا دکھائی دیا۔ اس نے آتے ہی رقم کاؤنٹر پر رکھ دی۔

”کافی ہے؟ اس وقت یہی ملے ہیں۔“ لٹڈا نے اٹھا کر گنا وہ دس ڈالر سے کچھ ڈال دئے۔ اس نے ڈالنا ٹھالیے اور باقی واپس کرتے ہوئے بولی۔

”بس اتنا کافی ہے تمہارا شکریہ میں جلد یہ رقم لوٹانے کی کوشش کروں گی۔“ جارڈن نے مسکرا کر اس کا شکریہ قبول کیا تھا۔ لٹڈا اسے ہاتھ ہلاتے ہوئے رخصت ہو گئی۔ ہر ایسے موقع پر جب لٹڈا کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی تھی جارڈن اس کے کام آیا تھا۔ وہ جارڈن کو تب سے جانتی تھی جب وہ ہائی اسکول کی طالبہ تھی وہ اس سے سینئر تھا۔ بہت سادہ دل اور ہمدرد جارڈن بہت جلد لٹڈا کا دوست بن گیا اور ہر موقع پر اس کی توقع پر پورا اترتا تھا۔

ہونٹ سے نکل کر وہ سڑک پر پیدل چلنے لگی۔ اس کا ارادہ مارکیٹ جانے کا تھا۔ اسے کچھ ضروری اشیا خریدنا تھیں۔ کیونکہ کل شام وہ جشن گڈ کے ساتھ اس کے فارم

ہاؤس روانہ ہونے والی تھی۔ اگرچہ اس نے جشن کو یہی تاثر دیا تھا کہ وہ سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہتی ہے مگر دراصل وہ اس خریداری کے لیے رقم کا بندوبست کرنا چاہتی تھی۔

جشن گڈ اسے ایک شام ایک بازار میں ملا تھا۔ لٹڈا نے اس کے پاس بہت دولت دیکھی تھی۔ وہ تب سے اس کے پیچھے تھی۔ پھر عادت کے مطابق وہ اچانک اس سے ٹکرائی۔ معذرت کے کلمات ادا کرتے کرتے اس نے جشن کو اس طرح مسکرا کر دیکھا کہ وہ اسے ایک گلاس بیئر کی آفر کیے بنا نہ رہ سکا۔

لٹڈا تو چاہتی ہی یہی تھی۔ ایک گلاس بیئر پینے کے دوران وہ دونوں ایک دوسرے کا تعارف حاصل کر چکے تھے۔ لٹڈا نے بڑی معصومیت سے اسے بتایا تھا۔

”میں اکیلی ہی ہوں۔ میری ماں نے اکیلے میری پرورش کی تھی۔ پھر جب میں دس سال کی تھی اس نے دوسری شادی کر لی۔ میں گورنمنٹ کے فنڈ پر پلٹی رہی۔ پھر تعلیم مکمل کر کے میں نے بہت سی نوکریاں کیں آج کل پھر سے فارغ ہوں اور نوکری کی تلاش میں جا رہی تھی کہ تم ٹکرا گئے۔“ تب لمحہ بھر سوچنے رہنے کے بعد جشن نے اس سے کہا تھا۔

”تم کل نو سے گیارہ کے درمیان مجھ سے ملو۔ ہو سکتا ہے میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔ میں ہوٹل گولڈن سینڈ کے پانچویں فلور پر کمرانمبر بائیس میں مقیم ہوں۔“

اور لٹڈا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہاں قسمت آزمائی ضرور کرے گی۔ اسی سلسلے میں وہ آج اس سے ملی تھی۔ حسب توقع جشن نے اسے نوکری کی آفر کی تھی۔

!!!

روم سروں کے ذریعے اس نے اپنے لیے کافی منگوائی اور خود چھینل بدلنے لگا۔ اسے شدت سے لٹڈا کے جواب کا انتظار تھا۔ اسے کسی بھی قیمت پر ایک میڈ کی ضرورت تھی۔ اگرچہ وہ اچھا کھانا بنا لیتا تھا مگر بہت سے دوسرے کام کرنے کے لیے اسے میڈ کی ضرورت تھی۔ وہ اسی سلسلے میں یہاں آیا تھا۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ وہ بولا۔

”یہ آ جاؤ..... دروازہ کھلا ہے۔“ اگلے لمحے ویٹرس ایک چھوٹی ٹرے میں کافی لے کر اندر آ گئی۔ اس نے بلیقے سے کافی میز پر رکھی پھر مسکرا کر بولی۔

”مزید کوئی خدمت جناب؟“ جشن نے کافی سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ وہ پچیس تیس برس کی ایک فریبی مائل لڑکی تھی۔ اگر اس کی آنکھیں قدرے بڑی ہوتیں تو شاید وہ

زیادہ اچھی لگتی مگر اس وقت وہ جشن کو بالکل نہیں بھائی تھی سو اس نے روکھے پن سے کہا۔
”نہیں اور کافی کے لیے شکریہ۔“
ویٹرس برا سامنہ بنا کر واپس مڑ گئی۔ جشن خاموشی سے کافی پینے لگا۔

!!!

بڑا سا کمر مختلف قسم کے چھوٹے بڑے جاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر جار میں کئی طرح کے چھوٹے بڑے سانپ رکھے ہوئے تھے۔ ایک پتلی سی لمبی لڑکی عجیب چال چلتی ہوئی ان جانوروں کے درمیان سے آگے بڑھ رہی تھی۔

اس کی چال میں واضح لڑکھٹاہٹ تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔ اسے دیکھ کر سانپ کلبلا نے لگے تھے۔ مگر لڑکی نیم وا آنکھوں سے انہیں دیکھتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ اس کے ہونٹ واضح طور پر نیلے نظر آ رہے تھے۔

چلتے چلتے وہ ایک دم نیچے بیٹھ گئی جیسے اسے چکر سا آ گیا ہو۔ چند لمحوں بعد اس کی مدھم سی آواز ابھری۔

”لگتا ہے میں مر رہی ہوں۔ میرا بدن ٹوٹ رہا ہے پتا نہیں وہ جاراں نے کہاں رکھ دیا ہے۔“

چند لمحوں بعد وہ پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی کمر پار کر کے وہ ایک اور کمرے میں داخل ہو گئی جس کا دروازہ اس ہال نما کمرے میں کھلتا تھا۔ کمرے کا فرش شیشے کا تھا۔ دیواروں پر گہرا سرمئی پنٹ کیا گیا تھا۔ اس کا عکس فرش میں بھی دکھائی دے رہا تھا۔ لڑکی خوشی سے چلائی۔

”وہ رہا سنہرا جارا۔“

کمرے کے ایک کونے میں سنہرا جارا رکھا تھا۔ اس میں سنہرے مائل زرد رنگ کا ایک تین فٹ لمبا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا، لڑکی کو دیکھتے ہی وہ دھیرے دھیرے بھٹکانے لگا۔ لڑکی کے ست قدموں میں قدرے تیزی آ گئی۔ وہ کمر پار کر کے کونے میں رکھے جارتک پہنچ گئی۔ اکڑوں بیٹھ کر اس نے احتیاط سے جارا کا ڈھکن ہٹایا۔

سانپ اچھل کر اس پر آ پڑا۔ لڑکی توازن برقرار نہ رکھ سکی اور پیچھے گر گئی۔ سانپ اس کے جسم پر ڈنک مارنے لگا۔ ہر بار جب سانپ اسے کاٹتا تو اس کے جسم کو جھٹکا لگتا اور اس کے منہ سے سکاری سی نکل جاتی۔ چار پانچ مرتبہ اسے ڈسنے کے بعد سانپ اتر کر تیزی سے ایک طرف کونے میں بنے چھوٹے سے بل میں غائب ہو گیا۔

لڑکی اسی طرح فرش پر پڑی تھی۔ بادی النظر میں یوں لگتا تھا جیسے وہ بے ہوش ہو گئی ہو اور غور سے دیکھنے پر سانس کا زیر و بم واضح دکھائی دیتا تھا۔

لڑکی کو اسی حالت میں چند منٹ گزرے ہوں گے جب باغ کی طرف کھٹنے والی کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک بہت بڑا سانپ نمودار ہوا۔ وہ سیدھا فرش پر بے سدھ پڑی لڑکی کی طرف آیا۔ سانپ کی لمبائی تو دس فٹ سے زیادہ نہیں تھی مگر وہ اتنا موٹا تھا کہ لڑکی کو آسانی سے نگل سکتا تھا۔ وہ انا کوئلہ کی نسل کا ایک سانپ تھا، لڑکی کے قریب پہنچ کر اس نے اپنا بڑا سامنہ کھولا اور لڑکی کا سر نگٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کے سامنے کے لمبے اور نوکیلے دانت جب لڑکی کے ماتھے میں چبھے تو وہ بری طرح تڑپی مگر سانپ نے اسے نگلنا ترک نہیں کیا۔ لڑکی مسلسل پھڑک رہی تھی مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنا بچاؤ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ استعمال کرتی۔ سانپ اپنی کوشش میں مصروف تھا۔ ایک سے ڈیڑھ منٹ میں وہ لڑکی کو گردن تک نگل چکا تھا۔ لڑکی کی مزاحمت ماند پڑتی جا رہی تھی۔

زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں سانپ لڑکی کو سالم نگل چکا تھا۔ اب وہ آرام سے کمرے کے فرش پر لدھر سے اُدھر پھر رہا تھا۔

اسکرین کے سامنے بیٹھے جسن کے لبوں پر ایک محفوظ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

”بے چاری ایناروزا“ اور کمپیوٹر بند کرنے لگا۔ یہ

وڈیو دو روز پرانی تھی۔ جسن کل شام ہی اپنے فارم ہاؤس پر واپس پہنچا تھا۔ لہذا اس کے ساتھ ہی آئی تھی۔ اسے اس کا کمراد کھا کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا تھا اور تب سے اب تک وہ کوئی دس مرتبہ یہ وڈیو دیکھ چکا تھا۔

”گویا کامیابی اس شخص ایک قدم کی دوری پر ہے۔“ اس نے یدِ ہم سی خود کلامی کی۔ اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر نکل آیا۔ لہذا باورچی خانے میں کچھ کھانے میں مصروف تھی۔ وہ وہیں آگیا۔

”ہیلو! گرل کیا ہو رہا ہے۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔

لہذا نے لمحہ بھر کو نظر اٹھا کر اسے دیکھا پھر مصروف سے انداز میں بولی۔ ”ہائی ٹی بنارہی ہوں۔ تمہیں کوئی کام تھا؟“

”ہاں مجھے ایک بڑا مگ چائے اور ساتھ کچھ کھانے کو دے دو۔ پھر میں اپنی تجربہ گاہ میں جانا چاہتا ہوں۔“

اوون کا تھر مو اسٹیٹ سیٹ کر کے لہذا اس کی طرف

مڑی۔ ”تم کوئی سائنس دان ہو؟“ جسن نے سر ہلایا۔ ”ہاں تم کہہ سکتی ہو۔“ لہذا چائے بناتے ہوئے بولی۔ ”مگر تم نے پہلے تو نہیں بتایا۔ تم نے تو کیا تھا کہ تمہارا ایک فارم ہاؤس ہے۔“ وہ کینٹ کی طرف گئی تھی ایک مگ اور ٹرے لا کر شلف پر رکھتے ہوئے کہا۔

”دراصل میں سائنس دانوں کو کچھ خاص پسند نہیں کرتی۔ تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہارا فارم ہاؤس کس قسم کا ہے؟“ جسن نے معتدل لہجے میں کہا۔

”تم نے پوچھا ہی نہیں تھا۔ بہر حال میں ویسا خشک مزاج نہیں جیسے عام طور پر سکی سائنس دان ہوتے ہیں۔ تمہارا وقت یہاں بڑا اچھا گزر جائے گا اور رہ گئی فارم ہاؤس کی بات تو میرا فٹن اور سانپوں کا فارم ہے۔ یہ میری ذاتی زمین پر قائم ہے۔ کیا تم دیکھنا پسند کرو گی؟“

لہذا نے چائے تیار کر کے ایک کیک پیس کے ساتھ اس کے سامنے رکھ دی۔

”ایک بار تو ضرور دیکھوں گی۔ اگر ماحول پسند آگیا تو روزانہ بھی وہاں جاسکتی ہوں ویسے کتنا بڑا ہے تمہارا فارم؟“

جسن اسے فارم کی لمبائی چوڑائی بتانے لگا۔ لہذا کام نمٹاتے ہوئے اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہی۔ چائے پی کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اوکے اب میں جا رہا ہوں۔ کام سے فارغ ہو کر تجربہ گاہ میں آجانا۔“ لہذا سر ہلا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

!!!

چھوٹا سا کمر ضرورت کی ہر چیز سے آراستہ تھا۔ اس میں ایک بیڈ، ٹویٹر صوفیہ ایک کلرٹی وی اور ایک دیوار گیر کپڑوں کی الماری بھی تھی۔ لہذا نے یہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنے ساتھ لائے گئے بیگ کو الماری میں رکھ کر مقفل کیا تھا۔

اس معاملے میں وہ کبھی بے پروائی نہیں کرتی تھی۔ پھر وہ کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ اس نے یہ غور کھڑکی اور اس کے فریم کا جائزہ لیا۔ کھڑکی اگرچہ چھوٹی تھی مگر اس جیسی اسمارٹ سی لڑکی کے لیے اس میں سے گزر جانا کوئی مشکل نہ تھا۔ وہاں سے پلٹ کر اس نے دروازے اور اس کے لاک کا اچھی طرح جائزہ لیا، اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

لاک میں خرابی پیدا کی گئی تھی۔ وہ سر جھٹک کر

کمرے سے باہر نکل آئی۔ جسن نے اسے بتا دیا تھا کہ اسے کھانا بنانے اور کپڑے دھونے کے علاوہ صفائی کا کام بھی کرنا تھا لیکن تنخواہ اتنی پرکشش تھی کہ لہذا نے فوراً ہائی بھری۔ ویسے بھی اسے تو یہ جاب ہر قیمت پر کرنا ہی تھی۔

اس کی جاب صبح سے شروع ہونا تھی۔ رات کا کھانا وہ شہر سے لے آئے تھے۔ جسن کا فارم ہاؤس قریبی قصبے سے بھی بہت دور تھا۔ راستے میں جسن نے اسے بتایا تھا کہ ”ہفتے میں ایک بار فٹن ٹرائل آکر مچھلی لے جاتا ہے اور میں اپنی ضرورت کی چیزیں پندرہ بیس دنوں بعد خود جا کر لے آتا ہوں راشن سمیت۔ ویسے میں زیادہ تر تازہ گوشت ہی کھاتا ہوں۔“

اگلی صبح دوپہر کا کھانا تیار کر کے وہ جسن کی دعوت پر اس کی تجربہ گاہ میں چلی آئی۔ وہ ایک سانپ کے منہ سے زہر نکالنے میں مصروف تھا۔ لہذا نے دپچی سے اس عمل کو دیکھا۔ ”تم تو کافی ماہر ہو۔“ اس نے جسن کی تعریف کی وہ ایک مبہم مسکراہٹ کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہا۔ لہذا دیواروں کے ساتھ ساتھ رکھے جاروں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”تمہارے پاس تو سانپوں کا بڑا اچھا کلیکشن ہے۔“ وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

”یہ میرا شوق ہی نہیں جنون ہے۔ اسی کی وجہ سے میں شہر سے اتنی دور اس ویرانے میں پڑا ہوں۔“ پھر وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ لہذا کو لگا وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ چلتے چلتے وہ مشرقی دیوار کے ساتھ رکھے جاروں کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ چھوٹے سے شیشے کے جار میں بند سرخ رنگ کے ایک بالشت بھر لیے سانپ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے جسن کی طرف دیکھا وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔

لہذا واپسی کے لیے مڑ گئی۔

”اوکے تم اپنا کام کرو میں اب فٹن فارم دیکھنے جا رہی ہوں۔“ جسن خاموشی سے اس زہر کو ایک اسپرٹ لیپ پر گرم کر کے بھاپ میں تبدیل کرتا رہا۔ لہذا کندھے اچکا کر باہر نکل گئی۔ اب اس کا رخ فٹن فارم کی طرف تھا۔

جسن گڈ کا فٹن فارم بہت بڑا نہیں تھا لیکن اتنا بڑا ضرور تھا کہ وہ ہر ہفتے پھلی مارکیٹ بھجواتا تھا۔ لہذا کو ایک خاص مچھلی کی تلاش تھی مگر اسے وہ فٹن فارم میں نظر نہیں آئی۔

”گویا سب کچھ تمہارا وہ سانپوں کا کمرہ ہی ہے۔“

فٹن فارم سے ہو کر وہ باقی جگہ کو گھوم پھر کر دیکھنے لگی۔

جسن کا فارم ہاؤس کل پانچ چھ ایکڑ پر محیط تھا۔ اس میں ایک بڑے سے باغ کے علاوہ رہائشی عمارت بھی تھی۔ رہائشی عمارت میں کل پانچ کمرے تھے۔ تین کمرے الگ بنے ہوئے تھے اور جسن کے استعمال میں تھے۔ ایک کمرہ لہذا کے پاس تھا اور ایک کچن تھا۔

گھوم پھر کر وہ واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے الماری کھولی اس میں سے بیگ نکالا۔ پھر بیگ کے خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک بیگ نکال لیا۔ پیکٹ میں ایک خط اور ایک تصویر دیکھی لہذا نے ایک مرتبہ پھر خط پڑھا۔ نظر جم کر تصویر دیکھی اور پھر سے پیکٹ میں بند کر کے واپس رکھ دی۔

”تو گویا گیم شروع ہے۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور دوپہر کا کھانا لگانے چل دی۔

جسن اپنی تجربہ گاہ میں مصروف تھا جب لہذا اندر آئی۔ ”جسن یہاں تو سگنل ہی نہیں آرہے۔ مجھے اپنے دوست کو فون کرنا تھا۔“ وہ قدرے پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا۔ سونار مل لہجے میں بولا۔

”دراصل مجھے شور و شغب سے سخت الجھن ہوتی ہے اس لیے میں نے جامر لگایا ہوا ہے تاکہ کوئی فون کر کے مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ اگر تمہیں کہیں ضروری کال کرنا ہوگی تو میں تھوڑی دیر کے لیے جامر بند کر دوں گا۔“

وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ”اوکے کل مجھے اپنے دوست کو فون کرنا ہے۔ تم کتنے بچے جامر بند کر دو گے؟“ جسن نے بلا توقف کہا۔ ”کل دوپہر میں دو گھنٹے کے لیے بند کر دوں گا۔“ وہ مطمئن ہو کر باہر نکل گئی۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

”پیاری لڑکی اب تم اس دنیا اور اس کی رنگینیوں کو بھول جاؤ۔“ اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

!!!

جسن اپنے کمرے میں نہا رہا تھا۔ لہذا تیزی سے تجربہ گاہ میں پہنچ گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پلیٹ کا سنہرے رنگ کا محلول اس چھوٹے سرخ سانپ کے جار میں انڈیل دیا۔

سانپ بڑی تیزی سے اسے پی رہا تھا۔ چند لمحوں میں ہی اس نے سارا محلول ختم کر دیا۔ لہذا کو یہ

سانپ بہت بھایا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی یہ دلچسپی جشن کی نظر میں آئے۔

اسے جشن کے فارم پر آئے ہوئے ہفتہ ہو گیا تھا۔ وہ جشن کی غیر موجودگی میں اس کے پورے گھر کی اچھی طرح تلاشی لے چکی تھی۔ سوائے اس کے بیڈروم کے۔ کیونکہ وہ جب بھی بیڈروم سے نکلتا اس کا دروازہ مقفل کر کے نکلتا تھا۔ یہ کوئی بڑی رکاوٹ نہیں تھی اصل مسئلہ اس کے بیڈروم کی چھت سے ایک زنجیر کے ذریعے لٹکتی چھوٹی سی بھوری چڑیا تھی جو دروازہ کھلتے ہی شور مچا کر گول دائرے میں اڑنے لگتی تھی۔

جبکہ لنڈا کو ڈرتا تھا کہ جشن اس کی آواز سن کر آنے جائے وہ اسے مشکوک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کچن میں آکر پلیٹ دھو کر رکھ رہی تھی جب جشن وہاں آیا۔ ”آج میں تمہیں اپنی پسند کا ہاٹ ڈاگ بنا کر کھلاتا ہوں۔“ لنڈا خوش ہو گئی۔ ”چلو میری تو کچن سے جان چھوٹ جائے گی۔ تم کھانا بناؤ میں تب تک لانڈری کو دیکھ لوں۔“

دو گھنٹے بعد جب لنڈا ہفتے بھر کے اپنے اور اس کے کپڑے دھو کر فارغ ہوئی تو جشن دوپہر کا کھانا تیار کر چکا تھا۔ ”تم ٹیبل سیٹ کرو، ہاٹ ڈاگ بس تیار ہی ہے۔“ وہ جیسے ہی کچن میں داخل ہوئی اس نے نیا حکم سنا دیا۔ لنڈا ابد مزہ ہونے کے باوجود ٹیبل سیٹ کرنے لگی۔ ”یہ تمہارا ہاٹ ڈاگ۔“ اس نے ایک پلیٹ لنڈا کے سامنے رکھی جو کچن میں پڑی چھوٹی سی میز پر بیٹھی ہوئی تھی ”اور یہ میرا“ وہ خود بھی میز پر بیٹھ گیا۔

لنڈا نے بے صبری سے کھانا شروع کر دیا۔ کھانا ختم کر کے وہ اٹھ گئی۔ ”میں کافی بنا لوں تم پیو گے؟“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں اس وقت بازار جا رہا ہوں راشن وغیرہ لانے کے لیے۔ تم چاہو تو اتنی دیر آرام کر سکتی ہو اور برائے مہربانی تجربہ گاہ کی طرف جانے کی کوشش مت کرنا۔ وہ سانپ زہریلے ہیں تمہیں کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔“

لنڈا نے فرماں برداری سے سر ہلایا۔ پھر بولی۔ ”تم کب تک لوٹ آؤ گے؟ کیا میں اتنی دیر میں ایک اچھی نیند لے سکوں گی۔“ اس نے دیکھا جشن کی سانپ جیسی آنکھوں میں چمک سی لہرائی تھی۔ اس نے مزید اضافہ کیا۔

”دراصل کھانا کھا کر میری طبیعت بوجھل سی ہو رہی ہے میرا خیال ہے کہ ایک بھر پور نیند لینے سے میں بالکل فریش ہو جاؤں گی۔“ وہ مسکرایا۔

”میری طرف سے مکمل اجازت ہے تم جی بھر کر سولو۔ اگر میں پہلے بھی آ گیا تو خود لاک کھول لوں گا۔“ لنڈا نے یوں ظاہر کیا۔ جیسے وہ جشن کی اس بات سے بہت خوش ہوئی ہو۔ جشن جیب میں بیٹھ کر شہر چلا گیا۔ لنڈا نے ایک بھر پور سانس اپنے اندر اتاری اور پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”تو بالآخر مجھے موقع مل ہی گیا۔“

وہ سیدھی اپنے کمرے کی طرف گئی۔ اس کی کھڑکی سے اس نے جشن کی جیب کو دور دھول اڑاتے سفر کرتے دیکھا۔ وہ تیزی سے الماری کی طرف بڑھی۔ اس میں سے اپنا بیگ نکالا۔ اس کا خفیہ خانہ کھولا اور ایک چپٹا سا باکس نکال لیا۔

اس باکس سمیت وہ سیدھی جشن کے کمرے کی طرف گئی۔ اس نے باکس کھول کے اس میں سے ایک ٹیڑھی میڑھی سی تار نکالی اور دروازے کا لاک کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ صرف دو منٹ میں وہ کمرے کے اندر تھی۔

چھت سے لٹکتی چڑیا اسے دیکھ کر شور مچانے لگی مگر لنڈا کو مطلق پروا نہ ہوئی۔ وہ خاموشی سے اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ اس نے سب سے پہلے جشن کے بیڈ کی تلاشی لی۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ چڑیا مسلسل شور مچا رہی تھی۔ لنڈا نے منہ اوپر کر کے اسے ڈانٹا۔

”خاموش ہو جا لگتی چڑیا۔“ مگر چڑیا شور مچاتی رہی حالانکہ جشن کے اندر آتے ہی وہ چپ ہو جاتی تھی۔ اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

”کہیں یہ نگرانی کرنے والا کوئی آلہ ہی نہ ہو۔“ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی سامنے ہی سوچ بورڈ تھا اس نے یکے بعد دیگرے کئی بٹن دبائے بالآخر ایک بٹن اسے مل ہی گیا جسے دباتے ہی چڑیا خاموش ہو گئی تھی۔

اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر کے لنڈا نے سکون سے تلاشی لی۔ ہر اہم چیز کو وہ تسلی سے پرکھتی اور پھر واپس اس کی جگہ پر رکھ دیتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جشن کو تلاشی کا علم ہو۔

کوئی پون گھنٹے کی مشقت کے بعد بالآخر وہ ایک خفیہ الماری دریافت کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ الماری کھولنا تو اس کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ جیسے ہی الماری کھلی لنڈا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”اوہ میرے خدا! کیا کچھ جمع کر رکھا ہے تم نے جشن.....“

الماری میں نوٹوں کی گڈیوں کے علاوہ کئی چھوٹی بڑی

شیشیاں تھیں جن میں کئی رنگوں کے مخلول تھے۔ لنڈا نے ایک ایک شیشی کو کھول کر سونگھا پھر سر ہلا کر واپس رکھ دیا۔ پھر وہ نچلے خانوں کی طرف متوجہ ہوئی ایک خانے میں کچھ ملائی زیورات اور کچھ قیمتی ہیرے پڑے تھے۔ اس کے علاوہ سونے کی کئی ڈلیاں بھی تھیں۔

”یعنی تمہارے پاس ایک بڑا خزانہ جمع ہے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔“

سب سے نچلے خانے میں کچھ کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ لنڈا نے انہیں بغور پڑھا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر انہیں بھی واپس اسی جگہ رکھ دیا۔ ان کاغذات کے ساتھ ایک فوٹو البم بھی پڑا تھا۔ لنڈا نے کھول کر دیکھا۔ اس میں جشن کی نوعمری کی تصاویر تھیں۔ اس کے خاندان کے باقی لوگوں کی تصویروں کے ساتھ۔ وہ انہماک سے تصویریں دیکھتی رہی پھر اسے بھی بند کر کے واپس رکھ دیا۔

اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ جشن کے پاس لاکھوں کی رقم اور سونا تھا۔ وہ بڑبڑائی۔

”یعنی اس رقم سے میں ایک عمدہ مکان بنا سکتی ہوں اور پوری دنیا کی سیر کو جاسکتی ہوں بلکہ بڑا چاہا بھی سکون سے گزار سکتی ہوں۔“

وہ ایک پیشیہ ور چور تھی۔ اس سے پہلے بھی اس نے بہت سی چوریاں کی تھیں۔ وہ بھی پکڑی نہیں گئی تھی۔ جشن کو ہول میں دیکھ کر وہ اس کی دولت کا اندازہ لگا چکی تھی۔ پھر بازار میں اچانک اس سے ٹکرائی اور حسب خواہش اب اس کے فارم ہاؤس پر اس کے ساتھ گئی۔

وقت کم تھا۔ جشن کسی بھی وقت لوٹ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے مستقبل کے خواب دیکھنے بند کر کے الماری کا دوسرا پٹ کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ جب الماری کا پٹ کھلا تو وہ دنگ رہ گئی۔ اس میں سے تنگ سی سیزھیاں نچے اتر رہی تھیں۔ وہ محتاط قدموں سے سیزھیاں اترنے لگی، نیچے مکمل تاریکی تھی۔ کمرے کی ٹیوب لائٹ کی وجہ سے ابتدائی کچھ سیزھیاں واضح دکھائی دے رہی تھیں آگے گھپ اندھیرا تھا۔ وہ رک گئی۔

چند لمحوں بعد جب اس کی آنکھیں اندھیرے سے قدرے مانوس ہو گئیں تو وہ پھر سے سیزھیاں اترنے لگی۔ جیسے جیسے وہ اترتی جا رہی تھی ایک ناگوار بو اس کی ناک سے نکلنے لگی تھی۔ چند لمحے غور کرنے کے بعد اسے پتا چل گیا کہ وہ باسی پھیلیوں کی سزا اندھا بو تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ جشن نے مچھلیاں اس تہ خانے میں کیوں رکھی تھیں۔

وہ ٹھنک کر رکی۔ کوئی دس فٹ کے فاصلے سے ایک گرم ہوا کا جھکا اس کی ناکوں سے ٹکرایا تھا۔ وہ اپنی سانس کو کھڑی رہی۔ سامنے بڑے سے بچھرے میں ایک بہت بڑا سانپ پڑا تھا۔ اندھیرے میں وہ اس کا رنگ تو سب طرح سے نہیں دیکھ سکی تھی مگر جسامت اسے بخوبی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑی بے یقین نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر تیزی سے واپس آ گئی۔

لنڈا کوئی بزدل لڑکی نہیں تھی مگر اس وقت اس کے ماتھے پر پسینا آیا ہوا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے الماری بند کی ہر چیز واپس ٹھکانے پر رکھی اور کمرے سے باہر آ گئی۔

اپنا باکس اور بیگ الماری میں بند کر کے وہ چت بہر پر پڑ گئی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

!!!

وہ صفائی کر رہی تھی جب جشن نے پیچھے سے پکارا۔ ”لنڈا ذرا دھیان سے۔ کوئی جار ٹوٹ نہ جائے۔“ اس وقت وہ سنہرے جار کو کپڑے سے چمکا رہی تھی جب جشن نے اچانک اسے پکارا تھا وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اگلے ہی پل کمر اس کی چیخوں سے گونج اٹھا۔

جار کا ڈھکن پہلے سے کھلا ہوا تھا اور لنڈا کا ہاتھ بے دھیانی سے لٹکنے کی وجہ سے جار کے منہ پر سے ہٹ گیا۔ ڈھکن ہٹے ہی اندر بیٹھے سنہری مائل زرد رنگ کے سانپ نے لنڈا کے ہاتھ پر ڈس لیا۔ جشن بھاگ کر اس کے پاس آیا۔ اس نے سانپ کو پکڑ کر واپس جار میں بند کیا اور لنڈا کو دلاسا دینے لگا۔

”بہادر بنو لنڈا۔ یہ بہت خطرناک سانپ نہیں ہے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں ابھی ایک دوا دیتا ہوں تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

فرش پر پڑی ہوئی لنڈا نے جشن کے چہرے سے جھلکتے اطمینان کو ایک نظر دیکھا۔ لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر سامنے دیوار میں بنے ایک ریک کے پاس چلا گیا۔ ایک چھوٹے سے گلاس میں اس نے دو تین شیشیوں سے مخلول انڈیلا اور لاکر زمین پر مدہوش سی پڑی لنڈا کے حلق میں پٹکا دیا۔

”آؤ میں تمہیں تمہارے کمرے میں چھوڑ آؤں تم کچھ دیر آرام کر لو۔“

یہ کہتے ہی اس نے جھک کر فرش پر ترچھی پڑی لنڈا کو اٹھایا اور اس کے کمرے میں لے گیا۔ بستر پر لیٹنے ہی لنڈا کو

میں اتفاقاً محسوس ہونے لگا۔ اسے نیند آرہی تھی۔ جشن کچھ دیر اس کے پاس کھڑا رہا پھر واپس پلٹ گیا۔ وہ سو گئی تھی۔

!!!

”جشن پلیز! صرف ایک مرتبہ مجھے سانپ سے سامنے دو۔ میرا بدن ٹوٹ رہا ہے۔“

لنڈا نے ایک بار پھر التجا کی۔ جشن نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”خاموش ہو جاؤ لنڈا کہہ تو دیا ہے کہ ایک دن میں دو مرتبہ سامنے سے تم مجھے سکتی ہو۔ کیا اتنا کافی نہیں کہ میں ایک قیمتی زہر ہر روز شیشی میں بھرنے کے بجائے تمہیں نشہ دے کر مارنے کے لیے دے رہا ہوں، حالانکہ اس کی بازار میں بڑی اچھی قیمت مل رہی ہے۔“

لنڈا خاموشی ہو گئی۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں جشن نے اسے بتایا تھا کہ اس سے پہلے جو میڈکھی وہ بھی اتفاق سے اس سانپ کے زہر کا شکار ہو گئی تھی اور زہر حاصل کرنے کے لیے وہ جشن کا ہر حکم بلاچوں چڑاں مانتی تھی۔ لنڈا نے فوراً پوچھا۔ ”اب وہ میڈ کہاں ہے؟“ وہ چونک گیا۔

”تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ لنڈا نے بلا توقف کہا۔ ”میں اس سے اس زہر کا علاج پوچھوں گی تاکہ مجھے ڈسوانے کی حاجت ہی نہ رہے۔“ جشن نے مدھم لہجے میں کہا۔ ”وہ بہت بیمار رہنے لگی تھی میں نے اسے شہر جانے کا مشورہ دے کر چھٹی دے دی اور علاج کے لیے رقم بھی دی۔ اس کے بعد اس نے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔ میں خود اسے شہر چھوڑ کر آیا تھا۔“

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔ ”جشن میں ابھی اپنے دوست کو فون کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارا کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ پچھلے ڈیڑھ ہفتے سے تم مجھے ٹال رہے ہو۔“ جشن کو غصہ آ گیا۔

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس کا آف کرنے والا سسٹم خراب ہو گیا ہے۔ جب میں شہر جاؤں گا تو نیا جامر لے آؤں گا۔ اب اگر تم نے مجھے تنگ کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔“

لنڈا نے لب بھینچ کر خود کو کچھ کہنے سے روکا۔ وہ باہر جا کر بھی کال نہیں کر سکتی تھی کیونکہ جامر کی ریخ بہت وسیع تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے لنڈا نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اگلے دو سے تین روز میں یہ فارم ہاؤس چھوڑ دے گی۔ کل فرش ٹالر آنے والا تھا۔ جشن اپنی نگرانی میں مچھلی لوڈ کروانا تھا۔ لنڈا کے لیے آدھے گھنٹے کی مہلت بھی

کافی تھی۔ وہ اگر سامان سمیٹ کر باغ کے آخری کونے میں چھپ جاتی تو ٹرالر میں سوار ہو کر واپس شہر جاسکتی تھی۔ ”جاؤ یہاں سے میں تمہاری وجہ سے ڈسٹرب ہو رہا ہوں۔“

لنڈا نے ایک نظر اسے دیکھا اور فرش فارم سے باہر نکل آئی۔ اپنے کمرے میں واپس آ کر اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے منصوبے پر غور شروع کیا۔ سوچتے سوچتے وہ ایک دم چونک گئی۔

”مجھے پہلے کیوں نہ خیال آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ پرجوش سی بستر سے اٹھ گئی۔

جشن فش لوڈ کر واپس آیا تو لنڈا فرائی فش اور ایلے چاول تیار کر چکی تھی۔ وہ دونوں میز پر آنے سامنے بیٹھ گئے۔ پہلی بد مزگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ جشن نے مسکرا کر اس کی تعریف کی۔

”آج تم نے کھانا بہت اچھا بنایا ہے اور تمہاری طبیعت بھی بہتر محسوس ہو رہی ہے۔“ لنڈا خاموشی سے ہلکا ہلکا مسکراتی رہی۔ وہ بولا۔

”آج اگر تم دو مرتبہ ڈسوانا چاہو تو میں اعتراض نہیں کروں گا۔“ لنڈا نے لقمہ چبانا موقوف کر دیا۔

”کیوں؟“ اس نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ کافی سرد ہو گیا تھا۔ جشن ہلکا ہلکا رہ گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

”او کے اگر تمہیں ضرورت نہیں ہے تو نہ سہی۔ میں نے تو تمہارے خیال سے کہا تھا۔“

لنڈا خاموشی سے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کھانا کھا کر جشن سیدھا اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ لنڈا نے اطمینان سے برتن دھو کر رکھے۔ پکن کی صفائی کی پھر ہاتھ دھو کر جشن کے بیڈروم کی طرف آ گئی۔

دروازہ خلاف معمول کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر چلی آئی۔ جشن بستر پر چت لیٹا ہوا تھا۔ وہ کھل کر مسکرائی۔ ”تو بالآخر اونٹ پہاڑ کے نیچے آ ہی گیا۔“ اس نے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا۔ جشن نے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

”تم سمجھتے تھے کہ تم جو مرضی کرو تو تمہیں کوئی پوچھے گا نہیں۔ ایسا ہی ہے نا۔ مگر دیکھ لو۔ میں تم سے اپنا انتقام لینے پہنچ گئی۔“ جشن کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کسمسا کر رہ گیا۔ لنڈا اکتاہٹ لگا کر ہنسی۔

”آرام سے آرام سے۔ اب تم بھی اپنی مرضی سے



حضرت شعیب علیہ السلام

رضوانہ ساجد

شُرک سے اجتناب، راست گوئی اور ناپ تول میں انصاف پر دور میں ایمان کا جزو لازم نہ تھے مگر جب جب انسان دنیا کی لذتوں میں گم ہو کر اپنے مرکز سے بھٹکا تو اس قوم پر اللہ نے اپنی تمام رحمتوں کو سمیٹ لیا لیکن... اس کے باوجود منہ نہیں موڑا بلکہ ان کی بھلائی کے لیے نبیوں کو مبعوث فرماتا رہا۔ اسی سلسلے میں حضرت شعیب علیہ السلام کا بھی شمار ہوا۔ جن کی قوم ناپ تول میں کمی اور زمین پر فساد پھیلانے میں ماہر تھی۔ آپ ﷺ اپنی قوم کی حالت پر روتے رہے جس سے آپ ﷺ کی بینائی جاتی رہی جو بارہ سال تک نہ لوٹ سکی اور اسی حالت میں آپ ﷺ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ اس قوم پر آپ ﷺ کی فصاحت و بلاغت کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے کہا: ”اگر تم سچے ہو تو اپنے پروردگار سے کہو کہ ہم پر بادل کا ٹکڑا گرا دے۔“ پھر ایک روز ان کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی جب اچانک بادلوں سے آگ کے شعلے برسنے لگے۔

سرور ان قوم کی بد اعمالیوں اور میزان حق کا ایک اور سچا واقعہ

حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر قبیلہ مدین آباد تھا۔ جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانے میں جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کنارے یمن سے شام تک جاتی تھی اور ایک دوسری تجارتی شاہراہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی، اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں واقع تھیں۔ سامی اقوام کا یہ عام قاعدہ تھا کہ اپنی آبادی اور قومیت کو اپنے بزرگانِ نسل کے نام سے موسوم کر دیا کرتی تھیں۔ یہ قبیلہ بھی اپنے بانی موسیٰ خاندان مدین بن ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ ان کی نسل کو اہل مدین کہا جاتا ہے۔ مدین، حضرت قطورہ کے بطن سے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری زوجہ تھیں۔

وہ سانس لینے کو رکھ کر پھر نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”سانپ کو دیکھتے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ تم وہ دروہ ایجاد کرنے کی کوشش کر رہے ہو جس سے انسان صدیوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے سانپ کو ہر چھ ماہ کے بعد ایک ایسے انسان کا گوشت کھلایا جاتا ہے جسے کسی سانپ سے ڈسوانے کی عادت ہو اور تم نے اپنا کو اسی لیے کسی بہانے سانپ سے ڈسوا دیا جس کے زہر میں نشہ ہوتا ہے۔“ اس نے سامنے گھورتے جھٹن کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ تنفر سے بولی۔

”تم اپنی دیرینہ آرزو کے پورا نہ ہونے پر رورہے ہو اور میں سوچ رہی ہوں کہ تم اپنا سے پہلے جانے کتنے قتل کر چکے ہو۔ بہر حال میں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا چ بنا کر بستر پر ڈال دیا ہے میں تمہیں قتل نہیں کروں گی کیونکہ میں ایسا کر ہی نہیں سکتی۔“

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں بعد بولی۔ ”تم نے پوچھا نہیں جھٹن گڈ کہ میں سانپوں کے بارے میں اتنی معلومات کیسے رکھتی ہوں اور یہ کہ اپنا روزانہ مجھے تمہاری تصویر کیوں بھجوائی تھی۔“ وہ استہزائیہ ہنسی۔

”تم تو پوچھ ہی نہیں سکتے۔ میں خود ہی بتا دیتی ہوں۔ اپنا روزانہ کو علم تھا کہ میں جھٹن گڈ کی تلاش میں ہوں۔ اس نے اسی لیے مجھے تمہاری تصویر بھجوائی تھی تاکہ میں دیکھ سکوں کہ تم میرے مطلوبہ آدمی ہو یا نہیں اور ہاں مجھے تمہاری تلاش اس لیے تھی کہ میں لنڈا گڈ ہوں۔ تمہاری سگی چھوٹی بہن۔ جب تمہیں ایسے ہی مجرمانہ تجربے کرنے پر ڈیڈ نے اپنی تجربہ گاہ سے نکالا تھا تو تم نے گھر بھی چھوڑ دیا مگر میں تمہیں بھلا نہ سکی اور خود مختار ہوتے ہی تمہاری تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ مگر تم نے اپنی روش ترک نہیں کی اور انسانوں کی جان لینے سے بھی نہیں چو کے۔ میں اسی بات کی تصدیق کے لیے تمہیں بدل کر تم سے ملی تھی۔“ وہ مسکراتی پھر بولی۔

”مگر اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگرچہ میں بھی سانپ کے ماہروں کے خاندان سے ہوں مگر مجھے سانپوں سے نفرت ہے۔ میں اب اس گھر کی قانونی وارث ہوں۔ یہاں سے سب سانپ ہٹا دوں گی اور چارڈن کے ساتھ مل کر ایک خوشگوار زندگی گزاروں گی۔ بلاشبہ وہ ایک اچھا انسان ہے۔“

وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کر باہر چلی گئی۔

اپنے بدن کو جنبش نہیں دے سکے۔ میں نے سرخ سانپ کا زہر تمہیں کھلا دیا ہے۔ تم جو ہر استعمال کر رہے تھے اس میں اس سانپ کا زہر انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ تم جانتے تو ہو۔ کیونکہ تم سانپوں پر اتنے عرصے سے تجربے جو کر رہے ہو۔ لنڈا کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔ اس نے بے بسی سے بستر پر پڑے جھٹن کو دیکھا پھر بولی۔

”میں نے تمہیں ہوٹل میں ہی دیکھ کر پہچان لیا تھا اور تم سے اپنا روزانہ کا بدلہ لینے کے لیے میں تمہارے ساتھ یہاں آ گئی۔ مگر یہاں آ کر مجھے احساس ہوا کہ تم مجھے بھی اپنا روزانہ جیسے انجام سے دوچار کرنا چاہتے ہو۔ تب مجھے تم پر شدید غصہ آیا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں تمہارے کیے کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔“

وہ اٹھی اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔ چند لمحوں بعد ایک تصویر اور خط لے کر پھر اس کے کمرے میں آ گئی۔ پہلے کی طرح اس نے کرسی سنبھالی اور ہاتھ بڑھا کر جھٹن کی کھلی آنکھوں کے سامنے تصویر رکھ دی۔

”لو پہچان لو۔ یہ تم ہی ہونا۔ تمہاری یہ تصویر مجھے اپنا روزانہ بھجوائی تھی اور ساتھ یہ خط بھی۔“ لنڈا نے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط اس کی پچھی ہوئی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

”اس میں اپنا نے بتایا تھا کہ اسے ایک سنبھے لائل زرد سانپ نے ڈس لیا ہے اب وہ روزانہ دو سے تین مرتبہ اس سے ڈسواتی ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کا بدن ٹوٹنے لگتا ہے۔ اس نے مجھے اپنے پاس بلوایا تھا۔ مگر بد قسمتی سے وہ یہاں کا پتا لکھنا بھول گئی۔“

وہ لمحے بھر کو رکھ کر پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ ”تم سوچتے تو ہو گے کہ اس نے خط کیسے پوسٹ کر دیا جبکہ تم اس کے خط پھاڑ کر پھینک دیتے تھے۔ تو مسٹر جھٹن اپنا روزانہ یہ خط فش ٹرالر والے لڑکے کو رشوت دے کر پوسٹ کرایا تھا تم سے چھپا کر ورنہ تم خط بھی پوسٹ نہ ہونے دیتے۔“

لنڈا نے خط لپیٹ کر میز پر رکھ دیا۔ جھٹن کے بدن میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ لنڈا بولی۔

”میرا ارادہ تھا کہ میں سزا کے طور پر تم سے تمہاری تمام دولت چھین لوں گی کیونکہ تم نے میری پیاری دوست کو اپنے تجربات کی بھیئت چڑھا کر زندگی سے دور کر دیا۔ لیکن یہاں آ کر مجھے پتا چلا کہ تم نے اسے مار دیا ہے۔ بلکہ اسے اپنے چہیتے سانپ کی غذا بنا دیا ہے۔ وہی سانپ جیسے تم نے تہ خانے میں چھپا رکھا ہے۔“

مدین اپنے اہل و عیال کے ہمراہ حضرت اسماعیل کے ساتھ ہی تقریباً 2000 سال قبل مسیح میں حضرت اسماعیل کے ساتھ ہی حجاز میں آباد ہو گئے۔ یہی خاندان آگے چل کر ایک بڑا قبیلہ بن گیا۔
حضرت شعیب علیہ السلام بھی اسی قبیلہ مدین سے تعلق رکھتے تھے اور اسی قوم کی اصلاح کے لیے آپ علیہ السلام کی طرف نبوت بھیجی گئی۔

مدین کا علاقہ نہایت سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ اس قوم نے قومی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے تجارت بھی شروع کر دی تھی لہذا خوش حالی ان کے قدم چوم رہی تھی۔

جب اس قوم پر صدیاں گزر گئیں تو وہ دین جنیف سے ہٹ گئے۔ انہوں نے جب اپنے ارد گرد دولت و ثروت کے انبار دیکھے باغوں کی زرخیزی اور شادابی کو دیکھا تو غرور میں مبتلا ہو گئے۔ اس خوش حالی کو اپنے دست و بازو کا کمال سمجھنے لگے۔ یہ بھول گئے کہ یہ سب کچھ خدائے تعالیٰ کی بخشش ہے۔ اسی لیے شکر گزار نہ ہو سکے اور ایک سرکش قوم بن گئے۔ اسی سرکشی نے ان میں طرح طرح کی بد اخلاقیات اور قسم قسم کے عیوب پیدا کر دیے۔

جب غیرت حق حرکت میں آئی تو سنت اللہ کے مطابق ان کو راہ حق دکھانے کے لیے انہی میں سے ایک ہستی کو چن لیا۔ یہ ہستی حضرت شعیب علیہ السلام کی ذات گرامی تھی۔

قرآن کریم میں مدین کے ساتھ ساتھ ایک اور قوم ”اصحاب الایکہ“ کا بھی ذکر کیا ہے یعنی جنگل والے۔ اس قوم کا ذکر بھی حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ آیا ہے۔

”مدین کی سمت ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔“
”جنگل والوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی جبکہ ان سے شعیب نے کہا کہ تم نہیں ڈرتے۔“

مفسرین اس بارے میں مختلف آراء رکھتے ہیں کہ مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی قبیلے کے دو نام ہیں یا دو جدا جدا قبیلے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ دونوں جدا جدا قبیلے تھے۔ مدین متمدن اور شہری قبیلہ تھا اور اصحاب الایکہ دیہاتی اور بدوی قبیلہ جو جنگل اور بن میں آباد تھا اس لیے اس کو بن والا یا جنگل والا کہا گیا۔

دوسرے مفسرین دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ وہو کی لطافت نہروں اور آبشاروں کی کثرت نے اس مقام کو اس قدر شاداب بنا دیا تھا اور اس قدر باغات تھے کہ اگر ایک شخص آبادی سے باہر کھڑے ہو کر نظارہ کرتا تھا تو اس کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ نہایت خوب صورت اور گھنے درختوں کا ایک جھنڈ ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے اس کو ”ایکہ“ کہہ کر متعارف کرایا۔

سید سلیمان ندوی کا یہ خیال ہے۔

”مدین اور ایکہ دو چیزیں ہیں کیونکہ ان دونوں قوموں کا حضرت شعیب علیہ السلام سے سوال و جواب، طرز خطاب اور پھر بربادی اور طریقہ بربادی بالکل مختلف ہے۔ اس بنا پر کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔“

ان کا خیال ہے حضرت قطورہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے دو ان بھی تھے۔ یہ ”اصحاب الایکہ“ انہی دو ان کی نسل سے تھے جو مدین کے فریب آباد ہوئے اور اصحاب الایکہ کہلائے۔ مدین اور ایکہ میں کوئی قریبی تعلق تھا اسی لیے دونوں قوموں پر ایک ہی پیغمبر (حضرت شعیب علیہ السلام) کی بعثت ہوئی۔

ان مفسرین میں سے حافظ عماد الدین ابن کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہاں ”ایکہ“ نام کا ایک درخت تھا۔ اہل قبیلہ چونکہ اس کی پرستش کرتے تھے لہذا اس کی نسبت سے ”مدین“ کو ”اصحاب الایکہ“ کہا گیا۔

مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی لکھتے ہیں۔

”مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی قبیلہ ہے جو باپ کی نسبت سے مدین کہلایا اور زمین کی طبعی اور جغرافیائی حیثیت سے ”اصحاب الایکہ“ کے لقب سے مشہور ہوا۔

دونوں قوموں کو ایک ہی سمجھا جائے یا الگ الگ اس سے فرق نہیں پڑتا لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام ان قوموں پر یہ طور نبی مبعوث ہوئے۔

”اور مدین کے پاس ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔“

علامہ میں سے چند کا کہنا یہ بھی ہے کہ حضرت شعیب (علیہ السلام)، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر تھے۔ اس کی بنیاد وہ قصہ ہے جو قرآن کے سورہ ”القصص“ میں بیان ہوا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں۔

”جب موسیٰ علیہ السلام نے مدین کا رخ کیا تو اس نے کہا۔ امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا اور جب وہ مدین کے کنوئیں پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں سے پوچھا ”تمہیں کیا پریشانی ہے؟“ انہوں نے کہا۔ ”ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتے اب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو نہ نکال لے جاتے اور ہمارے والد ایک بہت بوڑھے آدمی ہیں، یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔ پھر ایک سائے کی جگہ بیٹھا اور بولا۔ ”پروردگار، جو بھی خیر تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں۔“

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ”میرے والد آپ کو بلارہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے لیے جانوروں کو جو پانی پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دیں۔“ موسیٰ جب اس کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصہ اسے سنایا تو اس نے کہا۔ ”کچھ خوف نہ کرو۔ اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو۔“

ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا۔ ”ابا جان! اس شخص کو نوکر رکھ لیجیے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔ اس کے باپ نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری مرضی ہے۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ تم انشاء اللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے۔“

موسیٰ نے جواب دیا ”یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کر دوں اس کے بعد پھر کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو اور جو کچھ قول و قرار ہم کر رہے ہیں اللہ اس پر نگہبان ہے۔“

توریت میں بھی یہ قصہ تقریباً اسی طرح مذکور ہے۔

”موسیٰ فرعون کے حضور سے بھاگ کر ملک مدیان میں جا بسا۔ وہاں وہ ایک کنوئیں کے نزدیک بیٹھا تھا اور مدیان کے کاہن کی سات بیٹیاں تھیں۔ وہ آئیں اور پانی بھر کر گھڑوں میں ڈالنے لگیں تاکہ اپنے باپ کی بھیڑ بکریوں کو پلائیں اور چرواہے ان کو بھگانے لگے لیکن موسیٰ کھڑا ہو گیا اور اس نے ان کی مدد کی اور ان کی بھیڑ بکریوں کو پانی پلایا جب وہ اپنے باپ رعویل کے پاس لوٹیں تو اس نے پوچھا کہ آج تم اس قدر جلد کیسے آ گئیں۔ انہوں نے کہا ایک مصری نے ہم کو گڈرپوں کے ہاتھ سے بچایا اور ہمارے بدلے پانی بھر کر بھیڑ بکریوں کو پلایا۔ اس نے اپنی بیٹیوں سے کہا کہ وہ آدمی کہاں ہے۔ تم اسے کیوں چھوڑ آئیں۔ اسے بلا بلاؤ کہ روٹی کھائے اور موسیٰ اس شخص کے ساتھ رہنے کو راضی ہو گیا۔ تب اس نے اپنی بیٹی صفورہ، موسیٰ کو بیہاد دی۔“

توریت ہی میں یہ بیان ملتا ہے۔

”موسیٰ اپنے خسریترو کی جو مدیان کا کاہن تھا، بھیڑ بکریاں چراتا تھا۔“

قرآن کی عبارت میں صرف یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین آئے تو انہوں نے ایک بوڑھے شخص کی بیٹی سے شادی کی۔ اس شخص کا نام نہیں لیا گیا لیکن مفسرین نے مختلف قیاسات کو سامنے رکھتے ہوئے اور غالباً توریت کو سامنے رکھتے ہوئے بھی حضرت شعیب علیہ السلام کو آپ (موسیٰ علیہ السلام) کا خسر بتایا ہے۔

فرق اس سے بھی نہیں پڑتا کہ حضرت شعیب (علیہ السلام)، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر تھے یا نہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام پیغمبر تھے۔ قرآن اس کا گواہ ہے۔ اہل مدین سے تھے۔ ان کی قوم گمراہ تھی۔ ایک زمانہ گزر جانے کے بعد عاودہ شومو دھنسی قوموں کی طرح بت پرستی میں مبتلا ہو چکی تھی۔

یہ قوم بڑائیوں کی ایسی دلدل میں اتر چکی تھی جہاں اچھائی اور برائی کی تمیز ہی جاتی رہتی ہے۔ شرک و کفر میں ایسے مبتلا ہوئے تھے کہ درختوں، پتوں اور اہل قبور کی ارواح پاک کی ناپاک پوجا کرنے لگے تھے۔ بدعتی ان کے لہو کا حصہ بن گئی تھی انہوں نے دو قسم کے ترازو تیار کر رکھے تھے۔ ایک اشیاء لینے کے لیے دوسرا اشیاء دینے کے لیے یعنی جب تولتے تھے، کم تولتے تھے۔ اس پر بھی ان کی نیت نہیں بھرتی تھی۔ انہوں نے ڈاکازی کو اپنا پیشہ بنالیا تھا۔ سنان راستوں پر بیٹھ جاتے تھے اور گزرنے والوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اپنے اہل فعل پر نادم ہونے کے بجائے فخر کیا کرتے تھے اور ناپچے گاتے بستی میں داخل ہوتے تھے۔ بڑھا چڑھا کے اپنے کارنامے بیان کرتے تھے۔ جو لوٹ کا مال جتنا زیادہ لاتا اتنا ہی قابل تعریف سمجھا جاتا تھا۔ بستی میں کوئی نہیں تھا جو ملامت کی آواز اٹھاتا یا انہیں شرمندہ کرتا۔ سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

حضرت شعیب علیہ السلام اسی ماحول میں پلے بڑھے تھے لیکن آپ علیہ السلام نیک اور صالح تھے۔ کبھی بت پرستی کی طرف راغب

نہیں ہوئے تھے۔ اپنے ارد گرد ہونے والی برائیوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ دکھ اتنا بڑھ جاتا کہ آپ کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہنے لگتے۔ راتوں کو چھپ چھپ کر سجدے میں گر جاتے اور اپنی قوم کی بھلائی کے لیے دعا گو ہوتے۔

”اے میرے رب! میں اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ اپنی قوم کو برائی سے روکوں۔ اے اللہ! اگر ان پر تیرا غضب نازل ہوا تو یہ کبھی کے نہیں رہیں گے۔ یہ کچھ بھی ہیں میرے اپنے ہیں۔ تو ان کے دل بدل دے یا ان پر کوئی نئی مبعوث کر جو ان کی اصلاح کرے۔“

آپ اپنی قوم کے دکھ میں برسوں روتے رہے۔ جب موقع ملتا سمجھاتے بھی رہتے لیکن قوم ان برائیوں میں اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ آپ علیہ السلام کے دوست احباب بھی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ آپ علیہ السلام اس برے معاشرے میں تنہا رہ گئے تھے۔ ایک زوجہ اور بیٹیاں تھیں جو آپ کی دلداری کرتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھار آپ علیہ السلام بازار کی طرف جاتے تو کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ دیکھ آتے کہ توبہ کرتے ہوئے واپس آتے۔

ایک روز آپ علیہ السلام نے دیکھا کہ کچھ لوگ سامان سے لدا ہوا اونٹ بستی میں لے آئے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ لوٹ کا سامان ہے۔ لوگ اتنے دلیر تھے کہ خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔ ان کے نزدیک یہ بڑا کارنامہ تھا جو انہوں نے انجام دیا تھا۔ ان لٹیروں نے بازار میں کھڑے کھڑے سارا سامان وکانداروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔

کچھ دیر گزری تھی کہ ایک شخص روتا پیٹنا بستی میں داخل ہوا۔ اور اتفاق سے حضرت شعیب علیہ السلام ہی کے سامنے آیا اور فریاد کرنے لگا۔

”تم کیسے لوگ ہو۔ مسافروں کے سامان پر قبضہ کر لیتے ہو۔“

”بھائی کیا ہوا تیرے ساتھ؟“

”میں ایک قافلے کے ساتھ تھا۔ میرا اونٹ کمزور تھا، پیچھے رہ گیا۔ تمہاری بستی کے لوگوں نے مجھے مارا پیٹا اور میرا اونٹ یہاں لے آئے۔ تم بھی ضرور ان کے ساتھی ہو گے۔“

”اے بھائی، میرا قصور یہ ضرور ہے کہ میں اس بستی میں رہتا ہوں لیکن میں ان کا ساتھی نہیں۔“

”پھر مجھے بتاؤ، میں اپنا اونٹ کہاں تلاش کروں۔ کس کے پاس جاؤں؟“

”اب تو اپنے مال سے ہاتھ اٹھا لے اور جان بچا کر چلا جا۔ یہ لوگ تجھے بھی نقصان پہنچائیں گے۔“

حضرت شعیب علیہ السلام نے اسے مشورہ دیا لیکن وہ نہ مانا اور شور مچانے لگا۔ اس کی آواز سن کر لوگ جمع ہو گئے اور اسے پکڑ کر چند بڑے سرداروں میں سے ایک کے پاس لے گئے جو اس قسم کے فیصلے بڑی مہارت سے نمٹایا کرتا تھا۔ وہ بے چارہ یہ سمجھ کر چلا گیا کہ اسے انصاف ملے گا۔ حضرت شعیب علیہ السلام بھی اس کے ساتھ ساتھ چل دیے۔

اس شخص کو مجرموں کی طرح سردار کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ سردار نے تمام ماجرا سن کر عجیب منطق پیش کی۔

”جو شخص اپنے مال کی حفاظت نہ کر سکے اور الزام دوسروں پر رکھے وہ ہمارے قانون کے مطابق سزا کا مستحق ہے۔ اس شخص کو مار پیٹ کر بستی سے باہر نکال دو۔“

حضرت شعیب علیہ السلام نے کچھ کہنا چاہا تو سردار نے انہیں بھی خاموش کر دیا۔

”تم ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔ اگر ہم تمہارے کہنے پر چلے تو کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جائیں گے۔ جو ہم کر رہے ہیں ہمیں کرنے دو۔ ہم تمہارے خاندان سے ڈرتے ہیں ورنہ تمہیں بھی بستی سے نکال دیتے۔“

”کتنے نادان ہو تم لوگ کہ خدا سے نہیں ڈرتے اور میرے خاندان کی کثرت سے ڈرتے ہو۔“

آپ علیہ السلام کی ایک نہیں چلی اور لوگ اس شخص کو مارتے ہوئے عمارت سے باہر لے گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور بستی سے باہر پہنچ گئے۔ آپ علیہ السلام نے دیکھا وہ شخص زخموں سے چور بے حال زمین پر پڑا ہوا ہے۔ آپ علیہ السلام نے اسے سہارا دیا اور کسی نہ کسی طرح اپنے گھر تک لے آئے۔ اس کے زخم صاف کیے، مرہم پٹی کی اور اسے آرام سے لٹا دیا۔

بستی کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ حضرت شعیب علیہ السلام اس اجنبی کو اپنے گھر لے گئے ہیں تو کچھ شرارتی لوگ وہاں جمع ہو گئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ اس اجنبی شخص کو ان کے حوالے کیا جائے۔ آپ باہر نکل آئے اور ان سے التجا کرنے لگے کہ وہ شخص ابھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں۔ جیسے ہی وہ صحت مند ہوگا وہ اسے روانہ کر دیں گے۔ بڑی مشکل سے ان لوگوں کے منہ بند ہوئے اور وہ واپس چلے گئے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اسی رات سواری کے لیے اپنا گدھا اسے دیا اور رات کے اندھیرے میں اسے شاہراہ تک چھوڑ کر واپس آئے۔

حضرت شعیب علیہ السلام

اس رات بے چینی نے آپ علیہ السلام کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ رہ رہ کر اس اجنبی کا خیال آ رہا تھا جس کا مال بھی گیا اور بے عزت ہو کر واپس جانا پڑا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ اس اجنبی کا خیال ایسا آیا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ خیال پھر قوم کی برائیوں کی طرف چلا گیا۔ آپ کی ہچکی بندھ گئی۔ روتے روتے صبح ہو گئی کہ آپ علیہ السلام کی بیٹی صفورہ آپ علیہ السلام کے پاس آئیں۔

”ابا جان، آپ کیوں روتے ہیں؟“

”اس لیے کہ مجھے اپنی قوم سے محبت ہے اور وہ ایسی برائیوں میں پڑ رہی ہے جس کے بعد جہنم اس کا ٹھکانا ہوگا۔“

”ہمیں کسی سے کیا۔ ہم تو ٹھیک راہ پر ہیں۔“

”کل کو خدا مجھ سے بھی پوچھے گا کہ میں نے اپنے لوگوں کو روکا کیوں نہیں۔“

”یہ کام تو نبی کا ہوتا ہے۔ خدا ہم پر کوئی نبی کیوں نہیں اتار دیتا۔ آپ علیہ السلام برائی کو برائی سمجھتے ہیں یہی بہت ہے۔“

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ آپ علیہ السلام قوم کی حالت دیکھ دیکھ کر روتے رہے۔ آپ اتنا روئے کہ آپ کی پینٹاں زائل ہو گئی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جو ابھی پیغمبر نہیں بنے تھے مدین میں داخل ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک عرصہ تک شاہی تربیت میں بسر کرتے کرتے شباب کے دور میں داخل ہوئے تو نہایت قوی اور بہادر جوان نکلے۔ چہرے سے رعب ٹپکتا اور گفتگو سے ایک خاص وقار اور شان ظاہر ہوتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اسرائیلی ہیں اور مصری خاندان سے ان کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ بنی اسرائیل پر سخت مظالم ہو رہے ہیں اور وہ مصر میں نہایت ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ایک مرتبہ شہری آبادی سے باہر آپ علیہ السلام کسی طرف جا رہے تھے کہ دیکھا ایک مصری ایک اسرائیلی کو بیگار کے لیے گھسیٹ رہا ہے۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو آپ علیہ السلام کو مدد کے لیے پکارنے لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ٹھہر گئے اور مصری کو اس حرکت سے روکنے کی کوشش کی مگر مصری نہ مانا۔ آپ علیہ السلام نے غصے میں آ کر اس کو ایک طمانچا رسید کر دیا۔ مصری اس ضرب کو برداشت نہ کر سکا اور اسی وقت مر گیا۔

اس قتل کا چرچا ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے خوف سے مصر سے نکلے اور مدین آ گئے۔ یہ انتخاب آپ علیہ السلام نے اس لیے کیا تھا کہ یہ قبیلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نزدیک کی قربت رکھتا تھا۔

آپ علیہ السلام اتنی جلدی میں مصر سے نکلے تھے کہ نہ کوئی رفیق ساتھ تھا نہ زادراہ۔ طبری میں لکھا ہے کہ اس تمام سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خوراک درختوں کے پتوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھی اور برہنہ پا ہونے کی وجہ سے سفر کی طوالت نے پاؤں کے تلووں کی کھال تک اڑا دی تھی۔

جب آپ علیہ السلام مدین کی سرزمین میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کنویں کے سامنے پانی کے حوض پر بھیڑ لگی ہوئی ہے اور جانوروں کو پانی پلایا جا رہا ہے مگر کچھ فاصلے پر دو لڑکیاں کھڑی ہیں۔ ان کے ساتھ جو جانور ہیں وہ پانی دیکھ کر آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں، مگر لڑکیاں انہیں آگے بڑھنے سے روک رہی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان لڑکیوں پر رحم آیا۔ آپ علیہ السلام ان کے پاس گئے۔

”لڑکیو! تم کیوں پانی نہیں پلاتیں۔ پیچھے کیوں کھڑی ہو؟“

”کسے آگے بڑھیں۔ دیکھتے نہیں سرکشوں کی بھیڑ ہے۔ ہم آگے بڑھتے ہیں تو یہ ہمیں پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ روز ایسا ہی ہوتا ہے۔“

جب طاقتور لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا چکیں گے تو بچا کچھ پانی ہم اپنے جانوروں کو پلا دیں گے۔“

”تمہارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے جو جانوروں کو پانی پلائے؟“

”ہمارے والد نابینا ہیں۔ سب کام ہم پر آ پڑے ہیں۔“

”لاؤ میں پلاتا ہوں تمہارے جانوروں کو پانی۔ دیکھتا ہوں کون مجھے پیچھے ہٹاتا ہے۔“

”تمہیں کون ہٹائے گا تم تو یہاں جتنے ہیں، ان سب سے قوی ہو۔“ ان میں سے ایک لڑکی نے شوخی سے کہا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے کنویں پر پہنچ گئے اور کنویں کا بڑا ڈول جسے کئی لوگ مل کر کھینچتے تھے تنہا کھینچ کر لڑکیوں کے موبیشوں کو پانی پلا دیا۔ لوگوں کو ان کی قوت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چہرے پر اس وقت بلا کا غصہ بھی تھا لہذا کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ انہیں روکتا۔

ان لڑکیوں نے ان کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور موی شیوں کو لے کر گھر کی طرف چل دیں۔ حضرت موی علیہ السلام ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سنانے لگے۔ لڑکیاں وقت سے پہلے گھر پہنچ گئیں تو والد کو سخت تعجب ہوا۔

”آج اتنی جلدی کیسے آگئیں۔ کیا ان لوگوں نے تمہارے جانوروں کو جلدی پانی پینے دیا؟“

”وہ کہاں پینے دیتے تھے۔ وہ تو ایک مصری شخص وہاں آگیا۔ وہ اتنا طاقتور تھا کہ سب کو پیچھے ہٹا کر ہمارے جانوروں کو پانی پلا دیا۔“

”وہ شخص اب کہاں ہے؟“

”ہم تو اسے وہیں چھوڑ آئے تھے۔“

”جلدی جاؤ اور اس بھلے شخص کو یہاں بلا کر لاؤ۔“

ان دو میں سے ایک لڑکی تیزی سے کنویں پر پہنچی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ حضرت موی علیہ السلام اسے ایک درخت کے نیچے بیٹھنے پر آمادہ ہوئے۔

وہ لڑکی آپ علیہ السلام کے پاس پہنچی۔

”آپ ہمارے گھر چلیے۔ ہمارے والد نے آپ کو بلایا ہے۔ وہ آپ کو اس احسان کا بدلہ دیں گے جو آپ نے ہم پر کیا ہے۔“

حضرت موی علیہ السلام نے دل ہی دل میں کہا۔ ”پروردگار! اس وقت جو بھی بہتر سامان میرے لیے تو اپنی قدرت سے نازل کرے میں اس کا محتاج ہوں۔“

حضرت موی علیہ السلام اس لڑکی کے ساتھ چلتے ہوئے ایک مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ ایک نورانی صورت بزرگ ان کے منہ پر تھے۔ بعض مفسرین کے مطابق یہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے آپ سے مدین آنے کا سبب دریافت کیا تو آپ علیہ السلام نے تمام حالات سن و عن بیان کر دیے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے آپ کو تسلی دی اور فرمایا کہ خدا کا شکر کرو کہ اب تمہیں ظالموں کے پنجے سے نجات مل گئی۔ اب کوئی خوف کا مقام نہیں۔

جب حضرت موی علیہ السلام کھانے سے فراغت کے بعد آرام کرنے کے لیے لیٹے تو وہ لڑکی حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس آئی جو حضرت موی علیہ السلام کو بلانے کے لیے کنویں پر گئی تھی۔

”اگر آپ میری بات مانیں تو اس مہمان کو ملازم رکھ لیں۔ یہ شخص قوی بھی ہے اور امانت دار بھی۔“

”مجھے اس کی قوت و امانت کا حال کیسے معلوم؟“

”مہمان کی قوت کا اندازہ تو میں نے اس سے کیا کہ کنویں کا بڑا ڈول اس نے تنہا بھر کر کھینچ لیا اور امانت داری کی آزمائش اس طرح کی کہ جب میں اس کو بلانے گئی تو اس نے مجھے دیکھ کر آنکھیں پٹی کر لیں اور جب یہاں آنے لگا تو مجھ کو پیچھے چلنے کو کہا اور خود آگے آگے چلا اور میں نے صرف اشاروں ہی میں اس کی رہنمائی کی۔“

حضرت شعیب علیہ السلام نے بیٹی سے یہ باتیں سنیں تو بہت مسرور ہوئے اور حضرت موی علیہ السلام کو اپنے پاس طلب کر کے مطلب بیان کیا۔

”تمہیں اپنی حفاظت کے لیے ٹھکانا چاہیے اور مجھے ایک طاقتور نوکر کی ضرورت ہے تو کیوں نہ ہم اپنی حاجتیں آپس میں بدل لیں۔“

”مجھے خوشی ہوگی کہ اگر آپ جیسے بزرگ کی خدمت کروں۔“

”اگر تم آٹھ سال تک میرے پاس رہو اور میری بکریاں چراؤ تو اپنی بیٹی صفورہ کی تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں اور اگر تم اس مدت کو دو سال بڑھا کر دس سال کر دو تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی اس لڑکی کا مہر ہوگا۔“

حضرت موی علیہ السلام نے فرمایا۔ ”یہ میری خوشی پر چھوڑ دیجیے کہ میں ان دونوں مدتوں میں سے جس کو چاہوں پورا کر لوں۔ آپ علیہ السلام کی جانب سے مجھ پر اس بارے میں کوئی جبر نہ ہوگا۔“

طرفین کی اس باہمی رضامندی کے بعد بزرگ میزبان نے اس بیان کردہ مدت کو مہر قرار دے کر حضرت موی علیہ السلام کی شادی اپنی بیٹی سے کر دی اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مدت ختم ہونے پر عقد عمل میں آیا۔

حضرت موی علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرا نے لگے۔ اجرت کی مدت آپ علیہ السلام کے سامنے تھی۔

حضرت شعیب علیہ السلام

یہی وہ زمانہ ہے جب حضرت شعیب علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی۔ اب تک آپ علیہ السلام قوم کے غم میں آنسو بہاتے رہے تھے۔ اب آپ علیہ السلام کو حکم دیا جا رہا تھا کہ اٹھو اور اپنی قوم کے پاس جا۔

آپ علیہ السلام پہلے نبی ہیں جنہیں نابینائی میں نبوت سے نوازا گیا۔ گو بعد میں آپ کی بینائی لوٹا دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ کامل بارہ سال آپ دیکھنے سے محروم رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے پوچھا۔ ”اے شعیب! کیا تو جہنم کے خوف سے روتا ہے؟“

عرض کیا۔ ”تیری محبت میں روتا ہوں۔ جب تجھ کو دیکھ لوں گا تو مجھے کوئی پروا نہ ہوگی کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔“

اللہ نے بشارت دی کہ اے شعیب تجھ کو میری ملاقات مبارک ہو لہذا اسی وجہ سے میں نے موی بن عمران جو میرے ہم کلام ہیں وہ تجھ کو بطور خادم دے دیے ہیں۔“

یہ انکشاف ہوتے ہی حضرت شعیب علیہ السلام کی نظروں میں حضرت موی علیہ السلام کی وقعت بڑھ گئی۔ وہ جسے محض غلام سمجھتے رہے تھے اسے خدا اپنا ہم کلام کہہ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے عنقریب اسے یہ سعادت ملنے والی ہو۔

توریت کے مطابق اس گلہ بانی کے دور میں حضرت موی علیہ السلام کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جیرسون رکھا گیا۔

مدت اجارہ پوری ہوئی تو حضرت موی علیہ السلام نے مصر کو واپسی کی اجازت طلب کی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی روائی کے سال میں بکریوں نے جس قدر بچے دیے تھے ان کے حوالے کر دیے اور وہ اپنی بیوی اور اس ریوڑ کو لے کر چل پڑے۔ اس راستے میں وہ واقعہ پیش آیا کہ طور کی جانب آپ علیہ السلام نے آگ دیکھی۔ آپ علیہ السلام اس طرف گئے اور خدا سے ہم کلام ہوئے۔ آپ علیہ السلام نبوت سے سرفراز ہوئے اور حکم ہوا۔ ”ظالم فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ اور ان کو سمجھاؤ۔“

حضرت موی علیہ السلام دعوت تبلیغ کے لیے مصر کی جانب روانہ ہوئے اور حضرت شعیب علیہ السلام نے اہل مدین کو مخاطب کیا۔

”اے قوم! ایک خدا کی عبادت کرو۔ اس کے علاوہ کوئی پرستش کے قابل نہیں۔ خدا کو پوجو۔ اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ خدا کی جانب سے گواہی آچکی۔ خرید و فروخت میں ناپ تول کو پورا رکھو اور لوگوں کے ساتھ معاملات میں کھوٹ نہ کرو۔ کل تک ممکن ہے کہ تمہیں ان برائیوں کا حال معلوم نہ ہو مگر آج تمہارے پاس نشانی اور برہان آچکی۔ اب حق کو قبول کر لو اور باطل سے باز آ جاؤ۔“

یہ ایسی آواز تھی جو اہل مدین نے اس سے پہلے نہیں سنی تھی۔ اس پر انہیں بڑا تعجب ہوا کہ وہ جوان میں سب سے کمزور تھا اچانک ان کے سامنے آگیا ہے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا ہے۔

بات تعجب کی ضرورت تھی لیکن خطرے کی نہیں تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام ایسے با اثر نہیں تھے کہ لوگ ان کی باتیں غور سے سنتے اور ان پر عمل کرتے۔

”شعیب، تم کیا کہتے پھرتے ہو کہ نشانی اور برہان آگئی ہے۔ کس دلیل کی بات کرتے ہو۔ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔“

”مجھے تم پر رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ جو کچھ میں لایا ہوں وہی سچ ہے۔ تول اور ترازو کو پورا کرو اور لوگوں کو اشیا گھٹا کرنے دو اور زمین میں فساد نہ مچاؤ۔“

”اپنی نصیحتیں اپنے پاس رکھو۔ ہم تمہاری باتوں میں آنے والے نہیں۔“ لوگوں نے کہا اور ایک ایک کر کے آپ کے پاس سے ہٹ گئے۔ بھیڑ چھٹ گئی۔

مدت گزر گئی تھی لیکن کسی پر آپ علیہ السلام کی باتوں کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اب آپ نے ان مخلوق کا رخ کیا جہاں غریب اور کم حیثیت کے لوگ رہتے تھے۔ یہ تاجر پیشہ تو نہیں تھے لیکن شرک کی بیماری میں ضرور مبتلا تھے۔ درختوں اور پتوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں توحید کا درس دیا اور اخلاقی برائیوں سے باز رہنے کی تلقین کی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی باتوں کو مان لینے سے ان غریبوں کے مال و متاع کا نقصان نہیں ہوتا تھا، اس لیے بعض کمزور ہستیاں آپ پر ایمان لے آئیں اب حضرت شعیب علیہ السلام وعظ و تلقین کے لیے نکلتے تو یہ مٹھی بھر لوگ بھی آپ علیہ السلام کے ہمراہ ہوتے۔ آپ علیہ السلام کسی بلند ٹیلے پر کھڑے ہو جاتے اور قوم سے خطاب فرماتے۔

”خدا کی جانب سے گواہی آچکی۔ پیمانہ اور ترازو پورا کرو اور لوگوں کو ان کا حق کم نہ کرو اور ہر راستے پر دھکے نہ کھانا کرو اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو مت روکو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اللہ کے احسان کو یاد کرو۔ تم تعداد میں بہت تھوڑے تھے اس نے تم کو بڑھایا۔ تمہیں خوش حالی دی۔ اس کے شکر گزار بنو ورنہ مفسدین کے انجام سے تم واقف ہو۔ لوط کا زمانہ تم سے زیادہ دور نہیں۔ دیکھو اس کی قوم کے ساتھ کیا گزری میں بھی ڈرتا ہوں تمہیں کوئی عذاب نہ گھیر لے۔“

حضرت موی علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرا نے لگے۔ اجرت کی مدت آپ علیہ السلام کے سامنے تھی۔

تم میں کچھ لوگ تو جو پیغام دے کر میں بھیجا گیا ہوں، اس پر ایمان لا چکے ہیں اور بعض نہیں لائے تو اس وقت تک صبر کرو کہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔“

حضرت شعیب علیہ السلام بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ شیریں کلامی اور حسن خطابت میں نہایت ممتاز مقام رکھتے تھے۔ آپ علیہ السلام کی باتیں وقتی طور پر دلوں پر اثر انداز بھی ہوتی تھیں لیکن کچھ ہی دیر میں ان کے دلوں کی کجی ان پر غالب آ جاتی یا ایک کو دوسرا بہکا دیتا اور وہ کہتا تھے تھے۔

”تم پر تو جادو کیا گیا ہے۔ تم تو ہماری طرح آدمی ہو۔ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر سچے ہو تو آسمان سے ہم پر بادل کا ٹکڑا تو گرا دو۔“ یہ سراسر مذاق اڑانے والی باتیں تھیں۔ آپ علیہ السلام سب کچھ سنتے رہے اور صبر کرتے رہے۔ قوم کا یہ حال رہا کہ چند کمزور لوگوں کے سوا کسی نے پیغام حق پر کان نہیں دھرا۔ خود بھی اسی طرح بد اعمال رہے دوسروں کی راہ بھی مارتے رہے۔ راستوں میں بیٹھ جاتے اور جو کوئی حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر کی جانب جاتا نظر آتا تو اسے مارتے پیٹتے اور موقع لگ جاتا تو لوٹ بھی لیتے۔ اس کے باوجود آپ علیہ السلام رشد و ہدایت سے رک رہے تھے، نہ لوگوں نے آپ علیہ السلام کے پاس آنا جانا چھوڑا تھا۔ یہ بہت تھوڑے لوگ تھے لیکن سرداران قوم اس فکر میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اگر یہ تعداد بڑھ گئی تو ان کی سرداری خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ لوگ ہر ہونے والے جرم پر غنڈا ٹیکس وصول کرتے تھے۔ جب جرائم ہی نہیں ہوں گے تو ٹیکس کہاں سے وصول ہوگا۔ مدین کا تمام کاروبار ان سرداروں کے ہاتھوں میں تھا اور اب انہیں اپنی گدی خطرے میں پڑتی نظر آرہی تھی۔ بالآخر انہوں نے جو فیصلہ کیا وہ ان کے مزاجوں کے عین مطابق تھا۔ وہ یہی سوچ سکے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کا کوئی مطالبہ ہے جسے منوانے کے لیے انہوں نے یہ فساد کھڑا کیا ہے۔ اس زوال پذیر معاشرے میں کوئی اس کے سوا سوچ بھی کیا سکتا تھا۔

ایک دن یہ سردار ایک جگہ جمع ہوئے اور حضرت شعیب علیہ السلام کو بلا بھیجا۔ مقصد یہ تھا کہ انہیں دولت کا لالچ دے کر منہ بند رکھنے کا مشورہ دیا جائے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کو پیغام پہنچا تو اس وقت آپ علیہ السلام کے پاس ایک نہایت مسکین آدمی بیٹھا تھا جو لوگوں کے گھروں میں کام کر کے روزی کما تا تھا۔ وہ بھی ساتھ ہو گیا لیکن اسے سرداروں تک نہیں پہنچنے دیا گیا۔ بھلا ایسے گھٹیا لوگوں کا سرداروں سے کیا کام۔ وہ باہر بیٹھ گیا اور حضرت شعیب علیہ السلام تنہا سرداروں کے پاس گئے۔

”شعیب تمہاری تعلیمات کیا ہیں؟“

”میں کہتا ہوں ایک خدا کی پوجا کرو۔ جو اس کی مخلوقات ہیں ان کی پرستش چھوڑ دو۔“

”اور؟“

”اور یہ کہ ناپ تول میں کمی بیشی مت کرو۔ تم نے جو بات بنائے ہیں ان میں ہیرا پھری کرتے ہو۔ چیزیں فروخت کرتے ہوئے دوسرے باٹ استعمال کرتے ہو خریدتے وقت دوسرے۔“

”اور بھی کچھ فرماتا ہے یا بس؟“

”آتے جاتے مسافروں کو لوٹ لیتے ہو۔ ڈاکا زنی سے باز آ جاؤ۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنا کام کرتے رہو، ہمیں اپنا کام کرنے دو؟“

”میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ میں تو وہی کہتا ہوں جو میرا خدا مجھ سے کہلوانا چاہتا ہے۔“

”یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے شعیب۔ آپ تو اچھے خاصے عقل مند آدمی تھے۔ دراصل جو نماز آپ پڑھتے ہیں وہ آپ کو سکھاتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں یا ہم اپنے اموال میں سے اپنی مرضی سے کچھ نہ کریں۔ کیا زبردستی ہے کہ دنیوی معاملات میں بھی ہم آپ کی مرضی کے مطابق چلیں۔“

”میں تمہاری مخالفت میں تمہیں ان باتوں سے منع نہیں کرتا بلکہ اصلاح کا ارادہ رکھتا ہوں کیونکہ میں اپنے رب کی جانب سے واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی جانب سے بہترین رزق عطا فرمایا ہے جس سے تم بے بہرہ ہو۔ تو کیا میں تمہیں برائی میں پڑا رہنے دوں اور اپنی اصلاح کر لوں۔“

”شعیب، تم ہمارے ساتھ سودا طے کر لو۔ تمہیں اگر دولت درکار ہے تو اس کی ہمارے پاس کمی نہیں۔“

”خدا سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں تم سے اس کی اجرت نہیں مانگتا۔ میری اجرت صرف پروردگار عالم پر ہے۔ ناپ اور تول پورا کرو۔ ٹھیک ترازو سے تولو۔ لوگوں کے حق کو کم نہ کیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس سے ڈرو جس نے تم کو اور ہمیں قوموں کو پیدا کیا۔“

حضرت شعیب علیہ السلام

یہ باتیں ہوئی رہی تھیں کہ ایک سردار نہایت طیش کے عالم میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

”جب تم کوئی بات ماننے ہی کو تیار نہیں تو دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو کر رہے گی۔ یا ہم تم کو اور تم پر ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تم کو مجبور کر دیں گے کہ پھر ہمارے دین میں واپس آ جاؤ۔“

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اگر ہم تمہارے دین کو غلط اور باطل سمجھتے ہوں تب بھی زبردستی مان لیں۔ یہ تو بڑا ظلم ہے جبکہ ہم کو خدائے تعالیٰ نے تمہارے اس دین سے نجات دے دی تو پھر ہم اسی دین کی طرف لوٹ جائیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بول کر خدائے تعالیٰ پر بہتان باندھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہاں تمہیں چاہیے کہ باطل خیالات سے توبہ کرو۔ ایک رسول تم میں آچکا۔ تم پر حجت قائم ہو گئی۔ اب تمہارا کیا بہانہ ہوگا۔“

سرداروں نے آپ علیہ السلام کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد آپ علیہ السلام کو یہ باور کرا دیا کہ آج کے بعد سے کھلی جنگ ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر اپنے عزم کو دہرایا اور منصب نبوت کی رعایت سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”دیکھو، خدائے تعالیٰ نے مجھ کو اس لیے بھیجا ہے کہ میں اپنے مقدور بھرتہاری اصلاح کی سعی کروں اور میں جو کچھ کہتا ہوں اس کی صداقت اور سچائی کے لیے خدا کی حجت اور دلیل اور نشانی بھی پیش کر رہا ہوں۔ تم اس واضح حجت کو دیکھ کر بھی سرکشی و نافرمانی پر قائم ہو۔ میں اپنی اس رشد و ہدایت کے بدلے میں کوئی اجرت بھی نہیں مانگتا۔ میرا جزو اللہ کے پاس ہے اور اگر تم اب بھی نہ مانو گے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں خدا کا عذاب تم کو ہلاک نہ کر ڈالے۔“

آپ ان سرداروں سے رخصت ہوئے تو یہ دعا آپ کے ہونٹوں پر تھی۔

”اے پروردگار! تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق اور سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ تو ہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔“

قوم کے سرداروں نے قوم سے کہنا شروع کر دیا۔ ”اگر تم نے شعیب کا کہنا مانا تو تم ہلاک کر دیے جاؤ گے۔“

یہ فیصلہ صرف زبانی کلامی نہیں تھا۔ اس کا عملی مظاہرہ بھی ہوا۔ سب سے پہلے تو وہی غریب آدمی ہلاک کر دیا گیا جو حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ سرداروں سے ملنے چلا آیا تھا۔ اس کے بعد او بائیں لوگ ان کے پیچھے پڑ گئے جو حضرت شعیب علیہ السلام سے کسی طرح کا بھی تعلق رکھتے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی باقاعدہ نگرانی کی جانے لگی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان لوگوں کو منع کر دیا کہ وہ ان سے ملنے نہ آیا کریں خود بھی وعظ و تلقین بند کر کے گھر میں بیٹھ گئے اور خدا کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

کچھ دن تک کسی نے حضرت شعیب علیہ السلام کو نہیں دیکھا تو سرداروں کو فکر ستانے لگی کہ آخر ایسی کیا خفیہ سرگرمیاں ہیں جن میں حضرت شعیب علیہ السلام مبتلا ہیں۔ کہیں ہمارے خلاف کوئی اور کارروائی نہ کر رہے ہوں۔ وہ سب جمع ہو کر حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر پہنچے۔

”شعیب! کیا تیری نماز ہم سے یہ چاہتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے دیوتاؤں کو پوجنا چھوڑ دیں اور ہم کو اپنے مال و دولت میں یہ اختیار نہ دے کہ جس طرح چاہیں معاملہ کریں۔ اگر ہم کم تولنا چھوڑ دیں۔ لوگوں کے کاروبار میں کھوٹ نہ کریں تو ہم مفلس و قلاش ہو کر رہ جائیں۔ کیا ایسی تعلیم دینے میں تجھ کو کوئی متین اور سچا رہبر کہہ سکتا ہے؟“

حضرت شعیب علیہ السلام نے نہایت دل سوزی اور محبت کے ساتھ فرمایا۔ ”مجھے یہ خوف ہے کہ آپ علیہ السلام لوگوں کی یہ بے باکیاں اور خدا کے مقابلے میں نافرمانیاں کہیں تم لوگوں کا بھی وہی انجام نہ کر دیں جو تم سے پہلے قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح اور قوم لوط کا ہوا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ خدا کے سامنے جھک جاؤ اور اپنی بد کرداریوں کے لیے بخشش کے طلب گار بن جاؤ۔ میرا پروردگار رحم کرنے والا اور بہت ہی مہربان ہے۔ وہ تمہاری خطائیں ضرور بخش دے گا۔“

قوم کے سرداروں نے یہ سن کر جواب دیا۔ ”شعیب! ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ تو کیا کہتا ہے۔ تو ہم سب سے کمزور اور غریب ہے۔ اگر تیری باتیں سچی ہوتیں تو تیری زندگی ہم سے زیادہ اچھی ہوتی۔ ہم کو صرف تیرے خاندان کا خوف ہے ورنہ ہم کب کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے۔ تو ہرگز ہم پر غالب نہیں آ سکتا۔“

”کتنے افسوس کی بات ہے۔ تم میرے خاندان سے تو ڈرتے ہو لیکن خدا سے نہیں ڈرتے۔“

سرداروں نے بھڑک کر کہا۔ ”شعیب! ہم یہاں تیری باتیں سننے نہیں آئے تھے۔ تجھے سمجھانے آئے تھے کہ اپنی ہلاکت کو آواز نہ دے۔“

”اگر یہ بات ہے تو میں بھی تم سے کہتا ہوں۔ تم وہ سب کچھ کرتے رہو جو کر رہے ہو۔ عنقریب خدا کا فیصلہ بتا دے گا کہ عذاب کا مستحق کون ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔“

ان سرداروں نے چلتے چلتے پھر دھمکیاں دیں اور گھر سے نکل گئے۔

”اے اللہ! جلد ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔“
یہ دعا مقبول ہوئی۔ حکم الہی ہوا کہ شعیب اپنے ساتھیوں کو لے کر اس بستی سے نکل جاؤ۔ ہم تمہیں اور ان لوگوں کو جو تم پر ایمان لائے
ہیں بچالیں گے۔“

حضرت شعیب علیہ السلام کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کی قوم کس نوع کے عذاب میں مبتلا ہونے والی ہے۔ آپ علیہ السلام نے ان
چند لوگوں کو ساتھ لیا اور مدین سے نکلے گئے۔ بستی کے لوگوں نے دیکھا تو یہی سمجھے کہ آپ تنگ آ کر بستی چھوڑ رہے ہیں۔ وہ تو چاہتے ہی یہ
تھے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کسی طرح بستی چھوڑ کر چلے جائیں۔ ان کی تو جیسے مراد پوری ہو گئی۔ جن لوگوں نے آپ علیہ السلام کو بستی
سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا وہ دوڑتے ہوئے آئے اور سرداروں تک یہ بات پہنچائی۔ انہوں نے اس فرار کو اپنی کامیابی قرار دیا۔

”شعیب علیہ السلام عقل مند تھے کہ بستی چھوڑ کر چلے گئے ورنہ ہم تو انہیں سنگسار کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھے تھے۔“
ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہوانے چلنا چھوڑ دیا۔ سخت گرمی مسلط ہو گئی۔ یہ ایسی آفت تھی کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کچھ
لوگوں نے دے لفظوں میں کہا بھی کہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی بددعا کا اثر تو نہیں۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ انہیں راضی
کر کے لے آؤ لیکن سرداران قوم نے انہیں ڈانٹ دیا۔ نہیں جان سکتے تھے کہ اللہ کا عذاب سر پر آ گیا ہے۔

”اللہ نے ان پر پہلے تو سخت گرمی مسلط فرمائی اور سات دن مسلسل ان پر ہوا بند رکھی جس کی وجہ سے ان کو پانی اور سایہ بھی نفع نہیں
دے سکتا تھا۔ سرداران قوم ان کی کیا مدد کرتے۔ وہ تو خود اسی مشکل میں گرفتار تھے۔“

یہ لوگ اپنے محلوں سے بھاگ کر جنگل میں پہنچے تاکہ کچھ ہوا لگے۔ وہاں ان پر بادلوں نے سایہ کر لیا۔ تمام لوگ ان بادلوں کے نیچے
جمع ہو گئے۔ خوش تھے کہ گرمی اور دھوپ سے نجات ملے گی۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ موت انہیں ایک جگہ جمع کر رہی ہے۔

جب سب لوگ جمع ہو گئے تو بادلوں سے آگ کے شعلے برسنے لگے۔ پھر زمین ہلنے لگی۔ زلزلے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پھر آسمان
سے ایک چیخ آئی۔ اس کے شور سے ان کے کلیجے پھٹ گئے۔ سب اوندھے منہ گرے پڑے رہ گئے۔

فرمان الہی ہے۔ ”پھر وہ اپنے گھروں (یعنی علاقے) میں اوندھے منہ ہو گئے جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا۔ گویا وہ ان میں تھے
ہی نہیں۔ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی خسارہ اٹھانے والے ہوئے۔“

ایک تفسیر میں لکھا ہے کہ ان کو ایک زلزلے نے پکڑ لیا۔ اس کی وجہ سے وہ زمین میں دھنس گئے۔ زمین زلزلے کی زد میں آ گئی اور
ان کی روحیں ان کے جسموں کا ساتھ چھوڑ گئیں اور ان کے حیوانات بھی جمادات کی طرح ہو گئے۔ ان کے اجسام صرف ریت کے ڈھیر رہ
گئے جن میں کوئی حرکت نہ تھی اور نہ حواس تھے اور اللہ نے ان پر کئی اقسام کے عذاب جمع فرما دیے تھے اور کئی مصیبتوں اور ہلاکتوں کی
سورتیں ان پر اکٹھی کر دی تھیں اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ یہ بھی کئی قسم کے گناہوں کے ساتھ زندہ تھے تو اللہ نے ان پر آندھی بھیجی۔ اس نے
حرکتیں بند کر دیں اور چنگھاڑ بھیجی، اس نے آوازیں بند کر وادیں اور بادل بھیجے انہوں نے تمام اطراف سے آگ کے شعلے برسا دیے لہذا
اللہ نے جہاں بھی ان کے قصے کو بیان فرمایا وہیں کی مناسبت سے ان کے مختلف عذاب کو بیان فرمایا۔

کل تین طرح کے عذاب کا ان پر ذکر آیا ہے۔ زلزلہ، چنگھاڑ، آگ کے بادل۔

سورہ ہود میں ان کے متعلق چنگھاڑ کے عذاب کا حکم آیا جس کی وجہ سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے گر گئے۔ انہوں نے اپنے نبی کا
مذاق اڑایا تھا لہذا مناسب ہوا کہ ان کو ایسی ڈانٹ ڈپٹ کی جائے جو اس کے مطابق ہو تو اللہ نے اپنے فرشتے کے ذریعے ایک چیخ ان پر
لگوائی جس سے ان کے کلیجے تک پھٹ گئے اور اس بدکلامی کا مزہ مل گیا جو وہ حضرت شعیب علیہ السلام سے کرتے تھے۔

سورہ شعرا میں ہے کہ ان کو بادل کے عذاب نے آدو بچا۔ اس کا مطالبہ خود ان کی قوم نے کیا تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ آپ علیہ
السلام تو جادوگر ہیں۔ ہم تو آپ علیہ السلام کو بس جھوٹا گمان کرتے ہیں۔ اگر آپ علیہ السلام سچے ہیں تو بادل کا ایک ٹکڑا گرا دیجیے۔ وہ سمجھتے
تھے حضرت شعیب علیہ السلام ایسا بھی نہیں کر سکیں گے۔ لا جواب ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کے جواب میں حضرت شعیب علیہ السلام نے
فرمایا تھا ”میرا رب تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔“

اللہ نے ان کی خواہش کو پورا فرمایا۔

”پھر انہوں نے شعیب کو جھٹلایا تو ان کو سائبان کے دن کے عذاب نے پکڑ لیا۔ بے شک وہ بڑے دن کا عذاب ہے۔ بہر حال
اہل مدین تباہ و برباد ہو گئے۔ ان کا وہی حال ہوا جو ان سے پہلے آلِ نوح کا ہوا تھا۔“

ان سب امور کا خلاصہ قرآن کی زبانی یوں بیان ہوا ہے۔

”اور ہم نے (قبیلہ) مدین کی طرف اس کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے
کے لیے اٹھ گئے۔“

آپ علیہ السلام کچھ دن کے لیے دوسرے قبیلے ”ایکہ“ میں چلے گئے۔ اب حضرت شعیب علیہ السلام کی آواز وہاں کے بازاروں
میں گونج رہی تھی۔ پیغام وہی تھا جو آپ علیہ السلام نے مدین والوں کو دیا تھا۔

”میں تمہارا پیغمبر امین ہوں۔ خدا سے ڈرو اور میری بات مانو اور میں تم سے اس کی اجرت نہیں مانگتا۔ میری اجرت صرف
پروردگار عالم پر ہے۔ ناپ اور تول پورا کرو اور ٹوٹا دینے والوں میں سے نہ ہو اور ٹھیک ترازو سے تولو۔ لوگوں کے حق کو کم نہ کیا کرو اور زمین
میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس سے ڈرو جس نے تم کو اور پہلی قوموں کو پیدا کیا۔“

یہاں کے لوگ کچھ زیادہ ہی حد سے گزرنے والے ثابت ہوئے۔ وہ کھلم کھلا عذاب لانے کی فرمائش کرنے لگے۔

”اگر سچے ہو تو آسمان سے ہم پر بادل کا ٹکڑا تو گرا دو۔“

آپ علیہ السلام جدھر سے گزرتے یہی مطالبے کیے جاتے۔ آپ علیہ السلام پھر اپنے قبیلے ”مدین“ کی طرف آ گئے۔ یہاں
حالات پہلے سے بھی زیادہ ابتر تھے۔ اصحاب ایکہ کی طرح وہ بھی اب عذاب کی نوید سنانے کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ ان کا ایک ہی
مطالبہ تھا کہ یا تو عذاب لا کر دکھاؤ یا ہمارے دین میں شامل ہو جاؤ یعنی اصلاح کی خدمت چھوڑ دو۔

آپ علیہ السلام کا جواب یہی ہوتا۔ ”جب اللہ نے ہم کو تمہاری جھوٹی ملت سے نجات دے دی ہے اس کے باوجود بھی تمہاری
طرف لوٹیں گے تو یہ ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے۔ تمام کاموں میں اسی کی طرف ہمارا ٹھکانا اور وہی ہماری جائے پناہ ہے۔“

حضرت شعیب علیہ السلام قوم کے غم میں آنسو بہاتے تھے۔ انہیں ہر طرح سمجھانے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ کب سننے والے
تھے۔ پوری قوم اپنے کفر پر ڈٹی ہوئی تھی۔

آپ علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر ان پر رحمت قائم کی۔ انہیں سمجھایا۔

”اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آ کر کہیں ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ویسا ہی معاملہ پیش آ جائے جیسا قوم نوح کو یا قوم
ہود کو یا قوم صالح کو پیش آ چکا ہے۔“

اور پھر فرمایا۔ ”قوم لوط کا معاملہ تم سے کچھ دور نہیں ہے۔“

حضرت لوط علیہ السلام کی مثال آپ نے اس لیے دی کہ یہ نسبتاً قریب کے زمانے کی بات تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم اور اہل
مدین دونوں بڑی شاہراہ پر تھے۔

”اور لوط کی قوم اور مدین دونوں بڑی شاہراہ پر آباد تھیں۔“

دونوں کے افعال بھی کم و بیش یکساں تھے۔ دونوں قومیں ڈاکے اور راہ زنی میں طاق تھیں۔

اس روز حضرت شعیب علیہ السلام کے جلال کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ ہمیشہ نرمی سے بات کرنے والا دو ٹوک لہجے میں بات کر رہا تھا۔

”اے میری قوم! ذرا اس پر بھی غور کر کہ جن لوگوں نے خدا کی زمین پر فساد پھیلانے کا شیوہ اختیار کیا تھا ان کا انجام کس قدر عبرت
ناک ہوا اور اگر تم میں سے ایک جماعت مجھ پر ایمان لے آئی اور ایک جماعت ایمان نہیں لائی تو صرف اتنی ہی بات پر معاملہ ختم ہو جانے
والا نہیں بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کرو تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان آخری فیصلہ کر دے۔“

اس خطاب نے اہل مدین کے دلوں پر خوف سے کپکپی طاری کر دی۔ ایک دوسرے سے پوچھتے پھر رہے تھے کہ اس ”آخری فیصلے“
سے ان کا مطلب کیا تھا۔ وہ کس فیصلے کی بات کر رہے تھے۔

کفار آپ علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے تھے کیونکہ اس میں ان کا دنیاوی نقصان تھا لیکن اندر سے ڈرے ہوئے بھی تھے۔ سمجھتے
تھے کہ آپ علیہ السلام کی باتیں سچ پر مبنی ہیں لیکن عمل کرتے ہوئے کتراتے تھے۔ باپ دادا کا دین غالب آ جاتا تھا۔ جب کوئی خود کو
بدلنے پر تیار نہیں ہوتا تو چاہتا ہے کہ دوسرے کو بدل دے۔ یہی معاملہ اس قوم کے ساتھ پیش آ رہا تھا۔

مدین اور ایکہ میں خوف کی فضا طاری تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے خطاب مسلسل کسی عذاب کی خبر سن رہے تھے۔ سرداران
قوم یہ کہہ کر قوم کو تسلیاں دے رہے تھے کہ شعیب اپنی بات منوانے کے لیے ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی دھمکیوں میں
آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

”دیکھو اب بھی سنبھل جاؤ۔ جب اللہ کی پکڑ ہوگی تو سنبھلنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔“ حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو سمجھا
رہے تھے لیکن کوئی سننے کو تیار نہیں تھا۔

حضرت شعیب علیہ السلام جب اپنی قوم کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہو گئے تو ایک رات آپ علیہ السلام کے ہاتھ فیصلہ کن دعا
کے لیے اٹھ گئے۔

سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوش حال ہو (یعنی خدا نے تمہیں سب کچھ دے رکھا ہے) میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو سب پر چھا جائے گا اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔ اگر میرا کہا مانو تو جو کچھ اللہ کا دیا بیخ رہے اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے۔ اور دیکھو (میرا کام تو نصیحت کر دینا ہے) میں کچھ تم پر نگہبان نہیں۔ لوگوں نے کہا اے شعیب! کیا تیری یہ نمازیں تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آکر کہے، ان معبودوں کو چھوڑ دو جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے رہے ہیں یا یہ کہ ہمیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہیں کریں بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو۔

شعیب علیہ السلام نے کہا اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن رکھتا ہوں اور اس کے فضل و کرم کا یہ حال ہو کہ اچھی روزی عطا فرما رہا ہو (تو پھر بھی میں چپ رہوں اور تمہیں راہ حق کی طرف نہ بلاؤں) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس بات سے تمہیں روکتا ہوں اس سے تمہیں تو روکوں اور خود اس کے خلاف چلوں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس میں ہے اصلاح حال کی کوشش کروں۔ میرا کام بننا ہے تو اللہ کی مدد سے بننا ہے میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع ہوں اور اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آکر کہیں ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ایسا ہی معاملہ پیش آجائے جیسا قوم نوح کو یا قوم ہود کو یا قوم صالح کو پیش آچکا ہے اور قوم لوط کا معاملہ تم سے کچھ دور نہیں اور دیکھو اللہ سے معافی مانگو اور اس کی طرف لوٹ جاؤ۔ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت والا ہے، بڑی ہی محبت والا ہے۔

لوگوں نے کہا۔ ”اے شعیب علیہ السلام جو کچھ تم کہتے ہو اس میں اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہم لوگوں میں سے ایک کمزور آدمی ہو۔ اگر (تمہارے ساتھ) تمہاری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم ضرور تمہیں سنگسار کر دیتے۔ تمہاری ہمارے سامنے کوئی ہستی نہیں۔“

شعیب علیہ السلام نے کہا۔ ”اے میری قوم کے لوگو! کیا اللہ سے بڑھ کر تم پر میری برادری کا دباؤ ہوا اور اللہ تمہارے لیے کچھ نہ ہوا کہ اسے پیچھے ڈال دیا۔ جو تم کرتے ہو میرے پروردگار کے احاطہ علم سے باہر نہیں۔ اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ میں بھی اپنی جگہ سرگرم عمل ہوں۔ بہت جلد معلوم کر لو گے کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے گا اور کون فی الحقیقت جھوٹا ہے۔ انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں اور پھر جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آ پہنچا تو ایسا ہوا کہ ہم نے شعیب علیہ السلام کو اور ان کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا اور جو لوگ ظالم تھے انہیں ایک سخت آواز نے آچکڑا۔ بس جب صبح ہوئی تو اپنے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔“

۳۳۳

حضرت شعیب علیہ السلام عذاب آنے سے پہلے یہ کہتے ہوئے افسوس زدہ حالت میں چل دیے کہ اے قوم! بے شک میں نے تو اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا دیے تھے اور میں نے تمہارے لیے بہت خیر خواہی کی مگر تم نے میری ایک نہ سنی اور جو مجھ پر واجب تھا میں نے پورا کیا۔ میں نے تمہاری ہدایت میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن میری تمام کوششیں بیکار گئیں۔

پس جو ہوا سو ہوا۔ آج کے بعد میں تم پر افسوس نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ تم نے ہی نصیحت کو ٹھکرا دیا تھا اور رسوائی کے دن سے بے خوف ہو گئے تھے۔

اپنی قوم کے چھوڑنے کے بعد حضرت شعیب علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرت موت کے قریب آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں ایک قبر ہے جو زیارت گاہ خواص و عوام ہے۔ وہاں کے باشندوں میں مشہور ہے کہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر ہے۔

حضرت موت کے مشہور شہر ”شیون“ کے مغربی جانب ایک مقام ہے جس کو ”شیام“ کہتے ہیں۔ اس جگہ اگر کوئی مسافر وادی ابن علی کی راہ ہوتا ہوا شمال کی جانب چلے تو وادی کے بعد وہ جگہ آتی ہے جہاں یہ قبر ہے۔ یہاں مطلق کوئی آبادی نہیں۔ یہاں جو لوگ آتے ہیں وہ زیارت کے لیے آتے ہیں۔

وفات کے وقت آپ کی عمر مبارک 140 سال تھی۔ بعض مؤرخین نے 400 سال بھی درج کی ہے۔

قرآن پاک میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر مبارک سورہ اعراف، ہود، شعرا اور سورہ غلگبوت میں آیا ہے۔

آپ کو خطیب الانبیاء کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

قصص القرآن، قصص الانبیاء، ارض القرآن

ماخذات:



شاعمال

مختار آزاد

شامت کبھی دعوت دے کر نہیں بلائی جاتی بلکہ یہ تو بن بلائے مہمان کی طرح بلائے جان بن کر چلی آتی ہے۔ چاہے انسان کتنا ہی دامن بچائے وہ چمٹنے کے رستے نکال ہی لیتی ہے۔ وہ بھی نہ بیچ سکا، اگرچہ تدبیر کرتے کرتے اس کی عمر تمام ہو گئی مگر نتیجہ وہی صفر رہا... اسی لیے سفر کوئی بھی ہو سنبھل کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔

سطر بہ سطر جلد بازی کے عکار، پر تجس واقعات کا تسلسل

بھی ٹھیک ہوتا۔ فضائی سفر میں اس طرح ہو جاتا ہے مگر اس کے نتیجے میں جبری کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس سے تو وہ کھن چکر بن کر رہ گیا تھا۔

اگر پورٹ پر تاخیر سے پہنچنے والا کئی روز کا تھکا ماندہ جبری

ساری خرابی شروع ہوئی تھی اگر پورٹ پر چیکنگ کے غیر معمولی انتظامات اور سول ایوی ایشن سکیورٹی کے نئے قواعد کے تازہ تازہ نفاذ سے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ جہاز کی روانگی میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ بات یہیں تک رہتی، تب

پہلے ہی جھلایا ہوا تھا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ سے وہ تھک گیا تھا۔ اس کا جسم ٹھکن سے چور تھا۔ وہ جب ہوٹل سے اتر پورٹ کے لیے روانہ ہوا تو اسے دیر ہو چکی تھی مگر پھر بھی وہ راستے میں ہی پرواز کے طے شدہ وقت کے مطابق اپنا اگلا پروگرام ترتیب سے چکا تھا۔ جس کے تحت اسے ایک کنٹری چنچے ہی، گھر روانگی سے پہلے کلاسٹ کے دفتر جا کر سیکورٹی عملے کو سر بہ مہر فائل حوالے کرنا تھی اور پھر سیدھے گھر جا کر بستر پر ڈھیر ہونا تھا۔

جیری تو اتر پورٹ سے سیدھے گھر جانا چاہتا تھا مگر اس کے کلاسٹ کا حکم تھا کہ جیسے ہی پہنچے، گھر جانے سے پہلے تفتیشی فائل اس کے عملے کے حوالے کر دے۔ کلاسٹ تھا مس سحر خیزی کا عادی تھا اور اس کا دن صبح چار بجے شروع ہوتا تھا۔

تھامس اپنے اگلے دن کا آغاز فائل پڑھ کر کرنا چاہتا تھا۔ یہ حکم وہ اسے سر شام کو ہی سنا چکا تھا۔ جیری کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ بھاری فیس ایڈوانس لے چکا تھا۔ ویسے بھی اسے یقین تھا کہ آدھی رات کو جا کر سوئے گا تو صبح دس ساڑھے دس بجے تک ہی دفتر پہنچ پائے گا۔ اس لیے اس نے بھی مناسب سمجھا کہ فائل دیتا ہوا ہی جائے گا ورنہ فون کی کھٹی سونے نہیں دے گی مگر اتر پورٹ پہنچا تو سارا پروگرام دھڑے کا دھرا رہ گیا۔

پرواز میں منٹوں کی نہیں گھنٹوں کی تاخیر تھی۔

جیری کی عادت تھی کہ وہ ہر معاملے میں بہت جلد باز اور ضرورت سے زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اکثر ان عادتوں کی وجہ سے وہ مسائل کا شکار ہو جاتا تھا مگر پھر بھی اپنی عادت پر قائم و دائم تھا۔ اس دن اتر پورٹ کے لیے روانگی میں اس کی جلد بازی کی وجہ سے تاخیر ہوئی۔ چیک ان کے موقع پر اسے پتا چلا کہ پرواز میں تاخیر ہے، جس کی اطلاع اسے موبائل ایس ایم ایس پر دی گئی مگر وہ جلدی میں موبائل فون سوٹ کیس یا بریف کیس یا پھر کہیں اور رکھ کر بھول چکا تھا۔ فون کہاں رکھا ہے، اب کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر یہ یاد کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ویسے بھی جو ایس ایم ایس ملا تھا، اس کو پڑھنے کا وقت گزر چکا تھا۔ پرواز میں ٹکنگی خرابی کے باعث چار گھنٹوں کی تاخیر تھی۔ اس نے پرواز کی روانگی کا انتظار کرنے کے بجائے دوسری پرواز سے سفر کا فیصلہ کیا۔ وہ واپس باہر آیا اور مختلف فضائی کمپنیوں میں پروازوں کی معلومات حاصل کرتا رہا۔ آخر اسے ایک قریب ترین پرواز مل ہی گئی۔

پہلے سے طے شدہ پرواز میں تاخیر اور دوسری پرواز کے لیے ٹکٹ خریدنے کے لیے، ایک سے دوسرے لاؤنج میں سامان لیے لیے پھرنے کی وجہ سے وہ سخت ڈھنڈھنی تناؤ کا

شکار تھا۔ جیری کو شدید غصہ آ رہا تھا۔

جس وقت اس نے دوسری پرواز کا ٹکٹ خریدا، تب تک فلائٹ کی روانگی طے شدہ وقت کے مطابق تھی لیکن جب وہ چیک ان کے لیے پہنچا تو اس پرواز کی روانگی میں بھی کچھ تاخیر کا اعلان ہو رہا تھا۔ وہ فوراً انکوائری کاؤنٹر پر پہنچا۔ جہاں اسے بتایا گیا کہ پروازوں کی آمد میں رش کی وجہ سے اگلے پچاس منٹ تک اتر پورٹ کنٹرول ٹاور اڑان بھرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ بے چارہ کیا کر سکتا تھا۔ چیک ان کیا۔ بورڈنگ پاس تھا اور اپنا بریف کیس اور ہینڈ کیری پکڑے پکڑے بڑبڑاتا اور جھلاتا ہوا لاؤنج میں چلا آیا اور صوفے پر نیم دراز ہو گیا مگر اتنی چہل پہل میں وہ کیا خاک آرام کر سکتا تھا۔ پرواز کے انتظار میں پاؤں پٹختا رہا اور اپنے غصے سے اپنا ہی خون جلاتا رہا۔

جیری دوسری پرواز کی تاخیر کے ستم کو کافی دیر تک طبیعت پر جبر کر کے برداشت کرتا رہا۔ جب بورڈنگ کا اعلان ہوا تو وہ سمجھا کہ اس کی آزمائش ختم ہوئی مگر یہ اس کی خوش فہمی تھی۔

بورڈنگ کے لیے وہ تیزی سے اٹھا اور قطار میں لگ گیا۔ جس میں اس کا نمبر چوتھا تھا۔ اس کے آگے دو بوڑھے اور ایک جوان سال لڑکی اپنی باری کی منتظر تھی۔ جیری نے ایک ہاتھ میں بورڈنگ پاس اور بریف کیس پکڑا ہوا تھا تو دوسرے سے ہینڈ کیری کا ہینڈل تھام رکھا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ وہ ہی آزمائش سے صرف تین جوڑی جوتوں کی دوری پر تھا۔

جیسے ہی جیری کا نمبر آیا۔ اس نے کاؤنٹر کلرک کو بورڈنگ پاس تھمایا۔ اس کے ساتھ اتر پورٹ سیکورٹی کا اہلکار بھی کھڑا تھا جو مسافروں کے پاس موجود دستی سامان اور ان پر لگا سیکورٹی کلیئرنگ ٹیگ چیک کر رہا تھا۔ اس نے جیری کے سوٹ کیس کو غور سے دیکھا اور اسے سائڈ میں ہونے کو کہا۔ یہ سنتے ہی وہ پریشان ہو گیا مگر لاچار تھا۔ حکم پر عمل کے سوا کچھ اور اس کے بس میں نہیں تھا۔ جیری کے ہتے ہی اس کے پیچھے پانچویں نمبر پہ کھڑا مسافر آگے بڑھا، بورڈنگ پاس چیک کرایا اور دونوں خالی ہاتھ جھلاتا ہوا جہاز کی طرف بڑھ گیا۔

”کیا ہوا، کیا بات ہے؟“ جیری نے سائڈ میں ہوتے ہی اہلکار سے پوچھا۔ وہ ایک بار پھر سخت ڈھنڈھنی دباؤ میں تھا۔ ”یہ سوٹ کیس بڑا ہے، آپ اپنے ساتھ کیبن میں نہیں لے جاسکتے۔“ سیکورٹی اہلکار نے مہذبانہ انداز میں اسے مطلع کیا۔ یہ سنتے ہی اس کے پاؤں سے زمین ٹکل گئی۔

”مگر میں اسے جہاز میں ہی ساتھ لے کر...

”سوری سرائی“ جیری نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے ایک بار پھر سکون سے کہنا شروع کر دیا۔ ”آپ ضرور اسے اپنے ساتھ کیبن میں رکھ کر لائے ہوں گے مگر آج سے جو نئے سیکورٹی رولز لاگو ہوئے ہیں، ان کے تحت اتنا بڑا سوٹ کیس مسافر اپنے ساتھ اندر نہیں لے جاسکتے۔“ یہ کہہ کر وہ خواہواہ مسکرایا۔ ”امید ہے آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

اس کی بات سن کر جیری نے نئے رولز اور اس پر عملدرآمد کے لیے اہلکار کی چابکدستی پر سخت لعنت بھیجی مگر پھر اچانک اسے خوشامد سے کام نکالنے کی ترکیب سوچیں۔ ”دیکھیں سرائی! بورڈنگ شروع ہو چکی ہے، اب شاید وہ میرا سامان بگ نہ کریں۔ اس طرح تو میری پرواز رہ سکتی ہے، اگر آپ مہربانی کریں تو...“

”پریشان مت ہوں۔“ اس نے یہ سنتے ہی کہا۔ ”میں کاؤنٹر پر بات کرتا ہوں۔ خاص حالات میں آپ کا سامان بگ کیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی ان نئے رولز کی وجہ سے آج نہیں کل بھی ایسی گڑبڑ ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے واکی ٹاک پر کسی سے بات کی۔ ”مسٹر! آپ جلدی سے جائیے اور سوٹ کیس بگ کروائیں۔ پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔“

”مگر میری پرواز...“

”بالکل مس نہیں ہوگی، اگر آپ میری بات مانیں گے۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور انگلی سے اشارہ کیا۔ ”جلدی جائیے، کاؤنٹر پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔“ اس نے جیری کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

جیری سمجھ گیا کہ اب اس حکم پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ وہ ایک بار پھر ایک ہاتھ سے سوٹ کیس کو کھینچتے اور دوسرے سے بریف کیس تھامے، لاؤنج سے باہر بنے چیک ان کاؤنٹر کی طرف دوڑتا ہوا جا رہا تھا۔ اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ پرواز میں ہونے کا خوف، اوپر سے ٹھکن... اس کی سانس تیزی سے پھول رہی تھی۔

جیری بے ترتیب سانسوں کے ساتھ کاؤنٹر پر پہنچا۔ جلدی جلدی سوٹ کیس بگ کروایا اور جب وہ اسی طرح دوڑتا ہوا واپس لاؤنج میں پہنچا تو اس کے لیے اعلان ہو رہا تھا کہ فوراً بورڈنگ کاؤنٹر پر پہنچیں۔ جب وہ پھولی سانسوں اور ہانپتے کانپتے وجود کے ساتھ جہاز کے اندر داخل ہوا تو سارے مسافر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ وہ اس پرواز کا آخری مسافر تھا۔

دروازے پر کھڑی اتر ہوشس نے اس کا بورڈنگ پاس چیک کیا۔ ”جیری ہاپکن۔“ نام پڑھتے ہی وہ مسکرا دی۔ ”تاخیر سے آمد پر شکریہ۔“

اتر ہوشس نے اگرچہ بھرپور طنز کا وار کیا تھا مگر جیری اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ کچھ کہے بنا آگے بڑھ گیا۔ اب اسے اپنا بریف کیس کیبن میں رکھنا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے کیبن کی کھول کر دیکھ ڈالے مگر کسی میں بھی اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ اپنا بریف کیس رکھنا تو دور کی بات کم از کم ان کے پیچوں اٹکا سکے۔ ایک دوبار اس نے یہ کوشش کی بھی مگر بے سود۔

جہاز کے دروازے تو اس کے اندر داخل ہوتے ہی بند کیے جا چکے تھے۔ اب جہاز کو رن وے کی جانب دھکیلا جا رہا تھا۔ جیری کو ایک کے بعد دوسرے کیبن کو کھول کر اس کے اندر تاکا جھانک کر دیکھ کر ایک اتر ہوشس تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ ”سرائی! اپنی سیٹ پر بیٹھ کر حفاظتی بیلٹ باندھ۔“

سامنے ایک دوسری اتر ہوشس سفر کے آغاز پر مسافروں کو روایتی حفاظتی انتظامات کا غیر دلچسپ لیکچر پلا رہی تھی مگر اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔ سب اپنے آپ میں یا اپنے ہم سفر کے ساتھ خوش گپوں میں مشغول تھے۔ وہ بے چاری بھی یہ سب کچھ جانتی تھی مگر اس کے باوجود رپوٹ کی طرح رٹے رٹائے الفاظ دہراتے ہوئے اپنی ذمہ داری پوری کر رہی تھی۔

جیری نمبر چیک کرتا ہوا اپنی نشست کی طرف بڑھنے لگا۔ تین نشستوں کی قطار میں اس کی نشست درمیان کی تھی۔ وہ پھنس پھنسا کر موٹے سے مسافر کو اپنے وزن سے دھکیلتا ہوا، اپنی نشست کی طرف بڑھا، بیٹھ کر حفاظتی بیلٹ باندھی اور بریف کیس گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ اس کی دونوں کہنیاں بریف کیس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ہتھے پر تو اس کے دائیں بائیں کے پڑوسیوں کی موٹی موٹی کلائیوں براجمان تھیں۔ ابھی جہاز نے اڑان شروع ہی کی تھی کہ جیری کے خراٹوں نے اس کے پڑوسیوں کو بے چین کر دیا۔ ہتھے پر رکھی اُن پڑوسیوں کی کلائیوں اوپر انھیں اور خراٹوں سے پریشان پڑوسیوں نے اپنے ہاتھوں کو کانوں کی ڈھال بنالیا۔

جیری اُس وقت جو نیند جہاز میں پوری کر رہا تھا، پروگرام کے مطابق اسے اپنے گھر کے آرام دہ ماسٹر بیڈ پر لیٹ کر چین کی وہ نیند لینا تھی مگر کیا جائے کہ رات کے گیارہ بجے روانہ ہونے والی پرواز نے پونے ایک بجے اڑان شروع کی تھی۔ گھڑی اور کیلنڈر پر تاریخ بدل چکی تھی۔ گزرے کل کی تاریخ کے ٹکٹ پر اسے نئے دن کے پہلے گھنٹے میں جہاز کی

سیٹ پر بیٹھنا نصیب ہوا تھا..... جبری واقعی وہ بہت بری طرح تھک چکا تھا۔ اب بھی اگر وہ نہ سوتا تو شاید اس کی حالت مزید خراب ہو جاتی۔

ایسے عالم بدحواسی کا شکار تھکے ہارے مسافر سے کسی بھی حماقت کی توقع کی جاسکتی ہے وہ تو پھر بھی جبری تھا، جس سے اس طرح کے کارنامے اکثر و بیشتر سرزد ہوتے رہتے تھے۔ جبری جہاز میں پہنچ کر نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

گھنٹا بھر کی پرواز یا یوں کہہ لیں کہ جبری کی گھنٹا بھر کی نیند کے بعد جہاز نے اوہیرے ائر پورٹ پر لینڈ کیا۔ جہاز کے جھکوں سے اس کی آنکھ بھی کھل گئی۔ بریف کیس اس کی گود سے لڑھک کر نیچے پاؤں پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں مسلیں، جھک کر بریف کیس اٹھایا اور جیسے ہی دروازہ کھلنے کا اعلان ہوا وہ دھکم پیل کرتا ہوا قطار میں داخل ہو گیا۔ آگے نکلنے کی بے ہنگم کوشش میں اس کا بریف کیس آگے کھڑی ایک عورت کی ٹانگ سے بڑے زور سے ٹکرایا۔ اس نے غصے سے پلٹ کر دیکھا۔

”جلدی ہے تو پھر ایمر جنسی گیٹ استعمال کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس نے جبری کو گھورتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر اترنے کے منتظر، قریب کھڑے کئی مسافر معنی خیز انداز میں مسکرا دیے۔ جبری شرمسار ہو گیا اور اپنی خفت مٹانے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

اگر جبری کے پاس صرف دتی سامان ہوتا تو باہر نکلنے میں جلدی کی وجہ سمجھ آتی تھی لیکن اس نے اپنا سوٹ کیس بگ کرایا تھا۔ اب اسے کیا کہیے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مسافروں کا سامان جہاز سے اتار کر، کنویئر بیلٹ پر ڈال کر ان تک پہنچانے میں ابھی کچھ وقت لگے گا مگر پھر بھی وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ وہ جلد سے جلد جہاز سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ چاہے اس کے لیے اسے اپنے آگے کھڑے مسافروں کو کہنی مار کر ہی راستہ کیوں نہ بنانا پڑے مگر بڑا ہوا اس عورت کا جس کے انداز تحاطب اور مفید مشورے نے، اسے باہر نکلنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنے پر مجبور کر دیا۔

جبری کئی روز سے کام کے سلسلے میں اوہاما میں تھا اور اب شکاگو کے علاقے لیک کنسٹی میں واقع اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ وہ اپنی قانونی مشاورتی فرم چلاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ سرائرساں کے طور پر بھی اپنی خدمات سرانجام دیتا تھا۔ اس کے پاس اکثر ایسے میاں یا بیوی کی جاسوسی کے کیس آتے تھے، جنہیں ایک دوسرے کی وفاداری پر شک ہوتا تھا یا پھر وہ طلاق دینے کے لیے جواز کی

تلاش میں ٹھوس ثبوت کی فراہمی کے لیے اس کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جو کیس آتے تھے، وہ بھی زیادہ تر بے اعتباری، دھوکا بازی اور اسی طرح کے معاملات پر مشتمل ہوتے تھے۔

پچھلے تین چار دن سے وہ اوہاما میں ایک دھوکے بازی کے کیس کی سرائرساں کر رہا تھا۔ معاہدے کے مطابق یہ رات آخری تھی۔ خوش قسمتی سے اس نے اپنا کام کر لیا تھا اور تھامس کو بیوتوں اور تفتیش کی فائل دینے کے بعد یہ کیس بند ہو جاتا۔ تھامس شکاگو کے ایک بہت بڑے کاروبار کا مالک تھا۔ اس کے کئی پارٹنر تھے، ان میں سے ایک اوہاما میں مقیم تھا۔ تھامس کو شک تھا کہ وہ اس کے کاروبار کی طرز پر متوازی طور پر اپنا کاروبار شروع کر چکا ہے اور اب خفیہ طور پر اسے فروغ دے رہا ہے جس کی وجہ سے اس کے کاروبار اور آمدنی پر فرق پڑنے لگا تھا۔ تھامس کا خیال درست نکلا۔ جبری نے پتا چلا لیا تھا اور اب وہ کیس کی فائل اس تک پہنچا کر گہری نیند سونا چاہتا تھا۔

”براہو اس پرواز کی تاخیر کا، کمبخت ساری رات غارت ہو رہی ہے۔ اب تک تو مجھے اپنے بیڈ پر گہری نیند میں ہونا چاہیے تھا۔“ جبری نے گھڑی دیکھی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ وہ بیج لاؤنچ میں صوفے پر بیٹھا مسافروں کے سامان آنے کا منتظر تھا مگر وہاں دور دور تک فی الحال اس کے آثار نہیں تھے۔ جبری نے اکتاہٹ بھری جمائی لی اور صوفے کی پشت سے سرٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ دو منٹ سے کم وقت میں وہ ایک بار پھر سو چکا تھا۔

لاؤنچ میں دوسرے درجنوں مسافر بھی ٹرائی تھامے، سامان کی آمد کے منتظر تھے لیکن شاید ہی وہاں کوئی اور اپنے سامان کی آمد کا اتنے بے صبرے پن سے منتظر ہوتا جتنا کہ جبری خراٹے بھرنے سے پہلے تھا۔

تقریباً بیس منٹ تک وہ خراٹے بھرتا رہا۔ اچانک ایک جھٹکے سے اس نے آنکھیں کھولیں۔ کنویئر بیلٹ چل پڑا تھا۔ اسی کی زوردار گڑگڑاہٹ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ ایک بار پھر نیند کے دوران اس کا بریف کیس کھسک کر نیچے جا پڑا تھا۔ اس نے جھک کر بریف کیس اٹھایا اور آنکھیں مسلتے ہوئے اٹھ کر بیلٹ کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ سامان آنے لگا تھا۔ ”یہ رہا میرا سوٹ کیس۔“ اس نے خود کلامی کی اور جیسے ہی سوٹ کیس قریب آیا، لپک کر تھام لیا اور کھینچ کر اس کا ہینڈل باہر نکالا۔

یہ سیاہ چمڑے سے بنا عام سا سوٹ کیس تھا جسے کھینچنے

کے لیے اسٹیل کا چمکدار ہینڈل لگا ہوا تھا جس کا لاک ہٹا کر ذرا سا دباؤ تو وہ خود بخود اندر چلا جاتا تھا۔ عام طور پر مسافر اسی طرح کے سفری سوٹ کیس استعمال کرتے تھے۔ جبری نہایت احتیاط پسند تھا۔ اس نے سوٹ کیس کے ایک کونے پر چٹ بھی چسپاں کر رکھی تھی، جس پر اس کا نام اور پتا لکھا تھا۔ وہ اکثر دتی سامان لے کر سفر کرتا تھا۔ چٹ لگانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اگر کبھی وہ جہاز کے کمین میں سوٹ کیس بھول جائے تو فضائی کمپنی کا عملہ اسے بہ آسانی مالک تک پہنچا سکے۔ اس بار یہ پہلا موقع تھا کہ جبری کو سوٹ کیس بگ کروانا پڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سامان کی آمد میں صرف وقت اسے ضائع ہونے کے مترادف لگا۔

کچھ دیر بعد وہ ٹیکسی میں بیٹھا تھامس کے دفتر جا رہا تھا تاکہ سیکورٹی کے حوالے فائل کر سکے۔ فائل سوٹ کیس میں تھی۔ اس نے وقت بچانے کے لیے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی بریف کیس کھولا اور فائل نکال کر ہاتھ میں تھام لی۔ اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ تین بجے تک وہ گھر پہنچ جائے گا۔

☆☆☆

اوہیرے ائر پورٹ کے بیج لاؤنچ میں مسافروں کی بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ سارے مسافر جا چکے تھے۔ سیکورٹی عملہ بھی ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ صرف ایک شخص وہاں کھڑا تھا۔ گرے کلر کے قیمتی سوٹ میں ملبوس یہ ایڈی تھا۔ ایڈی بھی اسی پرواز سے پہنچا تھا جس میں جبری سوار تھا۔ وہ گہری نظروں سے کنویئر بیلٹ کو دیکھ رہا تھا جو ایک منٹ پہلے زودار جھٹکا لے کر بند ہو چکا تھا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ جو سامان آنا تھا، وہ آچکا۔

ایڈی کے سامنے کنویئر بیلٹ پر سیاہ چمڑے کا ایک سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ یہ بیگ بھی ہو بہو ویسا ہی تھا جیسا جبری یہاں سے لے کر نکلا تھا مگر مطمئن چہرہ، گنجبا اور پہلوانوں کی طرح کچھیم ایم ایڈی اپنا سوٹ کیس اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ اس کے سوٹ کیس جیسا تھا مگر اس کا نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا سوٹ کیس کہاں چلا گیا۔ لاؤنچ سے سارے مسافر جا چکے تھے۔ لمحہ بھر میں وہ ساری بات سمجھ گیا۔ اس کے سامنے جو سوٹ کیس تھا، اس کا مالک دانستہ یا نادانستگی میں اس کا سوٹ کیس لے جا چکا تھا اور اب یہ لاوارث سوٹ کیس اس کی وراثت میں آنے کا منتظر تھا۔ اس نے سوٹ کیس تھاما اور بڑے سکون سے چلتا ہوا کافی شاپ میں آ گیا۔ وہ اس وقت بری طرح پریشان ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود وہ حسب

مزاج بہ ظاہر بالکل مطمئن نظر آ رہا تھا۔

اندر پہنچ کر اس نے بلیک کافی کا آرڈر کیا۔ سوٹ کیس میز پر رکھا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے تین بجتے والے تھے۔ اچانک اس کی نظر سوٹ کیس کے کونے پر لگی چھوٹی سی چٹ پر پڑی۔ اس پر مالک کا نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔ ”اوہ جبری... تم نے میری رات ہی برباد نہیں کی میری پرواز بھی بس کروادی۔“ ایڈی کو گھنٹا بھر بعد اوہیرے ائر پورٹ سے نیویارک کی پرواز پکڑنا تھی۔

ایڈی نے اطمینان سے کافی پی۔ سوٹ کیس کے مالک کا نام اور پتا ملنے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ سوٹ کیس سے زیادہ دوری پر نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ دیر پہلے وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ کاؤنٹر پر جا کر اپنے سوٹ کیس کی کشدگی کی رپورٹ اور کلیم درج کروائے مگر کلیم میں کیا لکھوائے گا۔ سچ سن کر وہ الٹا اسے بے وقوف ٹھہرا لیں گے اور جھوٹ بولا تو سوٹ کیس ملے گا نیا مگر بالکل خالی۔ اسے تو اپنے سوٹ کیس میں رکھے سامان سے غرض تھی، سوٹ کیس سے نہیں۔

کافی پی کر اس نے اپنے سوٹ کیس کی چابی سے تالا کھولنے کی کوشش کی۔ لاک فوراً کھل گیا۔ اس میں نمبر اور مینوئل لاک دونوں تھے۔ سوٹ کیس کھولنے سے پہلے ایڈی حیران تھا کہ اس کے مالک نے ”نمبر لاک“ کیوں نہیں لگا یا مگر جیسے ہی اس نے سوٹ کیس کھولا، وہ اس کی وجہ بھی سمجھ گیا۔ اندر چند جوڑے ملے کپڑے، اضافی شیونگ بکٹ اور ہوٹل کے غسل خانہ سے اٹھائی گئی کچھ چیزیں تھیں۔ ”لعت ہو۔“ اس نے غصے سے کہا اور سوٹ کیس بند کر دیا۔

ایڈی نے جیب سے ایک کارڈ نکالا۔ اس کی پشت پر سوٹ کیس کے مالک کا نام اور پتا نوٹ کیا اور باہر نکلنے لگا۔ وہ ٹیکسی پکڑ کر جلد سے جلد لیک کنسٹی کے اس پتے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا سوٹ کیس لے جانے والا اب تک گھر پہنچ چکا ہوگا۔ ویسے بھی رات کے اس پہر چور بھی اپنے گھر کا راستہ لیتا ہے۔ ایڈی سیدھا اس کے گھر پہنچ کر، اپنا سوٹ کیس واپس لے کر دوبارہ ائر پورٹ پہنچنا چاہتا تھا تاکہ نیویارک کی پرواز پکڑ سکے مگر جب اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو پتا بتایا تو جواب سن کر اس کا دماغ جھک سے اڑ گیا۔ یہ جگہ ائر پورٹ سے چالیس میل دور، شکاگوئی کا مضافاتی علاقہ تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ فلائٹ میس ہوگئی۔ ایڈی کے لیے یہ اہم بات نہیں تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ سوٹ کیس واپس مل جائے۔ نیویارک کی فلائٹ تو دوسری بھی مل سکتی ہے مگر سوٹ

کیس... یہ خیال آتے ہی اس نے سر جھٹکا۔

”چلو۔“ وہ ٹیکسی ڈرائیور کو حکم دیتے ہوئے دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

”کوئی اور شارٹ کٹ نہیں ہے؟“ جیری نے بے تابی سے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ سامنے سڑک پر کوئی ٹریفک حادثہ ہو چکا تھا، جس کی وجہ سے سڑک بند تھی۔ ”کوئی اور راستہ نکالو۔“ اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ پونے تین بج رہے تھے۔

”ایک راستہ ہے مگر آٹھ کلومیٹر لمبا۔“

”وہی راستہ لے لو۔“ جیری نے پوری بات سنے بغیر کہا۔

”سوچ لو۔“ ڈرائیور نے ٹیکسی کو روک کر گھیر لگاتے ہوئے کہا۔ ”کل پبلک ٹرانسپورٹ مینجمنٹ آفس میں شکایت درج نہ کروادینا کہ ڈرائیور نے دھوکے سے لمبا راستہ لیا تاکہ کرایہ زیادہ وصول کر سکے۔“

”تم چلو، مجھے نہیں کرنی تمہاری شکایت۔ ویسے میں خود تم سے ایسا کرنے کو کہہ رہا ہوں۔“ جیری نے منہ بنا کر کہا بے تابی سے پہلو بدلا۔ ”اور ہاں، ڈرائیور اسپیڈ بکڑو، مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔“

”اوکے سرا“ سیاہ قام ڈرائیور نے ہنستے ہوئے ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

جیری نے تھامس کے دفتر پہنچ کر سیکورٹی عملے کے حوالے فائل کی اور واپس پلٹا، اس وقت رات کے سواتین بج رہے تھے۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہی اپنا ارادہ بدل دیا۔ پہلے تو وہ سوچ رہا تھا کہ گھر جا کر سکون سے سوئے گا مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ اگلے چالیس پچاس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے گھر پہنچا تو چار سو چار بج جائیں گے۔ اس نے غصے سے پاؤں زمین پر مارا۔ ”سارا دن میرے پلان ٹیل ہوتے رہے ہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک آئیڈیا آ گیا۔

چند کلومیٹر کے فاصلے پر اس کی کلاس فیلو اور بہت اچھی دوست کا فلیٹ تھا۔ ”رات اس کے ہاں رہتا ہوں اور صبح وہیں سے دفتر پہنچ جاؤں گا۔“ اس نے خود کلامی کی۔ ”ورنہ گھر جاتے جاتے توضیح ہو جائے گی۔“

کرشین اور جیری لاء کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ کافی عرصہ پہلے اس نے لاء کی پریکٹس چھوڑ کر ریڈیو پر موسیقی کے پروگرام پیش کرنا شروع کر دیے تھے۔ وہ کالج کے زمانے

سے اب تک بہت اچھے دوست تھے۔ جیری کو معلوم تھا کہ آج کل وہ ہر رات مقامی ایف ایم ریڈیو پر موسیقی کا پروگرام پیش کرتی تھی اور ڈھائی بجے تک گھر لوٹ آتی تھی۔ اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں تھا۔ وہ میلٹن ایونیو کے ایک اپارٹمنٹ میں تنہا رہتی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ”اب تک تو وہ گھر پہنچ گئی ہوگی۔“ جیری بڑبڑایا۔

دس منٹ بعد وہ کرشین کے اپارٹمنٹ کی ڈور ٹیل پر انگلی رکھ رہا تھا۔ کرشین نے دروازہ کھولا اور جیری کو ساز و سامان، ٹھکن زدہ چہرے اور ٹھکن آلود سوٹ میں دیکھ کر پریشان ہو گئی مگر جب کافی پیتے ہوئے اس نے اسے مختصر اپنی پتا سنائی تو وہ بھی اس سے ہمدردی جتانے لگی۔ ”تم بہت تھکے ہوئے ہو، میرے بیڈروم میں سو جاؤ۔ مجھے ابھی کچھ کام کرنا ہے۔ میں یہیں لاؤنج میں سو جاؤں گی۔“

کرشین کی بات سنتے ہی جیری صوفے سے اٹھا۔ ”ایک منٹ ٹھہرو۔“ کرشین نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بیڈروم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی۔ ”میں نے ٹراڈر اور ٹی شرٹ بیڈ پر رکھ دیا ہے، وہ پکمن لو اور یہ کپڑے اتار کر مجھے دے دو۔ استری کر کے یہیں رکھ دوں گی۔ صبح بدل لیتا۔“ ”بہت شکریہ کرشین۔“ اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا اور سونے کے لیے چل دیا۔ بیگ اس نے لاؤنج میں چھوڑ دیا اور بریف کیس ساتھ لے گیا۔ اس میں اس کی شیونگ کریم، ریزر، ٹوٹھ برش اور پیسٹ تھا۔ صبح تیار ہونے کے لیے اسے ان چیزوں کی ضرورت پڑتی۔

☆☆☆

پہنچنے سے پہلے ایڈی کو یقین تھا کہ شاید سوٹ کیس کا مالک لیک کنٹری کے کسی مہنگے علاقے میں واقع بڑے سے گھر میں رہتا ہوگا مگر اسے یہاں پہنچ کر مایوسی ہوئی۔ جیری کا ڈیننگ پیلس اپنے نام کے مطابق کوئی محل نما بنیگا نہیں بلکہ سڑک کنارے ایک بڑے سے شاپنگ سینٹر کے سامنے قطار میں بنے درجن بھر سے زائد چھوٹے گھروں میں سے ایک تھا۔ رات کے آخری پہر وہاں مکمل سناٹا طاری تھا۔

اس نے ٹیکسی چھوڑی اور سوٹ کیس تھامے ہوئے گھر کی طرف بڑھا۔ اسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ عام لوگوں کے اس وقت وہاں ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا، دور دور تک چوکیدار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دروازے پر پہنچا مگر وہ لاک تھا۔ بند تالے کھولنا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ چند لمحوں میں وہ جیری کے ڈیننگ پیلس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ اندر کی حالت بتا رہی تھی کہ اب تک

وہ گھر نہیں لوٹا تھا۔

ایڈی نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور اندر کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے کمرے کی لائٹس نہیں جلائی تھیں البتہ باہر کھمبے پر لگے بلب کی روشنی سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک کے پیچھے ایک بنے دو کمروں کا گھر تھا۔ پہلے کمرے کو اس نے دفتر کی شکل دے رکھی تھی۔ وہ بیگ لیے لیے دوسرا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ماسٹر بیڈروم خالی تھا۔ وہ واپس پہلے کمرے میں آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چاہتا تو کمرے کی لائٹس روشن کر سکتا تھا مگر اس نے باہر سے آنے والی روشنی پر ہی اتکا کیا۔ وہ یہ سب کچھ پہلی بار نہیں کر رہا تھا۔ اس طرح کے کاموں میں عمر بسر کی تھی۔ اس لیے وہ روایتی احتیاط پسندی کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

کافی دیر بعد ایڈی نے گھڑی پر نظر ڈالی، تین بج کر پینتیس منٹ ہو چکے تھے۔ ”شاید گھر لوٹتے ہوئے کسی ضروری کام سے کہیں رک گیا ہوگا۔“ اس نے دل میں سوچا مگر جب گھڑی چار کے ہندسے کو عبور کر گئی تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا مگر پھر بھی اس نے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے جیری کا منتظر تھا لیکن جب گھڑی نے صبح کے پانچ بجائے تو اس کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ وہ تڑپ کر اٹھا۔ ”مجھے اب کہیں اور اپنا سوٹ کیس تلاش کرنا ہوگا۔“ اس نے خود کلامی کی اور بے چینی سے اس کے دفتر کا پتا تلاش کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا ممکن ہے کہ وہ گھر آنے کے بجائے سیدھا اپنے دفتر پہنچا ہو اور رات ہونے کی وجہ سے وہیں رک گیا ہو۔ چند منٹ کی تلاش کے بعد اسے دفتر کا پتا مل ہی گیا۔

جیری ہاپکین

پروپرائٹر... بریکمن ایسوسی اٹس

15 ایڈورڈ پلازا، گراؤنڈ فلور، پارک ایونیو...

ایڈی نے جلدی جلدی ایڈریس پڑھا اور پھر سر تھام لیا۔ ”اوہ میرے خدا۔“ یہ پتا ادھر سے اتر پورٹ سے صرف پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ خوش قسمتی سے وہ شہر کے اس مہنگے ترین علاقے میں پہلے ایک دوبار جا چکا تھا۔ اس لیے اس جگہ سے کچھ شدید تھی۔ اب اسے واپس پلٹنا تھا۔

ایڈی نے سوٹ کیس تھاما اور نہایت سکون سے چلتا ہوا باہر آ گیا۔ ٹیکسی روکی، ڈرائیور کو پتا بتایا اور سفر شروع ہو گیا۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ یہ ظاہر بالکل مطمئن تھا۔ ویسے بھی وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ جو اس نے کھویا، وہ کسی اور نے کھو دیا ہوتا تو شاید دل کے دورے کے سبب اسپتال

حساب کتاب

تاریخ کی اہم اور نامور شخصیات کی طویل ترین عمریں

- 1۔ لقمان کی عمر..... 3500 سال
- 2۔ عوج بن عنق کی عمر..... 3300 سال یا بعض روایات کے مطابق 3600 سال
- 3۔ ذوالقرنین کی عمر..... 3000 سال
- 4۔ حضرت نوح، طہمورث اور اضحاک کی عمریں..... 1000 سال
- 5۔ قینان کی عمر..... 900 سال
- 6۔ مہلائیل کی عمر..... 800 سال
- 7۔ تفصیل بن عبداللہ کی عمر..... 700 سال
- 8۔ ربیعہ بن عمر عرف سح کاہن کی عمر..... 600 سال
- 9۔ حاکم عرب عامر بن ضرب، اور سام بن نوح کی عمر..... 500 سال
- 10۔ حرث بن مضاض جزیہی اور ارشد کی عمریں..... 400 سال
- 11۔ درید بن زید کی عمر..... 456 سال
- 12۔ حضرت سلمان فارسی اور عمر بن دوسی اور حرث بن ضیاص کی عمریں..... 400 سال
- 13۔ زہیر بن جناب بن عبداللہ کی عمر..... 430 سال
- 14۔ کعب بن حجر کی عمر..... 390 سال
- 15۔ نصر بن دھمان بن سلیمان کی عمر..... 390 سال
- 16۔ قیس بن ساعدہ کی عمر..... 380 سال
- 17۔ عمر بن ربیعہ کی عمر..... 333 سال
- 18۔ اکثم بن ضعی کی عمر..... 336 سال
- 19۔ عمر بن طفیل عدوانی..... 200 سال

مرسلہ: تفسیر عباس باہر، اوکاڑہ

میں ہوتا مگر وہ اب بھی مطمئن نظر آ رہا تھا۔

جس عمارت کے گراؤنڈ فلور پر جیری کی فرم کا دفتر تھا، وہ کئی منزلہ پلازا تھا۔ ایڈی نے کچھ فاصلے پر ٹیکسی چھوڑی اور پیدل عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ چھپ چھپا کر اندر داخل ہوتے وقت سیکورٹی کے روکے جانے کا تو امکان نہیں۔ عمارت کے گرد چھوٹی سی چار دیواری

تھی جس کے بعد پارکنگ تھی۔ اندر جانے اور باہر نکلنے کے لیے دو علیحدہ گیٹ تھے۔ ایک گیٹ کے ساتھ بنے چھوٹے سے کمرے میں روشنی تھی جبکہ باہر نکلنے والا گیٹ بالکل سناں تھا۔ صبح ہونے والی تھی مگر ماحول اب تک اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے آہستگی سے سوٹ کیس اندر پھینکا اور پھر چپ مار کر خود بھی چار دیواری پار کر گیا۔ وہ چند لمحے تک اندھیرے میں ڈبکا حالات کا جائزہ لیتا رہا اور پھر وہ سوٹ کیس تھاے آگے بڑھا۔ خوش قسمتی سے اسے سامنے ایک اور دروازہ نظر آ گیا۔ وہ اندر داخل ہوا اور کونے میں ہو کر اندر کی موجودگی کا اندازہ لگا تا رہا۔ اسے ویکویم کلیئر چلنے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے ذرا سی گردن باہر نکال کر جھانکا۔ ایک عورت فرش کی صفائی کر رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ دروازہ اسی نے کھولا ہوگا۔ وہ دائیں بائیں دروازوں پر نظر پڑا ڈالتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اس نے خود کو تسلی دے لی تھی کہ اتنی صبح صفائی کرنے والی عورت کو کیا پتا کہ کون کس دفتر کا مالک ہے یا وہاں کام کرتا ہے۔ ویسے بھی وہ شاندار مینجنگ سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ اگر وہ دیکھ بھی لیتی تو یہی سمجھتی کہ شاید دفتر کا مالک کہیں باہر سے لوٹا ہے اور گھر جانے کے بجائے سیدھا دفتر چلا آیا ہے۔ اب یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے سامنے سے گزرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ چند قدم آگے چلنے کے بعد دائیں ہاتھ پر مطلوبہ دفتر نظر آ گیا۔ ”بریکن ایسوسی ایٹس۔“

ایڈی نے سامنے دیکھا، صفائی کرنے والی عورت خاصی آگے بڑھ چکی تھی۔ اس نے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسے یہ سمجھنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا کہ دروازہ باہر سے لاک ہے۔ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا اور پھر کوئی چیز دیکھنے لگا۔ دو منٹ میں وہ اندر تھا۔ اس نے دروازہ لاک کیا۔ بلب روشن کیے۔ دفتر خالی تھا۔

”تو وہ یہاں بھی نہیں پہنچا۔“ ایڈی نے خود کلامی کی۔ دروازے کے ساتھ رکھے صوفے سے ٹیک لگا کر سوٹ کیس کھڑا کیا۔ روشنیاں بند کیں اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ نہایت مضبوط اعصاب کا مالک تھا مگر پچھلے چالیس گھنٹوں سے جاگ رہا تھا۔ اب وہ ایک لمحے کے لیے بھی مزید آنکھیں کھلی نہیں رکھ سکتا تھا۔ صوفے پر بیٹھنے کے دو منٹ کے اندر اندر وہ گہری نیند سوچکا تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو فرش پر چت لیٹا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی اس کے کانوں میں لوگوں کے چلنے پھرنے، باتیں کرنے، فونو کاپی مشینوں اور ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجنے کی آوازیں سنائی

دیں۔ ”میں کہاں ہوں؟“ اس نے اپنے اپنے دائیں بائیں نظریں گھمائیں۔ چند منٹ تو وہ کچھ سمجھ نہیں سکا کہ وہ کہاں ہے اور کس طرح وہاں پہنچا ہے مگر پھر اسے گزری رات کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی صبح کے دس بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے۔

روشنی سے آنے والی روشنی کے باعث کمرے کا منظر واضح تھا۔ یہ شاندار دفتر تھا جس کے ایک کونے پر چھوٹا سا دروازہ تھا۔ وہ اٹھا اور دروازہ کھولا۔ یہ ہاتھ روم تھا۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ بال درست کیے۔ اپنے کپڑے ٹھیک کیے اور پھر واپس آ گیا۔ سوٹ کیس صوفے کے ساتھ لگا تھا۔ اس نے سوٹ کیس کھینچا اور میز کے قریب دیوار سے لگا دیا اور بڑی سے میز کی دوسری طرف رکھی چڑے کی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ پشت سے اونچی اور چوڑائی میں غیر معمولی کرسی آرام دہ تو تھی ہی مگر اتنی بڑی تھی کہ اگر عقب سے کوئی اندر آتا تو فوراً یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اس پر کوئی بیٹھا ہے۔ ایڈی کا منہ دیوار اور پشت داخلی دروازے کی طرف تھی۔ کمرے کی لائٹس بہ دستور بند تھیں۔ چار پانچ گھنٹوں تک گہری نیند سونے کے بعد وہ اب اور بھی زیادہ مطمئن اور پرسکون نظر آ رہا تھا۔ یہ اور بات کہ اس وقت وہ شدت سے بلیک کافی کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اچانک کھٹکے کی آواز آئی۔ ایسا لگا جیسے کوئی دروازہ کھول رہا ہے۔ اس نے نظریں گھما کر پیچھے دیکھنے کے بجائے سامنے لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج کر اٹھائیس منٹ اور پچیس سیکنڈ ہو رہے تھے۔

کوئی اندر داخل ہوا۔ اس نے لائٹ جلائی اور جب وہ میز کے قریب پہنچا تو اس کی نظر ایڈی پر پڑی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں سیاہ چڑے کا سوٹ کیس تھا۔ اس شخص کا منہ ایڈی کی طرف تھا۔ وہ اجنبی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی لیکن اس نے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی اور دیکھے بنا سوٹ کیس دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اس کے برابر وہ سوٹ کیس تھا جو ایڈی نے لے کر یہاں پہنچا تھا۔ یہ جبری تھا، بریکن ایسوسی ایٹس کا مالک اور ایڈی کا مطلوبہ شخص۔

”آپ کی تعریف؟“ جبری اپنی سیٹ کی طرف بڑھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

”صبح ساڑھے دس بجے کا تمہارا ملاقاتی۔“ ایڈی نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

”مگر میری تو صبح ساڑھے دس بجے کی کوئی ملاقات طے

شدہ نہیں تھی اور... معاف کیجیے، آپ سے تو میرا تعارف بھی نہیں ہے۔“

”یہ ضروری نہیں۔“ ایڈی نے اپنے مخصوص انداز میں بے تاثر لہجے میں کہا۔ ”کچھ ملاقات تقدیر طے کرتی ہے، اگر آپ کو اس پر یقین ہو تو۔“

”تم کون ہو سکتے ہو؟“ جبری نے کپٹی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ ظاہر وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اصل میں وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اجنبی در انداز کون ہو سکتا ہے جو دروازے کا لاک کھول کر اندر داخل ہوا اور اتنے سکون سے اس کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی جسامت سے لگ رہا تھا کہ وہ ورلڈ ریسلنگ فیڈریشن کا کوئی اعلیٰ عہدیدار ہے۔ اس کا قیمتی سوٹ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی کنگنا نہیں مگر جس طرح وہ اندر داخل ہوا تھا، وہ حرکت اسے مشتبہ بنا رہی تھی مگر وہ یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اس سے خوفزدہ ہے۔ ”مجھے یاد نہیں آ رہا کہ تم کون ہو سکتے ہو۔“ تقریباً پندرہ بیس سیکنڈ کے بعد اس نے ایڈی کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔

”میں کوئی بھی ہو سکتا ہوں۔“ ایڈی نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ”کوئی بھی... پوپ... صدر امریکا... کوئی بہرہ دینا... کوئی بھی... مگر ایک بات یقین سے کہتا ہوں کہ میں وہ ہرگز نہیں جس کا نام سوٹ کیس کی چٹ پر لکھا ہوا ہے۔“ اس نے دیوار کے ساتھ لگے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پراسرار انداز میں جواب دیا۔

یہ سن کر جبری کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے سیدھے سادے انداز میں بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ”ایک منٹ... مجھے سوال ذرا بدل کر کرنے دو۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا۔ ”تم کون ہو اور اس وقت میرے دفتر میں کیا کر رہے ہو؟“ جبری نے سنبھل سنبھل کر بات مکمل کی۔

”میں یہاں اپنا سوٹ کیس لینے آیا ہوں۔“ اس بار ایڈی نے بھی سادہ سے سوال کا سادگی سے جواب دیا۔

”تمہارا سوٹ کیس؟“

”جی ہاں... میرا سوٹ کیس۔“ جبری اب تک سمجھ نہیں سکا تھا کہ اجنبی کس سوٹ کیس کی بات کر رہا ہے۔ ”ہم پہلے کبھی نہیں ملے، ایک دوسرے کو نہیں جانتے تو تمہارا سوٹ کیس میرے پاس کیسے... تم میرے دفتر کس طرح پہنچے؟“ اب وہ واقعی سخت حیران تھا۔

”تو کیا میں تمہیں احمق نظر آتا ہوں جو یہ کہہ رہا ہوں۔“ ایڈی نے تڑپ کر ذرا سخت لہجے میں کہا۔

﴿فائین ٹیجیزول﴾

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کے دینی معومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شافعی جاتی ہیں اس کا احتیاطی پابندی ہے لہذا جن صنفیات پر مذکور اور احادیث درج ہیں ان کی صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

”بالکل نہیں۔“ جبری نے جلدی سے کہا۔ وہ اس کے پہلوانی جیسے اور ممکنہ غصے سے گھبرا گیا تھا۔

”تم نے کل رات جلد بازی میں رپورٹ سے اپنے بجائے میرا سوٹ کیس اٹھالیا ہے۔“ اس بار اس کی آواز بھی قدرے اونچی تھی۔ ”تمہاری اس جلد بازی کی وجہ سے میں یہاں خوار ہو رہا ہوں۔“

”ایک منٹ...“ یہ سنتے ہی جبری نے کہا اور برابر میں نظر ڈالی جہاں کچھ دیر پہلے اس نے سوٹ کیس دیوار سے لگا کر کھڑا کیا تھا۔ ”حیرت انگیز۔“ اس نے زیر لب کہا۔ وہاں بالکل ایک جیسے دو سوٹ کیس کھڑے تھے۔ ”اوہ...“ یہ دیکھ کر اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”تو تمہارا مطلب ہے کہ ان میں سے...“

”ایک میرا ہے جو تم اٹھالائے تھے۔“ ایڈی نے اسے بات مکمل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

”اور تم نے میرا سوٹ کیس اٹھالیا۔“ جبری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”تم نے میرا سوٹ کیس اپنا سمجھ کر جلد بازی میں اٹھالیا تھا مگر میری مجبوری تھی۔“ ایڈی نے وضاحت کی۔

”تو وہ تم ہو سکتے ہو، جس نے میرا سوٹ کیس اٹھالیا تھا۔“ ایڈی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”میں بچ لاؤنج میں آخری مسافر تھا جو اس پرواز سے پہنچا، جس سے تم بھی آئے تھے مگر کوئی بھی اس سوٹ کیس کو ساتھ نہیں لے کر گیا۔ اس لیے میں نے اسے اٹھالیا اور پھر مجھے سارا قصہ سمجھ میں آ گیا کہ میرے سوٹ کیس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہوگا۔“

”حیرت انگیز۔“ جبری نے کہا۔ ”پھر تم نے کیا کیا؟“

”سوٹ کیس پر تمہارے نام اور گھر کے پتے کی چٹ لگی تھی اور پھر میں تمہارے گھر پہنچا مگر...“

”تو تم میرے گھر بھی ہو کر آ چکے ہو؟“ جبری کے لیے یہ بات انکشاف سے کم نہ تھی۔ اس نے کرسی پیچھے کھسکائی۔ میز کے نیچے ٹانگیں پھیلائیں اور پھر غیر محسوس... انداز میں درمیانی دراز کھول کر اس میں موجود اعداد و شمار یہ اڑتیں کا لوڈ پتول نکال

کر گود میں رکھ لیا۔ اب وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ اجنبی اس کے لیے خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ ”ایک بات بتاؤ... تم یہاں کیسے پہنچے، سوٹ کیس پر تو صرف میرے گھر کا پتہ درج تھا مگر...“
 ”یہ میرے لیے مشکل نہیں تھا۔“ ایڈی پہلی بار مسکرایا۔
 ”جب صبح پانچ بجے تک تم نہ لوٹے تو میں نے تلاش شروع کی اور دو منٹ میں ہی مجھے تمہاری فرم کا لیٹر پیڈل گیا، جس پر یہاں کا پتہ درج تھا۔“

”تم میرے گھر کا تالا توڑ کر یہ دیکھنے کے لیے اندر گھے کہ میں کہاں کام کرتا ہوں۔“ جیری نے حلقی سے کہا۔
 ”نہیں نہیں...“ ایڈی نے مداخلت کی۔ ”دراصل میں تمہارے گھر کا تالا کھول کر، اندر بیٹھ کر تمہارا انتظار کر رہا تھا مگر جب پانچ بج گئے تو مجھے یقین ہو گیا کہ شاید تم اپنے دفتر میں رک گئے ہو، اس لیے میں نے گھر کی تلاشی کا فیصلہ کیا مگر خوش قسمتی سے مجھے دو منٹ میں ہی تمہاری میز پر سے لیٹر پیڈل گیا تھا۔“ ایڈی نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔

”تو تم نے اور کیا کچھ دیکھا وہاں؟“
 ”کچھ خاص نہیں۔ بس تمہاری بینک اسٹیشنٹ اور دو چار کاغذات ہی دیکھ پایا تھا۔“ ایڈی نے مطمئن انداز میں ایسے جواب دیا جیسے کوئی خاص بات نہیں تھی۔
 ”تو تم نے میری بینک اسٹیشنٹ بھی پڑھی ہوگی؟“
 ”ہاں۔“ ایڈی نے سادگی سے کہا۔

یہ سن کر جیری کا ماتھا ٹھنکا۔ پستول پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ ”تو یہ اجنبی شخص جان چکا ہے کہ میرے پاس بینک میں کتنا پیسا ہے۔ کہیں یہ مجھے لوٹے تو نہیں آیا۔“ اس نے دل میں سوچا۔ اس نے سامنے نظر ڈالی۔ ایڈی بے فکرانہ طور پر بڑے مزے سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ اس کا اطمینان دیکھ کر جیری کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اسے اجنبی سے پیچھا چھڑانے میں ہی عافیت نظر آئی۔

”سنو...“ جیری نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔
 ”بہتر ہے کہ ہم اپنا اپنا سوٹ کیس لیں۔ پھر تم اپنے راستے اور میں اپنے دفتر میں۔“
 ”بالکل ٹھیک۔“ ایڈی نے چمک کر کہا۔ ”مگر ایک بات ہے؟“
 ”وہ کیا؟“

”میں اپنا سوٹ کیس لے جانے سے پہلے کھول کر چیک کرنا چاہوں گا اور چاہو تو تم بھی ایسا کر لو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر...“
 ”اب مگر کیا؟“ جیری نے زنج ہو کر اس کی بات کا نچ

ہوئے پوچھا۔

”میں پہلے اپنا سوٹ کیس کھول کر چیک کروں گا۔“
 ”تو تم سمجھ رہے ہو کہ میں نے اس کی تلاشی لی ہے۔“ یہ سن کر جیری کا منہ بن گیا تھا۔ اسے ایڈی کی بات سے اپنی ہلک محسوس ہوئی تھی۔

”مانیڈ کرنے کی ضرورت نہیں، ایسا ہو جاتا ہے۔“ ایڈی نے بھی اس کے لہجے سے ناراضی کو محسوس کر لیا تھا۔
 ”کیا ہو جاتا ہے؟“ جیری بہ دستور ناراض نظر آ رہا تھا۔
 ”جب کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ اس کے پاس موجود سوٹ کیس اس کا نہیں تو وہ اسے کھول کر دیکھ سکتا ہے۔ یہ تو معمولی سی بات ہے۔“ ایڈی نے اس کی ناراضی دور کرنے کے لیے بے فکری سے وضاحت کی۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ تم ایسا کر چکے ہو؟“ جیری نے چونک کر کہا۔

”یقیناً، میں نے ابھی تو تم سے کہا تھا نا کہ یہ تو معمولی سی بات ہے۔“

”تو تم نے میرے سوٹ کیس کو کھولا، سامان کی تلاشی لی؟“

”کھولنے کی حد تک درست ہے، البتہ تلاشی نہیں لی تھی۔ بس... یونہی دیکھا تھا چیزوں کو ذرا سا الٹ پلٹ کر۔“

”بہت گھٹیا حرکت...“
 ”ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم نے یہ گھٹیا حرکت نہیں کی ہوگی۔“

”نہیں کی...“ جیری نے تڑپ کر کہا۔
 ”تو تم نے میرا سوٹ کیس کھول کر نہیں دیکھا؟“

”نہیں دیکھا۔“ جیری نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور میں دیکھتا بھی کیوں... میں اب سے کچھ دیر پہلے تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ میرا سوٹ کیس ہے۔“

یہ کہہ کر وہ رکا اور چند سیکنڈ کے توقف کے بعد ایڈی کے چہرے پر اپنی نظریں گڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”کل رات پرواز پر بگ کروانے کے بعد سے اب تک مجھے سوٹ کیس کھولنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ ویسے بھی یہ تو مجھے ابھی پتا چلا ہے کہ جسے میں اپنا سمجھ رہا تھا وہ دراصل تمہارا سوٹ کیس ہے... سمجھے۔“

ایڈی اس کے چہرے کے تاثرات کو بہ غور دیکھتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ آیا وہ سچ بول رہا ہے یا صرف خود کو پاراسا ثابت کرنے کے لیے گواہ کر رہا ہے۔

”ویسے ایک بات اور...“ جیری بہ دستور غصے میں نظر آ رہا تھا۔ ”مجھے آپ کی حرکت بالکل پسند نہیں آئی۔ سوٹ کیس کے اندر کیا ہے، یہ میرا انتہائی ذاتی اور خفیہ معاملہ ہے جسے قانونی تحفظ بھی حاصل ہے۔ تم نے میری پرائیویسی میں دخل اندازی کی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا دل کر رہا تھا اجنبی در انداز کو اس کے سوٹ کیس سمیت دھکے مارتے ہوئے دفتر سے باہر نکال دے مگر مجبوری یہ تھی کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا۔
 ”سوری...“ جیری دل کی بھڑاس نکال کر خاموش ہوا تو ایڈی نے اطمینان سے کہا۔ ”جو کچھ ہوا غلط فہمی میں ہوا۔ ویسے یہ میرا وعدہ ہے کہ کبھی کسی کو یہ بات نہیں بتاؤں گا کہ تمہارے سوٹ کیس میں کیا کچھ تھا۔“

”اس میں میری قانونی دستاویزات تھیں۔“ جیری نے اپنی بھڑاس نکالنے کا ایک اور نکتہ تلاش کر لیا۔ ”یہ ایک قانونی مشاورت کی فرم ہے۔ وہ قانونی دستاویزات نہایت خفیہ تھیں مگر تم نے...“ جیری نے بات ادھوری چھوڑ کر دوسری طرف منہ کر لیا۔ ”تم نے مجھ سمیت کئی لوگوں کے پرائیویسی کے حق کو پامال کیا ہے۔ وہ دستاویزات میرے پاس اُن کی امانت ہیں۔“ کچھ توقف کے بعد اس نے لہجے کو مزید گھبرایا اور سرد بناتے ہوئے کہا۔ وہ چاہتا تھا کہ اجنبی سمجھ لے کہ میں اس سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوں۔ مگر وہ یہ بات نہیں جانتا تھا کہ اس کے مقابل بھی گھاگ شکاری بیٹھا تھا۔

”جو کچھ تم نے مجھ سے کہا، اُن سب باتوں کا سو فیصدی اطلاق تم پر بھی ہوتا ہے۔“ ایڈی نے سکون سے جواب دیا۔ ”میرا سوٹ کیس تمہاری تحویل میں تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ تم نے بھی اسے کھول کر، اُس میں موجود سامان کو ملٹ کیا ہوگا۔“
 ”پھر وہی سوٹ کیس...“ جیری نے تلملا کر کہا۔ ”میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔“

”تو پھر کیوں تلملا رہے ہو؟“ ایڈی نے فوراً لقمہ دیا اور تجویز پیش کی۔ ”ہم دونوں اپنے اپنے سوٹ کیس کھول کر دیکھتے ہیں۔ اپنی تسلی کرتے ہیں کہ سب کچھ موجود ہے۔ پھر اپنا اپنا سوٹ کیس تھامتے ہیں اور ہاتھ ملا کر میں اپنے راستے...“
 ”تو جاؤ اپنے راستے۔“ جیری نے قطع کلامی کرتے ہوئے اُس کا جملہ از خود مکمل کر دیا۔
 ”مگر میرا سوٹ کیس...“

اب تک تو جیری اس کی باتوں سے پریشان تھا لیکن اچانک اس کے دماغ نے پلٹا کھایا۔ ایڈی سوٹ کیس کھویا تھا مگر اب تک وہ کہیں سے بھی پریشان نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ رات بھر سوٹ کیس کے چکر میں خوار ہونے والا

موٹا ایڈی اتنا پرسکون کیوں نظر آ رہا ہے۔ ”میں نے کل رات ہی تمہارا سوٹ کیس کھول کر دیکھ لیا تھا۔“ اس کا اطمینان دیکھ کر جیری نے ایک چال چلنے کا فیصلہ کیا۔
 ”کیا مطلب۔“ ایڈی نے اطمینان بھرے لہجے لیکن ناراض انداز میں کہا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے تو تم کہہ رہے کہ میرا سوٹ کیس...“

”کھول کر نہیں دیکھا تھا۔“ جیری نے قطع کلامی کی۔ ”سوری! میں نے جھوٹ بولا تھا۔“ اس نے اپنے لہجے سے ندامت کا تاثر دینے کی کوشش کی۔ ”مجھے امید ہے کہ تم محسوس نہیں کرو گے۔“ اس نے سر کو نیچے جھکاتے ہوئے کہا۔ وہ ایڈی کو تاثر دینا چاہتا تھا کہ بہت شرمندہ ہے مگر حقیقت میں وہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پستول کا سیلفی لاک ہٹا ہوا ہے یا نہیں۔

”تو تم نے میرے سوٹ کیس کے ساتھ کیا کرنے کا سوچا تھا؟“ ایڈی کی آواز میں ترشی آگئی تھی۔
 ”کچھ نہیں۔“ جیری نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔ ”بس میں چاہتا تھا کہ تمہیں فون کروں گا اور یہ سوٹ کیس تمہارے حوالے کر کے اپنا سوٹ کیس لے لوں گا۔“
 ”مگر میرے سوٹ کیس پر میرا فون نمبر نہیں۔“
 ”مگر نام تو ہے۔“ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ لہجہ قہر پر ای ڈی لکھا ہوا تھا۔

”وہ میرا پورا نام نہیں۔“ ایڈی نے نکتہ اٹھایا۔
 ”یہ قانونی فرم ہے اور میں اسے چلاتا ہوں۔“ جیری نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ کسی شخص کا فون نمبر کیسے تلاش کیا جاسکتا ہے۔“ جیری نے صاف صاف کہنے کے بجائے گول مول جواب دیا۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ تمہارے پاس اس طرح کے وسائل ہیں۔“ ایڈی نے یہ سن کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔
 ”ہونا چاہئیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں پرائیویٹ سرائرساں بھی ہوں۔ سرائخ ڈھونڈنا میرے بائیس ہاتھ کا کھیل ہے۔“
 ”یقیناً، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ایڈی نے پھر اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سوچ رہے تھے کہ دیکھیں اب آگے کیا ہوتا ہے۔ کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔
 ”میں تمہیں فون ضرور کرتا۔“ آخر جیری نے سکوت توڑا۔

”میں بھی تمہیں فون ضرور کرتا۔“ ایڈی نے بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”میرے سوٹ کیس پر میرا نام اور پتا درج ہے۔“ کچھ دیر کے توقف کے بعد جیری نے کہنا شروع کیا۔ ”اب تم یہاں بیٹھے میرا منہ کیا تک رہے ہو، جاؤ جا کر اپنا سوٹ کیس اٹھاؤ اور چلتے بنو۔“

”لے جانے سے پہلے سوٹ کیس چیک کرنا ضروری ہے۔“ ایڈی نے کہا۔ ”تم تیار ہو؟“ یہ کہہ کر اس نے جیری کی طرف دیکھا مگر وہ خاموش تھا۔ ”تمہارے بقول تم نے سوٹ کیس کھولا تھا۔ تمہیں کچھ یاد ہے، اس میں کیا کچھ تھا؟“ ایڈی نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اب ضروری نہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں بات کی جائے۔“ جیری نے گول مول جواب دیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے سوٹ کیس کھولا ہی نہیں تھا۔ وہ تو اندھیرے میں تیر چلا کر یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس میں کیا ہو سکتا تھا مگر ایڈی گھاگ شخص تھا۔ اس نے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا، جس سے اسے کوئی سراغ مل سکتا۔ ویسے بھی اب جیری موٹے سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

”خیر! تم نہ بتانا چاہو مگر میں بتائے دیتا ہوں۔“ کچھ دیر کے توقف کے بعد ایڈی نے کہنا شروع کیا۔ ”جو کوئی بھی اس سوٹ کیس کو کھولتا، پہلی ہی نظر میں بھانپ جاتا کہ اس میں بھاری مالیت کے بیڑر بانڈز موجود ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں۔“

”بیڑر بانڈز۔“ جیری چونکا۔ وہ اب جان چکا تھا کہ اجنبی کے سوٹ کیس میں کیا تھا۔ ”تمہیں معلوم ہے ان کی مالیت کیا ہے؟“ ایڈی نے مسکرا کر سوٹ کیس کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یقیناً نہیں۔“ جیری نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ”البتہ اتنا اندازہ ضرور تھا کہ بہت زیادہ مالیت کے ہیں۔“ اس نے پھر بات بنائی۔ اس بار جیری میں ہمت نہیں تھی کہ سچ کہہ سکے کہ اس نے سرے سے سوٹ کیس کھولا ہی نہیں تھا۔

”لاکھوں ڈالر تک ہیں۔“ ایڈی نے بھی گول مول جواب دیا۔ یہ سن کر جیری کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر ایڈی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میرا دفتر نہایت محفوظ ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ”میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔ ان کے آنے تک تم اور یہ رقم... دونوں یہاں مکمل طور پر محفوظ رہیں گے۔“

پولیس کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے بیچ ان کا کیا کام۔ وہ میرا سوٹ کیس ہے۔ تم بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہو۔ جب ہمارے درمیان کوئی تنازعہ نہیں تو پھر پولیس... کو بلانے کی کیا ضرورت ہے؟“ پہلی بار ایڈی پریشان نظر آیا تھا۔

”تم نے کتنے لاکھ ڈالر بتائے تھے۔“ جیری نے پینترا بدلا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات اس نے نہیں کہی تھی۔ ”پانچ لاکھ ڈالر؟“ وہ اب بدحواس ہو رہا تھا۔ ”یہ بہت بھاری رقم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پولیس کے علم میں بھی یہ بات آجائے کہ میں نے تمہاری وہ رقم لوٹادی جو کل رات اتفاقی غلطی سے میرے پاس پہنچ گئی تھی۔“ جیری سمجھ گیا تھا کہ ایڈی پولیس کے نام پر پریشان ہو کر کتنی کترا رہا ہے۔ اس نے اجنبی کے کمزور پہلو کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہا۔ ”تم جانتے ہو کہ یہ رقم میری ہے پھر بھی پولیس کو بلانے پر اصرار کیوں؟“

”یقیناً یہ تمہاری ہوگی۔“ جیری نے اسے اطمینان دلایا۔ ”مگر میں ایک قانون پسند شہری ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ سوٹ کیس تمہارا ہے بھی یا نہیں۔ یہ اور بات کہ تم اس کے دعویدار ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پولیس آئے گی، تصدیق کرے گی اور تمہارا ہے تو تمہیں مل جائے بس اتنی سی بات ہے۔ آخر میں ایک ذمے دار شہری ہوں۔“

ایڈی نے کرسی موڑی، اپنے سوٹ کیس کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ایسا لگا کہ جیسے وہ اب اٹھ کر جیری کو گڈ بائے کہہ کر جانے والا ہے۔ ”میرا خیال ہے اب پولیس کو فون کر دیا جائے۔“ جیری نے میز پر رکھے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”تھہرو...“ ایڈی نے کہا۔ ”پولیس کو بلانا اچھا آئیڈیا نہیں۔“

”اچھا آئیڈیا نہیں۔“ جیری نے اس کے الفاظ دہرائے۔ ”تمہیں اندازہ ہے کہ بیڑر بانڈز کس کی ملکیت ہو سکتے ہیں۔“

”تم نے ہی تو بتایا تھا کہ یہ تمہارے ہیں۔“ جیری نے جواب دیا۔ ”اس وقت میرے ہیں پر میری ملکیت نہیں۔“ ایڈی نے جواب دیا۔ وہ ایک بار پھر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ”میں تو اس رقم کے لیے صرف ایک کوریئر کی حیثیت رکھتا ہوں وہ بھی اپنے ادارے کی طرف سے... سمجھ گئے۔“

لگا ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی نجی ادارہ ہو سکتا ہے، مالیاتی کمپنی ہو سکتی ہے، سرکاری ادارہ بھی ہو سکتا ہے... تم اس بات کو چھوڑو۔“ ایڈی نے کندھے اچکا کر کہا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ ادارہ یا کمپنی چاہے کوئی سی کیوں نہ ہو، مالیاتی معاملات کے بیچ پولیس کی دخل اندازی کسی کو بھی پسند نہیں۔ کوئی یہ نہیں چاہے گا کہ مالی معاملات کے بیچ پولیس آئے اور ان کے اثاثوں تک اس کی رسائی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ”تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ رقم کس ادارے کی ہو سکتی ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ مجھے اس بات کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔“ جیری نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تو پھر تم یہ بھی سمجھ رہے ہو گے کہ جب پولیس کو بیچ میں ڈالو گے تو کیسی مشکلات کھڑی ہو سکتی ہیں۔“ ایڈی نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔

جیری نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب معاملہ ختم۔ کسی بھی وقت وہ آگے بڑھے گا۔ اپنا سوٹ کیس اٹھائے گا، کھول کر رقم چیک کرے گا اور پھر چلتا بنے گا۔ وہ اسے اب نہیں روک پائے گا۔ اس کی گود میں رکھا اعشاریہ اڑتیس بور کا پستول بھی یونہی دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ اچانک اسے ایک نیا آئیڈیا سوچا۔ ”میں تمہیں ایک مفید کاروباری مشورہ دینا چاہتا ہوں۔“

یہ سن کر ایڈی کا چہرہ بے تاثر رہی رہا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ اس کی خاموشی کو جیری رضامندی سمجھا اور کہنے لگا۔ ”تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ تم اپنی ملازمت سے بہت خوش ہو۔ وہ جو کچھ تمہیں دے رہے ہیں۔ اس سے تم آسودہ زندگی گزار رہے ہو۔“

”ہاں... وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔“ ایڈی نے لقمہ دیا۔

”تم نے کبھی سوچا کہ اگر کسی دن وہ تمہیں ملازمت سے نکال دیں تو پھر کیا ہوگا؟“ یہ کہہ کر اس نے ایڈی کے چہرے پر نظریں گڑائیں۔ ”نہ تمہارا قیمتی سوٹ، ٹاٹھ باٹ، پُر آسائش گھر، گاڑی... کبھی زندگی کے اس پہلو پر سوچا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ رد عمل کا انتظار کرنے لگا۔

”یہ میرا نہایت نجی معاملہ ہے۔“ ایڈی نے غصے سے کہا۔

”میں تمہاری بے عزتی نہیں کر رہا۔“ جیری نے جلدی سے کہا۔ مگر تم جیسے ادنیٰ عمر مرد اس پہلو پر اس عمر میں بھی نہ سوچیں گے تو کب سوچیں گے، اُس وقت جب ہاتھ پاؤں

قسط وجہ اور

مشہور انگریز ادیب،

جی کے پیپرٹن اور جارج برنارڈشا

ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے ایک دوسرے پر پھبتیاں کتے ہوئے یہ بھی نہیں دیکھتے تھے کہ وہ جس مجلس میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی فقرے باتیاں آج بھی زبانِ نورِ خاص و عام ہیں۔ جانج برنارڈشا دبے تیلے تھے اور پیپرٹن موٹے تھے۔ ایک دن پیپرٹن نے برنارڈشا سے کہا: ”بنا اگر کوئی غیر ملکی بہتیں دیکھے تو کبھی گا کار انگلستان میں مٹتا ہے۔“

برنارڈشا سے یہ جملہ برداشت نہ ہو سکا فوراً بولے: ”اور اگر کوئی غیر ملکی بہتیں دیکھے تو فوراً اسے بھجھ جائے گا کہ اس نقطہ کا باعث کون ہے۔“



جواب دے چکے ہوں گے یا تب جب مالکان نکال باہر کر چکے ہوں گے... بولو؟“ یہ کہہ کر وہ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ ایڈی بہ دستور خاموش تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا مگر وہ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جیری کے لیے یہی بات حوصلہ افزا تھی۔ ”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ کافی دیر کی خاموشی کے بعد آخر اس نے منہ کھولا۔

”میں ابھی آدھے میل کے فاصلے سے یہ سوٹ کیس گھسیٹا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔“ جیری نے مطلب کی بات شروع کی۔ ”کسی کو پتا نہیں کہ اس کے اندر کیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔ ”اگر ہم دونوں، میرا مطلب ہے کہ تم اور میں اسے آپس میں...“ اس نے اٹکتے ہوئے کہا اور بات نامکمل چھوڑ دی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ایڈی نامکمل فقرے سے پوری بات سمجھ گیا ہوگا۔

وہ بہ دستور جیری کے سامنے وہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اگرچہ اس نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی تھی مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ نہ ہی اس کے تاثرات سے کچھ اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

جب سے ایڈی نے سوٹ کیس میں رکھے بانڈز کی مالیت بیان کی تھی، تب سے جیری کی نیت پھسل گئی تھی۔ وہ رات بھر اپنے پاس سوٹ کیس رکھنے کی فیس ہر حال



خود گواہی

سلیم انور

کبھی دام اور کبھی صیاد... بازی کبھی بھی کسی کے حق میں پلٹ سکتی ہے۔ ارتکاب جرم سے قبل مجرم خود دکو چھپائے رکھنے کے تمام نکات پر غور کرتا ہے مگر... ارتکاب جرم کے بعد وہ لاشعوری طور پر دور رہنے کی خوش قسمی میں مبتلا دھیرے دھیرے شکنجے سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے کہ یہی قدرت کا نظام ہے۔ غیر دانستہ سبھی مگر یہی غلطی وہ بھی کر رہا تھا۔

ایک مجرمانہ ذہن کی الجھی نفسیات..... اور حالات کا پیچ و خم

”احق عورت“ ڈین نے سوچا۔ وہ کسی جنگلی بلی کی طرح اس سے الجھ گئی تھی اور اس کے چہرے پر سے عینک اور اس کی وگ اتار پھینکنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اسے اب بھی اس عورت کے چہرے کے تاثرات بہ خوبی یاد تھے جن سے خوف جھلک رہا تھا۔ اس کیفیت نے اسے مزید برا بھینٹ کر

ڈین اولیری نے اٹھلا کی خواب گاہ کی کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگائی اور قریب کی گلی کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ اب اس کا اعتماد پختہ ہو چکا تھا۔ اسے اس بے حس و حرکت جسم کی قطعی پروا نہیں تھی جسے وہ خواب گاہ کے فرش پر پڑا چھوڑ آیا تھا۔

اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ آخر تھک بار کر وہ بھی خاموش ہو گیا۔ کمرے میں تقریباً پانچ منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔ ایڈی سوچ کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا اور جبری غور سے اس کے تاثرات سے معاملہ فہمی کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں نے فیصلہ کر لیا۔“ کافی دیر بعد ایڈی نے سزاوار پر اٹھایا اور جبری کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر اس کا ادل اچھل کر حلق میں آگیا مگر اس نے اپنے چہرے پر بہ دستور متانت طاری کیے رکھی۔

”سب سے پہلے تو میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ اتنی اچھی تجویز مجھے دی۔“ ایڈی کی بات سن کر جبری مسکرا دیا۔ ”تو اب ہم تمہارے منصوبے پر عمل کریں گے۔“ ایڈی نے بھی مسکرا کر بات آگے بڑھائی۔ اس کا ہاتھ نہایت آہستگی سے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ”مگر تمہارے منصوبے کے عین مطابق نہیں۔ اس میں، میں نے چھوٹی سی تبدیلی کر دی ہے۔“ جبری کی نگاہ اس کے چہرے پر مرکوز تھی۔ وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ کب اس کا ہاتھ کوٹ کے اندر گیا اور باہر آیا۔ جب تک وہ دیکھ پاتا سا ٹلسٹر لگے پستول سے ایک گولی نکلی اور سیدھی جبری کی پیشانی میں جا گئی۔

ایڈی نے آگے بڑھ کر اس کی لاش کو کھینچ کھانچ کر میز کے نیچے دھکیلا۔ جلدی سے سیاہ چمڑے کے سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑ کر کھینچا اور مسکراتا ہوا بڑے سکون سے باہر نکل گیا۔ اس نے کمرے کا دروازہ لاک نہیں کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک دو دن میں کوئی نہ کوئی اس کی لاش دریافت کر ہی لے گا۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے کے بعد ایڈی اوہیرے اتر پورٹ پر تھا۔ وہ اپنا پاسپورٹ ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے تین گھنٹے بعد لندن جانے والی پرواز کے ٹکٹ خریدے۔ چیک ان کیا اور لندن پہنچ گیا۔

مکمل سفر کے باعث وہ خاصا تھکا ہوا تھا۔ ہوٹل پہنچتے ہی وہ سو گیا۔ دوسرے دن اٹھا۔ تیار ہو کر اس نے سوٹ کیس اٹھایا تاکہ بیئر بائڈز فروخت کر سکے۔ ”یہ کیا!“ اچانک حیرت کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ پُر سکون نظر آنے والا ایڈی اچانک بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ سوٹ کیس کے کونے پر چٹ لگی ہوئی تھی۔

جبری ہانپکن

ڈیننگ پیلس، لیک کنٹری۔

میں وصول کرنا چاہتا تھا یعنی ڈھائی لاکھ ڈالر؟ ”تم نے اتر پورٹ پر اپنے سوٹ کیس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی تھی؟“ جبری نے ایک اور نکتہ بیان کیا۔

ایڈی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اٹھو... فوراً اتر پورٹ جاؤ اور گمشدگی کی رپورٹ درج کرواؤ۔“ جبری نے مفت قانونی مشورہ دیا۔

”میں اور یہ کروں... مگر کیوں؟“ ایڈی نے کافی دیر بعد سوال کیا تھا۔

”اس سے یہ ثابت کرنا آسان ہوگا کہ رقم والا سوٹ کیس واقعی غائب ہوا تھا۔“ جبری نے پٹی پڑھائی۔

”تم مجھے واقعی مشکل میں ڈال رہے ہو۔“ ایڈی نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں... میں رقم اور تمہیں بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ جبری نے فوراً کہا۔ ”ممکن ہے کہ جب تم اپنے ادارے سے کہو کہ اتر پورٹ سے سوٹ کیس غائب ہو گیا ہے تو وہ تمہاری بات پر یقین کر لیں اور انکواری نہ کروائیں۔ بڑی کمپنیوں کے لیے تو یہ معمولی رقم ہے اور ابھی تم نے ہی تو کہا تھا کہ بڑی بڑی کمپنیاں اور ادارے مالی معاملات کے حوالے سے پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے۔“ جبری اسے قائل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

”اگر میں ایسا نہیں کرتا تو پھر...“ ایڈی نے سخت لہجے میں کہا۔

”تو پھر مجبوراً مجھے پولیس کو فون کرنا پڑے گا۔“ جبری نے ایسا تاثر دیا کہ جیسے وہ بھی فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکا ہے۔

”میرا خیال ہے فون کر ہی لینا چاہیے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایڈی کی طرف دیکھا۔ ”آگے کی کہانی تو تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

ایڈی ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنے پاس ہیری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگرچہ اس نے پاس کے بڑے بڑے کام کیے تھے۔ وہ اس کا بہت شکر گزار تھا مگر پھر بھی یہ رقم کا معاملہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر رقم جبری کے منصوبے کے مطابق ہڑپ کر لی گئی تو ہیری اس کی بات پر بالکل یقین نہیں کرے گا۔ وہ بھی بلا کا کائیاں شخص تھا۔

دوسری طرف اسے سوچوں میں غرق دیکھ کر جبری کو پھر حوصلہ ملا۔ ”تم اس رقم کو لے کر کہیں بھی فرار ہو سکتے ہو۔ سوئٹزر لینڈ، یورپ کے کسی بھی ملک، برطانیہ... کون تمہیں ڈھونڈ پائے گا۔ اس رقم سے، کسی بھی ملک میں جا کر بڑے آرام سے اپنا کاروبار شروع کر سکتے ہو۔“ جبری اسے تجویز پہ تجویز دیے جا رہا تھا۔ مگر وہ خاموش تھا۔ ایڈی کی خاموشی

دیا تھا۔ اسے اچانک یوں لگا تھا جیسے وہ اسے پہچان گئی ہو اور تب ہی اسے غصہ آ گیا تھا۔

ڈین اندھیری گلی سے نکل کر باہر سڑک پر آ گیا۔ اس نے سڑک پار کی اور آل ٹائٹ گروسی پارکنگ لائٹ کی جانب چل دیا جہاں اس نے اپنی پک اپ چھوڑی تھی۔

اس کا موقف تھا کہ کبھی اپنی گاڑی جائے واردات پر پارک نہ کرو۔ اس لیے کہ اندھیرے میں ہمیں بدلے ہوئے چہرے کے مقابلے میں کار کو بہ آسانی شناخت کیا جاسکتا ہے اور اس کا کھوج لگایا جاسکتا ہے۔

اس نے وہ پلاسٹک بیگ اپنی پک اپ کی سیٹ پر اچھال دیا جس میں اس کے ”کام کا لباس“ موجود تھا۔ یہ لباس ایک سستی سی جینز، ایک پل اور شرٹ اور ٹائٹلون کے دستاںوں پر مشتمل تھا۔ اس نے پک اپ کا انجن اسٹارٹ کیا اور سوچنے لگا کہ اس بار اسے اس کام کے لباس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا کیونکہ اس عورت سے ہاتھ پائی میں لباس کا ستیاناس ہو گیا تھا۔

یہ اسی روز دن کے وقت کی بات ہے کہ وہ اپنی پک اپ کے نیچے لیٹا اس کا آئل چیک کر رہا تھا جب اسٹجلا ڈپلیکس میں وارد ہوئی۔ ڈین نے لیٹے ہوئے ہی اس کی ٹانگوں کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر پک اپ کے نیچے سے کھسک کر باہر نکل آیا تاکہ ان بھرپور ٹانگوں کی مالکہ کا بھی دل کھول کر نظارہ کر سکے۔ سنہری زلفوں اور متناسب جسم کی اسٹجلا اسے ایک نظر میں بھاگتی تھی۔ اسے اسی قسم کی عورتیں پسند تھیں۔

اس نے اسٹجلا کے ساتھ فلرٹ کرنے کی کوشش کی۔ عورتیں عام طور پر اس کے کرخت نقوش کو پسند کرتی تھیں اور اس کے فلرٹ کا مثبت جواب دیتی تھیں۔ لیکن اسٹجلا نے بڑی ادا کے ساتھ اپنی بڑے سے ہیرے والی منگنی کی انگلی اس کے سامنے لہرا دی۔ ڈین کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ یہ اس کے گاؤدی مالک مکان لیو بیلی کی منگیتر ہو سکتی ہے۔

بعد میں اس نے اسٹجلا کا چھپ کر چچا کیا تاکہ اس کی رہائش گاہ کا پتا لگا سکے۔ اسٹجلا کی رہائش شہر کے مشرقی حصے میں واقع ایک اپارٹمنٹ میں تھی۔ اس سے پہلے وہ اسٹجلا کو لیو بیلی سے یہ کہتے ہوئے سن چکا تھا کہ وہ اس رات اس کے ہمراہ باہر گھومنے نہیں جاسکے گی کیونکہ اسے رات دس بجے تک دفتر میں مصروف رہنا پڑے گا۔

ڈین نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے پاس

اسٹجلا کی خواب گاہ کی کھڑکی کے راستے اندر جانے اور وہاں چھپ جانے کے لیے خاصا وقت ہوگا۔

ڈین نے اپنے لباس کا بیگ ایک بند ریٹورنٹ کے عقب میں واقع کوڑے دان میں چھینک دیا اور پھر اپنے پسندیدہ بار کی جانب روانہ ہو گیا۔ بیئر کے چند گلاس اور تھوڑا سا بلیر ڈز کا کھیل..... اسے اس وقت بس ان ہی چیزوں کی طلب ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی جیب میں سے ہیرے کی انگلی نکال کر ایک بار پھر پر شوق نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ پھر وہ انگلی دوبارہ جیب میں رکھ لی۔ وہ دھیمے سروں میں سیٹی بجاتا، گنگناٹا ہوا بار کی جانب چل دیا۔ اس کی اس شب کی محنت رانگاہیں نہیں گئی تھیں!

یہ چند گھنٹوں بعد کی بات ہے کہ جب ڈین نے اپنی پک اپ بڑا سا موڑ کاٹنے کے بعد اپنی سڑک پر گھائی تو اس کا سانس رک سا گیا۔

اسے ڈرائیوے میں دو افراد کھڑے دکھائی دیے۔ ان کے برابر میں ایک سرکاری ٹائپ کی کار بھی کھڑی تھی۔ ان میں سے ایک کو ڈین نے دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ اس کا مالک مکان لیو بیلی تھا۔ دوسرے فرد کا چہرہ مخالف سمت میں تھا۔

”کیا وہ کوئی پولیس والا ہے؟“ ڈین نے سوچا۔ ڈین نے فوراً ہی اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا۔ ”یہ ناممکن ہے“ اس نے سوچا۔ وہ اتنی جلدی اس کا سراغ نہیں لگا سکتے اور وہ بھی کس بنیاد پر؟

اس نے اپنی پک اپ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ کے ساتھ روک دی اور اپنی نشست پر بیٹھا رہا۔ البتہ انجن بند نہیں کیا۔ جب ان دونوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف نہیں بڑھا تو ڈین کا اعتماد لوٹ آیا۔

اب اسے یقین آ گیا کہ انہیں حقیقت کا کوئی علم نہیں ہے اور وہ خواہ مخواہ گھبرا گیا تھا۔

پھر جب ڈین پک اپ سے اتر کر ان کی جانب بڑھا تو لیو بیلی سسکیاں لے رہا تھا۔ ڈین پر نگاہ پڑتے ہی وہ روتے ہوئے بولا۔ ”وہ..... وہ اسٹجلا..... کسی نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ اس وقت ویلے اسپتال میں ہے اور ابھی ابھی اس کی سرجری ہوئی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے موٹے شیشوں کی عینک ایک جھٹکے سے چہرے سے ہٹائی اور

آنسو پونچھنے لگا۔ پھر ڈپلیکس کے اپنے نصف حصے کی جانب چل دیا۔

ڈین اس وقت اچھل پڑا جب دوسرے فرد نے زبان کھولی۔ اس کا تعلق واقعی پولیس ہی سے تھا لیکن وہ ایک پولیس دوسن بھی۔

”سارجنٹ مارٹینیوز!“ اس عورت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اور میرا خیال ہے کہ تم ڈین اولیری ہو۔“

مشر لیو بیلی کے سننے کرائے دار!“ ڈین اس کی صورت دیکھنے لگا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ اس پولیس سارجنٹ خاتون کو اس کے نام کا پہلے سے علم تھا اور اسے یہ بات بھی پسند نہیں آئی تھی کہ اسٹجلا مری نہیں بلکہ زندہ تھی۔

”مس اسٹجلا..... اسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟“ ڈین نے محسوس سے لہجے میں سوال کیا۔

”ہاں، چوٹ تو اچھی خاصی آئی تھی لیکن اس نے دلیری کا مظاہرہ کیا اور اپنے حملہ آور سے بھڑکئی۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ وہ زندہ بچ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کل دوپہر سے پہلے یا سہ پہر تک بات چیت کرنے کے قابل ہو جائے۔“ سارجنٹ مارٹینیوز نے بتایا۔

لعنت ہو، ڈین نے دل ہی دل میں کہا۔ ”تو تمہیں کوئی سراغ نہیں ملا؟ کسی کو اس کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا گیا؟“

اس بات پر سارجنٹ مارٹینیوز نے ایک لمحے کے لیے ڈین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے توقف کیا، پھر ایک آہ بھرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”مس اسٹجلا کسی نہ کسی طرح گھسٹتے ہوئے فون تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی اور اس نے 911 ڈائل کر دیا۔ بے ہوش ہونے سے قبل اس نے بانٹتے ہوئے آپریٹر سے جو کچھ کہا تھا، بس وہی ہمارے لیے ایک کلیو ہے جس پر ہمیں کام کرنا پڑے گا۔“

ڈین اس کے بات جاری رکھنے کا انتظار کرتا رہا لیکن سارجنٹ اب خاموش ہو گئی تھی۔

ڈین نے مزید چند لمحے انتظار کیا۔ پھر بالآخر خود ہی پھٹ پڑا۔ ”اس نے آپریٹر سے کیا کہا تھا؟“

”مجھے یقین ہے کہ اخبارات میں یہ سب تفصیل سے آجائے گا۔ ویسے میں تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ اس نے ہانپتے ہوئے پہلے مدد کی درخواست کی تھی۔ پھر کہا تھا۔ لیوٹیننٹ (Lieutenant)..... اس نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔“

”لیوٹیننٹ؟“ ڈین نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے دہرایا۔

سارجنٹ مارٹینیوز نے شانے اچکا دیے۔ ”شاید اس کے حملہ آور نے ملٹری یونیفارم پہنی ہوئی تھی۔ اسی حوالے سے اس نے اسے لیفٹیننٹ کہا ہو، لیکن بد قسمتی سے مشر لیو بیلی کے ذہن میں ایسا کوئی شائبہ نہیں جو اس حلیے پر پورا اترتا ہو۔“

ڈین کا دل چاہا کہ خوب تحقیقہ لگائے۔ اس کا مطلب تھا کہ پولیس کو حملہ آور کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے اور اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا جب تک وہ دوبارہ بولنے کے قابل نہیں ہو جاتی۔

سارجنٹ مارٹینیوز اپنی پولیس کار میں وہاں سے روانہ ہو گئی۔ ڈین لان عبور کرتے ہوئے چند لمحوں کے لیے لیو بیلی کے بچن کی کھڑکی کے پاس رک گیا۔ بچن میں روشنی ہو رہی تھی اور وہ احقر ڈائنگ ٹیبل کی ایک کرسی پر بیٹھا کسی بچے کے مانند رو رہا تھا۔

ڈین نے حقارت سے گھاس پر تھوک دیا اور تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے کی سمت چل دیا۔

اسے ایک کام سرانجام دینا تھا۔ اس سے پہلے کہ اسٹجلا مزید کوئی لفظ زبان سے ادا کرے، اسے ہمیشہ کے لیے گہری نیند سلا دینا ہوگا۔

ڈین نے اپنے بھروپ بدلنے والی بھانت بھانت کی اشیا کو الٹ پلٹ کر جانچنا شروع کیا۔ منصوبہ بھی بدستور اس کے ذہن میں ترتیب پا رہا تھا۔

اسے ڈاکٹروں والا وہ سفید کوٹ دکھائی دے گیا جو اس نے ایک دلکش نوجوان لڑکی کو متاثر کرنے کے لیے خریدا تھا اور پہنا کرتا تھا۔ وہ یہ سفید کوٹ پہن کر اور عینک لگا کر اس کے اسپتال پہنچ جائے گا اور اس کمرے میں داخل ہو جائے گا جہاں اسٹجلا کو رکھا گیا ہے۔ پھر اس کے جسم میں انجکشن کے ذریعے دوا داخل کر دے گا۔ اس کے پاس تالے میں بند چوری شدہ ہر قسم کی دوائیں موجود تھیں۔ وہ ان دواؤں میں سے کوئی ایک دوا استعمال کر سکتا ہے جو اس نے جانوروں کے ڈاکٹر کے کلینک سے چوری کی تھیں۔ وہ ایسی دوائیں تھیں جو جانوروں کو ہمیشہ کی نیند سلانے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔

ہاں، اسے یہ کام سرانجام دینے کے لیے اسٹجلا کے کمرے میں داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے میں صرف چند سیکنڈ لگیں گے۔

اپنے اس شاندار منصوبے پر ڈین کے ہونٹوں پر ایک

اطمینان بخش مسکراہٹ ابھر آئی۔

۳۳۳

ڈین سورج نکلنے سے کچھ دیر قبل ویلے اسپتال پہنچ گیا۔ اس نے اپنی پک اپ اسپتال کے وسیع پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر دی۔ اس نے اسٹجلا کے کمرے کا نمبر پہلے ہی معلوم کر لیا تھا۔

کسی بھی مریض کے کمرے کا نمبر دریافت کرنا مشکل نہیں رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آپ اگر یہ کہتے ہیں کہ میں مریض کے لیے گلدستہ بھجوانا چاہتا ہوں تو اسپتال والے بلا جھجک مریض کے کمرے کا نمبر بتا دیتے ہیں۔ اسٹجلا کے کمرے کا نمبر 327 تھا۔

ڈین نے اپنی عینک اپنی ناک پر جماتے ہوئے بے باکی کے ساتھ اسپتال کے مرکزی دروازے کی سمت قدم بڑھانا شروع کر دیے۔ اس کا داہنا ہاتھ اس کے سفید کوٹ کی داہنی جیب میں تھا جس میں دوا سے بھری ہوئی سرنج موجود تھی۔

وہ معمول کے انداز میں چلتا ہوا اسپتال میں داخل ہو گیا۔

پھر لفٹ میں سوار ہو کر تیسری منزل پر پہنچ گیا۔ جب وہ لفٹ سے باہر نکل رہا تھا تو ایک نرس سے اس کا سامنا ہو گیا۔ وہ نرس کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ نرس بھی جواباً مسکرا دی۔

وہ با اعتماد انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے صبح سویرے کے معمول کے راؤنڈ پر ہو۔ وہ اب اپنے مطلوبہ کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کمرانمبر 321 323 325 ڈین نے اپنی رفتار دہشی کر دی۔ سامنے سے ایک اور نرس آرہی تھی۔ جب نرس آگے نکل گئی تو ڈین نے تیزی سے اطراف کا جائزہ لیا۔ پھر دے پاؤں کمرانمبر 327 میں داخل ہو گیا۔

صبح کی ہلکی روشنی چمن کرکمرے میں آرہی تھی۔ ڈین بیڈ کے نزدیک پہنچا اور اپنی جیب میں سے سرنج باہر نکال لی لیکن جب اس نے نگاہ اٹھا کر بیڈ کی طرف دیکھا تو ششدر رہ گیا۔

بیڈ خالی تھا!

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا اس کے کانوں میں ایک حکمانہ آواز سنائی دی۔ ”ہنڈ زاب!“ ڈین نے آواز کی سمت پلٹنے سے قبل ہی اس آواز کو پہچان لیا تھا۔ وہ سارجنٹ مارٹینز کی آواز تھی۔ ڈین کی نگاہ کمرے کی کھڑکی کی جانب اٹھ گئی۔

”تمیں منزل سے چھلانگ لگانا خاصا رکھی ہوگا، اولیری لیکن اگر تم کوشش کرنا چاہتے ہو تو کر سکتے ہو۔ مگر میں پہلے بتا دوں کہ نیچے ایک پولیس مین موجود ہے اور تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ چھلانگ لگانے کے باوجود تم بچ کر نہیں جاسکو گے۔“ سارجنٹ مارٹینز نے کہا۔

”تم..... تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں آؤں گا؟“ ڈین نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ پھر اسے جھرجھری سی آگئی جب ایک باوردی پولیس مین نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔

”میں تمہارے بارے میں یقین تو نہیں تھی۔ لیکن تم گزشتہ شب خاصے گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے اور بے پروائی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور پھر جب تم نے یہ پوچھا کہ کیا کسی کو اسٹجلا کے اپارٹمنٹ سے نکلنے ہوئے دیکھا گیا تھا تو اس بات نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ لیو بیلے نے یہ تو کہا ہی نہیں تھا کہ اسٹجلا پر حملہ کس جگہ ہوا ہے۔ سو تمہیں کیسے پتا چل گیا کہ اس پر حملہ اس کے اپارٹمنٹ میں ہوا تھا؟ پھر ہمارے پاس ایک گواہ بھی تھا۔“

”گواہ؟“ ڈین چونک پڑا۔

”ہاں، اسٹجلا۔“

”وہ کیسے؟“

”میرے پاس اس بارے میں کوئی جواز نہیں تھا کہ اسٹجلا کی گمشدہ ہیرے کی انگلی کے لیے تمہاری یا تمہاری رہائش گاہ کی تلاشی لے سکوں۔ لیکن اس بارے میں مجھے کامل یقین تھا کہ اگر میرا شبہ درست ہے تو تم اسٹجلا کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے کے لیے قدم ضرور اٹھاؤ گے۔ سو میں نے تمہاری نگرانی شروع کر دی۔ پھر کچھ دیر پہلے جب تم اسپتال کی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئے تو ہم نے اسی لمحے اسٹجلا کو اس کمرے سے دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا۔“

”تم واقعی بہت چالاک ہو۔“ ڈین نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”لیکن یہ تمہاری خام خیالی ہے کہ اسٹجلا نے 911 کے آپریٹر کو فون پر کوئی کارآمد بات بتائی تھی۔ تم دن میں خواب دیکھ رہی ہو۔ میں کوئی لیفٹیننٹ نہیں ہوں..... کبھی ملٹری میں نہیں رہا۔“

اس بات پر سارجنٹ مارٹینز نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور بولی۔ ”اسٹجلا نے اپنے حملہ آور کو لیفٹیننٹ نہیں کہا تھا۔ اس نے کہا تھا لیو ٹیننٹ (Leo Tenent) یعنی لیو کا کرایہ دار!“



میں نے کبھی نیٹ چیٹنگ نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس ان فضول کاموں کے لیے وقت ہی نہیں لیکن لوئیس بروکس میں نہ جانے ایسی کیا خاص بات تھی کہ میں پہلی ملاقات میں ہی اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اس سے میرا رابطہ کس طرح ہوا؟ یہ آگے چل کر بتاؤں گا۔ فی الحال تو یہ سن لیجیے کہ

نیٹ چیٹنگ سے پہلے چیٹنگ تک ایک دلچسپ ماحبرا

مشکل

تنویر ریاض

بھیس بدل کر بھید پالینا کبھی آسان تھا مگر آج کل لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ کبھی کسی کی مشابہت شبہات کے دروازوں پر دستک دیتی ہے تو کبھی کسی کی حماقت ہی قابلیت کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس رنگ بدلتی دنیا پر بھلا کوئی کیسے اعتبار کر سکتا ہے، جبکہ اعتبار بھی بار بار ڈسنے والا ہو تو محتاط رہنا ہی بھلا ہوتا ہے۔



ہوں اور تنہا رہتا ہوں۔ اب میں شدت سے کسی ایسے ساتھی کی تلاش میں ہوں جو مجھے جی محبت اور عزت دے سکے۔
رومانک۔“

میں ایک ہفتے تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا جب میری مایوسی انتہا کو چھونے لگی تو اس کا جواب آ گیا۔
”ڈیزر رومانک! تمہاری طرح میں بھی کسی ایسے ساتھی کی تلاش میں ہوں جو خود مختار ہو اور مجھے بھرپور محبت دے سکے۔ مجھے بھی موسیقی، شاعری اور خاص طور پر فلمیں بہت پسند ہیں۔ اپنے بارے میں کچھ اور بتانا چاہو گے۔ لوئیس بروکس۔“
”ڈیزر لوئیس بروکس، میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے کوئی مالی پریشانی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے ابھی تک اپنی آئیڈیل لڑکی نہیں ملی۔ لوگ کہتے ہیں کہ حقیقی زندگی میں آئیڈیل ملنا مشکل ہے۔ یہ سب رومانوی باتیں ہیں لیکن میں اس فلسفے کو نہیں مانتا اور مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل مجھے میرا آئیڈیل ضرور مل جائے گا۔ اسی لیے میں اپنے آپ کو رومانک کہتا ہوں کیا تم یہ بتانا پسند کرو گی کہ تم نے اپنے لیے لوئیس بروکس کے نام کا انتخاب کیوں کیا؟“

”ڈیزر رومانک! اگر تم فلمیں دیکھتے ہو تو جانتے ہو گے کہ لوئیس بروکس خاموش فلموں کے دور کی ایک خوب صورت اداکارہ تھی۔ ایک دن میرے ایک بوائے فرینڈ نے مجھے اس کی تصویر دکھائی۔ اس کی شکل ہو بہو مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ وہ تصویر آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ مجھے اس کے چہرے پر کچھ پراسراریت سی محسوس ہوئی، جبکہ اس کے برعکس میں ایک کھلی کتاب کے مانند ہوں، میں نے بھی اب تک شادی نہیں کی اور تمہاری طرح اپنے آئیڈیل کی تلاش میں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ مجھے مل ہی جائے گا۔ کیا پتا وہ تم ہی ہو۔ ایک بات پوچھوں، کیا تمہاری کوئی گرل فرینڈ ہے؟ لوئیس بروکس۔“

”ڈیزر لوئیس! میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم سوچو گی کہ میں تمہیں جانتا تک نہیں پھر ملنے کی خواہش کیوں ظاہر کر رہا ہوں؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں بہت دور تک ساتھ چل سکتے ہیں۔ کیا تم اس بارے میں سوچنا پسند کرو گی؟ رومانک!“

”ڈیزر رومانک! تم نے مجھے کس الجھن میں ڈال دیا۔ میں بہت شرمیلی لڑکی ہوں اور پہلی بار کسی مرد سے نیٹ چیٹنگ کر رہی ہوں، میں نہیں جانتی کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں ماں کو پتا نہ چل جائے۔“

وہ تو میرا جینا عذاب کر دے گی۔“

”ڈیزر لوئیس! میں بھی تمہاری طرح شرمیلا ہوں اور میری زندگی میں یہ پہلا اتفاق ہے کہ کسی لڑکی کے ساتھ اس طرح نیٹ کے ذریعے چیٹنگ کر رہا ہوں لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے اور میں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم دونوں کا ساتھ خوب رہے گا۔ کیا میں تمہارے گھر آ سکتا ہوں؟ مجھے امید ہے کہ تمہاری ماں مجھے پسند کرے گی۔ رومانک۔“

”ڈیزر رومانک! میرے گھر پر تو یہ ملاقات ممکن نہیں۔ اگر کو تو میں تمہارے گھر آ جاؤں۔ تم مجھے اپنا پتا بتا دو۔ میں کل شام تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔ تمہاری لوئیس۔“

”ڈیزر لوئیس! مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری دعوت قبول کر لی۔ میرا پتا بہت آسان ہے۔ میں گو مس موئیر میں واقع ایک چار منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر رہتا ہوں۔ اس عمارت کی ہر منزل پر صرف ایک ہی اپارٹمنٹ ہے۔ تم انٹر کام کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع دے دینا۔ میں مٹن دبا دوں گا۔ مجھے تمہارا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ امید ہے کہ تم وقت پر پہنچ جاؤ گی۔ رومانک۔“

میں سارا دن بے چین رہا اور جیسے جیسے ملاقات کا وقت قریب آ رہا تھا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے اس کے استقبال کے لیے خاصا اہتمام کیا تھا۔ پورے اپارٹمنٹ کی صفائی کی۔ گل دانوں میں تازہ پھول سجائے۔ سارے فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کی اور کچن میں جا کر تمام برتن دوبارہ دھوئے۔ پھر فرنیچر کھول کر دیکھا کہ اس میں ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں یا نہیں۔ میں کھانے پینے کا بہت سا سامان لے آیا تھا جبکہ کینٹ میں عمدہ شراب کا ذخیرہ پہلے سے موجود تھا۔ خدا خدا کر کے اس کے آنے کا وقت قریب آیا تو میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہونے لگی پھر انٹر کام پر اس کی دلکش آواز سنائی دی۔
”لوئیس۔“

میں نے انٹر کام کا مٹن دبا دیا۔ کچھ دیر بعد میرے اپارٹمنٹ کی کھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔ وہ گوری چٹی، قبول صورت عورت تھی جس کے بالوں کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔ پہلی نظر میں دیکھنے پر لگتا تھا کہ انہیں خضاب سے رنگا گیا ہے۔ اس نے ایک چست سامنی اسکرٹ پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی خوب صورت گوری ٹانگیں نمایاں ہو گئی تھیں۔ میں قدامت پسند شخص ہوں۔ اس لیے مجھے اس کا یہ لباس پسند نہیں آیا۔ میری سمجھ سے بالاتر تھا کہ اس نے ایسے لباس کا انتخاب کیوں کیا؟ شاید

اس طرح وہ مجھے متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب وہ آہی آہی تھی تو میں اسے دھکے دے کر باہر نہیں نکال سکتا تھا لہذا دل پر جبر کر کے کہنا پڑا۔

”براہ مہربانی۔ اندر آ جاؤ۔“
میرے سامنے وہ عورت کھڑی تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ اتنی جلدی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی اندازہ ہو سکے گا کہ وہ کس قماش کی عورت ہے۔ وہ لہراتی ہوئی اندر آئی تو میں نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

”تمہارا اپارٹمنٹ بہت خوب صورت ہے۔“ وہ چاروں طرف نظر پھرتے گھماتے ہوئے بولی۔ ”کیا یہ تمہارا اپنا ہے؟“
”نہیں۔ یہاں میں کرایہ پر رہتا ہوں۔ میرا اپنا اپارٹمنٹ بارہ میں ہے۔“

”میرا اصلی نام ڈیانا ہے۔“
”اور مجھے کارلوس کہتے ہیں۔“ میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”ویسے تم بھی شہزادی ڈیانا سے کم نہیں ہو۔“

”یہ مردوں کی پرانی عادت ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”عورت کی چھوٹی سی تعریف کر کے اسے اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں تمہیں پہلی نظر میں ہی پسند کر چکی ہوں۔“

”میرا بھی یہی حال ہے۔“ میں نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں مبالغہ آرائی نہیں کر رہا۔ تم واقعی بہت خوب صورت ہو۔“

”اگر کوئی دوسرا یہ بات کہتا تو کبھی یقین نہیں کرتی لیکن تم کہہ رہے ہو تو مان لیتی ہوں۔“ اس نے اپنے پرس سے ایک تصویر نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ لوئیس بروکس کی وہی تصویر ہے جس کا میں نے تم سے تذکرہ کیا تھا۔ میں تمہیں ہی دکھانے کے لیے لائی ہوں۔“

وہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ اس کا رنگ گورا اور بال غیر معمولی طور پر سیاہ تھے۔ بلاشبہ وہ ایک خوب صورت عورت تھی۔

”کچھ پینا پسند کرو گی؟“
”ہیں تھوڑی سی دہسکی۔“

میں کینٹ سے دہسکی اور منزل وائر کی ایک ایک بوتل اور ٹرے میں تھوڑی سی برف لے کر آ گیا۔
”میں برف کے بغیر ہی دہسکی میں پانی ملا کر پیتا

دلچسپ معلومات

☆ دنیا کے سارے دریا روزانہ کروڑوں ٹن نمک زمین سے چوس کر سمندر میں پھینکتے ہیں۔

☆ اگر سمندر کے پانی میں نمک نہ ہوتا تو ہم بارش جیسی نعمت سے محروم ہوتے۔

☆ ایک سیکنڈ میں مجموعی طور پر 15 ارب ٹن پانی بخارات بن کر ہوا میں اڑتا ہے۔

☆ ایک چمچ شہد میں 2 لاکھ پھولوں کا رس ہوتا ہے۔

☆ ایک پاؤنڈ شہد بنانے کے لیے شہد کی مکھی 35 لاکھ دفعہ اڑتی ہے اور 50 ہزار کلو میٹر کا سفر کرتی ہے۔

☆ دس کروڑ چوٹیوں کا اگر نروس سسٹم نکال کے تول لیا جائے تو اس کا مجموعی وزن 20 گرام بنتا ہے۔

☆ دنیا کی سب سے پہلی کتاب تین ہزار قبل مسیح میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب ”زگ وید“ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سندھ میں لکھی گئی تھی۔

مرسلہ: سلمان خان، ضلع بونیر

گر کی باتیں

ایک آرٹ سے دل کے دروازے کی تصویر بنانے کو کہا گیا اور اس نے بہت حسین گھر بنایا اور اس میں چھوٹا سا خوب صورت دروازہ لگایا، لیکن اس کا اینڈل نہیں تھا۔

کسی نے پوچھا کہ اینڈل کیوں نہیں لگایا۔ تو اس نے بڑی خوب صورت بات کہی۔

”کہہ دل کا دروازہ اندر سے کھولا جاتا ہے باہر سے نہیں۔“

☆☆☆☆

کسی کی مدد کرتے وقت اس کی آنکھوں میں نہ دیکھو ورنہ ہو سکتا ہے اس کی آنکھوں میں موجود شرمندگی تمہارے دل میں غرور پیدا کر دے۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

ہوں جس میں وہ سکی کی مقدار زیادہ اور پانی کی کم ہوتی ہے۔ میں نے گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔
”میرے گلاس میں برف ضرور ڈالنا اور بہت سا پانی بھی۔“

میں نے دو گلاس تیار کیے اور ٹرے میز پر رکھ دی۔ وہ بڑے غور سے میری جانب دیکھ رہی تھی پھر اچانک ہی بے تکلف ہوتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟“

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دوسرے حصے میں جا کر مختلف کینٹ دیکھنے لگا۔ وہاں مجھے بسکٹ کے کچھ پیکٹ نظر آئے۔ میں نے ان میں سے ایک اٹھایا اور دوبارہ اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ہماری دوستی کے نام۔ امید ہے کہ یہ تعلق دیر پا ثابت ہوگا جیسا کہ تم نے اپنی ای میل میں کہا تھا۔“

میں نے اپنا گلاس ہونٹوں سے لگایا اور بولا۔ ”اے پیٹے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ بچن میں سے کچھ ممکن چیزیں بھی لے آؤں۔ اس وقت میں جلدی میں صرف بسکٹ ہی اٹھالایا تھا۔“

یہ کہہ کر میں بچن میں چلا گیا۔ واپس آیا تو میرے ہاتھ میں اسٹیکس کی پلیٹ تھی پھر میں نے اپنا گلاس اوپر اٹھایا اور بولا۔ ”دیر پا تعلق کے نام۔“

لوئیس نے مسکراتے ہوئے اپنا گلاس میرے گلاس سے ٹکرایا اور بولی۔ ”چیزز۔“

ہم دونوں مشروب پینے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے رہے۔ اس نے بتایا کہ اس کا باپ مرچکا ہے اور وہ اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی رشتہ دار نہیں۔ اس کی ماں ایک سخت مزاج عورت ہے اور اس پر بہت سختی کرتی ہے۔ وہ اس کی مرضی کے بغیر کسی سے مل سکتی ہے اور نہ ہی کہیں جاسکتی ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے کا بہانہ کر کے یہاں آئی تھی۔

میں نے بھی اسے اپنے خاندان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ یہ کہ میری چار بڑی بہنیں ہیں۔ سب کی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ اپنی زندگی گزار رہی ہیں۔ صرف میں ہی تنہا رہ گیا ہوں اور جلد از جلد اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں۔ مجھے گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے اور میں اسے اپنے ساتھ لے کر پیرس یا نیویارک جانا چاہتا ہوں۔ اس سفر کے لیے میں نے خاصی رقم بچا کر رکھی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کھمبہ لڑو جانا چاہتی ہے۔ اسے ایشیائی شہر بہت پسند ہیں۔

باتیں کرتے کرتے مجھے کچھ خیال آیا اور میں اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”پانی ختم ہو گیا ہے، میں بچن سے دوسری بوتل لے کر آتا ہوں۔“

کھڑے ہوتے ہی میں بری طرح لڑکھڑایا اور میں نے جلدی سے کرسی کی پشت کا سہارا لے لیا۔
”لگتا ہے کہ مجھے چکر آرہے ہیں۔“
وہ مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی۔ ”واقعی تمہیں چکر آرہے ہیں یا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں سہارا دوں؟“

پھر وہ مجھ پر جھکتے ہوئے بولی۔ ”فکر نہ کرو۔ ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ اس صوفے پر بیٹھ جاؤ۔“
اس نے سہارا دے کر مجھے صوفے پر بٹھایا لیکن فوراً ہی میرا سر ایک جانب ڈھلک گیا۔
”کارلوس، کارلوس! تم ٹھیک تو ہو۔“ وہ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا پھر اس نے میرا بازو دھلا دیا اور بولی۔ ”کارلوس! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟“
میں پھر بھی خاموش رہا۔ پھر مجھے اس کے قدموں کی چاب سنائی دی۔ وہ بیڈروم کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ لاک تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری جیبوں کی تلاشی لے رہی ہو پھر مجھے اس کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ سیل فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

”ایگور! وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی تمام قیمتی اشیاء دوسرے کمرے میں بند ہیں۔ تم فوراً آ جاؤ۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔ یہاں کا پتا تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ یہاں پہنچ کر انٹرکام بٹن دبا دینا میں دروازہ کھول دوں گی۔“

میں صوفے پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا لیکن سب آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد انٹرکام پر ایگور کی آواز سنائی دی۔
”اوپر چلے آؤ۔“ ڈانٹانے انٹرکام کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

پھر مجھے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ایگور اندر چلا آیا۔
”کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں۔ اب تک تو سب ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمام نقدی اور قیمتی اشیاء اس کے بیڈروم میں ہیں۔ میں نے اس کی چابی تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں ملی۔“

”تم نے اس کی جیبیں دیکھیں؟“
”ہاں۔ اچھی طرح دیکھ چکی ہوں۔ کسی جیب میں بھی

چابی نہیں ہے۔“

”پھر تو کمرے کا دروازہ ہی توڑنا پڑے گا۔“ ایگور بیڈروم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔
اس سے پہلے کہ وہ وہاں تک پہنچتا۔ بیڈروم کا دروازہ کھلا اور وہاں سے دو پولیس والے برآمد ہوئے جو میرے ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو نشانے پر لیتے ہوئے فرش پر بیٹھ جانے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ اپنے ہاتھ پشت پر کر لیں۔ جیسے ہی ان دونوں کو ہتھکڑی لگی میں صوفے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”مارٹا کا سترہ اور ایگور ڈی سلوا۔ تم دونوں کو ایڈورڈ گوریلا کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔“
وہ ایک دوسرے پر الزام لگانے لگے۔ ایگور کا کہنا تھا کہ مارٹا نے ہی اسے ایڈورڈ کو قتل کرنے پر مجبور کیا تھا جبکہ مارٹا اپنی صفائی میں کہہ رہی تھی کہ اس نے ایگور کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہر قیمت پر ایڈورڈ کو قتل کرنے پر تڑپا ہوا تھا۔

”تم نے ایڈورڈ کو قتل کیا ہے۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔“ مارٹا ہڈیانی انداز میں بولی۔
”بد معاش عورت! تو نے ہی مجھے اسے قتل کرنے پر اکسایا تھا۔“ ایگور نے جواب دیا۔
ان دونوں کو پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔ وہاں بھی ان کے درمیان یہی ٹکرا رہی رہی۔ قتل کا معاملہ تھا۔ اس لیے ان کی ضمانت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لہذا انہیں حوالات میں بند کر دیا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ انہیں عمر قید کی سزا ہو جائے گی۔ جب مارٹا کو حوالات میں بند کیا جا رہا تھا تو وہ مجھ سے بولی۔

”میں نے تمہارے گلاس میں بے ہوش کر دینے والی دوا کی اچھی خاصی مقدار ڈالی تھی۔ اس کے باوجود تم بے ہوش نہیں ہوئے۔“
”مجھے شبہ تھا کہ تم ضرور کوئی نہ کوئی حرکت کرو گی۔ اس لیے میں اسٹیکس لینے کے بہانے اپنا گلاس ہاتھ میں پکڑے پکڑے بچن میں چلا گیا اور وہاں سے دوسرے گلاس میں ہسکی ڈال کر لے آیا۔“

”لیکن تم نے میرا پتا کیسے چلایا؟“
”ایک سراغ رساں کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ جب میں نے ایڈورڈ گوریلا کا کمپیوٹر ریکارڈ چیک کیا تو اس کے ای میل باکس سے مجھے تمہارا نام اور ای میل ایڈریس مل گیا۔ تم اس سے بھی لوئیس بروکس کے نام سے چیٹنگ کرتی تھیں۔ تمہیں کم از کم اپنا نام تبدیل لینا چاہیے تھا۔“

”ہاں۔ بہت زیادہ۔“ میں نے اعتراف کیا۔
واقعی مارٹا فلم ایکٹریس بن سکتی تھی لیکن اب شاید اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے۔ اگر اسے پیروں پر رہائی مل گئی تب بھی بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

”کیا تم نے اس کی جیبیں دیکھیں؟“
”ہاں۔ اچھی طرح دیکھ چکی ہوں۔ کسی جیب میں بھی

چابی نہیں ہے۔“
”پھر تو کمرے کا دروازہ ہی توڑنا پڑے گا۔“ ایگور بیڈروم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔
اس سے پہلے کہ وہ وہاں تک پہنچتا۔ بیڈروم کا دروازہ کھلا اور وہاں سے دو پولیس والے برآمد ہوئے جو میرے ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو نشانے پر لیتے ہوئے فرش پر بیٹھ جانے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ اپنے ہاتھ پشت پر کر لیں۔ جیسے ہی ان دونوں کو ہتھکڑی لگی میں صوفے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”مارٹا کا سترہ اور ایگور ڈی سلوا۔ تم دونوں کو ایڈورڈ گوریلا کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔“
وہ ایک دوسرے پر الزام لگانے لگے۔ ایگور کا کہنا تھا کہ مارٹا نے ہی اسے ایڈورڈ کو قتل کرنے پر مجبور کیا تھا جبکہ مارٹا اپنی صفائی میں کہہ رہی تھی کہ اس نے ایگور کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہر قیمت پر ایڈورڈ کو قتل کرنے پر تڑپا ہوا تھا۔

کڑکٹ کیسے اپنے بارے میں خوش فہمی کا شکار تھا اور کیپٹن کی بات نہیں مانتا تھا۔ تمہیں معلوم ہے؟ اس نے کہا۔ دو کھلاڑیوں کو فوراً ٹیم سے نکال باہر کرنا چاہیے۔

”ہاں، مجھے معلوم ہے! کیپٹن سر دیکھ بولنا! تم دوسرے کا نام بتاؤ۔“
کڑکٹ کے دو عمر رسیدہ کھلاڑی ایک کلب میں کھڑے تھے۔
”تمہارا سب سے زیادہ اسکور کیا ہے؟“
”ایک سو دس رن ناٹ آؤٹ۔“
”میرا سب سے زیادہ اسکور ایک سو بیس رن ناٹ آؤٹ اور ایک اننگ میں زیادہ سے زیادہ وکٹوں کی تعداد؟“
”اوہ نہیں، اس بار پہلے تم بتاؤ۔“

”لیکن یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اسے ہم دونوں نے قتل کیا ہے؟“
”قاتل خواہ کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو۔ اپنے پیچھے کئی ثبوت چھوڑ جاتا ہے۔ تم ایڈورڈ سے نیٹ چیٹنگ کرتی رہیں۔ پھر جب اس نے تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس کے گھر پہنچ گئیں۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے پاس آئی تھیں۔ سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے میرے ساتھ ہوا پھر تم نے اس کے بیڈروم سے نقدی اور زیورات سمیٹے اور وہاں سے فرار ہونے ہی والی تھیں کہ اسے ہوش آ گیا۔ اس نے تمہارا راستہ روکنے کی کوشش کی تو ایگور نے تمہارے کہنے پر بے آواز پستول سے اس پر فائر کر دیا۔ اس کے گھر سے ہم نے تم دونوں کے قدموں اور انگلیوں کے نشانات حاصل کر لیے ہیں اور تمہیں مجرم ثابت کرنے کے لیے یہی ثبوت کافی ہیں۔ ہاں اگر تم اپنا نام بدل لیتیں تو شاید میں تم تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔“

”مجھے اس نام سے جذباتی لگاؤ ہے۔ میں اس جیسی ہی بننا چاہتی ہوں۔ سچ بتاؤ، کیا میری شکل اس سے نہیں ملتی؟“

”ہاں۔ بہت زیادہ۔“ میں نے اعتراف کیا۔
واقعی مارٹا فلم ایکٹریس بن سکتی تھی لیکن اب شاید اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے۔ اگر اسے پیروں پر رہائی مل گئی تب بھی بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

”لیکن تم نے میرا پتا کیسے چلایا؟“
”ایک سراغ رساں کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ جب میں نے ایڈورڈ گوریلا کا کمپیوٹر ریکارڈ چیک کیا تو اس کے ای میل باکس سے مجھے تمہارا نام اور ای میل ایڈریس مل گیا۔ تم اس سے بھی لوئیس بروکس کے نام سے چیٹنگ کرتی تھیں۔ تمہیں کم از کم اپنا نام تبدیل لینا چاہیے تھا۔“

”ہاں۔ بہت زیادہ۔“ میں نے اعتراف کیا۔
واقعی مارٹا فلم ایکٹریس بن سکتی تھی لیکن اب شاید اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے۔ اگر اسے پیروں پر رہائی مل گئی تب بھی بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

”لیکن تم نے میرا پتا کیسے چلایا؟“
”ایک سراغ رساں کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ جب میں نے ایڈورڈ گوریلا کا کمپیوٹر ریکارڈ چیک کیا تو اس کے ای میل باکس سے مجھے تمہارا نام اور ای میل ایڈریس مل گیا۔ تم اس سے بھی لوئیس بروکس کے نام سے چیٹنگ کرتی تھیں۔ تمہیں کم از کم اپنا نام تبدیل لینا چاہیے تھا۔“

”ہاں۔ بہت زیادہ۔“ میں نے اعتراف کیا۔
واقعی مارٹا فلم ایکٹریس بن سکتی تھی لیکن اب شاید اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے۔ اگر اسے پیروں پر رہائی مل گئی تب بھی بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

عزیمات قرض مسافت

سیانے کہتے ہیں... طوائف جب کسی مرد کی زندگی میں داخل ہوتی ہے تو اس کا پیچھا قبر تک نہیں چھوڑتی... جہاں کی راتیں انگڑائی لے کر جاگتی ہوں، ساز کی آواز پر گھنگرو کھنکھتے ہوں اور نظروں کی کاٹ دلوں میں تلاطم برپا کرتی ہو وہاں جذبات کی ہلچل چین لینے دیتی ہے نہ ہی مزاج کی آوارگی درست سمت میں چلنے دیتی ہے۔ یونہی تو وہ بھی درہ در محو سفر نہیں تھا... جانے کس مسافت کا قرض ادا کر رہا تھا... وہ جو شبیم کی بوندوں کے مانند نرم تھی، آج سراپا انتقام بن کر بستی بستی اس کے تعاقب میں بھنکتی پھر رہی تھی... وہ جو ایک خوشگوار جھونکے سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ اچانک تیز اندھی بن کر زندگی کی ہر شے کو الٹ پلٹ کر رکھ چھوڑا۔ ان بگولوں کی زد پر جانے کتنے چراغ بھڑک رہے تھے مگر... ان کی تھرکتی روشنی میں اسے صرف اپنے خوابوں کی کرچیاں دکھائی دے رہی تھیں، جن پر ناچتے ناچتے اس کے پیر لہولہاں تھے لیکن جوش انتقام نے اس کے خوابوں کی طرح گھنگروٹوں کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ حتیٰ کہ نفرت کا الاٹھو سرد ہونے سے پہلے ہی اس کی بے ترتیب کہانی کو انجام مل گیا... جس کے ہر اسان کردار بالآخر اخبار کی ایک بڑی سرخی میں ڈھل گئے... سیانے سچ ہی کہتے ہیں... طوائف موت سے قبل پیچھا نہیں چھوڑتی... خواہ اپنی موت ہو یا اپنے چاہنے والے کی... انتقام کے اندھیرے میں لہو کے دیے روشن کرنا پڑتے ہیں۔

رنگین لحاظ میں حسین چہروں کے بدلے رنگ اور... سنگین واردات قلبی کا شاخسانہ

احمد علی کا شمار ان خوش نصیبوں میں ہوتا تھا جو دین اور دولت دونوں ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ہزار گز کی کوشی میں مقیم تھے لیکن قبر کی دو گز زمین کو نہیں بھولے تھے۔ کاروباری آدمی تھے لیکن اپنے طبقے کے دوسرے افراد کی طرح کاروباری سیاست اور بے ایمانی سے کوسوں دور تھے۔ خدا نے برکت بھی شاید اسی لیے دی تھی۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتے مٹی کو سونا بنا کر اٹھتے۔ تجارتی حلقوں میں ان کی عزت بھی تھی اور شہرت بھی۔

اس اعتبار سے بھی خوش قسمت تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نیک اولاد سے نوازا تھا۔ دو بیٹیاں تھیں جو نئے زمانے کے ساتھ چل ضرور رہی تھیں لیکن اس مادر پدر آزادی سے

دور تھیں جس کے نمونے دولت مند گھرانوں میں دیکھے جاسکتے تھے۔ ایک بیٹا تھا جسے انہوں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی اور اب وہ کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ بیٹیاں تو خیر پرایا دھن ہوتی ہیں لیکن انہیں اپنے اکلوتے بیٹے سرفراز علی سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ ضرورت سے زیادہ پھیلا ہوا کاروبار اسی کا تو تھا اور اسی کو اس کاروبار کی حفاظت کرنی تھی۔ سرفراز علی کی سعادت مندی اور قابلیت صاف بتا رہی تھی کہ وہ ان کی امیدوں پر پورا اترے گا۔

احمد علی اس جنت میں آباد بھی تھے اور خوش بھی کہ ایک روز ایک چنگاری نے ان کے اعتماد کی فصل کو جلا ڈالا۔ انہیں خبر ملی کہ سرفراز علی کا ایک طوائف ستارہ ہائی کے گھر آنا جانا



ہے۔ یہ ایسی اطلاع نہیں تھی جسے وہ آسانی سے برداشت کر لیتے۔ سننے ہی سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

”یا الہی! میری تربیت میں کہاں کی رہ گئی جو یہ خبر سننے کو ملی ہے۔“ وہ اسی وقت دفتر سے اٹھے اور اپنی بہن مخدومہ جہاں کے گھر پہنچ گئے۔ مخدومہ جہاں خاندان میں سب سے بڑی بھی تھیں اور نہایت سمجھ دار بھی۔ واجبی سی پڑھی لکھی تھیں لیکن مسائل کی بغیر پر ایسا ہاتھ تھا کہ ان کے مشورے ہمیشہ کار آمد ثابت ہوتے تھے۔ احمد علی تو ان کے ایسے معتقد تھے کہ کاروباری معاملات میں بھی ان سے مشورہ لے کر قدم اٹھاتے تھے۔

مخدومہ جہاں ابھی نماز ظہر پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں کہ ملازمہ نے احمد علی کے آنے کے خبر پہنچادی۔ یہ کوئی ایسی اطلاع نہیں تھی کہ وہ پریشان ہو جاتیں۔ احمد علی خلاف معمول اس وقت آئے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ان کے لیے وقت کی کوئی پابندی تھی۔ بھائی تھے کسی وقت بھی آ سکتے تھے۔ مخدومہ جہاں جیسی بیٹی تھیں انھیں کڑوا رنگ روم میں آگئیں۔

”احمد علی خیریت تو ہے۔ اس وقت تو تمہیں اپنے آفس میں ہونا چاہیے تھا۔“

”بات ہی ایسی تھی کہ مجھے ناوقت آنا پڑا حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت آپ آرام کرتی ہیں۔“

”میرے آرام کو چھوڑو۔ تم بتاؤ بات کیا ہے بہ صورت سے بھی کچھ پریشان لگ رہے ہو۔“

”آپ سنیں گی تو آپ بھی پریشان ہو جائیں گی۔ سرفراز علی نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔“

”ایسا کیا کر دیا اس نے۔ مجھے تو اس سے ایسی ویسی امید نہیں۔“

”امید تو مجھے بھی نہیں تھی لیکن اس نے وہ کیا ہے جو ہمارے خاندان میں کسی نے نہیں کیا۔ مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی طوائف کے پاس جانے لگا ہے۔ اب میں آپ کے پاس مشورے کے لیے آیا ہوں کہ اس مردود کے ساتھ میں کیا سلوک کروں۔“

”احمد علی، تم نے مجھے ذرا ہی دیا تھا۔ جوان بچہ ہے ایسی غلطی اس عمر میں ہوئی جاتی ہے۔ اب تمہیں عقل مندی سے کام لینا ہوگا۔“

”آپ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ کیسے پیچھا چھڑاؤں اس نامعقول طوائف سے سرفراز علی کا۔“

”اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ سرفراز سے بھی نہیں۔ یوں بنے رہو جیسے تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔“

”اس سے کیا ہوگا۔ وہ اس طوائف کے پاس جانا چھوڑ دے گا؟“

”اس کے بعد تمہیں کیا کرنا ہے یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ اس وقت تم گھر جاؤ اور آرام کرو۔“

”باجی، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ سرفراز کو اس کے حال پر چھوڑ دوں۔ یہ کیسے ہوگا؟“

”بہت جلد سمجھ جاؤ گے۔ ابھی میں جو کہہ رہی ہوں وہ کرو۔“ احمد علی چپ ہو گئے۔ اس کے بعد کچھ نہیں بولے۔ تھوڑی دیر بیٹھے پھر اٹھ کر چلے آئے۔

☆☆☆

احمد علی کی بیوہ بہن لندن سے کراچی مستقل قیام کے لیے آ رہی تھیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ کچھ دن وہ احمد علی کے پاس رہیں گی پھر اپنی رہائش کا الگ بندوبست کر لیں گی۔ اس عرصے میں ان کا بیٹا بھی اپنی تعلیم مکمل کر کے امریکا سے واپس آچکا ہوگا۔

سلطانہ جہاں پورے پندرہ سال بعد واپس آ رہی تھیں۔ ان کا بیٹا علی بارہ سال کا اور بیٹی فرزانہ پانچ سال کی تھی۔ جب انہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان چھوڑ دیا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد انہوں نے شوہر کا کاروبار وائسٹڈ اپ کیا اور اب پاکستان آ رہی تھیں۔

احمد علی اپنی بہنوں سے بہت محبت کرتے تھے اور سلطانہ جہاں تو بیوہ ہو گئی تھیں۔ محبت کے ساتھ ہمدردی بھی شامل ہو گئی تھی۔ انہی کے مشورے سے وہ پاکستان آ بھی رہی تھیں۔

سلطانہ جہاں کا خط ملتے ہی احمد علی نے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ کوٹھی کا اوپری حصہ نوکروں کے سپرد کر دیا تھا کہ جلد سے جلد صفائی ستھرائی مکمل کر لیں۔ جس روز فلائٹ تھی اس روز احمد علی کی بے چینی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سرفراز علی سے ایک دن پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ اتر پورٹ چلے جائیں گی کہ ان کی تنظیم جو بیمار چلی آ رہی تھی انہیں بھی حکم ہوا کہ وہ بھی اتر پورٹ چلیں گی۔ وہ کہتی ہی رہ گئیں کہ سلطانہ کو آنا تو نہیں ہے میں یہاں مل لوں گی لیکن احمد علی نے انہیں گاڑی میں بٹھایا دیا۔ یہ قافلہ اتر پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔

اتر پورٹ لاؤنج میں بیٹھے ہوئے سرفراز کی اکٹاہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسے اس وقت ستارہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ ستارہ کو اس نے ایک جگہ شام کی چائے پر بلایا تھا۔ باپ سے کچھ کہہ نہیں سکا تھا اور اب پرواز میں تاخیر

قرض مسافت

ہو رہی تھی۔ لگتا تھا شام نہیں ہو جائے گی۔

اس نے بہت سوچ سمجھ کر باپ سے کوئی بہانہ کرنا چاہا کہ واپسی کا موقع مل سکے لیکن اسی وقت اعلان ہو گیا کہ پرواز کی آمد ہو چکی ہے۔ اب ہر بہانہ بے کار تھا۔ اسے بھی دوسروں کی طرح انتظار کرنا تھا کہ سامان کی کلیئرنس وغیرہ کے بعد ان کی ملاقات ہونے والی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ان کی بیٹی فرزانہ کا خیال بھی آیا۔ اس کا ہلکا سا عکس اب بھی اس کی آنکھوں میں تھا۔ وہ پانچ چھ سال کی ہوگی جب لندن گئی تھی۔

وہ ابھی ان خیالوں میں گم تھا کہ احمد علی نے سب کی توجہ سلطانہ جہاں کی طرف مبذول کرائی۔ نگاہیں اٹھی تھیں کہ سلطانہ جہاں اور فرزانہ دوسرے مسافروں کے ساتھ دروازے سے باہر آئیں۔ ان کی نظروں نے بھی بھائی کو تلاش کر لیا۔ گھلے مل کر دیر تک آنسو بہاتی رہیں۔ بیوہ ہونے کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان آئی تھیں۔ یہ آنسو فطری تھے۔ بیوگی کا سارا دکھ ان آنسوؤں سے ساتھ بہہ نکلا تھا۔ بھائی سے جدا ہوئیں تو باری باری سب کو گلے سے لگایا۔ فرزانہ احمد علی کی دونوں بیٹیوں سے گپ شپ میں مشغول ہو گئی تھیں۔

سرفراز کو ان مناظر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ فرزانہ کی مسکورت کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے براؤنش بال اس کی کمر سے نیچے تک جھول رہے تھے۔ جینز اور شرٹ میں بے حد متاثر کن لگ رہی تھی اور جب سلطانہ جہاں نے اس کا تعارف سرفراز سے کرایا تو وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

”یہ فرزانہ ہے، تمہیں یاد تو ہوگا؟“

”پھوپھی جان، میں نے کچھ کچھ یاد تو آ رہا ہے لیکن اگر آپ نہ بتاتیں تو میں پہچان نہیں سکتا تھا۔“

”تم بھی تو بدل گئے ہو۔ پندرہ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔“ فرزانہ کو تو وہ بالکل بھی یاد نہیں تھا۔ ایک آدھ تصویر دیکھ لی ہو تو الگ بات ہے ورنہ پانچ سال کی بچی کو کیا یاد رہتا ہے۔

”اب کیا ساری باتیں یہیں کر لوگی۔ کچھ باتیں گھر کے لیے بھی بچا کر رکھو۔“ احمد علی نے یاد دلایا کہ دیر ہو رہی ہے۔ سرفراز علی ابھی تک اکتایا ہوا تھا۔ اسے ستارہ سے ملنے کی جلدی ہو رہی تھی۔ جب سے وہ اس سے ملا تھا یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس کے گھر سے باہر اس سے مل رہا تھا اور آج ہی یہ رکاوٹیں درمیان میں آ گئی تھیں۔ جلدی جلدی سامان گاڑیوں

میں رکھا گیا اور یہ قافلہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔

مخدومہ جہاں بھی احمد علی کے گھر ہی پہنچ گئی تھیں۔ کب کب کی باتیں کس انداز سے ایسی چھڑیں کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ باتوں کے درمیان سرفراز کا ذکر آیا تو اسے بلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پوری کوٹھی چھان ماری۔ اس کی خوشبو بھی وہاں موجود نہیں تھی۔ کسی کو کچھ بتا کر بھی نہیں گیا تھا۔ احمد علی نے پھر خود ہی بہانہ کر دیا کہ ایک بزنس میٹنگ تھی وہ وہاں چلا گیا ہوگا۔ انہوں نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا تھا لیکن انہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہوگا۔ وہ اپنی بہن مخدومہ جہاں کو ایک طرف لے گئے اور اپنی تشویش سے انہیں آگاہ کیا۔

”باجی، آپ دیکھ رہی ہیں سرفراز علی کس طرح میری ناک کٹانے پر تلا ہوا ہے۔“

”اب کیا ہو گیا؟“

”گھر میں مہمان بھرے ہوئے ہیں اور وہ غائب ہے۔“

”تم نے خود ہی تو بتایا ہے کہ وہ کسی بزنس میٹنگ میں ہے۔“

”اور کیا کہنا سب کو یہ بتانا کہ وہ کسی طوائف سے ملنے جاتا ہے، وہیں گیا ہوگا۔ کوئی میٹنگ نہیں تھی۔ وہ اسی طوائف کے گھر گیا ہوگا۔ آپ نے مجھے روک دیا ہے ورنہ میں اس طوائف کے پر بھی کاٹ دیتا اور سرفراز کے پیروں میں زنجیریں بھی ڈال دیتا۔“

”احمد علی! سرفراز جس کا قیدی ہے وہ عورت نہیں طوائف ہے۔ طوائف کا نشہ والدین کی سختی سے نہیں اترتا۔ مصلحت سے اترتا ہے۔ سختی کرو گے تو بیٹا ہاتھ سے چلا جائے گا۔“

”وہ میری نرمی کا غلط فائدہ اٹھا رہا ہے۔“

”سختی کا فائدہ تمہیں نہیں پہنچے گا۔“

”تو کیا خاموش بیٹھا رہوں۔ گھر میں سلطانہ اور اس کی بیٹی آگئی ہیں۔ انہیں کب تک معلوم نہیں ہوگا کہ صاحبزادے کے رنگ ڈھنگ کیا ہیں۔“

”کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ آگے آگے دیکھتے جاؤ کیا ہونے والا ہے۔ ابھی تو میں نے پہلا قدم اٹھایا ہے کہ سلطانہ یہاں آگئی ہے۔ آگے کیا کرنا ہے یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔“ احمد علی کی سمجھ میں کچھ بھی تو نہیں آیا لیکن بہن کے ادب میں کچھ نہ کہہ سکے۔

☆☆☆

حیران رہ گئی کہ شادی کا نام سن کر ان کا غصہ جھاگ کی طرح بجھ گیا ہے اور وہ اس سے کہہ رہی ہیں کہ سرفراز کو ان کے پاس بھیجے۔

”وہ کہہ رہا تھا اس کے گھر کچھ مہمان آکر ٹھہرے ہیں اس لیے وہ کچھ دن نہیں آسکے گا۔ مجھے یہ موقع بھی دیا ہے کہ میں اچھی طرح سوچ لوں۔“

”ٹھیک ہے تم اچھی طرح سوچ لو لیکن یہ یاد رکھنا کہ طوائف کو شادی راس نہیں آتی۔ تم سے محبت سرفراز کرتا ہوگا اس کے گھر والوں کو تم سے کوئی غرض نہیں ہوگی۔ آئندہ چل کر جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ سرفراز کو یہ وہم ہمیشہ ستا رہا ہے گا کہ تم طوائف کی زندگی گزار چکی ہو۔ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد ہی شادی کا دم بھرنا۔“ ماں کی ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں تھی جسے ستارہ جھٹلا سکتی۔ اس نصیحت میں ان کا تجربہ بول رہا تھا جسے آسانی سے جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔

ستارہ کی ماں کا نام افشاں بیگم تھا۔ وہ ہمیشہ سے طوائف نہیں تھیں۔ ان کے شوہر نے ان پر بد چلنی کا الزام لگایا اور چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ بھری ہوئی شیرینی کی طرح انتقام لینے پر تل گئیں۔ انتقام لینے کے کئی طریقے ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے ایک انوکھا طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ اپنے گھر کے دروازے پر اے مردوں کے لیے کھول دیے۔ شوہر کے نام پر اپنی عزت کی دجیاں بکھیرتی رہیں۔ یہ سوچ کر خوش ہوتی رہیں کہ جس کی بیوی ہیں عزت اس کی خراب ہو رہی ہے۔ ان کا شوہر بھی کوئی ایسا بے حس تھا کہ پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس کی دو بیٹیاں بھی ہیں جو ماں کے ساتھ ہیں ان کا انجام اور مستقبل کیا ہوگا۔

افشاں بیگم خوب صورت بھی تھیں اور جوان بھی۔ خریداروں نے گھر دیکھ لیا۔ ان خریداروں میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس کا تعلق بازار حسن سے تھا۔ اس نے افشاں بیگم کو مشورہ دیا کہ شریفوں کے محلے سے طوائفوں کے محلے میں آباد ہو جائیں۔ افشاں بیگم کوئی پیشہ ور خاندانی طوائف نہیں تھیں۔ وہ کسی قیمت پر تیار نہیں ہو رہی تھیں جبکہ اس شخص کا مفاد اسی میں تھا کہ وہ انہیں ریڈ لائن ایریا میں لے جائے۔ اس شخص کا نام لاڈلا تھا اور یہ بازار میں بیٹھنے والی طوائفوں کے لیے کام کرتا تھا۔ ایسے لوگوں کے پولیس میں بھی بہت تعلقات ہوتے ہیں۔ اس نے پولیس سے مل کر افشاں بیگم کے گھر پر چھاپا ڈلوایا۔ افشاں بیگم اور ان کی دونوں کم سن بیٹیاں تنہا پھنس دی گئیں پھر یہی شخص ان کا ہمدرد بن کر

نئی کہ بھرے کے دوران بھی تمہارے پاؤں تمہارا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ تمہا شائی مایوس ہو کر گئے ہیں۔ یہی حال رہا طوائفوں کی نوبت دور نہیں ہوگی۔“

”اماں میں انسان ہوں کبھی بھی تھک بھی جاتی ہوں۔“

”طوائف بس طوائف ہوتی ہے۔ نہ انسان ہوتی ہے نہ برت۔ وہ تھکتی اس وقت ہے جب کچھ اور بننے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ تو کچھ اور بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ سچ بتا تو مجھ سے پہلے کہاں گئی تھی۔ جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ جھوٹ صرف شریفوں میں بولا جاتا ہے اور تو شریف نہیں ہے۔“

”میں سرفراز علی سے ملنے گئی تھی۔“

”یہاں کون سی پابندی تھی جو تجھے باہر جانا پڑا۔ وہ یہاں دن کے وقت بھی آتا ہے۔ میں نے کبھی پابندی نہیں لگائی۔ ان رئیس زادوں کے دم سے ہی ہماری دنیا آباد ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے حکم پر چلا جائے۔ انہیں ان کی اوقات پر رکھا جائے تو یہ ٹھیک رہتے ہیں۔“

”وہ ایک ایسی بات مجھ سے کہنا چاہتا تھا جو اس گھر میں نہیں کہی جاسکتی تھی۔“

”ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے؟“

”وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ اس نے کوئی ایسی بات کہہ دی تھی کہ ستارہ کی ماں سناٹے میں آ گئی۔ خود ستارہ شدید رد عمل کے انتظار میں تھی۔

”ذرا پھر سے کہہ اس نے کیا بات کرنے کو تجھے بلایا تھا؟“

”وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”طوائف کے لیے شادی کا لفظ گالی سے کم نہیں ہوتا۔ تو نے یہ گالی سنی کیسے؟“

”اب تو اس گالی ہی میں میری نجات ہے۔“

”کوٹھوں پر آنے والی براتوں کا انجام تو جانتی ہے؟“

دور کیوں جاتی ہے اسی بازار کی ایک لڑکی گھنٹا گئی۔ وہ بھی اس طرح اپنے نجات دہندہ کے ساتھ بھاگی تھی۔ اسی نجات دہندہ نے اس کے چہرے پر تیزاب پھینکا۔ مجھے تیرے انجام سے ڈر لگتا ہے۔“

”ضروری نہیں تیزاب کی کوئی بوتل میرے لیے بھی تیار رکھی ہو۔“

”اگر تجھے اتنا ہی یقین ہے تو سرفراز سے کہنا مجھ سے بات کرے۔“ ستارہ نے چونک کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان کا رد عمل شدید ہوگا لیکن وہ یہ دیکھ کر

میری جان سے لپٹے ہوئے یہ لوگ اتنی آسانی سے مجھے آپ کے حوالے نہیں کریں گے۔“

”میں تمہارے لیے ہر طاقت سے ٹکرا جاؤں گا۔ تمہاری ماں کا منہ بند کرنے کے لیے میرے پاس بہت دولت ہے تم کیوں فکر کرتی ہو۔“

”شریف گھروں میں رہنے والی لڑکیوں کے مقابلے میں ہماری آزادی کچھ بھی نہیں۔ ہم اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم کچھ پتلیاں ہیں جن کی ڈور ٹائیکہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے آپ کو اماں سے بات کرنی ہوگی اور مجھے پکا یقین ہے کہ وہ آپ کو مایوس کر دیں گی۔“

”تم بے زبان نہیں ہو ستارہ۔ کیا تم میری حمایت نہیں کرو گی؟“

”میں صرف اتنا کہہ سکوں گی کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔“

”میرے لیے یہی گواہی بہت ہوگی۔ میں عنقریب تمہاری ماں سے بات کروں گا۔“

”میں اب چلتی ہوں۔ مجھ سے کا وقت ہونے کو ہے۔ میں نہیں پہنچی تو قیامت پہنچ جائے گی۔ اماں مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔“

”میں کتنا بد نصیب ہوں مجھ سے کے لیے خود تمہیں یہاں سے جانے کے لیے کہوں گا۔“

”میرے پاؤں بھی اب اس راہ پر چلنے کو تیار نہیں لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔“

☆☆☆

محفل ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ ستارہ جھکن سے چور اپنے بستر پر اوندھی لیٹی تھی۔ وہ اتنی تھک گئی تھی کہ لباس تو کیا بدلتی ٹھنکرو اتارنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر اس کے قریب ہی بستر پر بیٹھ گئی۔ ستارہ کو جیسے ہی احساس ہوا کوئی اس کے بستر پر بیٹھا ہے وہ سیدھی ہو گئی۔

”اماں، تم کیوں آ گئیں۔ کوئی بات تھی تو نازلی سے کہلوادیا ہوتا میں آ جاتی۔“

”مجھ سے کے بعد تم ہمیشہ میرے کمرے میں آتی تھیں۔“

”میں آج بہت تھک گئی تھی۔ میرے پاؤں میرے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔“

”تھکن جسم میں نہیں روح میں ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہی

شہر کے ایک پر رونق اور مشہور ریستورنٹ میں ستارہ اور سرفراز آنے سامنے بیٹھے تھے۔ ستارہ کو اس وقت طوائف کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا عبا یا پہنا ہوا تھا۔ شاید یہ اہتمام اس لیے تھا کہ پہچانی نہ جائے۔

”تم جانتی ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟“

”میں خود حیران ہوں۔ میرے گھر میں تنہائی کا ایسا کون سا موقع ہے جو آپ کو نہیں ملتا ہے پھر یہاں اس بھرے ریستورنٹ میں آنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟“

”میں جو بات پہلی مرتبہ تم سے کہنا چاہتا ہوں وہ تمہارے گھر پر نہیں کہی جاسکتی تھی کیونکہ گھروں کی باتیں کوٹھوں پر نہیں کی جاتیں۔“

”اس کوٹھے پر آپ بڑے شوق سے آتے رہے ہیں۔“

”میں تماش بین کی حیثیت سے آیا کرتا تھا جہاں ستارہ نام کی ایک طوائف کو میں پسند کرنے لگا تھا۔ اب میں صرف ستارہ سے ملنا چاہتا تھا۔ اسی لیے تمہیں اس ریستورنٹ میں بلایا ہے۔“

”میں پوچھ سکتی ہوں، ستارہ سے آپ کو کیا کام آن پڑا ہے؟“

”میں تمہیں طوائف سے لڑکی بنانے کا خواہاں ہوں۔ یہ احساس دلانے کے لیے یہاں بلایا ہے کہ تمہارے کوٹھے سے باہر بھی ایک دنیا آباد ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”یہ سننے کے لیے میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔ میں خود بھی اپنی موجودہ زندگی سے بے زار ہو چکی ہوں لیکن آپ اس کام کو جتنا آسان سمجھ رہے ہیں یہ کام اتنا آسان ہے نہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ میں جس معاشرے میں ہوں وہاں شادی کا مطلب بربادی ہوتا ہے۔ ان سب کی بربادی جنہیں میرے پیروں میں بندھے ٹھنکرو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ میرے جسم کی گرمی سے میرے گھر کا چولہا جلتا ہے۔ میری ماں جسے عرف عام میں ٹائیکہ کہا جاتا ہے میری کمائی پر غش کرتی ہے۔ سازندوں کی ٹولی، نوکر چاکر سب کے سب اجڑ جائیں گے میری شادی سے۔“

”تو کیا ان سب کی خاطر تم میری محبت ٹھکرا دو گی؟“

”نہیں سرفراز نہیں۔ میں تو محبت سے آگے بڑھ کر تمہیں اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگی ہوں۔ میں تو صرف یہ بتا رہی تھی کہ

خدارا • خدارا

شوگر مریض

ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہتا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبہ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوائیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دوا خانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0308-6627979

0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں

شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

آغاز کیا تو بازار میں سب کے چراغ گل کر دیے۔ پہلے حجرے کا شور مچا تو تماشا بینوں کا ہجوم لگ گیا۔

یہی دن تھے جب سرفراز کسی دوست کے ہمراہ وہاں پہنچا اور ستارہ کا اسیر ہو گیا۔ چشم فلک نے ان کوٹھوں پر بہت سون کو اسیر ہوتے اور برباد ہوتے دیکھا ہے لیکن سرفراز کی قسمت اچھی تھی۔ صرف وہ ستارہ کا اسیر نہیں بنا تھا بلکہ ستارہ کا دل بھی اس کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ طوائف جب کسی سے محبت کرتی تھیں تو وہ اسے نجات دہندہ سمجھتی تھیں۔ ایسا نجات دہندہ جو اسے گناہ کی زندگی سے نجات دلائے گا۔ اسے طوائف سے عورت بنادے گا۔ ستارہ کی رگوں میں کسی شریف باپ کا خون دوڑ رہا تھا اس لیے یہ احساس اس کے دل میں نہایت شدت سے بیدار ہوا۔ وہ دیوانہ وار سرفراز کی طرف بڑھتی گئی۔ اب ان کی ملاقاتیں محفل کے ہجوم سے نکل کر دن کی تنہائیوں تک آ گئیں۔ طوائفوں کے کوٹھے دن کے وقت قبرستان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ افشاں بیگم کا بڑھا پا بھی رات کی نیند دن کے وقت پوری کر رہا ہوتا تھا۔ اس سنانے میں دونوں کی محبت پر دان چڑھتی رہی۔ ستارہ کا وجود اس گھر میں سونے کی چڑیا کی طرح تھا۔ افشاں بیگم کو یہ کبھی گوارا نہ ہوتا کہ اس کے ناپتے ہوئے قدم رک جائیں اور لکشمی برسنہ بند ہو جائے لیکن سرفراز کی دولت ان کا منہ بند کیے ہوئے تھی اور جب انہوں نے یہ سنا کہ وہ ستارہ سے شادی کا خواہش مند ہے تو ان کے اندر کی ماں جاگ گئی۔ انہوں نے عام طوائفوں کی طرح ہنگامہ کھڑا نہیں کیا بلکہ خاموشی سے کہہ دیا کہ سرفراز سے کہو مجھ سے بات کرے۔

☆☆☆

سلطانہ بیگم کو آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اس ایک ہفتے میں وہ صرف دو مرتبہ ان سے ملا تھا۔ کاروبار کی مصروفیات کا بہانہ کر کے جان چھڑالی تھی۔ گھر میں مہمانوں کا وجود اس کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ ان کی موجودگی میں ستارہ سے اپنی شادی کا تذکرہ چھیڑنا مشکل تھا۔

ستارہ سے اس کی ملاقاتیں برابر ہو رہی تھیں۔ اس نے اسے بھی بتا دیا تھا کہ مہمانوں کے چلے جانے کے بعد وہ اپنی شادی کی بات اپنے والد سے کرے گا۔

انہی دنوں احمد علی کو بزنس ٹور پر ملک سے باہر جانا پڑا۔ انہوں نے جاتے وقت سرفراز کو پابند کر دیا کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں سلطانہ بیگم اور فرزانہ کا خیال رکھے گا خصوصاً فرزانہ کو کہیں جانا ہو تو وہ اس کے ساتھ جائے گا۔

وہ اس روز جلدی گھر آ گیا تھا۔ ستارہ سے ملے کئی دن

ستارہ اور نیلما رقص بھی سیکھنے لگیں۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ افشاں بیگم کی دونوں بیٹیاں بڑی محنت سے تعلیم حاصل کر رہی تھیں خصوصاً ستارہ بیگم سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ اسے آواز بھی اچھی ملی تھی اور صورت بھی اللہ نے خوب بنائی تھی۔ سمجھ بوجھ بھی اتنی تھی کہ مشکل سے مشکل دھنیں بڑی آسانی سے ازبر کر لیتی تھی۔

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ افشاں بیگم نے اپنی پوری جوانی جسم فروشی میں گزاری تھی لیکن نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ہاتھ اس کی بیٹیوں کی طرف بڑھے۔ اسے لاڈلے کی طرف سے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا جو بھنورے کی طرح ستارہ کے گرد گھومتا رہتا تھا۔ وہ اپنے گاہکوں کی موجودگی میں بھی لاڈلے کی طرف سے غافل نہیں رہتی تھی۔ جتنی دیر وہ اپنے کسی گاہک کے ساتھ کمرے میں بند رہتی اس کے کان باہر کی آوازوں پر لگے رہتے کہ لاڈلا کہیں زور زبردستی تو نہیں کر رہا ہے۔

اب وقت اس موڑ پر آ گیا تھا جب ستارہ پہلے حجرے کے لیے تیار تھی۔ رسم کے مطابق پہلا حجرہ خاندان والوں کے سامنے ہونا تھا۔ خاندان سے مراد بازار حسن کے وہ تمام لوگ تھے جو اس پیشے سے وابستہ تھے۔ سب کو دعوت نامے بھیج دیے گئے۔ نامی گرامی طوائفیں اس نئے پھول کی مہک کو محسوس کرنے کے لیے افشاں بیگم کے مکان پر جمع ہو گئیں۔ مختلف کوٹھوں کے سازندے بھی بلائے گئے تھے کہ وہ ستارہ بیگم کی قدر و قیمت کی گواہی پیش کریں۔ اس محفل میں کسی تماشا کی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ سازندوں نے ساز چھیڑے۔ پردوں کو جنبش ہوئی چھم چھم کی آواز نے احساس دلایا کہ قیامت قریب ہے پھر ایک شان بے نیازی سے ستارہ محفل میں نمودار ہوئی۔ ایک ایک کی خدمت میں پیش ہو کر فرشی سلام پیش کیا۔ جواب میں دعائیں لیں۔ طلبے پر تھاپ پڑی، سارنگی نے سہارا دیا۔ ستارہ نے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر سارنگی کا ساتھ دینا شروع کیا۔ ساتھ میں ہتھکڑیوں کی آواز شامل ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے ستارہ دائرہ سا بنا کر گھومنے لگی۔ یہ دائرہ ٹوٹا تو ستارہ فرش پر گئی۔ گردن اٹھائی تو کسی غزل کے بول اس کے لبوں پر تھے۔ رقص کا انداز سب نے دیکھ لیا تھا۔ اب اس کی آواز کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ محفل ختم ہوئی تو تجربہ کار طوائفوں کی زبان پر پیش گوئی تھی کہ وہ افشاں بیگم کو سونے کی ترازو میں تول دے گی۔

ان کے یہ بھرے دل خوش کرنے کے لیے نہیں تھے۔ برسوں کا تجربہ تھا جو بول رہا تھا۔ ستارہ نے جب عام مجرموں کا

تھانے آگیا اور اپنی ضمانت پر انہیں رہا کر کے لے آیا۔ اس نے افشاں بیگم کو ایک مرتبہ پھر سمجھایا کہ اگر وہ ان مخلوق میں رہی تو اسی طرح پولیس پریشان کرتی رہے گی۔ افشاں بیگم کو ابھی پوری طرح نصیحت نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے خوفزدہ ہو کر صرف اتنا کیا کہ شوہر کا گھر فروخت کر کے ایک اور گھر کرائے پر لے لیا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ گھر بدل لینے سے پولیس کی آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ ایسا ہو بھی جاتا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ لاڈلا برابر ان کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ لاڈلا نے ایک مرتبہ پھر اپنے تعلقات استعمال کیے اور چھاپا ڈلوادیا۔ اس مرتبہ پولیس نے کچھ زیادہ ہی جالا کی دکھائی۔ افشاں بیگم کو نہ صرف گرفتار کر کے تھانے لے گئی بلکہ گھر میں رکھے ہوئے زیورات اور نقدی پر بھی ہاتھ صاف کر لیا۔

افشاں بیگم نے چند گھنٹے تھانے میں گزارے تھے اور پولیس والوں کی غلیظ گالیاں سنی تھیں کہ لاڈلا پھر سامنے آ گیا۔ افشاں بیگم کو چھڑا کر لے آیا۔ افشاں بیگم اس کے احسان تلے دب گئی تھیں لیکن وہ اب بھی طوائفوں کے محلے میں جا کر آباد ہونے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

علاقے کا ایس ایچ او ان کے دروازے پر آیا۔ وہ سمجھیں پھر کوئی چھاپا پڑ گیا ہے۔ چھاپا پڑا ضرور تھا لیکن اس مرتبہ افشاں بیگم تھانے نہیں گئیں بلکہ تھانہ ان کے گھر آ گیا۔ ایس ایچ او نے ایسا گھر دیکھا کہ وقت بے وقت چلا آتا تھا۔ افشاں بیگم کو مفت میں اس کی خدمت کرنی پڑتی تھی۔ افشاں بیگم نے لاڈلے سے مشورہ کیا۔ اس نے پھر یہی مشورہ دیا کہ وہ بازار حسن میں کوئی جگہ لے کر رہنے لگیں۔ اس نے وہاں کی آزادی اور بے فکری کا ایسا نقشہ کھینچا کہ افشاں بیگم تیار ہو گئیں۔ لاڈلا کی کوششوں سے ایک مکان مل گیا۔ افشاں بیگم وہاں منتقل ہو گئیں۔ لاڈلا بھی ان کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔

جسم فروش عورتوں کی عزت بازار حسن میں ہی ہوتی ہے اور پھر افشاں بیگم کی عمر بھی اب ڈھلتی جا رہی تھی لہذا لاڈلے نے مشورہ دیا کہ افشاں بیگم اپنی دونوں بیٹیوں ستارہ اور نیلما کو موسیقی کی تعلیم دلائے تاکہ جب وہ اپنی عمر کو پہنچیں تو ان کا شمار گانے والی طوائفوں میں ہو۔ افشاں بیگم کو بھی یہ مشورہ پسند آیا۔ وہ خود جس جہنم سے گزری تھیں نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹیاں بھی اس دہکتے لاڈ میں جلتی رہیں۔ وہ اس بازار سے واپس تو نہیں جاسکتی تھیں لیکن اتنا تو کر سکتی تھیں کہ پیٹے کی نوعیت بدل لیں۔ لاڈلا کی معرفت ایک استاد گھر پر آنے لگا۔ موسیقی کے ساتھ رقص بھی ضروری ہوتا ہے لہذا

ہو گئے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ ستارہ کی طرف جائے گا۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ابھی کمرے میں ہی تھا کہ فرزانہ آگئی۔

”اس وقت میں کچھ اور مانگتی تو وہ بھی مل جاتا۔“

”کیا مانگا تھا تم نے؟“

”یہی کہ آپ کے ساتھ بازار جاؤں گی اور آپ تیار کھڑے ہیں جیسے آپ کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ میرے ساتھ بازار جانا ہے۔“

”میں بازار جانے کے لیے نہیں اپنے کسی کام سے جانے کے لیے تیار ہو رہا ہوں۔“

”اب آپ میرے ساتھ بازار جائیں گے۔“

”آج تم اکیلی چلی جاؤ یا راستے سے سعدیہ کو ساتھ لے لیتا۔ میں پھر کسی دن تمہارے ساتھ چلا جاؤں گا۔“

”آپ مجھ سے اتنا پرہیز کیوں کرتے ہیں؟“

”اس لیے کہ میرے پاس شاپنگ وغیرہ کے لیے فالٹو نام نہیں ہوتا۔“

”بچپن میں تو آپ مجھ سے کہتے تھے کہ فرزانہ ساتھ جائے گی تو بازار جاؤں گا ورنہ نہیں۔“

”مجھے تو ایسی کوئی ضد یاد نہیں۔“

”آپ کو تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ آپ گھوڑا بنتے تھے اور میں گھوڑے پر بیٹھا کرتی تھی۔“

”بچپن کی باتیں بے کار لوگ یاد کرتے ہیں اور میں بے کار نہیں ہوں۔“

”اچھا یہ بتائیے، آپ میرے ساتھ شاپنگ کے لیے چل رہے ہیں یا نہیں۔“

”پھوپھی جان کو بھی ساتھ لے لو تو چل سکتا ہوں۔“

”وہ ساتھ جا رہی ہو تو آپ سے کیوں کہتی۔ انہیں کل سے بخار ہے۔ آپ کے پاس تو کسی بیمار کو دیکھنے تک کا وقت نہیں۔“

”کمال ہے! مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔ میں ڈاکٹر کو فون کر دیتا۔“

”یہ زحمت آپ کیوں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کو بلا لیا گیا تھا۔ وہ آکر دیکھ بھی گیا ہے۔“

اس کے باوجود سرفراز نے ضروری سمجھا کہ میں پھوپھی کے پاس جائے اور ان کی طبیعت وغیرہ پوچھوں۔ وہ ان کے کمرے میں گیا اور اپنی مصروفیات کا بہانہ کر کے ان کی عیادت کی۔ انہیں خوش کرنے کے لیے یہ بھی کہنا پڑا کہ وہ فرزانہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا رہا ہے۔ بے دلی سے سہی

لیکن اسے فرزانہ کے ساتھ جانا پڑا۔

شاپنگ سے ٹمنے کے بعد فرزانہ زبردستی اسے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئی۔ یہاں بیٹھ کر بھی وہ مسلسل اپنے اور اس کے بچپن کی باتیں کرتی رہی۔ سرفراز کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”تم اس وقت صرف پانچ سال کی تھیں اور ایک ایک بات اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو تمہیں وہ باتیں بھی یاد ہیں جو مجھے یاد نہیں جبکہ میں تم سے بڑا تھا۔ مجھے تو یہ لگ رہا ہے جیسے دل سے گھر کر سنا رہی ہو۔“

”مجھے اس لیے یاد ہیں کہ میں یہاں سے جانے کے بعد آپ کے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ آپ سے وابستہ یادوں کو یاد کرتی رہتی ہوں۔“

”کیوں محترمہ، آپ کو اور کوئی کام نہیں تھا لندن میں۔“

”میں لندن میں خوش نہیں تھی۔ پاکستان کو یاد کرتی رہتی تھی اور پاکستان میں آپ تھے۔“

”اب تم پاکستان آگئی ہو۔ یہاں میرے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں۔ میرے بچپن کا پیچھا چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو۔“

”آپ کو بچپن سے چڑ ہے تو جوانی کی بات کیے لیتی ہوں۔ یہ بتائیے آپ کا شادی کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟“

”ابھی کوئی ارادہ نہیں۔“

”کوئی لڑکی دیکھی؟“

”یہ میرا نہیں میرے والدین کا کام ہے۔“

”پھر ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے کام بن گیا۔“

”کیا مطلب۔“

”وہ میں پھر کسی وقت سمجھا دوں گی۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔ چلیے چلتے ہیں۔“ فرزانہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

سرفراز بھی اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

ابھی وہ ریسٹورنٹ سے باہر نکلے ہی تھے کہ سرفراز کو لاڈلا نظر آگیا۔ سرفراز نے بچ کر ٹکٹنا چاہا تھا لیکن وہ جان بوجھ کر سامنے آگیا۔

”سرفراز صاحب، آفس کی سکرٹری ہے یا گھر کی۔“ لاڈلانہ نہایت بدتمیزی سے سوال کیا۔

”میری کزن ہے۔ ہم شاپنگ کے لیے آئے تھے۔“

”یہ لفظ شاپنگ بھی خوب ایجاد ہوا ہے۔“

”کل آفس آنا تو ملاقات ہوگی۔“ سرفراز نے کہا اور فرزانہ کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

قرض مسافت

فرزانہ گاڑی تک تو خاموشی سے آگئی لیکن پھر اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی اس نے لاڈلا کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔

”کون تھا یہ بے ہودہ آدمی۔“

”کاروباری دنیا میں ہر قسم کے آدمیوں سے ملنا پڑتا ہے۔“

”کیسا کاروبار ہے آپ کا جو ایسے لفٹے آپ سے ایسی بے تکلفی سے پیش آتے ہیں۔“

”یہ اسٹیٹ ایجنٹ ہے۔ اس سے ایک بلڈنگ کا سودا چل رہا ہے۔“

”اس قدر بے تکلف۔ تو یہ!“

”یہ لوگ بے تکلفی پیدا کر کے دوستی ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ خیر تم چھوڑو اسے۔ یہ بتاؤ شاپنگ کے لیے پھر کب آنا ہے۔“ سرفراز نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔

”اس مرتبہ شاپنگ نہیں۔ کوئی اچھی سی مووی دیکھیں گے۔“

سرفراز کو اس کے اس آئیڈیے سے اختلاف ہو سکتا تھا لیکن وہ اس وقت انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دل میں چور تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

لاڈلا کی ملاقات سے ستارہ کا راز ظاہر ہو گیا ہو۔

اس نے گھر پہنچ کر سوچا کہ ستارہ سے ملا جائے۔ ممکن ہے لاڈلانے اسے کچھ بتایا ہو۔ وہ اپنی صفائی پیش کرے لیکن اس وقت تماش بینوں کی موجودگی میں ستارہ سے ملنا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ بہت دن سے دن کے وقت ملاقات کے لیے جانے لگا تھا۔

مجرے کا خیال آتے ہی اس کے دل پر گھونسا سا لگا۔ حسد کی آگ اس کے تن بدن میں پھیل گئی۔ لوگ اس پر نوٹ نہجدار کر رہے ہوں گے۔ گندی نظریں اس کا استقبال کر رہی ہوں گی۔ مجھے جلد از جلد ستارہ کو وہاں سے نکال لانا چاہیے۔

پھر اسے پھوپھی اور فرزانہ کا خیال آیا۔ ان لوگوں کی موجودگی میں شادی کا ذکر کیسے چھیڑ سکتا ہوں۔ شادی کا ذکر گھر میں نہ چھیڑوں، ستارہ کو تو ملی تو دے سکتا ہوں۔ وہاں جا تو سکتا ہوں۔

دوسرے دن وہ کچھ دیر دفتر میں گزارنے کے بعد ستارہ کے گھر پہنچ گیا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ لاڈلا اسے بتا چکا تھا کہ اس نے فرزانہ کو ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے چنانچہ اسے دیکھتے ہی ستارہ بھڑک اٹھی۔

”ہم طوائفیں تو بدنام ہیں کہ ہر جانی ہوتی ہیں۔ آپ تو شریف زادے ہیں آپ بھی مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔“

”تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں۔“

”لاڈلانے اپنی آنکھوں سے تمہیں ایک لڑکی کے ساتھ ریسٹورنٹ سے نکلتے دیکھا ہے۔“

”یہ بھی تو پوچھو وہ لڑکی کون سی تھی؟“

”کوئی بھی تھی۔ کیا وہ لڑکی نہیں تھی؟“

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میری پھوپھی لندن سے آئی ہوئی ہیں۔ وہ لڑکی انہی کی بیٹی تھی۔ میرے ساتھ شاپنگ کے لیے آئی تھی۔“

”آپ کے ساتھ اکیلی آنے کا مطلب کیا تھا۔“

”مجھے خوشی ہوئی کہ تمہیں میرا اس لڑکی کے ساتھ آنا برا لگا۔ یہ تمہاری محبت کی دلیل ہے لیکن جو تم سمجھ رہی ہو وہ نہیں ہے۔“

”پھر تم شادی کے لیے اماں سے بات کیوں نہیں کرتے؟“

”میری کچھ گھریلو مجبوریاں ہیں بس ان سے نجات مل جائے۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔“

”کل کو یہ مت کہہ دینا کہ میں اس ”لڑکی“ سے شادی کر رہا ہوں۔“

”تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔ تم میری محبت ہو۔ میں تمہارے لیے اپنے والدین کو چھوڑ سکتا ہوں فرزانہ کیا چیز ہے۔“

ستارہ خوش ہو گئی۔ وہ دوڑتی ہوئی گئی اور ستارا اٹھالائی۔

یہ اس کا اندازہ میزبانی تھا جو وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی لیکن آج اس کا اندیشہ تھا جو اس کی آواز میں لرز رہا تھا۔ اس کی انگلیوں نے ستارہ کے تاروں کو چھیڑا اور اس کے ہونٹوں پر یہ غزل آگئی۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

سرفراز، فرزانہ سے وعدہ کر چکا تھا کہ وہ اس کے ساتھ مووی دیکھنے جائے گا۔ اسے وعدہ پورا کرنا پڑا۔ اسے ایک مرتبہ پھر احساس ہوا جیسے وہ ستارہ سے وعدہ خلافی کر رہا ہے لیکن یہ کہہ کر ذہن کو جھٹک دیا کہ وہ محض وعدہ پورا کر رہا ہے ورنہ فرزانہ سے اسے کیا دیکھی۔

وہ سنیما ہال سے باہر نکلے تو فرزانہ کی ضد اسے شیرٹن ہوٹل کی طرف لے گئی۔ دونوں نے ایک ساتھ ڈنر کیا اور بہت ساری باتیں کیں۔ زیادہ باتیں فرزانہ ہی کر رہی تھی لیکن اسے بعض باتوں کا جواب دینا پڑ رہا تھا۔ اس لیے یہ نہیں کہا

سرفراز کو اس سے نفرت ہو جائے گی۔“

☆☆☆

سرفراز کو اب محسوس ہونے لگا تھا کہ فرزانہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اس کی یہ غلط فہمی دور ہونا چاہیے۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ ستارہ کا ذکر اس کے سامنے کر دے گا اور یہ درخواست بھی کرے گا کہ وہ اپنی ماں کے ذریعے احمد علی تک یہ بات پہنچا دے۔ اس نے فون کر کے فرزانہ کو بتا بھی دیا تھا کہ وہ گھر آ رہا ہے۔ فرزانہ تیار رہے۔ کہیں گھومنے چلیں گے۔

وہ گھر پہنچا تو تمام گھر والے اس کے والد کے کمرے میں جمع تھے۔ دونوں شادی شدہ بہنیں بھی آئی ہوئی تھیں۔ مخدومہ جہاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی موجودگی بتا رہی تھی کہ کوئی خاص بات ہے۔ وہ اسی وقت کسی جگہ آتی جاتی تھیں جب کوئی خاص مسئلہ درپیش ہوتا تھا۔ سرفراز بھی یہ جاننے کے لیے کہ بات کیا ہے وہیں پہنچ گیا۔

”آج تو ہمارے گھر میں بڑی رونق ہے۔“

سرفراز نے کمرے میں داخل ہوتے وقت کہا۔

”بات ایسی ہے کہ آئندہ اس رونق میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔“ احمد علی نے کہا۔

”پھوپھی جان، کیا فرزانہ کی شادی کا سلسلہ ہے۔“

سرفراز نے سلطانہ جہاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہیں تمہاری بڑی پھوپھی بتائیں گی۔“

”تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ ہم فرزانہ کی شادی کر رہے ہیں۔ یہ پوچھو اس کی شادی کس سے ہو رہی ہے۔“

”جس سے بھی ہوگی خوش قسمت ہوگا۔“

”دل چھوٹا مت کرو، وہ خوش قسمت تم ہی ہو۔“ مخدومہ جہاں نے کہا۔

”کیوں مذاق کرتی ہیں پھوپھی بیگم۔“

”یہ مذاق نہیں ہے۔ ہمارے خاندان کی اب تک کی روایت بھی یہ رہی ہے کہ خاندان میں شادی کی جانی ہے۔ فرزانہ جیسی لڑکی گھر میں ہے تو ہم باہر کیوں جائیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ تمہاری پسند ہیں۔“

”یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟“

”یہ تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم بڑوں کے سامنے شرمارہے ہو ورنہ ہمیں سب معلوم ہے۔“

”آپ فرزانہ کو بلا کر پوچھ لیں۔ میں نے آج تک اس سے یہ نہیں کہا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔“

”وہ لڑکی ہے اور ہمارے خاندان کی لڑکی ہے۔ لندن

محبت گھر کرنے لگی تھی۔ سرفراز کی مصلحت آمیز بے تکلفی نے اس کے دل میں یہ غلط فہمی بھی پیدا کر دی تھی کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔ فرزانہ نے اپنی پسند کا اظہار اپنی ماں کے سامنے کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ سرفراز بھی اسے چاہتا ہے۔ سرفراز علی کے بڑے پہلے ہی ان دونوں کی بڑھتی ہوئی دوستی کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ سلطانہ جہاں نے اپنے بھائی احمد علی سے تذکرہ کیا۔

”بھائی صاحب، میں بیٹی کی ماں ہو کر کہہ رہی ہوں۔ اس لیے کہ سرفراز بھی میرا ہی بیٹا ہے۔ اگر سرفراز اور فرزانہ کی شادی ہو جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔“

احمد علی کو اپنی دوسری بہن مخدومہ جہاں کی بات یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا، ابھی سرفراز کو کچھ مت کہو۔ آگے کیا کرنا ہے یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ انہوں نے ضروری سمجھا کہ مخدومہ جہاں سے مشورہ کیا جائے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر مخدومہ جہاں کے گھر پہنچ گئے۔

”باجی، میں ایک ضروری مشورے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ سلطانہ جہاں چاہتی ہیں کہ سرفراز کی شادی فرزانہ سے کر دی جائے۔“

”ہاں تو دیر کس بات کی ہے۔“

”آپ سے مشورہ بھی تو ضروری تھا۔ آپ نے کہا تھا اس کے بعد کیا کرنا ہے آپ بتائیں گی۔“

”سلطانہ میرے کہنے پر ہی پاکستان آئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ فرزانہ جب آپ کے گھر میں رہے گی اور سرفراز سے آشنا سامنا ہوگا تو ضرور دونوں کے دلوں میں جگہ پیدا ہوگی اور وہی ہوا۔ زہر کو زہر مارتا ہے۔ شادی ہو جائے گی تو سرفراز کے سر سے طوائف کی محبت کا بھوت بھی اتر جائے گا۔“

”آپ کیا سمجھتی ہیں سرفراز شادی کے لیے تیار ہو جائے گا جبکہ میری اطلاع کے مطابق وہ اب بھی اس طوائف کے گھر جاتا ہے۔“

”آپ سرفراز سے کہہ کر تو دیکھیں۔ اگر وہ نہ مانا تو اس کا علاج بھی میرے پاس ہے۔ طوائفیں دولت کی پجاری ہوتی ہیں۔ اسے سرفراز کی دولت سے پیار ہے سرفراز سے نہیں۔ آپ دولت خرچ کریں گے تو طوائف کی محبت نفرت میں بدل جائے گی۔“

”میں پیسے خرچ کروں گا؟“

”اگر ایسا وقت آیا تو آپ اس طوائف کا منہ اپنی دولت سے بھر دیجئے گا۔ وہ خود اسے اسباب پیدا کر دے گی کہ

سے تو چھوٹے ہیں۔“

”یہ کیا بڑے چھوٹوں کا چکر لے کر بیٹھ گئیں۔ ہم دونوں برابر ہیں۔ اسی لیے تو دوست ہیں۔“

”آپ کہیں تو میں آپ کے کمرے میں کبھی کبھی آجایا کروں؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“

”آپ بھی اوپر کی منزل پر کبھی نہیں آئے۔ امی جان کہہ رہی تھیں کہ شاید سرفراز کو ہمارا یہاں آنا پسند نہیں آیا۔“

”ارے، وہ یہ سوچ رہی ہیں۔ پھر تو میں اپنا بستر بھی وہیں لگا لوں گا۔“

”اب اتنا بھی فری ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”چلو پھر یونہی وقت گزارنے کو آجایا کروں گا بلکہ ایسا کرتے ہیں ابھی چلتے ہیں۔“

وہ فرزانہ کے ساتھ اپنی پھوپھی کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے سرفراز کو اپنے کمرے میں دیکھا اور وہ بھی نہایت خوش گوار موڈ میں تو انہیں خوشی ہوئی، حیرت بھی۔ انہیں اتنے دن آئے ہوئے ہو گئے تھے وہ ان سے اس طرح نہیں ملا تھا جیسے اب مل رہا تھا۔

وہ بڑی دیر تک یہاں بیٹھا گپ شپ کرتا رہا۔ یہ خبر احمد علی تک بھی پہنچی۔ اس کا سبب اس طرح بن گیا کہ وہ اپنے وکیل سے کسی کاروباری مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ گفتگو کے دوران سرفراز علی کی ضرورت پڑی تو معلوم ہوا وہ سلطانہ بیگم کے پاس ہے۔

اس دن کے بعد سے سرفراز علی نے تو اتر سے سلطانہ بیگم کے پاس جانا شروع کر دیا تھا۔ دراصل وہ فرزانہ کو کم سے کم یہ موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے کمرے میں اکیلی آئے لیکن پھر بھی وہ اس کے کمرے میں آ ہی جاتی تھی۔ اس کی شوخ باتیں اس کے کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔

فرزانہ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہنے لگی تو وہ ستارہ اور فرزانہ میں موازنہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ خوب صورتی میں دونوں کا جواب نہیں تھا۔ فرزانہ، ستارہ سے زیادہ شوخ اور چنچل تھی مگر پھر بھی یہ فرق ضرور تھا کہ فرزانہ محض دوست تھی اور ستارہ اس کی محبت تھی۔

وہ ستارہ کی طرف اب بھی پابندی سے جارہا تھا۔ اسے ستارہ کی زبانی یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی ماں اس شادی کی مخالفت نہیں کرے گی۔ مخالفت کا خدشہ تھا تو سرفراز کو اپنے گھر والوں سے تھا۔ اسی لیے وہ فرزانہ کو شیشے میں اتار رہا تھا لیکن اس کے ارادوں سے بے خبر فرزانہ کے دل میں اس کی

جاسکتا تھا کہ وہ شریک گفتگو نہیں تھا۔

احمد علی واپس آچکے تھے۔ اب موقع تھا کہ سرفراز موقع دیکھ کر باپ کو اعتماد میں لے اور ستارہ کا ذکر چھیڑ دے لیکن ایک نادیدہ خوف اس پر غالب آ گیا۔ یہ اس کی تربیت کا حصہ تھا کہ وہ اتنی بڑی بات باپ کے سامنے نہیں کہہ سکتا تھا۔

ستارہ اگر محض عام لڑکی ہوتی تو یہ بات کہنا مشکل نہ ہوتا مصیبت یہ تھی کہ ستارہ طوائف بھی۔ یہ بات چھپائی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے ہمت جمع کی اور سوچا ماں سے ذکر کیا جائے۔ وہ ان کے پاس جا کر بیٹھا بھی لیکن ادھر ادھر کی باتیں کر کے اٹھ آیا۔

اس دن کے بعد سے اسے ایک راہ سوچی۔ اسے فرزانہ کا خیال آیا۔ اگر فرزانہ سے وہ دل کی بات کہہ دے اور اس کے ذریعے پھوپھی جان تک بات پہنچ جائے تو وہ ڈیڈی کو آمادہ کر سکتی ہیں لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے فرزانہ سے دوستی کی راہ ہموار کی جائے۔ اب تک وہ فرزانہ سے اکھڑا کھڑا رہتا تھا مگر اب اس نے سوچ لیا کہ اس سے دوستی پیدا کرے گا تا کہ وقت پڑنے پر اس سے بھرپور سفارش کی امید کر سکے۔ اس نے خود پیشکش کی کہ وہ اسے شاپنگ پر لے جانا چاہتا ہے۔ فرزانہ کے لیے یہ خبر کسی خوش خبری سے کم نہیں تھی۔ وہ فوراً تیار ہوئی اور اس کے ساتھ بازار چلی گئی۔

سرفراز نے اپنی جیب سے اسے شاپنگ کرائی۔ وہ تحائف سے لدی پھندی گھر پہنچی تو اپنے آپ پر فخر کر رہی تھی۔ چوری چھپے کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ تحائف سب گھر والوں کو دکھائے۔ سب سے زیادہ خوشی احمد علی کو ہوئی تھی۔ سرفراز علی، فرزانہ میں دلچسپی لے رہا ہے یہ احساس ان کے لیے خوش کن تھا۔ کچھ دیر بعد فرزانہ، سرفراز کے کمرے میں آئی تھی۔

”میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔“

”کئی گھنٹے بعد تمہیں خیال آیا۔“

”بازار میں شکریہ ادا کرنا اچھا نہیں لگتا اس لیے۔۔۔۔۔“

”شکریہ غیروں کا ادا کیا جاتا ہے۔ میں تو تمہارا اپنا ہوں۔ دوستوں کے درمیان کیا غیریت۔“

”سرفراز بھائی، میں تو سمجھ رہی تھی آپ بچپن کے مقابلے میں بدل گئے ہیں۔ آپ تو بالکل نہیں بدلے۔“

”تم نے یہ سمجھ بھی کیسے لیا تھا کہ میں بدل گیا ہوں۔“

”آپ رعب ہی ایسا جھاڑ رہے تھے جیسے بہت بڑے ہو گئے ہیں۔“

”بڑا تو میں ہوں۔“

”اب اتنے بڑے بھی نہیں ہو گئے۔ اپنی بہنوں تک

سے تو چھوٹے ہیں۔“

”یہ کیا بڑے چھوٹوں کا چکر لے کر بیٹھ گئیں۔ ہم دونوں برابر ہیں۔ اسی لیے تو دوست ہیں۔“

”آپ کہیں تو میں آپ کے کمرے میں کبھی کبھی آجایا کروں؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“

”آپ بھی اوپر کی منزل پر کبھی نہیں آئے۔ امی جان کہہ رہی تھیں کہ شاید سرفراز کو ہمارا یہاں آنا پسند نہیں آیا۔“

”ارے، وہ یہ سوچ رہی ہیں۔ پھر تو میں اپنا بستر بھی وہیں لگا لوں گا۔“

”اب اتنا بھی فری ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”چلو پھر یونہی وقت گزارنے کو آجایا کروں گا بلکہ ایسا کرتے ہیں ابھی چلتے ہیں۔“

وہ فرزانہ کے ساتھ اپنی پھوپھی کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے سرفراز کو اپنے کمرے میں دیکھا اور وہ بھی نہایت خوش گوار موڈ میں تو انہیں خوشی ہوئی، حیرت بھی۔ انہیں اتنے دن آئے ہوئے ہو گئے تھے وہ ان سے اس طرح نہیں ملا تھا جیسے اب مل رہا تھا۔

وہ بڑی دیر تک یہاں بیٹھا گپ شپ کرتا رہا۔ یہ خبر احمد علی تک بھی پہنچی۔ اس کا سبب اس طرح بن گیا کہ وہ اپنے وکیل سے کسی کاروباری مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ گفتگو کے دوران سرفراز علی کی ضرورت پڑی تو معلوم ہوا وہ سلطانہ بیگم کے پاس ہے۔

اس دن کے بعد سے سرفراز علی نے تو اتر سے سلطانہ بیگم کے پاس جانا شروع کر دیا تھا۔ دراصل وہ فرزانہ کو کم سے کم یہ موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے کمرے میں اکیلی آئے لیکن پھر بھی وہ اس کے کمرے میں آ ہی جاتی تھی۔ اس کی شوخ باتیں اس کے کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔

فرزانہ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہنے لگی تو وہ ستارہ اور فرزانہ میں موازنہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ خوب صورتی میں دونوں کا جواب نہیں تھا۔ فرزانہ، ستارہ سے زیادہ شوخ اور چنچل تھی مگر پھر بھی یہ فرق ضرور تھا کہ فرزانہ محض دوست تھی اور ستارہ اس کی محبت تھی۔

وہ ستارہ کی طرف اب بھی پابندی سے جارہا تھا۔ اسے ستارہ کی زبانی یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی ماں اس شادی کی مخالفت نہیں کرے گی۔ مخالفت کا خدشہ تھا تو سرفراز کو اپنے گھر والوں سے تھا۔ اسی لیے وہ فرزانہ کو شیشے میں اتار رہا تھا لیکن اس کے ارادوں سے بے خبر فرزانہ کے دل میں اس کی

میں رہنے کے باوجود اتنی بے حجاب نہیں ہوئی کہ اپنی پسند کا اقرار سب کے سامنے کرے گی۔

”پھوپھی بیگم، مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ہے۔“

”کیوں؟ کیا فرزانہ میں کوئی عیب ہے یا تم ابھی شادی کی عمر کو نہیں پہنچے ہو۔“

”آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہے۔ کھل کر بتاؤ۔ سب کے سامنے نہیں بتا سکتے تو میں سب کو باہر بھیج دیتی ہوں۔ مجھے اکیلے میں بتا دو۔“

احمد علی جانتے تھے کہ وہ کیوں انکار کر رہا ہے۔ ان کا دل دھڑک رہا تھا کہ ابھی وہ شادی سے انکار کی وجہ بتائے گا اور ابھی وہ راز کھل جائے گا جسے وہ چھپاتے چلے آ رہے تھے۔ مخدومہ جہاں اصرار کر رہی تھیں کہ وہ انکار کی وجہ بتائے۔ وہ کیوں شادی کرنا نہیں چاہتا۔

ایک مرتبہ پھر اس کی تربیت اس کے راستے میں حائل ہوئی۔ وہ کھل کر کسی کو کچھ نہ بتا سکا۔ بس یہ کہہ کر شادی کو ٹالنا چاہا کہ ابھی وہ اس جھیلے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ یہ بہانہ ایسا نہیں تھا جس پر کوئی قائل ہوتا۔ مخدومہ جہاں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”ضروری تیاری کر لی جائے۔ صرف ایک ہفتہ بعد آج ہی کے دن سرفراز اور فرزانہ کی شادی کر دی جائے گی۔“

سرفراز علی اس وقت خاموش ہو گیا لیکن جب اپنے کمرے میں پہنچا اور بڑوں کی نظروں سے دور ہوا تو اسے اپنی حالت پر غصہ آنے لگا۔ اسے سب کے سامنے کہہ دینا چاہیے تھا کہ وہ ستارہ نامی ایک طوائف سے محبت کرتا ہے۔ اگر سب سے نہ کہہ سکا تو فرزانہ سے کہہ دے۔ وہ جب سنے گی تو اس کے دل میں میرے لیے خود نفرت پیدا ہو جائے گی۔ کسی کو علم بھی نہیں ہو سکے گا اور وہ خود انکار کر دے گی۔

مخدومہ جہاں بالکل صحیح اندازہ لگا رہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ سرفراز جو ہم سے نہ کہہ سکا فرزانہ سے کہے گا تا کہ وہ اس اہم انکشاف کو سن کر خود انکار کر دے۔ انہوں نے اسی وقت سلطانہ جہاں سے کہا کہ وہ فرزانہ کو لے کر ان کے گھر آ جائے اور سرفراز سے فرزانہ کو نہ ملنے دے۔ سلطانہ جہاں کو تعجب ضرور ہوا لیکن مخدومہ جہاں کا کہا مال بھی نہیں سکتی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی ان کے گھر چلی گئیں البتہ گھر جا کر پوچھا ضرور۔ ”سرفراز سے ایسی کیا غیریت ہوئی کہ فرزانہ کو سرفراز سے نہ ملنے دوں؟“

”وہ کسی وجہ سے نہیں چاہتا کہ ابھی شادی کرے لہذا وہ

فرزانہ کو بھڑکانے کی کوشش کرے گا۔ ممکن ہے اپنی بے راہ روی کے سن گھڑت قہقہے سنائے۔ فرزانہ ہنسی ہی تو ہے۔ اگر اس کے دل میں نفرت بیٹھ گئی تو وہ شادی سے انکار کر دے گی۔“

”آپ نے تو مجھ پر بھی پابندی لگا دی ہے۔“

”آپ سے بھی وہ وہی باتیں کر سکتا ہے جو فرزانہ سے کرے گا۔ آپ کے دل میں بھی کوئی خیال آ سکتا ہے۔“

”باجی، آخر بات کیا ہے۔ اتنی رازداریاں کیوں ہوتی جا رہی ہیں۔ مجھے کچھ معلوم تو ہو؟“

”ابھی کسی کو کچھ معلوم نہ ہو یہی سب کے حق میں بہتر ہے۔ ایک مرتبہ شادی ہو جائے سب کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا میں جو کچھ کر رہی ہوں سب کی بہتری کے لیے کر رہی ہوں۔“

سرفراز علی سخت مشکل میں تھا۔ وہ کئی مرتبہ فون پر کوشش کر چکا تھا کہ کسی طرح فرزانہ سے بات ہو جائے لیکن اس سے کہا جا رہا تھا کہ اب چونکہ شادی ہونے والی ہے اس لیے فرزانہ اس سے بات نہیں کر سکتی۔ وہ ایک دن ہمت کر کے مخدومہ جہاں کے گھر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر بھی اسے مایوسی ہوئی۔ مخدومہ جہاں نے اسے فرزانہ سے ملنے نہیں دیا۔ جواز یہی پیش کیا کہ ہمارے خاندان میں شادی سے پہلے لڑکے کی ملاقات نہیں ہو سکتی۔ پردہ ہو جاتا ہے۔ سرفراز علی نے چاہا کہ مخدومہ جہاں کو تمام حالات سے آگاہ کر دے لیکن کیا کہتا۔ یہ کہ وہ ایک طوائف سے شادی کرنا چاہتا ہے ہمت کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکا اور اٹھ کر چلا آیا۔

وہ اکیلے کمرے میں بیٹھا دیر تک سوچتا رہا۔ اگر وہ بغاوت کرتا ہے تو اسے کاروبار سے ہاتھ دھوئے پڑیں گے۔ بات نکلی تو خاندان کی بدنامی بھی ہوگی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اس کے والد ممکن ہے اس کی بات مان لیتے اور ستارہ سے شادی پر تیار ہو جائے لیکن فرزانہ کے آجانے کے بعد یہ ممکن نہیں۔ وہ بھی نہیں چاہیں گے فرزانہ کی جگہ کوئی اور لڑکی اس گھر میں آئے اور وہ بھی طوائف۔ اس نے انکار کر دیا تو ستارہ پر کیا میتے گی؟ وہ سوچ رہا تھا ستارہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے جو اس کے فراق میں کھل کھل کر مر جائے گی۔ کچھ دن واویلا کرے گی پھر اپنی چمیلی دنیا میں گم ہو جائے گی۔ اس نیکی کا کیا ہوگا جو میں ستارہ کو طوائف سے عورت بنا کر کمانے والا تھا؟ اللہ کی مرضی۔ خاندان کی عزت بچانا بھی تو نیکی ہے۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ لوگ دوسری شادی بھی تو کرتے ہیں۔ فرزانہ سے شادی کے بعد فرزانہ کو اعتماد میں

لے کر ستارہ سے دوسری شادی بھی تو کر سکتا ہوں۔ اس وقت کوئی میرے راستے میں نہیں آئے گا۔ کوئی میری مخالفت نہیں کرے گا۔ یہ بات اس کے دل کو لگی اور وہ مطمئن سا ہو گیا۔ اس نے کسی احتجاج کے بغیر فرزانہ سے شادی کی ہامی بھری۔

☆☆☆

ستارہ بیگم نے سرفراز کو آدمی نہیں نجات دہندہ سمجھا تھا۔ ایک ایسا نجات دہندہ جو اسے ایک ایسی دنیا میں لے جانے آیا تھا جہاں عورت کے کئی پاکیزہ رشتے ہیں۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ ٹھنڈا راز دار دے گی۔ اسے وہ مقام ملے گا جو عورت کا اصل مقام ہے۔ وہ بہو بنے گی، ماں بنے گی۔ گھر کے بزرگوں کی خدمت کا موقع ملے گا۔ اسے خیالوں ہی خیالوں میں خود پر فخر ہونے لگا تھا۔ اسے سرفراز علی کی شرافت پر بھی ناز ہوا تھا جس نے اسے گھر کی مالک بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے اندھیروں سے روشنی میں لے جانے کا عہد کیا تھا مگر ایک خبر نے اس کے تمام خواب چکنا چور کر دیے۔ وہ ماں سے جھگڑ رہی تھی کہ اب وہ مجرا نہیں کرے گی کہ لاڈلا آگیا۔ اس کے چہرے پر ایک خمیٹ مسکراہٹ تھی۔

”کس بات پر لڑائی ہو رہی ہے باکی جی؟“

”کہتی ہے مجرا نہیں کروں گی۔ گھوڑا کہہ رہا ہے گھاس نہیں کھاؤں گا۔ اسے سرفراز علی پر ناز ہے۔ اس نے اسے شریف زادی بننے کے خواب دکھائے ہیں۔ ارے میں ان شریف زادوں کو خوب جانتی ہوں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن جب یہ شادی کر لے اس وقت مجرے سے ہاتھ اٹھائے۔ ابھی دلی دور ہے۔ وعدہ کرنا آسان ہے وعدہ نبھانا مشکل۔“

”باکی جی، داد دیتا ہوں آپ کے تجربے کی۔ آپ نے جو سوچا تھا بالکل ویسا ہی ہوا ہے۔ سرفراز علی نے شادی کر لی ہے۔“

ستارہ بیگم کے ہاتھ میں آنیہ تھا، ہاتھ سے گرا اور چھین سے ٹوٹ گیا۔ خبر تھی کہ آسمانی بجلی۔ وہ سر سے پاؤں تک جل کر رہ گئی۔ ابھی کچھ جان باقی تھی کہ لاڈلا پر برس پڑی۔

”تم بھی اماں سے مل گئے ہو کہ مجھے سرفراز علی کی طرف سے بدگمانی کرنے کے لیے ایسی بے پرکی اڑا رہے ہو۔“

”تمہاری جان کی قسم ستارہ بیگم۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ خبر سولہ آنے درست ہے۔ سرفراز میاں نے شادی کر لی ہے۔ وہ ایک دن یہاں آئے بغیر نہیں رہتے تھے اب ہفتہ گزر گیا۔“

وکت کپڑا سا بیٹھا بیٹھتے سخت مالا متھا۔ چونہ کھیل رہا تھا اور دم بھی آؤٹ ہو رہا تھا۔ ”میں نے سنا ہے کہ بیٹھی کرکٹ سے عشق ہے۔“ بیٹھی بیٹھی نے پلٹ کر وکت کی طرف سے کہا۔

”ٹھیکے سنا ہے۔ وکت کیپڑے آہ بھر کر کہا۔ لیکن تم اس بات کو پروا مت کرو پس کیپڑے رہو، میں تمہیں قتل نہیں کروں گا۔“

ٹھیکری کی بیوی اس کے لیے باعث شرم ثابت ہوئی ہے۔ جانچ پڑا لطف ہے میں اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ ہم لوگ کرکٹ کو کچھ متعلق لکھکھو کر رہے تھے، وہ بے چاری سمجھی کہ کرکٹ کوچ کے چارپے پر بیٹھ بیٹھ کرکٹ کی بیوی اچھن بیٹھ پڑ گئی۔ وہ بولی: ”اچھا جارح۔ تو پھر کرکٹ کوچ کے کتے پیٹتے ہوتے ہیں؟“

”اگر یہ خبر غلط ہوئی تو میں عورت سے ڈائن بن جاؤں گی۔ ایک ایک کا خون پی لوں گی۔“

”آپ تو آپ یقین تو مجھے بھی نہیں آتا۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا۔“

ستارہ ایسے صدمے سے دوچار ہوئی کہ نہ ثبوت طلب کیا نہ گواہی مانگی۔ بھاگتی ہوئی گئی اور کمر بند کر لیا۔ سب کے سب دروازہ پٹتے رہ گئے کہ ممکن ہے خبر غلط ہو ابھی ایسا ویسا قدم مت اٹھائیو۔ لاڈلا وہاں سے کھٹکنے کو تھا کہ افشاں بیگم کی گالیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ افشاں بیگم اس کی جان کو کوس رہی تھیں کہ اس نے ایسی بری خبر ستارہ کے کانوں تک کیوں پہنچائی۔ جب تک چھپ سکتی تھی چھپا لیتا۔ بہر حال اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیرکمان سے نکل چکا تھا۔

”اب میرا منہ کیا تک رہے ہو۔“ افشاں بیگم نے لاڈلا سے کہا۔ ”کسی کو بلوا کر دروازہ توڑو۔ اگر میری بیٹی نے ایسا ویسا کوئی قدم اٹھا لیا تو میں کھڑے کھڑے تمہیں آگ لگا دوں گی۔“

اس کی نوبت نہیں آئی۔ ستارہ خود باہر آگئی لیکن اس اطلاع کے ساتھ کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ مجرا نہیں کرے گی۔ اس کے بجائے آج نیلما کو مہانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

”ستارہ، میں تجھ پر قربان۔ تیری طبیعت مائدہ ہے تو

آج رات آرام کر۔ نیلما جو کڑے توڑ رہی ہے وہ بھی تو کچھ ہاتھ پاؤں چلائے۔“

اس رات مجرا ہوا لیکن تاجنے والی ستارہ نہیں نیلما تھی۔ دوسرے دن ستارہ سو کر اٹھی تو اس نے لاڈلا کو بلا بھیجا۔ وہ اس خبر کی مزید تصدیق چاہتی تھی جو وہ لے کر آیا تھا۔ رات بھر سوچنے کے بعد ستارہ جسم انتقام بن گئی تھی۔ وہ طے کر چکی تھی کہ سرفراز کو زندگی بھر چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ سرفراز کی بے وفائی نے اسے پھر سے طوائف بنا دیا تھا۔

”میں ایسا چکر چلاؤں گی کہ وہ بار بار یہاں آئے گا۔ پرستار کی حیثیت سے نہیں بھکاری کی حیثیت سے۔ اب محبت نہیں اس کو ٹھے پر تجارت ہوگی۔ سرفراز علی دیکھے گا کہ ایک طوائف کا انتقام کہاں تک انسان کا پیچھا کرتا ہے۔ یہاں نواب آتے ہیں بھکاری جاتے ہیں۔ میں نے اپنی محبت سے مجبور ہو کر سرفراز علی کو نواب رہنے دیا تھا مگر اب میں اسے بھکاری بنا دوں گی۔ اس کی دولت بھی چینیوں کی اور اس کی عزت بھی۔ اس کے دل میں بھی آگ لگاؤں گی اور اس کے گھر میں بھی۔“

وہ طوائف کے کوٹھے پر پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ جانتی تھی کہ شریفوں کو چھکانے کے لیے کس داؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سوچ چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ صرف ایک مرتبہ سرفراز اس کے کوٹھے پر آجائے۔ یہ کام لاڈلا کر سکتا تھا۔

”یہ کام تمہیں کرنا ہے۔ اگر تم اسے یہاں لے آئے تو میں تمہیں مالا مال کر دوں گی۔“

”اس دروازے سے دولت تو مجھے بہت ملی ہے۔ میں تو وہ چاہتا ہوں جس کے تقاضے اب تک کرتا رہا ہوں۔“

”بوڑھے ہو گئے مگر ٹھکر نہیں گئی۔ میں اسے بھی سرفراز سے انتقام سمجھوں گی۔ تم سرفراز کو یہاں لے آؤ۔ میں تمہارے پاس چلی آؤں گی۔“

لاڈلا باتونی آدی تھا اور پھر سرفراز کے بہت سے رازوں سے واقف تھا۔ اس نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ سرفراز بندہ بے دام بن کر ستارہ کے حضور حاضر ہو گیا۔

”ستارہ، میں شرمندہ ہوں کہ تم سے شادی نہیں کر سکا لیکن اسے میری بے وفائی نہیں مجبوری سمجھ کر معاف کر دینا۔“

”شرمندہ ہو کر مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ غلطی تو میری تھی کہ میں نے اپنی آنکھوں سے بڑے خواب دیکھ لیے تھے۔ میں شریفوں کی مجبوریوں سے واقف ہوں۔ آپ مجبور

کر دیے گئے ہوں گے۔ مجھے احساس ہے کہ آپ کی دنیا میں عزتوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ میں آپ کی شادی سے نہیں آپ کی عزت کی طرف سے پریشان ہوں۔“

”اس عزت کو بچانے کے لیے ہی تو میں تمہارے سوا کسی اور سے شادی پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔“

”اسی لیے پریشان ہوں کہ اب آپ اپنی عزت کس طرح بچائیں گے۔“

”ستارہ، میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”میری کوکھ میں آپ کا بچہ یا بچی پرورش پارہی ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد میں اسے آپ کے دروازے پر چھوڑنے ضرور آؤں گی۔ بس یہ سوچ کر پریشان ہوں۔“

”آج سے پہلے تو تم نے یہ تذکرہ بھی نہیں کیا۔“

”اس لیے نہیں کیا کہ اس کی پیدائش اس کے باپ کے گھر میں ہوتی تھی لیکن اب یہ پیدائش کوٹھے پر ہوگی۔ شریفوں کی اولاد کوٹھے پر پلتی کیا اچھی لگے گی۔“

”ستارہ مجھ پر ایک احسان کر دو۔ اس حمل کو ضائع کرادو۔“

”اپنے گناہوں کو شریفوں میں چھپایا جاتا ہے ہم طوائفوں میں نہیں۔“

”میری خاطر۔ میری عزت کی خاطر۔“

”آپ کی عزت کے لیے میں صرف اتنا کر سکتی ہوں کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ کروں۔ یہاں ویسے بھی کوئی کسی کے باپ کا نام نہیں پوچھتا۔ آپ کی اولاد میرے پاس پلتی رہے گی لیکن اس کا خرچ ماہ بہ ماہ آپ مجھے پہنچاتے رہیں گے تاکہ وہ یہاں کی حرام کمائی پر نہ پلے۔“

”مجھے منظور ہے۔ جب تک تم اس راز کو راز رکھو گی۔ میں خرچ تمہیں پہنچاتا رہوں گا۔“

”ایک اور شرط ہے اور وہ یہ کہ اس بچے کا خرچ یہاں آ کر میرے ہاتھ میں دو گے۔“

”مجھے یہ بھی منظور ہے۔ بس یہ بات میرے گھر تک نہ جائے۔“

”نہیں جائے گی۔ بس آپ یہاں آتے رہیں۔ ایک نظر میں بھی آپ کو دیکھ لوں گی۔“

سرفراز علی نے شکر بھیجا کہ جان چھوٹی۔ اسے یہ آس بھی تھی کہ گزرنے والا وقت گس نے دیکھا ہے۔ پیدائش ہوگی پھر بچی یا بچہ بڑا ہوگا۔ میں کہاں ہوں گا ستارہ کہاں ہوگی۔ اس عرصے میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں ستارہ سے دوسری شادی کر لوں۔

انسان کا قاعدہ ہے کہ وقتی فائدے پر شاکر ہو جاتا ہے سرفراز علی نے بھی یہی کیا۔

اس کے جاتے ہی ستارہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن پھر گھبرا کر آنسو پونچھ بھی لیے۔ طوائف کی آنکھ میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ آنسو تو تماشا بینوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ سازندوں میں سے ایک سازندہ چاند خاں خود کو ستارہ کا عاشق کہتا تھا لیکن سرفراز کی موجودگی میں اس کا چراغ جلتا نہ تھا۔ اب جو سرفراز کا پتا صاف ہوا تو چاند خاں آگے بڑھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ستارہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔

افشاں بیگم اس کھیل کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں لیکن اس لیے برداشت کرنے پر مجبور تھیں کہ ستارہ مجرا کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ محبت میں ناکامی کے بعد اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ افشاں بیگم سوچتی تھیں کہ اگر اس نے اپنی دلچسپی کے لیے کوئی سہارا ڈھونڈ لیا ہے تو کیا خرچ ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی رہیں۔ ان کی آنکھیں تو اس وقت جھکیں جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ستارہ کا پاؤں بھاری ہو گیا ہے۔ اب وہ مجرا کرنے کے لائق بھی نہیں رہی تھی۔ آمدنی نے ہاتھ کھینچا تو افشاں بیگم نے قیامت کھڑی کر دی۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ اس آفت سے پیچھا چھڑا لے۔ حمل ضائع کرادے۔ وہ ستارہ کی ضد کے سامنے صرف اصرار کر سکتی تھیں۔

”کم بخت، یہ تو سوچ کہ اگر لڑکا ہو گیا تو کیا زندگی بھر اسے بٹھا کر کھلائے گی۔“ افشاں بیگم نے ایک دن اس سے کہا۔

”میں یہی چاہتی ہوں کہ لڑکا ہو۔“

”تو بہ بچی۔ تو دنیا کی پہلی طوائف ہے جو لڑکا ہونے کی دعا کر رہی ہے۔“

”یہی لڑکا بڑا ہو کر سرفراز علی کے سامنے تن کر کھڑا ہوگا۔ میرے انتقام کی قسطیں وصول کرے گا۔“

”سرفراز علی درمیان میں کہاں سے آ گیا۔ یہ تو میرے خیال میں چاند خاں میرانی کا گناہ ہے جو تیرے پیٹ میں پل رہا ہے۔“

”یہ تو تمہیں معلوم ہے سرفراز علی تو نہیں جانتا۔ اسے میں نے یہی بتایا ہے کہ میرے پیٹ میں اس کی اولاد پل رہی ہے۔“

”تو بڑی بھولی ہے۔ اس کے جوان ہونے کا انتظار کرے گی۔ سرفراز علی کو بتا ہی دیا ہے تو اسے بلیک میل کر۔ اسے مجبور کر کہ وہ اس کا خرچہ باندھے۔“

”اماں، میں تمہاری ہی تو بیٹی ہوں۔ میں نے یہ سودا پہلے ہی طے کر لیا ہے۔ میں اس سے صرف خرچ وصول نہیں کروں گی بلکہ مجرے کا نقصان بھی اس سے وصول کروں گی۔“

”شاباش! میں سمجھوں گی میری تربیت رائگاں نہیں گئی۔“ افشاں بیگم نے کہا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”اچھا تو یہی ہوتا کہ سرفراز علی تجھ سے شادی کر لیتے۔“

”اماں تم خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ شریفوں سے وفا کی امید مت رکھنا۔“

”وفا مل تو گئی۔ چاند خاں تجھ پر جان فدا کرنے کو تیار رہتا ہے۔“

افشاں بیگم کو پہلی مرتبہ نقصان کا اندازہ ہوا تھا۔ وہ شاندار بستر پر لیٹی ان کانٹوں کی چھین محسوس کر رہی تھیں جو شوہر کی بے وفائی سے لے کر اب تک ان کے جسم میں پیوست ہوتے رہے تھے۔ اپنے گناہ یاد آئے تو لرز کر رہ گئیں۔ شوہر سے انتقام لینے کے اور بھی طریقے ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے جسم فروشی اختیار کی تھی۔ اب انتقام کا یہ دائرہ پھیل کر ان کی بیٹی تک آ گیا تھا۔ اگر انہوں نے یہ راستہ اختیار نہ کیا ہوتا تو آج ان کی بیٹیاں کوٹھے پر نہ ہوتیں۔ ستارہ کو اس حال تک پہنچانے کی گناہ گار بھی وہی تھیں۔

وہ خاندانی طوائف نہیں تھیں۔ ایک حادثے نے انہیں طوائف بنا دیا تھا۔ اگر وہ کسی کوٹھے پر ہی پیدا ہوئی ہوتیں تو یہ خیالات ہرگز انہیں نہ ستاتے۔ انتقام کی جس آگ نے مجھے جلا دیا اب وہی آگ ستارہ کا تعاقب کر رہی ہے۔ میں شرافت کی زندگی گزار رہی تھی۔ انتقام کے راستے پر چلی تو طوائف بن کر رہ گئی۔ طوائف بننے کے بعد وہ اور کتنی گرے گی۔ اس کا انتقام سرفراز علی کو کہیں کا نہ چھوڑے گا۔ وہ ستارہ کو اس انتقام سے باز رکھنے کی کوشش کرے گی یہ سوچتے ہی وہ ستارہ کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

”تو اس بچے کو گرا دے۔“

”اماں، میں نے آج تک آپ کا ہر حکم مانا ہے لیکن یہ حکم نہیں مانوں گی۔ سرفراز علی نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ مجھے اپنی پاکیزہ دنیا میں لے جائے۔ اب میں اسے بتاؤں گی انتقام کیا ہوتا ہے۔ اس کا بیٹا اس غلیظ دنیا میں طوائفوں کے پاؤں دبائے گا۔ یہ تماشا دیکھنے سرفراز علی ہر مہینے میرے پاس آیا کرے گا۔“

”ستارہ، میں نے بھی کسی سے انتقام لیتا چاہا تھا لیکن

اس انتقام کا نشانہ میں خود بن گئی۔ تو بھی اسی راستے پر چل نکلی ہے۔ یہ آگ کہیں تجھے جلا نہ دے۔“

”میں طوائف تو بن گئی۔ اب اس سے زیادہ اور اپنا کیا نقصان کروں گی۔ ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر میرے بیٹی ہوئی تو اسے کسی گھر کی بہو بنا دوں گی۔“

”سرفراز علی کی جان بخش دے۔“

”یہ تمہیں اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہوگئی۔ وہ مجھے طوائف بنا کر چھوڑ گیا ہے اور طوائف اپنے عاشق کا پیچھا قبر تک نہیں چھوڑتی۔ میں اسے امیر سے فقیر بنا دوں گی۔ آپ درمیان میں نہ آئیں تو اچھا ہے۔ آپ نے مجھے تنگ کیا تو میں چاند خاں کے ساتھ بھاگ بھی سکتی ہوں۔“

یہ دھمکی ایسی تھی کہ افشاں بیگم کو چپ لگ گئی۔ ستارہ بیگم ان کے بڑھاپے کا سہارا تھی۔ ایک بیٹی نیلیا بھی تھی لیکن اس کی آنکھ میں فرق تھا۔ آواز بھی بس واجبی سی تھی۔ افشاں بیگم کے کوٹھے کی شان و شوکت تو ستارہ کے دم سے تھی۔ اگر اس کی شادی ہو جاتی تو الگ بات تھی لیکن وہ کسی میراثی کے ساتھ بھاگ جائے اور گھر میں فاقے ہونے لگیں، یہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ نو مہینے رخصت نہیں کرے گی لیکن بیٹہ کر تو گالے گی۔ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اسے برداشت کرتی رہیں۔

ایک لمبی سی کارگلی کے باہر آ کر کھڑی تھی۔ سرفراز علی اس کار سے اتر کر پیدل گلی میں داخل ہوتا تھا۔ ایک مکان کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتا تھا۔ یہ تمام راستہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا لیکن ان راستوں کے لیے اب وہ خود اجنبی ہو گیا تھا۔ اب وہ تماشا بین نہیں تماشا تھا۔ یہ تماشا دیکھنے ستارہ خود دروازے پر آتی تھی اور نوٹوں سے بھر الفافہ لے کر اندر چلی جاتی تھی۔ ہر ملاقات میں یہ عہد ضرور کر لیتی تھی کہ وہ اس راز کا کسی پر انکشاف نہیں کرے گی۔ دوسرے لفظوں میں وہ ہر بار یہ دھمکی دے دیا کرتی تھی کہ اگر یہ پیسے پہنچنے میں ذرا دیر ہوئی تو وہ اس کی عزت کا جنازہ نکال سکتی ہے۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے۔ سرفراز علی حسب معمول اپنے دفتر پہنچا تھا کہ اس کی سیکریٹری نے اطلاع دی۔

”سر، کوئی لاڈلا نام کا شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے آپ اسے جانتے ہیں۔“

لاڈلا کا دفتر میں آنا اسے ناگوار گزرا تھا۔ پہلے اس نے سوچا ملنے سے انکار کر دے لیکن پھر خیال آیا کہ وہ کوئی ہنگامہ کھڑا نہ کر دے۔ وہ انتظار کرنے کو بھی نہ کہہ سکا۔ فوراً بلا لیا۔

لاڈلا اپنے حلیے ہی سے اوباش دکھائی دے رہا تھا۔ سفید ملل کا کرتا، ٹانگوں میں آڑا پاجامہ۔ پیلے رنگ کا رومال گلے میں پھندے کی طرح پڑا ہوا۔ سر پر چھدرے بال، ڈاڑھی مونچھے صاف، ہونٹوں پر ہنسی جمائے کمرے میں داخل ہوا۔

”سرفراز میاں، قسم اللہ کی! اگر تمہارے دفتر والوں کا خیال نہ ہوتا تو مٹھائی لے کر آنے کو جی کر رہا تھا۔ ایسی خبر لایا ہوں۔ ستارہ کے بیٹی ہوئی ہے۔ اس کا باپ کون ہے یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔“

اگر اس وقت کوئی دیکھنے والا ہوتا تو دیکھتا، سرفراز علی کا چہرہ ہلدی سے زیادہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ اس دن کا منظر تو یقیناً تھا لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ لڑکی بھی ہو سکتی ہے۔ لڑکی کا سنتے ہی اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کی رگوں میں میرا خون ہوگا لیکن وہ طوائف بننے پر مجبور کر دی جائے گی۔ ذرا بڑی ہوگی تو اس کے پیروں میں گھٹکرو بندھ جائیں گے۔ ایک لمحے کو تو اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اپنی ساری دولت دے کر اسے اپنے گھر لے آئے لیکن اپنی عزت انسان کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اپنی عزت کتنی عزیز ہوتی ہے یہ وہ نومولود بچے بتاتے ہیں جن کو اکثر نادیدہ ہاتھ قتل کر کے کچرا کنڈیوں میں پھینک دیتے ہیں۔ ناجائز بچوں کی مائیں بننے والی لڑکیاں اپنی عزت بچانے کے لیے اپنی مامتا کو مار دیتی ہیں۔ یہ بچی بھی تو ناجائز ہے۔ ستارہ سے میرا نکاح کب ہوا تھا اگر میں اسے گھر لے آؤں تو کیا فرزند اس کی ماں کا نام نہیں پوچھے گی؟ کیا میں بتا سکوں گا کہ اس بچی کی ماں ایک طوائف ہے جس سے میرے تعلقات تھے۔ کیا یہ صدمہ امی جان برداشت کر لیں گی؟ کیا والد صاحب کی نیک نامی برقرار رہ سکے گی؟ کیا میں کسی کو مٹہ دکھانے کے لائق رہوں گا۔

سرفراز علی کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ لاڈلا گھبرا گیا۔ میز پر پانی کا گلاس رکھا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور گلاس اٹھا کر سرفراز کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

”سر، میرا مطلب آپ کو تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔ میں تو اس لیے یہ خبر سنانے آ گیا تھا کہ مجھے انعام مل جائے گا۔ دو تین دن کی شراب کا خرچ نکل آئے گا۔“

”تیری یہ ہمت کیسے ہوئی کہ میرے دفتر میں چلا آئے۔“

”میں چلا جاتا ہوں لیکن یہ یاد رکھو اگر ستارہ خود یہ خبر دینے یہاں یا آپ کے گھر پہنچ جائے تو کیا ہوگا۔“

”اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، وہ کبھی نہیں آئے گی۔“

”آپ صرف چند دن ایک کوٹھا چڑھے اترے ہیں۔ میری عمر گزر گئی ہے۔ میں ان طوائفوں کو بھی جانتا ہوں اور ان کے وعدوں کو بھی۔ ذرا سوچیں اگر میں جا کر یہ کہہ دوں کہ آپ نے خرچ دینے سے انکار کر دیا ہے تو ستارہ کو اپنا عہد توڑتے دیر نہیں لگے گی۔ میں تو آپ کے بھلے کے لیے کہہ رہا تھا کہ مجھ سے بنا کر رکھیں۔ آپ کی سیکریٹری مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں کس لیے حاضر ہوا ہوں۔ اگر میں اسے بتا دیتا تو سوچے کیا ہوتا یا میں دفتر آنے کے بجائے آپ کے گھر آتا تو؟“

سرفراز علی اس چھپی ہوئی دھمکی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے چیک بک نکالی اور چیک کاٹ کر لاڈلا کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ تو میرا انعام ہو گیا۔“ لاڈلا نے کہا۔ ”اب جو کچھ ستارہ کو دینا ہو وہیں آ کر دیجیے گا۔“

لاڈلا ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ سرفراز علی کا اب دفتر میں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کچھ ضروری کام نمٹائے اور دفتر سے اٹھ گیا۔ احمد علی نے اس کی شادی کے بعد ایک دفتر اس کے حوالے کر دیا تھا لیکن مہینے دو مہینے بعد حساب کتاب خود آ کر چیک کر لیا کرتے تھے۔ ستارہ اسے بہانے بہانے سے خوب لوٹ رہی تھی لیکن وہ اس خوبی سے حساب کتاب میں گڑبڑ کر رہا تھا کہ ابھی تک اس کی چوری نہیں پکڑی گئی تھی البتہ وہ ڈرتا ضرور رہتا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ ستارہ اسے بے وقوف بنا رہی ہے لیکن اس سے پیچھا چھڑانا آسان بھی نہیں تھا۔ اس کا ایسا راز ستارہ کے ہاتھ میں تھا کہ اگر کھل جاتا تو بڑی بدنامی ہوتی۔

وہ دفتر سے گھر پہنچا تو بخاری آگ میں اس کا بدن جل رہا تھا۔ فرزند نے فوراً ڈاکٹر کو فون کر دیا۔ وہ دوا دے کر چلا گیا۔ سرفراز نے خند کا بہانہ کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ دوا نے اثر دکھایا اور کچھ دیر میں بخاری شدت میں کمی آگئی۔ اب اس کا ذہن سوچنے کے قابل ہو چکا تھا۔ اس کا ذہن ایک مرتبہ پھر لاڈلا کی طرف چلا گیا۔ اس کے دھمکی آمیز فقرے یاد آنے لگے۔ اگر ستارہ کے دل میں انتقام کی آگ روشن ہوگئی اور وہ بچی کو لے کر یہاں آگئی تو کیا ہوگا۔ کیا میں اسے جھٹلا سکوں گا؟ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر فرزند کو بلا لے اور اپنے

گناہ کا اقرار کر لے۔ اپنی بیٹی کو جا کر لے آئے اور فرزند کی گود میں ڈال دے۔ اس مصوم نے کیا گناہ کیا ہے کہ اسے طوائف بننے کے لیے ستارہ کے پاس چھوڑ دے۔ ایک لمحے کو یہ بھی خیال آیا کہ ہونے والی بچی اس کی ہے بھی یا نہیں۔ کسی اور کا گناہ ہو جو ستارہ نے اس کے سر چھو پ دیا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی اسے سکون سا مل گیا۔

انسان اپنی پردہ پوشی کے لیے مختلف جواز تلاش کر لیتا ہے۔ یہی حال اس وقت اس کا تھا لیکن وہ اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا تھا کہ ستارہ سے اس کا جسمانی تعلق رہ چکا ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر بے سکون ہو گیا۔ اس بے سکونی میں مظلومیت نہیں گناہ کا احساس تھا۔ میری اولاد طوائف بنے گی؟ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ بدنامی کا طوق گلے میں ڈال لوں گا۔ لیکن اعلان یہ کہوں گا کہ ستارہ کی کوکھ سے جنم لینے والی بچی میری بیٹی ہے۔ میں اسے ستارہ کے پاس نہیں رہنے دوں گا۔ کیا اسے وہ عزت مل سکے گی جو جائز اولاد کو ملتی ہے؟ وہ بڑی ہو کر ان طعنوں کو برداشت کر سکے گی کہ وہ اپنے باپ کی ناجائز اولاد ہے؟ کیا وہ مجھ سے نہیں پوچھے گی کہ جوانی میں آپ کے قدم کسی کوٹھے کی طرف اٹھے تھے۔

فرزند کمرے میں داخل ہوئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر فرزند گھبرا گئی۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ دلا ساملا تو اس کے آنسو اور بھی بے قابو ہو گئے۔ وہ فرزند کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگا۔

”فرزند تم جانتی ہو میں کتنا بڑا گناہ گار ہوں؟“

”مجھے یہ جاننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان تو نام ہی گناہوں کا ہے۔ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ اپنی غلطیاں دوسروں پر نہ ظاہر ہوں۔ اسی لیے میں یہ بھی نہیں چاہوں گی کہ آپ کوئی اعتراف میرے سامنے کریں۔ مجھے آپ کے ماضی سے نہیں حال سے غرض ہے اور میں یہ قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ آپ میرے ساتھ مخلص ہیں۔“

”تم نہ چاہو لیکن میں اپنے ایک جرم میں تمہیں ضرور شریک کروں گا۔ اس لیے کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔“

”اگر میری مدد درکار ہے تو ضرور بتاؤ۔“

اس سے پہلے کہ سرفراز جذبات کی رو میں آ کر سب کچھ بتا دیتا ایک ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بتایا کہ بڑی بیگم صاحبہ سرفراز کو دیکھنے کے لیے آرہی ہیں۔ بات جہاں بھی دیر رہ گئی۔

طوائفوں کے گھر بیٹی پیدا ہو جائے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی پوشیدہ خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ لیکن ستارہ تو یوں پریشان ہو گئی جیسے اس نے سانپ کو جنم دے دیا ہو۔ اسے لڑکے کی آرزو تھی۔ وہ اس کے لیے کمائی کا ذریعہ نہ بنتا لیکن اس کی امنگوں کا سہارا ضرور بنتا۔ اس کے عزائم میں شامل تھا کہ جوان ہونے کے بعد وہ اسے سرفراز علی کے مقابل کھڑا کرے گی۔ وہ اس سے اپنا حق بھی مانگے گا اور بڑھاپے میں اسے رسوا بھی کرے گا لیکن چال الٹی پڑ گئی تھی۔ افشاں بیگم تو اسے مبارک باد دے رہی تھیں کہ بڑھاپے کا سہارا پیدا ہو گئی ہے لیکن ستارہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”طوائف کی گود میں بیٹی آجائے تو وہ کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ ذرا سوچ تو نہ ہوتی تو میں کب کی مرکھپ گئی ہوتی۔“ ستارہ سن رہی تھی اور بیچ و تاب کھا رہی تھی۔ پھر وہ کسی خیال سے قہقہہ مار کے ہنس پڑی۔ اس کے قہقہے تھے کہ تھمنے میں نہ آتے تھے۔ افشاں بیگم اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہی تھیں۔

”میری بچی ہوش میں آ۔ کیا پاگل ہو گئی ہے۔“
”پاگل تو اب سرفراز علی ہوگا۔ میں نے سوچ لیا ہے مجھے کیا کرنا ہے۔“

”کیا کرے گی تو۔ کچھ ایسا ویسا مت کر بیٹھنا اس بچی کے ساتھ۔“

”مجھے جو کرنا ہے وہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ بس اتنا بتا سکتی ہوں کہ سرفراز علی کی غیرت کا جنازہ سرعام نیلام کروں گی۔“

”چھوڑ دے اس شریف آدمی کا پیچھا۔“
”اماں، کمال ہے! یہ تم کہہ رہی ہو۔ طوائف جب کسی کا پیچھا کرتی ہے تو قبر تک نہیں چھوڑتی۔ اس کی نسلوں تک کو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔“

”میں تو یوں کہہ رہی تھی کہ سرفراز میاں خرچ پہنچا تو رہے ہیں۔“

”دولت والوں کی دولت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ انہیں اپنی مفلسی کا احساس تو اس وقت ہوتا ہے جب ان کی عزت کا سرمایہ لٹتا ہے۔ میں سرفراز علی کو اسی مفلسی سے دوچار کروں گی۔“

”یہ نادانی مت کرنا کہ بچی کو لے کر اس کے گھر پہنچا آؤ۔ خرچے سے بھی جاؤ گی۔“

”میں اتنی نادان نہیں ہوں۔ جو کام کروں گی وقت

آنے پر کروں گی۔ میں نے سوچ بھی لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“ سرفراز علی کا بخارا بھی اتر نہیں تھا صرف کم ہوا تھا لیکن ہمت کر کے اٹھ گیا تھا۔ اسے ستارہ کی طرف جانا تھا۔ وہ لاڈلا کے دفتر آنے سے گھبرا گیا تھا۔ ستارہ سے جانے کیا الٹی سیدھی لگا دے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اب ستارہ کے تیور کیا ہیں۔

ایک لمبی سے کار ستارہ کی گلی کے باہر آ کر رکی۔ شام ہو گئی تھی۔ گلی میں چہل پہل دن کے مقابلے میں کچھ بڑھ گئی تھی۔ سرفراز علی پیدل چلتا ہوا گلی میں داخل ہوا۔ ایک مکان کی سیڑھیاں چڑھیں اور دستک دے دی۔ چاند خاں دروازے پر آیا اور اگلے پاؤں لوٹ گیا۔ اس کے جاتے ہی ستارہ بیگم دروازے پر آ گئی۔

”اماں، سرفراز صاحب آئے ہیں۔ میں صدقے میں قربان۔ آئیے اندر آئیے۔“

”نہیں شکریہ۔ میں بس یہ لفافہ تمہیں دینے آیا تھا۔ ویسے بھی تمہارے مجرے کا وقت ہونے کو ہے۔“

”تو اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے۔ مجرا تمہاری بیٹی تو نہیں کرے گی۔ ابھی تو خیر سے بہت دن ہیں اس کے گھنگرو باندھنے میں۔“

”ستارہ، میرے سامنے تمہیں یہ سب نہیں کہنا چاہیے۔“

”میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ اس کی پرورش یہاں ہوگی تو مجرا ہی کرے گی۔ لڑکیاں تو لوکی کی بیل ہوتی ہیں، دیکھتے دیکھتے جوان ہو جائے گی۔ اتنی غیرت ہے تو میں تیار ہوں۔ کل ہی جا کر تمہاری بیوی کی گود میں ڈال آتی ہوں۔“
”نہیں ستارہ ہرگز نہیں۔ ایسا ہرگز مت کرنا۔“

”اپنی بیٹی کو دیکھو گے نہیں۔“
”میں تو اسے دیکھ لوں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھے دیکھے۔“

”ٹھیک ہے یہ پردہ بھی رکھ لیتے ہیں۔ ایک گزارش اور ہے۔ جتنا خرچ آپ دیتے ہیں اگلے مہینے سے اس کا دو گنا کر دیجیے۔ ہمارے گھروں میں بچیوں پر خرچ بہت کیا جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں رقم بڑھا دوں گا۔“

وہ اس کے دروازے سے ہٹا تو اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن اس کا دل رورہا تھا۔ اس کی کیفیت ایسی تھی جیسے وہ بیٹی کی پیدائش پر نہیں اسے دفن کرنے آیا ہو۔ اس کے لیے وہ مر رہی تو گئی تھی۔ وہ ایک ایسا بد نصیب باپ تھا جو اپنی بیٹی کو اس خوف سے دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ کہیں

اس کے دل میں بیٹی کی محبت پیدا نہ ہو جائے۔

☆☆☆

پانچ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اس دوران سرفراز علی کئی نشیب و فراز سے گزرا۔ کئی تبدیلیوں کا منہ دیکھا۔ فرزانہ نے اس کو ایک بیٹے کا تحفہ دیا جس کا نام اس نے ایاز علی رکھا۔ والدہ کا انتقال ہو گیا اور والد احمد علی ایسے بیمار پڑے کہ اپنا تمام کاروبار سرفراز علی کے حوالے کر کے بستر سے لگ گئے۔ ایاز علی کی پیدائش کے بعد سرفراز کو قلبی سکون ملا تھا۔ اب تک وہ خود کو مفلس سمجھ رہا تھا مگر اب وہ بھی مالدار تھا۔ اسے اب اپنی بیٹی کا خیال بہت کم آتا تھا لیکن اب وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ستارہ بلیک میلنگ پر اتر آئی ہے۔ اس کے مطالبات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ بچی کے خرچ کے نام پر پورے گھر کے اخراجات سرفراز ہی کو اٹھانے پڑ رہے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسے کوڑی کوڑی کو محتاج کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ کئی دنوں سے لاڈلانے یہ دتیر اختیار کر لیا تھا کہ وہ اس سے ملنے اس کے گھر چلا آتا تھا۔ کہتا کچھ نہیں تھا لیکن یہ ظاہر کرتا تھا کہ کچھ کہنے کے لیے بھی آسکتا ہے۔ شکر یہ ہوا تھا کہ فرزانہ اسے پہچان نہیں سکی تھی کہ یہ وہی آدمی ہے جو شادی سے پہلے اس وقت ملا تھا جب وہ سرفراز کے ہمراہ ریسٹورنٹ سے باہر نکل رہی تھی اور بڑی بدتمیزی سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ اسے پہچان نہیں سکی تھی لیکن وضع قطع سے عجیب سا لگا تھا۔ اس نے سرفراز سے کہا بھی تھا کہ اس نے کیسے کیسے دوست بنارکھے ہیں۔ سرفراز نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ بزنس میں ہر قسم کے لوگوں سے تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ اس نے فرزانہ کو چپ ضرور کرادیا تھا لیکن اس بلا سے خود بھی پریشان تھا۔ یہ کیسے کہتا کہ وہ گھر نہ آیا کرے۔ اس کا دفتر میں آنا اور بھی خطرناک تھا۔ نہ جانے کس کے سامنے کیا بک دیتا۔ وہ اس زیادتی کو سہتا رہا لیکن یہ سوچ کر کانپ بھی جاتا تھا کہ لاڈلانے گھر دیکھ لیا ہے۔ فرزانہ کی والدہ نے ایک کوٹھی کرائے پر لے لی تھی۔ ان کا بیٹا بھی آسٹریلیا سے آ گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اس کوٹھی میں منتقل ہو گئی تھی۔ پہلے اس نے سوچا وہ بھی فرزانہ کو لے کر وہاں منتقل ہو جائے لیکن پھر خود ہی اپنے فیصلے کی تردید کر دی۔ یہ کوئی حل نہیں تھا۔ لاڈلا حرفوں کا بنا ہوا تھا۔ وہاں کا پتا بھی لگا لیتا۔ ایک شہر میں رہ کر وہ کب تک چھپ سکتا تھا۔ اس خیال کے ساتھ اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر وہ اپنا کاروبار سمیٹ کر بیرون ملک منتقل ہو جائے تو ستارہ سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے۔

وہ فیصلہ کر چکا تھا لیکن باپ کی بیماری سے مجبور تھا۔ ساتھ لے جانے کے قابل وہ تھے نہیں اور چھوڑ کر جانیں سکتا تھا۔ رسوائی کے خوف سے ستارہ کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کے لیے دولت لٹاتا رہا۔ ایک سال اور گزر گیا۔ احمد علی کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سعادت مند اولاد کی طرح ان کی تیار داری میں دن رات ایک کر رہا تھا لیکن وہ انہیں بچانہ سکا۔ احمد علی کا انتقال ہو گیا۔

اس کے اپنے حالات کی طرح ملک کے حالات بھی دگرگوں ہوتے جا رہے تھے۔ لاقانونیت بڑھتی جا رہی تھی۔ جان و مال سلامت نہیں رہے تھے۔ جرائم پیشہ افراد کی بن آئی تھی۔ بڑے پیمانے پر بہتا وصول کیا جا رہا تھا۔ جرائم پیشہ افراد کھلے عام فیکٹریوں اور کارخانوں میں داخل ہوتے یا پرچیاں بھیجتے کہ اتنی رقم کا بندوبست کرلو ہمارا آدمی آکر لے جائے گا۔

سرفراز یہ وحشت ناک خبریں سن ضرور رہا تھا لیکن جب ایک دن ایک گم نام فون اس کے نام بھی آ گیا تو اسے یقین ہو گیا۔ اس نے فون کرنے والے کو جھڑک دیا۔ اس کا خیال تھا کہ لوگ خاموشی سے ان لوگوں کے مطالبات پورے کر دیتے ہیں اسی لیے ان کی اتنی ہمت ہو گئی ہے۔ ان کے سامنے کوئی ڈٹ جائے تو یہ نوبت نہ آئے۔ اس نے فون کرنے والے سے صاف کہہ دیا کہ وہ کسی حالت میں اس کا مطالبہ پورا نہیں کرے گا بلکہ پولیس کو اطلاع بھی کرے گا۔ اس نے اس فون کی اطلاع اپنے علاقے کے پولیس اسٹیشن پر درج بھی کرادی لیکن کوئی خاطر خواہ کارروائی نہیں ہوئی۔

دو چار دن بعد وہی فون پھر آیا۔ اس فون کو سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ فون کرنے والا اس کے بیٹے ایاز کے بارے میں معلومات فراہم کر رہا تھا۔

”تمہارے بیٹے کا نام ایاز ہے۔ بڑا پیارا بچہ ہے۔ ابھی نیا نیا اسکول جانے کے قابل ہوا ہے۔ جس اسکول میں پڑھتا ہے وہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ اگر کوئی اسے راستے میں سے اغوا کر لے تو تمہیں کیسا لگے گا۔“

”کون ہو تم کیا چاہتے ہو؟“

”کرڈوں کھاتے ہو ہم نے صرف چند لاکھ مانگے تھے۔ تم نے انکار کر دیا۔“

”فون بند مت کرنا۔ میں رقم دے دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ آدھے گھنٹے بعد ہمارا آدمی پہنچ جائے گا۔“

سلیم مردار نام بتائے گا۔ پچاس لاکھ اسے دے دینا پولیس

بلانے کی غلطی مت کرنا۔ پولیس تمہارے بیٹے کی حفاظت نہیں کر سکے گی۔“

فون بند ہوتے ہی سرفراز نے ایک آدمی کو بینک بھیجا اور رقم منگوائی۔ اسے اپنی بے عزتی کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ میں اس ملک میں اتنا بے وقعت ہو گیا کہ ایک گناہ نام فون پر اتنی بڑی رقم دینے پر مجبور ہوں۔ ابھی ایک غنڈا میرے دفتر میں آئے گا اور رقم لے کر چلا جائے گا۔ کوئی اسے روکنے والا نہیں ہوگا۔ یہی ہوا۔ اس شخص کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ پہلے اس کی سیکرٹری سے ملا جاتا ہے۔ وہ بڑی بدتمیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔

”میرا نام سلیم مردار ہے۔“

سرفراز نے رقم اس کے حوالے کر دی۔ وہ جیسے آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔

”ہیلو، فرزانہ۔“ سرفراز اپنی بیوی کو فون کر رہا تھا۔

”ڈرائیور سے کہو، ایاز کو اسکول سے لے آئے۔“

”ابھی سے؟ ابھی تو چھٹی کا وقت نہیں ہوا۔“

”جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ چھٹی سے پہلے لے آؤ۔“

”خیریت تو ہے سرفراز۔ آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔“

”میں گھر پہنچ رہا ہوں۔ گھر آ کر بتاؤں گا۔“

وہ گھر پہنچا تو ایاز علی اسکول سے آچکا تھا۔ فرزانہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

سرفراز نے آتے ہی بیٹے کو گود میں اٹھالیا۔ وہ اس طرح اسے چوم رہا تھا جیسے برسوں بعد ملاقات ہو رہی ہو۔

”ایاز کو کھل سے میں اسکول چھوڑنے اور لینے جاؤں گا۔ ڈرائیور نہیں جائے گا۔“

”آپ ہی چھوڑ آئیے گا مگر بتائیے تو بات کیا ہے۔“

فرزانہ نے کہا۔

سرفراز نے فرزانہ کو تفصیل بتائی تو اس کے ہوش بھی اڑ گئے۔ وہ عورت تھی، ماں تھی۔ کچھ زیادہ ہی گھبرا گئی۔

”ایاز آج سے اسکول نہیں جائے گا۔ آپ بھی اسے چھوڑنے نہیں جائیں گے۔“

”جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ اسے اسکول نہ بھیجوں لیکن کب تک۔“

”کچھ بھی ہو جائے۔ میں اپنے بچے کو گھر میں پڑھا لوں گی۔ مجھے تو آپ کی فکر بھی لگی ہوئی ہے۔“

”میں نے ان کا منہ بند کر دیا ہے۔ اب وہ کوئی قدم

نہیں اٹھائیں گے۔ سوچنا تو یہ ہے کہ میں کب تک اپنی کمائی لٹاتا رہوں گا۔ یہاں تو کوئی کہنے سننے والا ہی نہیں ہے۔ حکومت نام کی تو کوئی چیز یہاں ہے ہی نہیں۔“

”آپ نے ایک مرتبہ بیرون ملک جانے کا بھی ارادہ کیا تھا۔“

”تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ بہت سے مل

مالکان ملائیشیا اور بنگلہ دیش میں اپنا سیٹ اپ لگا رہے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں بھی پرواز کے لیے پرکھولوں۔ ایسا کب تک چلے گا۔“

اس نے خوب اچھی طرح غور کیا۔ ایک طرف ستارہ کا

دھڑکا لگا ہوا تھا۔ دوسری جانب بھتا خوری کی وبا پھیل رہی

تھی۔ لوڈ شیڈنگ کا عذاب الگ تھا۔ اتنے محاذوں پر میں

اکیلا کیسے لڑ سکتا ہوں، اس نے سوچا۔ یہ بھی یقین نہیں ہے کہ

جان کب تک بچی رہتی ہے۔ مارگٹ کنگ کا بازار گرم ہے۔

اچھا تو یہی تھا کہ میں اپنے ملک کی خدمت کرتا۔ اس کی

معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرتا لیکن زندہ

رہوں گا تو یہ کردار ادا کروں گا۔ کس وقت کون سی گولی میری

زندگی کے چراغ کو گل کر دے۔ کون سا ہاتھ میرے بچے کو

اٹھا لے جائے۔ وہ وقت آنے سے پہلے بہتر ہے کہ میں یہ

ملک چھوڑ دوں۔ اس نے خاموشی سے کوششیں شروع

کر دیں۔ اس کے ایک دوست ملائیشیا چلے گئے تھے۔ اس

نے ان کے توسط سے اپنا سرمایہ منتقل کرنا شروع کر دیا۔ خود

بھی ملائیشیا گیا۔ ایک بار نہیں کئی چکر لگائے۔ اس دوران وہ

ستارہ کو پابندی سے خرچ پہنچاتا رہا۔ لاڈلا کئی مرتبہ آیا۔ اسے

بھی خبر نہ ہونے دی کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔

جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو اس نے ملک چھوڑ

دیا۔ جہاز میں بیٹھے ہوئے اسے اپنی بیٹی کا خیال آیا جس کو

اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا نام تک اسے معلوم نہیں

تھا۔ اس کی آنکھیں فرط جذبات سے بھیگ گئی تھیں۔

”آپ کیوں اداس ہوتے ہیں۔ یہ ہمارا ملک ہے۔

حالات ٹھیک ہوتے ہی ہم پھر یہاں آجائیں گے۔ ہمیشہ

کے لیے تو نہیں جا رہے ہیں۔“

”تمہیں کیا معلوم میں یہاں کیسی کیسی امور یادیں

چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“

جہاز نے اڑان بھری۔ سرفراز علی نے آنکھیں

بند کر لیں۔

☆☆☆

”ارے لڑکی، تو اب تک یونہی پھر رہی ہے۔ محفل کا

سسینس ڈائجسٹ 278 ستمبر 2012

سسینس ڈائجسٹ 278 ستمبر 2012

سسینس ڈائجسٹ 278 ستمبر 2012

”آپ سے زیادہ ہمیں ان کی فکر ہے۔ اللہ قسم جب سے وکیل صاحب نے ان کا ذکر کیا ہے ہماری آنکھیں دروازے پر ہیں۔ میں نے تو منت بھی مان لی تھی۔ ایاز میاں آئیں گے تو مجھی کے چراغ روشن کروں گی۔“

پردوں کو ایک مرتبہ پھر جنبش ہوئی۔ سازندے اندر آ گئے۔ ابھی انہوں نے اپنی نشست سنبھالی تھی کہ چم چم کی آواز نے کمرے میں پھول بکھیر دیے۔ پردے کو پھر جنبش ہوئی۔ ایک لڑکی سولہ سنگار سے آراستہ آدمی پنڈلیوں تک گھٹکر و باندھے چم چم کرتی آئی اور ایاز کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ ایاز اپنی جگہ سے کھٹکنے لگا تو وہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ پھر بیٹھے بیٹھے اس کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔

”حضور کیا سننا پسند کریں گے۔“
ایاز کی عجیب حالت تھی۔ آنکھیں بند ہو گئی تھیں، ہونٹ خاموش تھے۔ دوسری جانب سے پھر پوچھا گیا۔
”بتائیے ناں، کیا سننا پسند کریں گے؟“
”جو آپ کا جی چاہے۔“ ایاز نے بڑی مشکل سے کہا۔

”اللہ ہم قربان جائیں آپ کے اس شرمانے پر۔“
دلشاد نے کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سازندوں نے ساز ملائے۔ دلشاد نے غزل چھیڑ دی۔

ہم تو حیران ہوئے جاتے تھے آجانیے پر
اور قربان ہوئے آپ کے شرمانے پر
غزل ایسی حسب حال تھی کہ ہر شعر ایاز کی حالت زار کی ترجمانی کر رہا تھا۔ دلشاد کی ادائیں اور والہانہ رقص اس پر مستزاد تھا۔ عجیب سا بندھ گیا۔

ایاز علی بھول گیا تھا کہ وہ کسی طوائف کے کوٹھے پر ہے۔ اسے ایسے ماحول کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا وہ تو بس یہ دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکی ہے جو صرف اس کے لیے نغمہ سرا ہے۔ عجیب سی لذت تھی جو اس کی رگوں میں اتر رہی تھی۔

غزل ختم ہوئی پھر دوسری غزل شروع ہوئی۔ ستارہ نے ایک کے بعد ایک کئی غزلیں سنائیں۔ ایاز کو نہ شاعری سے دلچسپی تھی نہ ان کے مفہوم کو سمجھ رہا تھا لیکن کوئی بات ایسی تھی کہ ہر غزل کے بعد اس کا جی چاہتا تھا یہ لڑکی اسی طرح ناچتی رہے۔

میرا ختم ہوا۔ وکیل نے ایاز کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ ایاز کو یاد آ گیا کہ آتے وقت وکیل نے اس سے کیا کہا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑے نوٹوں کی ایک گڈی دلشاد کی طرف بڑھا دی۔ دلشاد

”ڈر کی کیا بات ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پھر دلشاد سے میں نے کہہ دیا ہے۔ وہ انتظار کر رہی ہوگی۔“
”کسی نے دیکھ لیا تو۔“

”یہاں کوئی کسی کو نہیں دیکھتا۔ بس تم گاڑی لا کر کرو۔ ایک مرتبہ دلشاد کو دیکھ لو گے تو میرے بغیر ہی آیا کرو گے۔ وہ طوائف نہیں لڑکی ہے۔ کچی کلی ہے جو پھول بننے کے انتظار میں ہے۔“

”یار میں.....“
”مرد ہو کر شرم رہے ہو۔“ وکیل نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آگے کی طرف چل دیا۔

ستارہ کے کوٹھے پر تمام انتظامات مکمل تھے بس مہمان کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔ یہ انتظار بھی ختم ہوا۔ پہلے وکیل اندر داخل ہوا پھر پچیس چھیس سال کا ایک نوجوان شرماتا ہوا اندر آیا۔ یہ ایاز علی تھا۔

ہال نما کمرے میں دور تک سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ جہاں کمر ختم ہوتا تھا باریک پردے پڑے ہوئے تھے ایاز علی ایک گاؤں کے کھیتوں کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ یہ سوچ کر وہ اور بھی گھبرا رہا تھا کہ ابھی اور لوگ بھی آئیں گے۔ کیا خبر ان میں کوئی جاننے والا بھی ہو۔ اگر بات گھر تک پہنچ گئی تو کیا ہوگا۔

”ابھی اور لوگ بھی آئیں گے؟“ ایاز نے قریب بیٹھے ہوئے وکیل سے پوچھا۔

”گھبراؤ مت۔ محفل تو یہاں خوب جھتی ہے لیکن تمہارے لیے میں نے خاص اہتمام کرا دیا ہے۔ سب کا داخلہ بند ہے۔ آج کی محفل میں صرف تم ہی تم ہو گے۔“
”یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ لوگوں کا سامنا کرنا واقعی میرے لیے بہت مشکل ہو جاتا۔“

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ پردے کو جنبش ہوئی اور ستارہ اندر آئی۔ وہ نے تلے قدم اٹھائی ہوئی ایاز علی تک آئی اور ہاتھوں کی کنوری بنا کر سلام پیش کیا۔ ایاز علی گڑبڑا گیا تھا کہ جواب میں کیا کہے لیکن وکیل نے صورت حال سنبھال لی۔ اس نے ستارہ کا تعارف کرایا۔ ایاز علی کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ یہ وہ لڑکی نہیں ہے جس کے پاس اسے لایا گیا ہے بلکہ اسی لڑکی کی ماں ہے۔

”حضور کو بس چند گھنٹوں کی زحمت ہوگی۔ بچی تیار ہو رہی ہے۔“

”حضور کو تا ب انتظار کہاں ہے۔“ وکیل نے کہا۔
”بڑی مشکل سے تو یہاں تک آئے ہیں۔“

کی آگ نے اسے جھلسا دیا تھا۔ افشاں بیگم اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں اس کی یادگار لاڈلا تھا جواب تک زندہ تھا لیکن بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ ایک کونے میں پڑا رہتا تھا۔ شراب کے علاوہ کوئی اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ البتہ اس کے مشورے اب بھی کام آجاتے تھے۔ یہ اسی کا مشورہ تھا کہ کوٹھے پر آنے والے ایک وکیل نے ایاز علی سے دوستی گانٹھی اور پھر ستارہ بیگم کی بیٹی دلشاد بیگم کے حسن کا ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ اسے دیکھنے بازار حسن تک آنے کو تیار ہو گیا اور بقول چاند خاں، بس آنے ہی والا ہے۔

میں سیال ملائیشیا میں گزارنے کے بعد سرفراز علی کو وطن کی یاد آئی تھی۔ ستارہ کا نام تک اس کے ذہن سے نکل گیا تھا، خطرہ کیسا۔ اس کا بیٹا ایاز علی جوان ہو چکا تھا۔ اس کی شادی بھی کرنی تھی۔ یہ کام اپنے وطن ہی میں ہو سکتا تھا۔ سرفراز نے ایک مرتبہ پھر ہجرت کی اور پاکستان آ گیا۔ اب وہ بیمار رہنے لگا تھا لہذا تمام کاروبار بیٹے کے سپرد کر کے مطمئن ہو گیا لیکن بد قسمتی ساتھ لگی ہوئی تھی۔ ایک روز وہ چاند خاں کو نظر آ گیا۔ اس نے جا کر ستارہ کو خبر کر دی۔ ستارہ نے آدمی پیچھے لگا دیے کہ اس کے بارے میں معلومات جمع کریں۔ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس نے پھر سے اپنا کاروبار بھال لیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا کاروباری دنیا میں آگے بڑھ رہا ہے۔ ستارہ کے شیطانی دماغ نے منصوبہ بنالیا۔ اس منصوبے کے مطابق ایاز کو باپ کے مقابل کھڑا کرنا تھا۔ اب ستارہ کے نشانے پر سرفراز علی نہیں ایاز تھا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہی تھی۔ ستارہ جیسی عورتوں کے محلے دن میں سوتے ہیں رات کو جاگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ گناہ اندھیرے میں پرورش پاتے ہیں۔ یہ بازار بھی اندھیرا ہوتے ہی روشن ہو گیا۔ کھڑکیاں جگمگائیں۔

وقت پیچھے کی طرف چلنے لگا تھا مگر تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ۔ گلی کے موڑ پر ایک لمبی کار آ کر رک کر جیسے بیس سال پہلے آ کر کتی تھی لیکن اس میں سرفراز علی نہیں اس کا بیٹا ایاز علی بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ وہ وکیل بیٹھا تھا جو اسے یہاں تک لے کر آیا تھا۔

”ایاز علی، یہاں سے ستارہ کے گھر تک پیدل چلنا ہوگا۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ڈر لگ رہا ہے۔ ایسی جگہوں پر میں اس سے پہلے بھی نہیں آیا۔ میرے خیال میں تو لوٹ چلو۔ پھر کسی دن آجائیں گے۔“

وقت ہونے کو ہے۔ گھٹکر تو تو رہی دور کی بات ہاتھوں میں پھولوں کے کنگن تک نہیں ڈالے۔ اپنے حسن پر ہمیں بھی ناز تھا لیکن مردوں کو رجھانے کے لیے روپ سنگا تو ہم بھی کر لیتے تھے۔“

”تو کیا میں نہیں کرتی۔ آج ایسی کیا بات ہے جو یوں بوکھلا رہی ہو اماں۔“

”آج تیری نہیں میری فتح کی رات ہوگی۔ وہ آ رہا ہے جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔“

”سچ اماں، بتاؤ تو کسی کون ہے وہ۔ پھر تو میری جگہ آپ سنگار کریں۔“

”شکار میرا ہے لیکن گردن تو تیرے ہاتھ میں ہوگی۔“
”مجھ سے آج تک کوئی بچا ہے جو وہ بچے گا۔“

”خالی پر نوچوں یا چوچ بھی توڑنی ہے۔“
”اے ہے، مرغا ہے، پردوں پر چاندی لپیٹ کر آئے گا۔ بس چھری پھیرنے کے سوا سب کچھ ایسا کرنا کہ جیتیں خالی کرتا ہے۔“

”سچی اماں، تم ہو بڑی چالاک۔“
”پیار کا ایسا ناک کرنا کہ لیلی مجنوں یاد آ جائیں۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے وہ رفتہ رفتہ تجھے خود پتا چلتا جائے گا۔“

”یہ بات ہے تو یوں گئی اور یوں تیار ہوئی۔“
”اور دیکھو ویسا ہی کرنا جیسا تجھے بتایا ہے۔“

اس کے جاتے ہی چاند خاں اندر آ گیا۔
”اب تو خوش ہو۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ بیس سال بعد سرفراز علی دوبارہ دریافت ہو گیا۔ میں نے بھی ایسے بندے کو اس کے بیٹے کے پیچھے لگایا کہ اس نے اس غریب کوشیشے میں اتار ہی لیا۔“

”واقعی کمال ہو گیا۔ اس سے بڑا کمال یہ ہوا کہ ایاز علی یہاں آنے پر تیار بھی ہو گیا۔“

”ہوتا کیسے نہیں۔ باتوں کے جادو میں تو اچھے اچھے گرفتار ہو جاتے ہیں۔“

”اب تم دیکھنا میں کرتی کیا ہوں۔ باپ بیٹے کو آمنے سامنے کھڑا نہ کر دوں تو ستارہ چہمارن نام رکھ دینا۔“

”وہ تو مجھے معلوم ہے ایاز علی کا کیا حال ہونے والا ہے۔“

”ایاز علی تو یونہی درمیان میں آ گیا۔ مجھے تو سرفراز علی کا حساب بے باق کرنا ہے۔ یہ سوچ کر ملک سے باہر چلا گیا تھا کہ آنکھ اوچھل پھاڑا جھل۔“

ستارہ بیگم وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئی تھی۔ شاید انتقام

نے جھک کر تمیں سلام کیے اور نذرانہ قبول کر لیا۔

ستارہ نے وکیل کو اشارہ کیا۔ اشارے کا مطلب یہ تھا کہ سیر ہو کر پانی نہ پینے دو۔ پیاسے کو پیاسا ہی اٹھا دو۔ ”یار، تم بیٹھو۔ میں زیادہ دیر گھر سے باہر نہیں رہ سکتا۔ مجھے اب جانا ہوگا۔“

”میں..... اکیلا..... یہاں۔ چلو پھر میں بھی چلتا ہوں۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“

ایاز علی اٹھ کر کھڑا ہوا تو دلشاد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”بیٹھے، کچھ دیر باتیں کریں گے۔“

”نہیں اب میں چلوں گا۔“

”ایک شرط پر جانے دوں گی۔ آپ پھر آئیں گے۔ آپ کو میں نے تماشائی نہیں سمجھا ہے۔ آپ تو میرے دل میں اتر گئے ہیں۔“

نوخیز ایاز علی کی سماعت نے کسی لڑکی کی زبانی ایسا بھرپور اصرار بھی نہیں سنا تھا۔ جب اس سے یہ اصرار کیا جا رہا تھا وہ یہ بھول گیا تھا کہ یہ لڑکی ایک طوائف بھی ہے۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ پھر آئے گا۔

”ہاں ہاں میاں، پھر آنا۔ اس گھر کے دروازے تم پر بند تھوڑی ہیں۔“ ستارہ نے اس وعدے کو مزید پختہ کر دیا۔

ابھی دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ اسے دلشاد کی یاد آنے لگی لیکن وہ وکیل غائب تھا جو اسے دلشاد کے گھر لے کر گیا تھا وہ فون بھی نہیں اٹھا رہا تھا۔ غالباً یہ بھی منصوبے کا حصہ تھا کہ ایاز کی آتش شوق کو بھڑکایا جائے۔ یہ آگ واقعی اتنی بھڑک گئی تھی کہ تیسرے دن ہمت کر کے ایاز علی خود دلشاد کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر بھول گیا تھا کہ وہ دلشاد سے نہیں دلشاد بانی سے ملنے آیا ہے۔ یہ کسی لڑکی کا گھر نہیں طوائف کا کوٹھا ہے۔ یہ بھرے کا وقت تھا۔ محفل عروج پر تھی۔

اس نے اندر قدم رکھا اور دلشاد کی نظر اس پر پڑی تو وہ بے تال ہو گئی۔ سارنگی کی روں روں ہوتی رہی لیکن دلشاد کے پاؤں رقص کرنا بھول گئے۔ پھر اس نے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے اور دیکھتے ہی دیکھتے دائرہ سا بن کر گھومنے لگی۔ اس کی پشت کا دامن حلقہ بنا کر بلند ہوا اور اس کی کمر تک آ گیا۔ وہ دائرہ وار آگے بڑھی اور وہاں تک آ گئی جہاں ایاز علی کھڑا تھا۔ اس نے ایاز علی کا ہاتھ پکڑا اور ایک خالی جگہ پر بٹھا دیا۔

اس بھری محفل میں وہ اسے اتنی ہی اہمیت دے سکتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ایک من چلے تماشائی نے اس کی کلائی پکڑ لی تھی اور اس پر نوٹ نچھاور کر رہا تھا۔ ایاز تمل کر رہ گیا۔ وہ تو

یہ سمجھ کر آیا تھا کہ پہلے دن کی طرح اس وقت بھی ستارہ اس کے لیے گائے گی لیکن وہ تو جمع محفل بنی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے فقرے اچھا لے جا رہے تھے۔ اس سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا لیکن مجبور تھا۔ اٹھ کر جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

بجرا ہوتا رہا۔ وہ جھنجھلا تا رہا مگر جبر کر کے بیٹھا رہا۔ بجرا ختم ہوا اور لوگ رخصت ہوئے لیکن ایاز بیٹھا رہا۔ دلشاد اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اس کے گلے میں اپنی بانہیں حائل کر دیں۔ ستارہ نے خونخوار آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”دلشاد، تماشائیوں سے اتنی بے تکلفی اچھی نہیں ہوتی۔“

”یہ کوئی تماشائی تھوڑی ہیں۔“

”میں جو کوئی بھی ہوں شاید آئندہ نہ آسکوں۔“

”بندی کا قصور۔“

”مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ تم اتنے لوگوں کے سامنے ناچو۔“

دلشاد کیا جواب دیتی لیکن ستارہ بول پڑی۔ ”میاں، ابھی تک بچے ہو۔ یہ شریفوں کا گھر نہیں طوائف کا کوٹھا ہے۔ یہاں ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔ انہی لوگوں سے ہمارا رزق وابستہ ہے۔ میں کس برتے پر تمہاری خاطر ان سب کو روک دوں۔“

”میرے جو جذبات تھے ان سے میں نے آپ کو آگاہ کر دیا۔“

”اگر ایسا ہی ہے تو خرچ اٹھانے کا وعدہ کرو۔ دلشاد صرف تمہارے لیے ناچ لیا کرے گی۔“

”مجھے منظور ہے۔ میں اتنا خرچ دوں گا جتنا سب تماشائی مل کر بھی نہیں دے سکتے۔“

”اے میں قربان لیکن میاں ایک شرط میری بھی ہے۔ تمہیں دن کے وقت آنا ہوگا۔“

”مجھے یہ بھی منظور ہے۔“

”آپ کتنے اچھے ہیں۔“ دلشاد نے کہا۔ ”تو پھر کل انتظار کر لو۔ اللہ قسم میرے لیے رات کا ٹنا مشکل ہو جائے گا۔“

ایاز وہاں سے یوں اٹھا جیسے فتح کا پروانہ ہاتھ میں لے کر اٹھا ہو۔

پھر یوں ہوا کہ وہ دن کے وقت دلشاد کے پاس جانے لگا۔ اس وقت اتنے بڑے مکان میں ایسا سنا ہوتا تھا کہ سانسوں کی آواز گن لو۔ تھکے ہارے سازندے بے دلی سے

ساتھ دیتے رہتے پھر ان کی بھی چھٹی کر دی جاتی۔ دونوں کو باتیں کرنے کا خوب موقع مل جاتا۔ ستارہ بیگم بھی کبھی آ کر جھانک جایا کرتی تھیں ورنہ وہ ہوتا اور دلشاد۔ وہ پابندی سے آنے لگا۔

اس تنہائی نے تماشائی کے رشتے کو محبت کے تعلق میں تبدیل کر دیا۔ ستارہ بیگم اسے دلشاد کی اداکاری سمجھ رہی تھیں لیکن دلشاد اس پر دل و جان سے فدا ہو گئی تھی۔ یہی حال ایاز کا تھا۔

گرمیوں کی دوپہر میں دلشاد نے اس کے نام کر دی تھیں لیکن ایاز کے دل میں ایک خلش اب بھی باقی تھی۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ دلشاد دن کے وقت بے شک میرے ساتھ ہوتی ہے لیکن رات کو تو بجرا ہوتا ہوگا۔ میری آنکھوں کے سامنے نہ سہی لیکن وہ سب کے سامنے ناچتی تو ہوگی۔ کیسے کیسے گندے فقرے اس کی طرف اچھلتے ہوں گے۔ اس نے یہ سوچ کر صبر بھی کر لیا تھا کہ دلشاد بہر حال ایک طوائف ہے۔ وہ اسے بجرا کرنے سے نہیں روک سکتا۔

تجربہ کار ستارہ بیگم اس کی کیفیت کا بخوبی مشاہدہ کر رہی تھی۔ گاہے گاہے ایسے جذباتی جھٹکے دیتے رہتی تھی کہ ایاز علی تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ وہ دلشاد سے محبت کرنے لگا تھا اور ہر محبت کرنے والے کی طرح یہ چاہتا تھا کہ دلشاد صرف اس کی ہو کر رہے۔ ستارہ بیگم اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اس کی جیبیں خالی کرتے بہت دن ہو گئے تھے اب اس نے ایسا جذباتی جھٹکا دینے کا سوچا کہ ایاز ضد میں آ جائے۔ دلشاد کے مزید قریب بھی آئے اور نوٹوں کی برسات بھی کر دے۔ یہ جذباتی جھٹکا یہی ہو سکتا تھا کہ اس کی محبوبہ کچھ دیر کے لیے کسی اور کی بانہوں میں ہو اور ایاز کو اس کا علم بھی ہو جائے۔ بہت سوچ سمجھ کر ستارہ نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ ایاز دلشاد سے ملنے اس کے گھر پہنچا تو دلشاد کے بجائے ستارہ نے استقبال کیا اور اسے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ ایاز نے اسے اپنی توہین سمجھا کہ اسے انتظار کرایا جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ستارہ اندر آئی تو اس نے دلشاد کے بارے میں پوچھا۔

”وہ کچھ مصروف ہے۔ فارغ ہوتی ہے تو آپ کے پاس آتی ہے۔“ ستارہ نے بڑی بے مروتی سے جواب دیا۔

”اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھے انتظار کرنا پڑا ہو۔“

”اب آپ نے اسے خرید تو نہیں لیا ہے۔ ایک بہت بڑی سیاسی شخصیت ہیں جو دلشاد کو پسند کرتے ہیں اور اس پر

بہت کچھ خرچ کرتے ہیں۔ اس وقت وہ آئے ہوئے ہیں۔ دلشاد ان کے پاس بیٹھی ہے وہ چلے جائیں گے تو دلشاد آپ کے پاس آ جائے گی۔“

”آپ نے تو کہا تھا میں دن کے وقت آیا کروں۔ دن میں کوئی نہیں آتا۔“

”میاں یہ طوائف کا کوٹھا ہے۔ کوئی اگر دن کے وقت آ گیا تو میں اسے روک نہیں سکتی۔“

”میں دلشاد سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے اگر میرے سوا کوئی اس کے پاس بیٹھے۔“

”طوائف سے محبت کی نہیں جاتی، خریدی جاتی ہے۔ جو نوٹ دے گا دلشاد اس کے پاس بیٹھے گی۔“

”یہ رہی قیمت؟ ایاز نے نوٹوں کی ایک گڈی ستارہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”دلشاد کو میرے پاس بھیج دیجیے۔“

”یہ ہوئی نابات۔ دلشاد ابھی حاضر ہوتی ہے۔“

دلشاد کے پاس کوئی نہیں آیا تھا۔ یہ بہانہ صرف اس لیے کیا گیا تھا کہ ایاز کی عزت نفس کو زخمی کیا جائے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ دولت خرچ کرے۔ ستارہ کا میاں ہو گئی تھی۔ وہ کمرے سے باہر گئی اور دلشاد اندر آ گئی۔ جتنی دیر میں دلشاد آتی ایاز علی سوچ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

”دلشاد، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم صرف مجھ سے ملو، کسی اور سے نہ ملو۔“

”ایاز، میں تو خود یہی چاہتی ہوں لیکن میں طوائف ہوں۔ میرے بہت سے خریدار ہیں۔ میں کس کس کو منع کروں گی۔“

”میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے ہر خریدار کو خرید لوں گا۔“

”تم کس کس کو خریدو گے۔“

”پھر میں تمہیں خرید لوں گا۔“

”اماں نہیں مانیں گی۔“

”انہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ بھاگ چلو۔“

”مجھے اس سے بھی انکار نہیں لیکن تمہارے گھر والے مجھے قبول نہیں کریں گے۔ مجبور ہو کر تم مجھے پھر یہیں چھوڑ جاؤ گے۔“

”میں سب سے بغاوت کر لوں گا لیکن تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

دوای کے کسی بھی گوشے میں اور ملک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد

رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے

ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر

رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے

ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر

بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شماریات (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیروز ٹریڈنگ ہاؤس اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

والدہ سے ضرور کریں گے۔ ممکن ہے ان کے سمجھانے کے بعد ان کا فیصلہ تبدیل ہو جائے۔ وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ والدہ بھی اس سلسلے میں اس سے ضرورات کریں گی۔ اس نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا لیکن یہ طے کر لیا تھا کہ اب وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ کوشش کرے گا کہ دلشاد کی ماں اپنی شرائط میں نرمی پیدا کر دیں۔

اس کی توقع کے عین مطابق اس کی ماں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ باپ کی شرافت کا واسطہ دیا۔ خاندان کے وقار کا سوال درمیان میں رکھا۔ طوائفوں کی بد اعمالیوں اور فریب کاریوں کے قصے سنائے۔ ان میں کون سی ایسی نئی بات تھی جو ایاز علی نے پہلے نہ سنی ہو لیکن وہی بات کہ وہ جوانی ہی کیا جو دیوانی نہ ہو۔ اسے نہ باپ کی عزت کا خیال آیا نہ ماں کے آنسو دیکھ سکا اور اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

دوسرے کیا سوچ رہے ہیں ایاز کو اس کا علم تو نہیں تھا لیکن خود اس کا حال یہ تھا کہ دورا ہے پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک طرف گھر والے تھے دوسری طرف دلشاد تھی۔ دلشاد کی طرف بڑھتا تھا تو گھر والے چھوٹتے تھے۔ گھر والوں کی بات مانتا تھا تو دلشاد ہاتھ سے جاتی تھی۔ اسے دونوں میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرنا تھا لیکن یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ اس کشمکش نے اسے بے حال کر دیا۔ اس نے گھر میں رہنا کم کر دیا تھا۔ کاروبار کی طرف سے بھی غافل ہو گیا تھا۔ کئی کئی دن دفتر کی شکل بھی نہیں دیکھتا تھا۔ تمام کام ملازموں پر چھوڑ دیا تھا۔ جس کے دل میں جو آتا، کرتا تھا۔

اس نے کئی مرتبہ اپنی حالت کو بہ غور دیکھا۔ اسے خود پر ترس آنے لگا تھا۔ ماں باپ کو دیکھتا تو ان پر بھی رحم آتا تھا۔ وہ بار بار سوچتا تھا کہ وہ دلشاد سے شادی کا ارادہ ترک کر دے تو تمام پریشانیوں سے نجات مل جائے گی لیکن ہر بار اسے شکست ہوتی تھی۔ دلشاد کی محبت اس کے ہر ارادے کو توڑ دیتی تھی۔ لگتا تھا دلشاد کے بغیر زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔

ستارہ نے بڑی ہوشیاری سے چاند خاں کو اس کا ہمدرد بنا کر اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ چاند خاں نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ دلشاد سے شادی کے لیے اس کی مدد کرے گا۔ ستارہ کو سمجھائے گا کہ وہ اپنی شرط تبدیل کر دے۔ اس کے والد کی شرکت کے بغیر اس کی شادی پر رضامند ہو جائے۔

چاند خاں کے ذریعے ستارہ کو ایاز کی خبریں برابر مل رہی تھیں۔ یہ سن کر اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا تھا کہ ایاز علی اپنے باپ کا گھر چھوڑنے والا ہے۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ جب اکلوی اولاد باپ سے باغی ہو جائے تو باپ کے دل پر کیا گزرتی

سے بتا دو کہ وہ لڑکی ہے کون۔ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ ہمیں اس کے گھر کب جانا ہے۔“

”ڈیڈی، وہ لڑکی شاید آپ کے معیار پر پوری نہ اترے۔“

”مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے بیٹا۔ غریب ہونا کوئی جرم نہیں۔ اچھا ہے تم کسی غریب کا سہارا بنو گے۔“

”وہ لڑکی غریب نہیں۔“

”معمولی شکل و صورت کی ہے؟“

”ہے تو بہت خوب صورت۔“

”پھر ایسی کیا کمی ہے اس میں کہ بتاتے ہوئے ڈر رہے ہو۔“

”وہ لڑکی طوائف ہے۔“

”کیا بچہ سرفراز کی آواز اتنی بلند ہو گئی کہ ایاز کو ان کی صحت کی فکر ہونے لگی۔“

”تم اپنی آوارگی کی سند اس طرح پیش کر رہے ہو۔ میری تربیت کا اس طرح مذاق اڑا رہے ہو۔ اب اس گھر میں طوائف آئے گی۔ اس کے رشتہ دار میراثی ہوں گے، اس کی ماں نائیکہ ہوگی۔“

”مجھے کسی سے غرض نہیں۔ کوئی یہاں نہیں آئے گا۔ میں اس لڑکی کو اس گندے ماحول سے نکالنا چاہتا ہوں۔“

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہاں کا کوڑا یہاں لانا چاہتے ہو۔“

”اگر آپ اس کوڑے کو گھر میں رکھنا نہیں چاہتے تو میں اسے کہیں اور لے جاؤں گا۔ بس آپ میری ایک خوشی پوری کر دیں۔ میرے ساتھ چلیں اور اس لڑکی کی ماں سے مل کر میرا رشتہ مانگ لیں۔ اس کی یہی شرط ہے۔“

”میرے بچے میں یہ بھی نہیں کر سکوں گا۔ تو یہ خیال ہی دل سے نکال دے۔ میں بھی جوانی میں ایسی جگہوں پر نہیں گیا۔ اب کیا جاؤں گا۔“

”اگر آپ نے قسم ہی کھالی ہے تو میں کوئی اور راستہ تلاش کروں گا۔ اس لڑکی سے شادی ضرور کروں گا۔“

”جو جی میں آئے کرتے پھرو۔ مجھے تمہاری خوشی ضرور عزیز ہے لیکن خاندان کا وقار اس سے زیادہ عزیز ہے۔“

ایاز علی کا اس جواب کے بعد بھی کچھ بولنا گستاخی کے مترادف تھا۔ بولنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا کیونکہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا اس نے کہہ دیا تھا۔ اب تو یہ انتظار کرنا تھا کہ باپ کے اس فیصلے میں کوئی چپک آتی ہے یا نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ اتنے بڑے انکشاف کے بعد اس کے والد اس کا تذکرہ

”تم کیا سمجھتے ہو اماں تیار ہو جائیں گی؟ میں ان کے لیے سونے کی کان ہوں۔“

”میں اپنی ساری دولت انہیں دینے کو تیار ہوں۔“

”بات کر کے دیکھ لو لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو پھر تمہارے یہاں آنے پر بھی پابندی لگ جائے گی وہ تمہیں تماشا کی سمجھ کر لوٹ رہی ہیں۔ راز کھل گیا تو تمہیں تماشا بنا دیں گی۔ بہتر یہ ہے کہ تم یہاں آنا ہی چھوڑ دو۔ بھول جاؤ مجھے۔“

”اب میں تمہیں بھولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”تمہاری ضد ہے تو اماں سے بات کر لو۔“

اس نے ستارہ سے بات کی۔ خلاف توقع اس نے انکار نہیں کیا لیکن یہ شرط رکھ دی کہ یہ شادی صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ اسے باپ کو لے کر یہاں آئے۔ اس نے ستارہ سے تو وعدہ کر لیا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس شرط کا پورا ہونا محال ہے۔ کون باپ ہوگا کہ بیٹے کا رشتہ لے کر طوائف کے کوٹھے پر جائے گا۔

ایاز نے بہت دن سوچنے کے بعد ایک مرتبہ پھر ستارہ سے بات کی۔

”میرے والد کبھی تیار نہیں ہوں گے کہ یہاں آئیں۔ میں شادی کر لیتا ہوں اس کے بعد انہیں بتا دوں گا۔ اگر انہوں نے اس کے بعد بھی قبول نہیں کیا تو میں گھر والوں کو چھوڑ دوں گا۔“

ستارہ بیگم کا تو منصوبہ ہی یہ تھا کہ سرفراز یہاں آئے اور وہ اسے ذلیل کرے۔ اس کا سر جھکا دے۔ پھر وہ کیوں ایاز کی بات مانتی۔ مصیبت یہ تھی کہ دلشاد بھی یہی اصرار کر رہی تھی کہ اس کا باپ رشتہ لے کر آئے۔

ایک زمانہ وہ تھا جب سرفراز علی کے سامنے بھی یہ مرحلہ آیا تھا لیکن انہیں یہ ہمت نہیں ہو سکی تھی کہ اپنے باپ احمد علی کے سامنے اپنی شادی کی بات کر سکتے لیکن اب زمانہ بدل گیا تھا۔ ایاز علی نے ہمت کر لی۔

”ڈیڈی میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں چاہتا تھا پہلے تم کاروبار کے نشیب و فراز اچھی طرح سمجھ لو اس کے بعد تمہارے لیے ایک اچھی سی لڑکی تلاش کی جائے۔ اب تم کہتے ہو تو میں تمہاری ماں سے بات کروں گا۔“

”لڑکی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ڈیڈی۔ لڑکی میں نے دیکھ لی ہے۔“

”ارے واہ! یہ تو اور اچھی بات ہے۔ اب ذرا جلدی

ہے۔ وہ سرفراز کو اسی طرح کی صورت حال سے دوچار کرنے کے خواب دیکھا کرتی اور اب اس کے خواب کی تعبیر اسے مل رہی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ طوائف جب ایک مرتبہ کسی آدمی کی زندگی میں داخل ہو جائے تو قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سرفراز خوش قسمت تھا کہ ابھی تک قبر کا منہ نہیں دیکھا تھا۔

اس وقت بھی چاند خاں کے سامنے بیٹھی وہ یہی باتیں کر رہی تھی۔

”تم تو کہہ رہی تھیں کہ ایک دن تم نخل میں ٹاٹ کا پیوند لگاؤ گی۔ سرفراز کے خاندان کا وقار اپنے پیروں تلے روند دو گی۔ دلشاد کو اس گھر کی بہو بناؤ گی۔ یہ تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا ہے۔ سرفراز اس شادی پر تیار نہیں۔ تم اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہو۔ میں تو کہتا ہوں، یہ شرط ختم کر دو۔ دلشاد کا ہاتھ ایاز کے ہاتھ میں دے دو۔ اس خاندان کی بہو تو وہ اس طرح بھی بن جائے گی۔“

”آدی کو ایک دم مار دو تو مزہ نہیں آتا۔ سرفراز کو ماروں گی مگر رڑ پاتر پا کر۔“

”سرفراز کے بیٹے کو اس کے مقابل تو لے آئی ہوں لیکن ابھی میرے ترکش میں کئی تیر اور بھی ہیں وہ بھی تو چلانے ہیں۔ ابھی تو اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوا ہوگا کہ اس کی بربادی کے پیچھے ہے کون۔“

”یہ بتانے کا وقت آئے گا کب۔“

”شاید وہ وقت اب آ گیا ہے۔ میں نے ایاز کے یہاں آنے پر پابندی لگا دی تھی مگر اب یہ پابندی اٹھا رہی ہوں۔ تم کل دن کے وقت اسے یہاں لے آؤ۔ اس کے سامنے اپنا یہ احسان بھی جتنا کہ میری ضد کا پتھر تمہاری کوششوں سے موم ہوا ہے۔“

”میں کل اسے یہاں لے کر آ جاؤں گا۔ تمہارا انتقام بھی پورا ہو جائے گا۔ اب اپنا وعدہ بھی پورا کرو۔“

”کیسا وعدہ۔“

”تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دلشاد میری بیٹی ہے سرفراز کی نہیں لیکن میں نے اپنا منہ بند رکھا ہے۔ صرف اس لیے کہ تم سرفراز کو بلیک میل کرتی رہو۔ اس کا صلا مجھے کیا ملا۔ میری جوانی بھی گزر گئی تمہاری بھی۔ میں اب تک شادی کے لیے ترس رہا ہوں۔ تم نے بیٹی حاصل کرنے کے لیے مجھ سے تعلقات قائم کیے اور پھر مجھے فراموش کر دیا۔“

”مرے کیوں جاتے ہو۔ ابھی کچھ کام باقی ہے۔ بس

وہ ہو جائے شادی بھی کر لوں گی حالانکہ میں صرف سرفراز سے شادی کر سکتی تھی۔ خیر تم سہی۔“

چاند خاں کمرے سے نکلا تو ستارہ نے دلشاد کو بلایا کیونکہ اب وہ جو کچھ کرنے والی تھی اس کے لیے اسے اعتماد میں لینا ضروری تھا۔

دلشاد سے چپکے چپکے باتیں کرتی رہی۔ دلشاد کبھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ لیتی کبھی اثبات میں گردن ہلاتی تھی۔

”بس یہ کام ہو جائے پھر میرا وعدہ میں تیری شادی ایاز سے کر دوں گی۔ مجھے تم دونوں سے کوئی دشمنی نہیں۔ میں تو ایاز کے باپ سے انتقام لینا چاہتی ہوں جو میری دنیا میں آیا اور مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ ذرا سوچ سرفراز کا بیٹا جب اسے ذلیل کرے گا تو اس پر کیا گزرے گی۔“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“

”مجھے کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے میری جان۔ بس جو میں نے کہا ہے اس پر عمل کر لینا۔“

دوسرے دن چاند خاں ایاز کو لے آیا اور دلشاد کے حوالے کر کے گھر کے کسی کمرے میں غائب ہو گیا۔ اب یہاں سے دلشاد کو کرنا تھا جو کچھ کرنا تھا۔ اس نے ایاز کا ہاتھ پکڑا اور ایک کمرے میں لے آئی۔

”آج یہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

ایاز کا یہاں تقریباً ایک مہینے کے بعد آنا ہوا تھا۔ دلشاد کو بھی وہ اتنے دنوں بعد ہی دیکھ رہا تھا۔ دلشاد کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن دیوار پر لگی ایک تصویر پر نظر پڑتے ہی سب کچھ نظر آنے لگا۔ یہ اس کے باپ سرفراز علی کی جوانی کی تصویر تھی لیکن صاف پہچانی جا رہی تھی۔ ایسی ہی ایک تصویر اس نے گھر کی البم میں بھی دیکھی تھی۔ اس وقت وہ حیران تھا کہ یہ تصویر یہاں کیسے!

”یہ تصویر کس کی ہے دلشاد۔“

”تم جانتے ہو اس آدمی کو؟“

”اگر جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا البتہ ایسا لگتا ضرور ہے کہ جس کی یہ تصویر ہے اسے میں نے دیکھا ہے۔“

”تم بھی کن باتوں میں الجھ گئے۔ چھوڑو اس تصویر کو۔ اتنے دن بعد تو ہم ملے ہیں۔ آؤ بیٹھو۔ اپنی باتیں کرتے ہیں۔“

ایاز اس کے کہنے سے بیٹھ تو گیا۔ دلشاد سے باتیں بھی کرنے لگا لیکن اس کا ذہن اس تصویر ہی میں الجھا ہوا تھا۔ وہ

بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے بے اختیار تصویر کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ دلشاد اس کی اس کیفیت کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ تصویر کس کی ہے جو تم اتنی دلچسپی لے رہے ہو۔“

میری باتیں بھی تمہیں اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔“

”یہی تو مجھے نہیں معلوم کہ یہ تصویر کس کی ہے۔ میں تو تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ اماں کو کچھ معلوم ہو تو ہو۔“

”شہر و میں ان کو بلاتی ہوں۔“

ستارہ فاتحانہ انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔ ایاز اس وقت بھی تصویر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے نہیں شرمندگی کے آثار تھے۔

”دلشاد کہہ رہی ہے اس تصویر میں چھپے آدمی کو جانتے ہو۔“

”جانا تو اب ہوں البتہ پہچانتا ضرور ہوں۔ میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ یہ تصویر یہاں کیوں ہے۔ اس آدمی سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“

”وہی جو تمہارا دلشاد کے ساتھ ہے۔ یہ کبھی میرے عاشق ہوتے تھے۔ پھر جب مطلب نکل گیا تو ایسے غائب ہو گئے کہ میں آج تک ڈھونڈ رہی ہوں۔“

”اگر میں انہیں آپ کے سامنے پیش کر دوں؟“

”میری آنکھیں تمہارے احسان کا بوجھ اٹھانے کے لیے جھک جائیں گے۔“

”اور دلشاد سے میری شادی۔“

”شاید اب میں اپنی شرط واپس لے لوں۔“

”نہیں شرط واپس لینے کی ضرورت نہیں۔ اب مجھے امید ہے کہ اپنے والد کو راضی کر لوں گا۔“

”پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

وہ گھر پہنچا تو خوش قسمتی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

سرفراز علی لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ چائے کا کپ سامنے رکھا تھا اور سگاران کے ہونٹوں سے لگا ہوا تھا۔ وہ اندر گیا تو معلوم ہوا اس کی والدہ ڈرائیور کے ساتھ کہیں باہر گئی ہوئی ہیں۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور باپ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ مہینوں بعد اس نے باپ کا سامنا کیا تھا۔ سرفراز علی کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔ ملازم چائے رکھ کر چلا گیا تھا۔

”ایاز کیسے ہوا اور آج کل کہاں غائب ہو۔“

”ڈیڈی، میں آپ کے سامنے ہوں اور خوش بھی

ہوں۔“

”میری دعا ہے کہ تم اسی طرح خوش رہو۔“

”ڈیڈی، آپ سے ایک بات پوچھوں۔“

”پوچھو بیٹا۔“

”آپ کسی ستارہ نامی عورت کو جانتے ہیں جو آپ کی جوانی میں آپ کو کہیں ملی تھی۔“

”ایاز، جوانی ہم سے اتنی پیچھے رہ گئی ہے کہ یہ نام اگر حافظے میں ہوگا بھی تو اب مٹ چکا ہے۔ مجھے تو اس نام کی کوئی لڑکی یاد نہیں۔ پھر بات یہ ہے کہ ہم اڑتے ہی گرفتار ہو گئے تھے۔ کاروبار میں الجھے رہے پھر تمہاری ماں سے شادی ہو گئی۔ کالج کے زمانے میں کوئی ستارہ ملی ہو تو ایسا تعلق نہیں رہا ہوگا کہ ہم نام بھی یاد رکھتے۔ ویسے تمہیں یہ عورت کہاں مل گئی۔ اس نے بتایا نہیں کہ وہ مجھے کیسے جانتی ہے؟“

”میں نے پوچھا تھا۔ اس نے بڑا دلچسپ انکشاف کیا۔ وہ کہہ رہی تھی آپ اس کی محبت میں گرفتار تھے۔“

”بہت خوب! ہم محبت میں گرفتار ہوئے تھے اور ہمیں معلوم ہی نہیں۔ وہ محترمہ ایک طرفہ عشق کرتی ہوں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میاں ہم خوب صورت ہوا کرتے تھے اس زمانے میں۔“

”اس عورت کو آپ نے اس لیے تو فراموش نہیں کر دیا کہ وہ طوائف ہے۔“

”یہ وہی عورت تو نہیں ہے جس کی بیٹی سے تم شادی کرنا چاہتے ہو۔“

”آخر آپ نے پہچان ہی لیا۔ اگر آپ نے اس عورت سے شادی کر لی ہوتی تو وہ گناہوں سے نکل چکی ہوتی اب میں اس کی بیٹی کو گناہ کی دلدل سے نکالنا چاہتا ہوں تو آپ مجھے بھی روک رہے ہیں۔“

”کیا بکو اس لگا رہی ہے۔ تم ان طوائفوں کے ہتھکنڈوں کو نہیں جانتے۔ اس نے یہ کوئی نئی چال چلی ہے۔ وہ تمہیں یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ تم کسی پاکباز باپ کے بیٹے نہیں ہو۔ میں اسے جانتا تک نہیں وہ مجھ پر تہمت لگا رہی ہے۔“

”میں نے آپ کی تصویر اس کے کمرے میں دیکھی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے وہ بہت ہی شاطر ہے۔ اس نے میری تصویر کہیں سے حاصل کر لی ہوگی اور اب تمہیں بلیک میل کر رہی ہے۔“

”ڈیڈی میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میں تو

بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چلیں اور اس کی بیٹی سے میرا رشتہ طے کر دیں۔“

سرفراز علی صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ لیکن بیٹے پر اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے انہوں نے اپنا غصہ اپنی شفقت میں چھپا لیا۔

”بیٹا جب وہ عورت اتنی چالیں چلنے لگی ہے تو ہمیں بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ میں تمہیں اپنا فیصلہ کل سناؤں گا۔ اس وقت تو مجھے اپنے ایک دوست کی طرف جانا ہے۔“

ایاز بھی اب انہیں زیادہ شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے جو کہنا تھا کہہ ہی چکا تھا۔ باپ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

فرزانہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ ان کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ ایاز سے کہہ ہی چکے تھے کہ اپنے کسی دوست سے ملنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کپڑے تبدیل کیے پستول کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ گاڑی نکالی اور ستارہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

انہیں اس کا گھر ڈھونڈنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ شہر میں سب کچھ بدل گیا تھا لیکن اس محلے کا جغرافیہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ گاڑی اسی طرح گلی کے باہر پارک کی جو ان کا کبھی معمول رہا تھا۔ کوٹ میں رکھے پستول کا جائزہ لیا اور گاڑی سے اتر گئے۔

پیدل اس کے گھر تک گئے اور دروازے پر دستک دے دی۔ گھر کے کسی ملازم نے دروازہ کھولا اور اسے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ان کی محبت پر وان چڑھی تھی۔ اس کمرے میں بیٹھ کر پہروں محبت کی باتیں کی تھیں آج وہی جذبہ محبت، نفرت میں بدل گیا تھا۔ وہ آج اس ارادے سے آئے تھے کہ ستارہ کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیں گے۔ ایک مرتبہ پھر انہوں نے کوٹ کی جیب پر ہاتھ مار کر پستول کا جائزہ لیا۔

ستارہ اندر داخل ہوئی۔ کچھ دیر کے لیے وہ طوائف سے عورت بن گئی۔ ٹنگٹنگی باندھ کر سرفراز کو دیکھتی رہی۔ سرفراز کی کیفیت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ ان کا دل بھی کہہ رہا تھا۔

”بھئی اس شکل کو ہم پیار کیا کرتے تھے۔“

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دونوں اپنی اپنی حالتوں پر واپس آ گئے۔

”زہے نصیب! سرفراز علی آئے ہیں۔ شاید گھر میں آگ لگ چکی جو یوں گھبرائے ہوئے آئے ہیں۔“

”ذلیل عورت! میں آج تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

سرفراز نے کہا اور جیب سے پستول نکال لیا۔

”مٹھرو سرفراز! ابھی گولی مت چلاتا۔ مجھے ایک اہم راز تم پر ظاہر کرنا ہے۔ میں مرگئی تو یہ راز بھی ظاہر نہ ہو سکے گا اور تمہارے بیٹے کا نقصان ہو جائے گا۔“

”حرفہ عورت! اب کوئی اور چال چلنے والی ہے۔ میں اب تیری کوئی بات نہیں سنوں گا۔“ انہوں نے کہا اور پستول کا رخ ستارہ کی طرف کر دیا۔

”راز تو تم ظاہر کر چکیں۔ تم نے میرے بیٹے پر ظاہر کر دیا کہ میرا تم سے بھی کوئی تعلق تھا۔ میں نے تم پر کتنی دولت خرچ کی۔ صرف اس لیے کہ راز کو راز رکھو گی مگر تم نے عہد شکنی کی۔ تمہیں معلوم تھا کہ ایاز میرا بیٹا ہے اس کے باوجود تم نے اپنی بیٹی کو جو دراصل میری بیٹی ہے ایاز کے سامنے پیش کر دیا۔ تم کتنے بڑے گناہ کی مرتکب ہوئی ہو۔“

”دلشاد تمہاری بیٹی نہیں ہے۔“

”جو پہلے کہا تھا وہ جھوٹ تھا یا اب جھوٹ بول رہی ہو۔“

”سرفراز، ہم بازار میں بیٹھنے والے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ کس آدمی کا علاج کس دوا سے ہوگا۔ میں اگر دلشاد کو تمہاری بیٹی نہ کہتی تو تم کڑی کے جالے میں کبھی کی طرح تڑپنے پر بھی تیار نہ ہوتے۔ تم نے مجھ سے بے وفائی کی تھی۔ تمہیں سبق سکھانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ تم برسوں میرے درازے پر بیٹھنے کی طرح آکر کھڑے ہوتے رہے اور اب بھی میرے ایک اشارے پر بھاگے چلے آئے ہو۔“

”اگر دلشاد میری بیٹی نہیں تو کس کی اولاد ہے۔“

”خبردار! کوٹھے پر پیدا ہونے والیوں کے باپ کا نام نہیں پوچھتے۔ اس بازار میں بیٹیاں باپ سے نہیں ماں سے پہچانی جاتی ہیں۔ ہوگی کسی حرامی کی اولاد۔ میں نے تم سے شادی کا خواب دیکھا تھا۔ میرا خواب تو تم نے پورا نہیں کیا لیکن میں اپنی بیٹی کے ذریعے تمہارے خاندان کی شکل میں ٹاٹ کا پیوند لگا کر رہوں گی۔ تمہاری بیوی نہ بن سکی اس کا مجھے افسوس رہے گا لیکن تمہاری سمدھن بن کر تمہیں شکست ضرور دوں گی۔“

”ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ایاز میرا بیٹا ہے۔ وہ میری مرضی کے بغیر شادی نہیں کرے گا۔“

”یہ تمہارا دور نہیں ہے کہ تم اپنے باپ کے ازار بند سے بندھ گئے تھے۔ وہ تمہیں چھوڑ دے گا، دلشاد کو نہیں چھوڑے گا۔ وہ اب تک شادی کر بھی چکا ہوتا۔ وہ تو میں نے ڈھیل دینا بند کر دی تھی۔ میں چاہتی تھی دست سوال لے کر میرے دروازے پر تم آؤ۔“

قرض مسافت

”میں نے اب بھی تم سے بھیک نہیں مانگی۔“

”بھکاری بن کر آئے تو ہو۔ شریف بھکاری زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ دل ہی دل میں بھیک تو اب بھی مانگ رہے ہو گے کہ ستارہ میرے بیٹے کی جان چھوڑ دو۔ میں جواب میں یہ پوچھوں گی، کسی طوائف کو فریب دینے کا نتیجہ دیکھا؟“

”میں ایاز کو اپنے ہاتھ سے مار دوں گا لیکن تم سے بھیک نہیں مانگوں گا۔“

سرفراز علی کا غصہ ابھی اتر نہیں تھا لیکن اس نئی صورت حال میں ایک اور ترکیب ان کے ذہن میں آچکی تھی۔ یہ بات تو صاف ہو چکی تھی کہ دلشاد ان کی بیٹی نہیں۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ اگر وہ ان کی بیٹی ہوتی تو ستارہ لاکھ طوائف سہی بھائی بہن کی شادی پر بھی آمادہ نہ ہوتی۔ بہت پہلے ایاز کو آگاہ کر چکی ہوتی۔ اگر ایاز کو یہ بتا دیا جائے کہ دلشاد اس کی بہن ہے تو وہ خود بخود پیچھے ہٹ جائے گا۔ یہ یقین تو اسے ہو چکا کہ ستارہ سے میرے تعلقات تھے۔ اس روشنی میں اسے یہ ماننے میں دیر نہیں لگے گی کہ دلشاد اس کی بہن ہے۔ میں اس کی نظروں میں گر جاؤں گا لیکن خاندان کی عزت تو بچ جائے گی۔ میری سلیس تو محفوظ ہو جائیں گی۔ میں ستارہ کو قتل کر کے پھانسی کیوں چڑھوں۔ حکمت سے کیوں نہ کام لوں۔ اس نے درست فیصلہ کیا اور ستارہ کو کمرے میں چھوڑ کر اس کے گھر سے نکل گیا۔

جب ستارہ کے پاس کوئی ہوتا تھا تو گھر میں کسی کی جرات نہیں تھی کہ اس کمرے کا رخ بھی کرنا لیکن چاند خاں کسی سے نہ دبتا تھا۔ وہ اس وقت بھی دروازے سے لگا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا اور اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس نے یہ سن لیا تھا کہ ستارہ نے سرفراز کو حقیقت بتادی ہے۔ اب تک تو وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ سرفراز علی چونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ دلشاد ان کی بیٹی ہے اس لیے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن یہ سن کر اسے غصہ آ گیا کہ ستارہ نے ان کا ذہن صاف کر دیا۔ اب یا تو وہ شادی پر رضامند ہو جائیں گے یا ایاز خود شادی کر لے گا۔ اس سے پہلے کہ یہ راز کسی اور پر ظاہر ہو ستارہ کا منہ بند ہو جانا چاہیے کیونکہ اگر دلشاد اس گھر سے چلی گئی تو کوٹھا ہی بند ہو جائے گا۔ دلشاد میری بیٹی ہے۔ اس پر میرا حق ہے۔ اس کی کمائی کو کیوں ہاتھ سے جانے دوں۔

سرفراز علی جیسے ہی کمرے سے باہر نکلے چاند خاں کمرے میں پہنچ گیا۔ ستارہ صوفے پر بیٹھی تھی اور غالباً کچھ دیر پہلے ہونے والی گفتگو پر غور کر رہی تھی۔ چاند خاں جیسے ہی

اندر داخل ہوا اس کی نظر ایک پستول پر پڑی جو بستر پر رکھا تھا۔ سرفراز علی جاتے جاتے اپنا پستول میز پر رکھا چھوڑ گئے تھے۔ پستول دیکھتے ہی چاند خاں کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کودا۔

”ارے سرفراز علی اپنا پستول ہمیں چھوڑ گئے۔“ چاند خاں نے کہا اور جیب سے رومال نکال کر یہ پستول اٹھا لیا تاکہ انگلیوں کے نشان نہ آئیں۔

ستارہ نے گردن اٹھا کر دیکھا اور اسی وقت چاند خاں نے یکے بعد دیگرے تین فائر نہایت قریب سے کر دیے۔ ستارہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔

چاند خاں نے رومال جیب میں رکھا۔ پستول زمین پر پھینکا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ گولی کی آواز سن کر گھر کے تمام لوگ جمع ہو گئے۔ چاند خاں چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ سرفراز علی ستارہ کو قتل کر کے بھاگ گیا۔

”میں نے خود سرفراز علی کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔“ پورے بازار میں شور مچ گیا۔ لوگ جمع ہونے لگے۔ کچھ لوگوں نے سرفراز علی کو مکان سے نکلتے ہوئے دیکھا بھی تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کون ہے لیکن یہ بتا سکتے تھے کہ کوئی سیزہیاں اتر کر گلی سے باہر گیا تھا۔ چاند خاں نے حلیہ بتایا تو سب نے تصدیق بھی کی۔ کچھ لوگ تھانے گئے اور سرفراز علی کے نام کی ایف آئی آر کنوادی۔ تھوڑی دیر میں پولیس بھی آ گئی۔ آلہ قتل یعنی پستول قبضے میں کر لیا گیا۔ ستارہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال روانہ کر دی گئی۔ کمرے میں لگی سرفراز علی کی تصویر ایک بڑا ثبوت بن گئی کہ سرفراز علی کے تعلقات ستارہ سے رہ چکے تھے۔ چاند خاں نے نمک مرچ لگا کر اپنا بیان پولیس کو لکھوا دیا۔

سرفراز علی گھر پہنچے۔ غصے میں تو تھے ہی جاتے ہی ایاز کے بارے میں پوچھا۔ وہ اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ ورنہ وہ اسے اسی وقت بتا دیتے کہ دلشاد ان کی بیٹی ہے اس لیے اس سے شادی نہیں ہو سکتی۔ ان کا یہ حربہ کامیاب ہو جاتا لیکن ستارہ کے کوٹھے پر کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔

ایاز رات کو بہت دیر سے آیا۔ سرفراز علی نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس وقت بات چھیڑی جائے۔ ان کے ذہن میں اب بھی وہ باتیں گردش کر رہی تھیں جو ان کے اور ستارہ کے درمیان ہوئی تھیں۔ انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ایاز ان باتوں سے لاعلم ہے۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ ستارہ سے میرا کبھی کوئی تعلق رہا ہے۔ اگر میں اسے یہ بتاؤں کہ دلشاد اس کی بہن ہے تو کیا وہ اس خبر کو برداشت کر سکے گا۔ اس کا رد عمل کیا

ہوگا؟ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ کوئی بات ہی نہ کی جائے۔ اگر ایسا ہوا تو ایاز، دلشاد سے شادی کر لے گا۔ میری عزت بچ جائے گی لیکن خاندان کی عزت کا کیا ہوگا۔ ستارہ جیسی عورت اور اس کے رشتہ داروں کا میرے گھر آنا جانا ہو جائے گا۔ دلشاد ایاز کی صرف بیوی نہیں ہوگی اس کے بچوں کی ماں بھی ہوگی۔ ان بچوں ہی سے ایاز کی نسل چلے گی۔ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ ان خدشات سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ ایاز کو اس شادی سے روک دیا جائے۔ میں اس سے کہہ دوں کہ دلشاد میری بیٹی ہے۔ میں گھر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا لیکن خاندان کی عزت تو محفوظ ہو جائے گی۔ انہیں اب اپنی غلطی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ اگر ستارہ سے میرے مراسم نہ رہے ہوتے تو مجھے یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ میں نے جو بویا تھا وہی کاٹنا پڑ رہا ہے۔ یہ میرے گناہ ہیں جو میری اولاد کے آگے آرہے ہیں۔ یہ سلسلہ اگر اب بھی نہیں رکا تو ایاز کی اولاد کے آگے آئے گا۔ میں ایاز کو اس شادی سے روکوں گا۔ میرے پاس دلیل اتنی مضبوط ہے کہ ایاز کو قاتل ہونا پڑے گا۔ اسے جذباتی صدمہ ضرور پہنچے گا لیکن میں دلشاد کو بہو کہنے سے بچ جاؤں گا۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں تھے۔ کسی فیصلے پر نہیں پہنچے تھے کہ انٹرکام پر چوکیدار نے اطلاع دی کہ دو پولیس موبائلیں آئی ہیں پولیس والے آپ کو باہر بلا رہے ہیں۔ سرفراز علی نے گھڑی دیکھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ ان کا ذہن فوراً ایاز کی طرف گیا۔ یہ لڑکا تو کہیں کوئی ایسی ویسی حرکت کر کے نہیں آرہا ہے۔ انہوں نے فرزانہ کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ پاؤں میں سلیپر ڈالے اور باہر نکل آئے۔

”سر، ہم آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔“

”مجھے؟ کس جرم میں؟“

”قتل کے الزام میں۔ ایک طوائف ستارہ بیگم کا قتل ہوا ہے۔ ایف آئی آر میں آپ کا نام درج کرایا گیا ہے۔“

”ستارہ کا قتل ہو گیا!“

”جی ہاں۔“

”میں اس سے ملنے ضرور گیا تھا لیکن قتل میں نے نہیں کیا ہے۔“

”آپ اپنی بے گناہی عدالت میں ثابت کیجیے گا۔ فی الحال تو ہم آپ کو حراست میں لے رہے ہیں۔“

”میں اپنے وکیل کو فون کر لوں؟“

”آپ تھانے جا کر وکیل سے رابطہ کر لیجیے گا۔ ہم آپ کو بھاگنے کا موقع نہیں دے سکتے۔“

اتنی دیر میں ایاز بھی باہر آ گیا۔ اس نے بھی سنا کہ ستارہ کا قتل ہو گیا ہے اور الزام اس کے باپ کے سر آیا ہے۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ الزام جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ ڈیڈی نے اپنے گواہ کو راستے سے ہٹایا ہے۔ پولیس سرفراز کو لے کر چلی گئی۔

ایاز نے اپنے فیملی وکیل کو فون کر دیا۔ سرفراز علی نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے جرم سے انکار کیا تھا لیکن وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے کہ پستول ان کا نہیں ہے۔

انہوں نے عدالت میں بھی جرم سے انکار کیا۔ پستول پر ان کی انگلیوں کے نشان تھے۔ اس بات کو انہوں نے قبول کیا تھا کہ ستارہ ان کی پرانی واقف کار تھی۔ یہ بات بھی سامنے آگئی تھی کہ ان کا بیٹا ستارہ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مقتولہ کے وکیل نے یہی نکتہ اٹھایا تھا کہ سرفراز علی نے یہ شادی رکوانے کے لیے ستارہ کو راستے سے ہٹا دیا۔

سرفراز کے وکیل نے اعتراض کیا۔ ”اگر قتل کا یہی مقصد تھا تو سرفراز علی دلشاد کو قتل کرتے نہ کہ ستارہ کو۔ شادی تو اب بھی ہو سکتی ہے۔“

”شادی نہیں ہو سکتی۔“ مقتولہ کے وکیل نے انکشاف کیا۔ ”دلشاد دراصل سرفراز علی کی ناجائز بیٹی ہے اور ایاز کی بہن ہے۔ ستارہ نے دولت کے لالچ اور انتقام کے لیے اس رشتے کا پاس نہیں کیا۔ سرفراز علی کو یہی غصہ تھا۔ اس لیے انہوں نے ستارہ کو قتل کیا۔“

اس کے ثبوت میں چاند خاں کو پیش کیا۔ چاند خاں نے بھی دعویٰ کیا کہ دلشاد، سرفراز علی کی بیٹی ہے اور یہ اس کا خرچ اٹھاتے رہے ہیں۔

اس انکشاف نے عدالت پر سناٹا طاری کر دیا۔

دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر جلی حروف میں شائع ہوئی۔

”ستارہ بیگم کے قتل میں مبینہ ملزم سرفراز علی کے بیٹے ایاز علی نے خودکشی کر لی۔“

سرفراز علی کے مقدمے کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ ایاز نے اپنا فیصلہ خود کر لیا۔

سرفراز علی خاندان کی عزت بچانے کے لیے زندگی بھر مصروف عمل رہے لیکن نہ عزت بچا سکے، نہ بیٹا۔ صرف خون ہی رنگ نہیں لاتا، گناہ بھی رنگ دکھاتا ہے۔